بسم الله الرحمن الرحیم

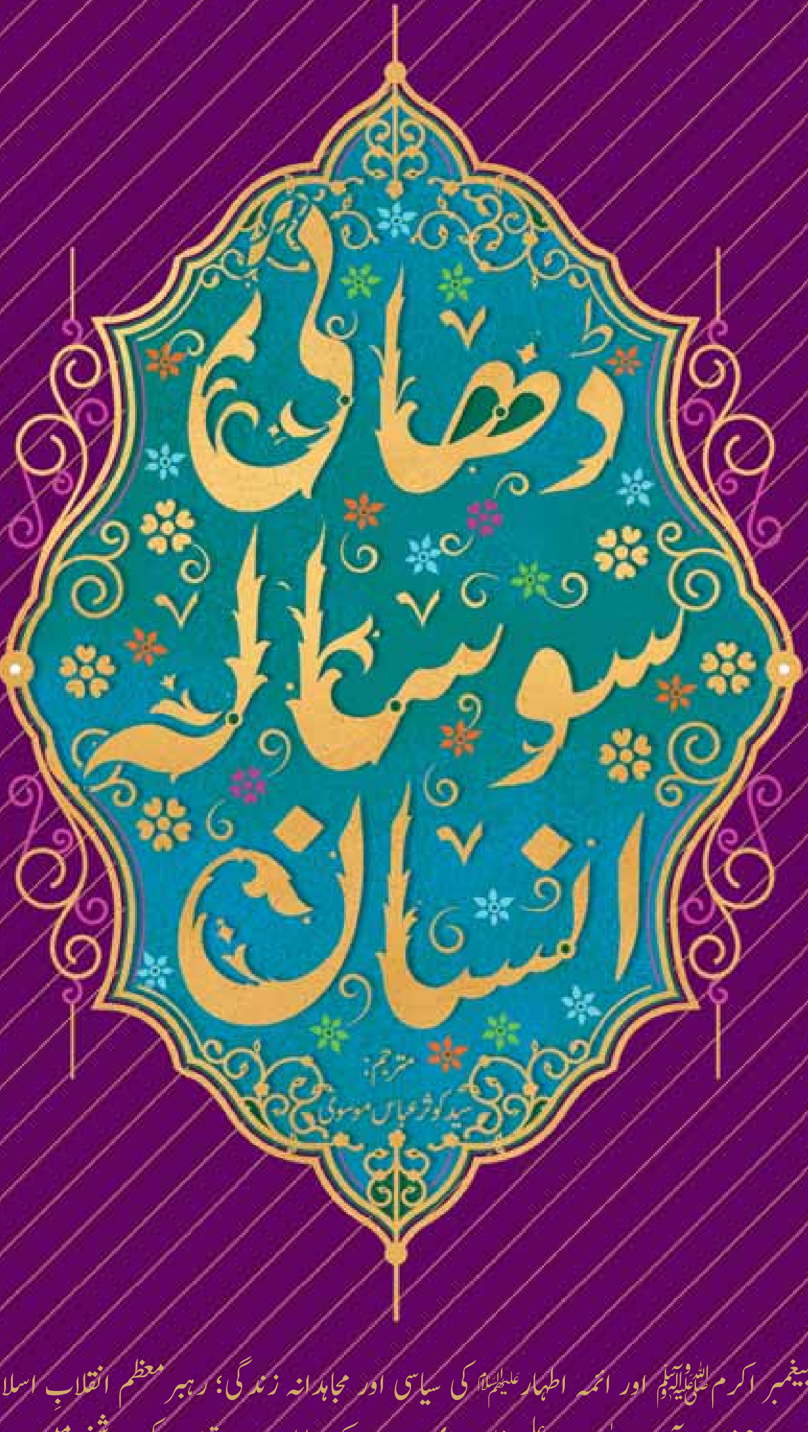

ڈھائی سو سالہ انسان

مترجم:
سید کوثر عباس موسوی

پیغمبر اکرم ﷺ اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی سیاسی اور مجاہدانہ زندگی؛ رہبر معظم انقلابِ اسلامی
حضرت آیت اللہ سید علی خامنہ ای دام ظلہ الوارف کے بیانات اور تقاریر کی روشنی میں

عنوان: ”ڈھائی سو سالہ انسان“

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی سیاسی اور مجاہدانہ زندگی؛ رہبر معظم انقلابِ اسلامی
حضرت آیت اللہ سید علی خامنہ ای دام ظلہ الوارف کے بیانات اور تقاریر کی روشنی میں
مترجم: سید کوثر عباس موسوی
پروف ریڈنگ و تصحیح: سید عقیل حیدر زیدی
ڈیزائننگ جلد: مصطفٰی معمی وند
ڈیزائننگ صفحات: نجمہ معمی وند
بہ کوشش: مدیریت زائرین غیرایرانی آستان قدس رضوی
طبع اول: ۱۴۳۸ھ ق/۱۳۹۶ھ ش/۲۰۱۷ء
تعداد: ۲۰۰۰ نسخے

فہرست مطالب

پیش گفتار ۱۱

مقدّمہ ۱۵

پہلا باب: پیغمبر اکرم حضرت محمد ﷺ کی سیاسی اور مجاہدانہ زندگی ۲۷

بعثتِ خاتم الانبیاء ﷺ، بیداری کا آغاز ۲۹

اسلامی نظام کی بنیاد ۳۳

نظام مصطفوی ﷺ کی اہم خصوصیات ۳۶

پیغمبر اکرم ﷺ کی مدینہ ہجرت ۳۹

اسلامی نظام کی دشمنوں سے حفاظت ۴۵

مدینہ منوّرہ کے یہودیوں کے ساتھ آپؐ کا برتاؤ ۵۲

پیغمبر اکرم ﷺ کی شخصیت کے پہلو ۵۸

اسلامی نظام کا استحکام ۶۰

دوسرا باب: حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی سیاسی اور مجاہدانہ زندگی ۶۹

امامت کا حقیقی مفہوم ۷۱

ائمہ اطہار علیہم السلام کی زندگی میں حصولِ اقتدار کی جدّوجہد ۷۶

تاریخ امامت کے چار ادوار ۷۸

امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی شخصیت ۸۳

امیر المومنین علیہ السلام کا اندازِ حکومت ۸۵

امیر المومنین علیہ السلام کی فداکاری ۸۷

رسول اکرم ﷺ کی رحلت سے خلافتِ ظاہری تک ۸۹

خلافتِ ظاہری کا زمانہ ۹۵

امیر المومنین علیہ السلام کا عادلانہ دورِ حکومت ۹۹

امیر المومنین علیہ السلام کی سادہ زندگی ۱۰۵

حضرت علی علیہ السلام کی زندگی میں اقتدار، مظلومیت اور کامیابی ۱۰۷

تیسرا باب: حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کی سیاسی اور مجاہدانہ زندگی.............................۱۲۱

حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام...۱۲۳

حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کی سیاسی اور مجاہدانہ زندگی..۱۲۶

حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کا معنوی مقام ۱۲۹

حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کی علمی و عبادی زندگی...۱۳۴

چوتھا باب: حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی سیاسی اور مجاہدانہ زندگی ۱۳۹

صلح امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے اسباب ۱۴۱

تاریخ کا باعظمت اور ملائمت سے بھرپور مصالحانہ اقدام...۱۴۴

اُموی اور عباسی خلافتوں کا دور ۱۴۷

صلح امام حسن علیہ السلام کے اثرات...۱۵۰

امیر شام کے سیاسی ہتھکنڈے ۱۶۰

حق کی تحریک کا طریقہ کار...۱۶۶

اسلامی اقدار کا تحفُّظ ۱۶۹

پانچواں باب: حضرت امام حسین علیہ السلام کی سیاسی اور مجاہدانہ زندگی ۱۷۳

اسلام کے اندرونی و بیرونی دشمنوں سے مقابلہ...۱۷۵

قیامِ امام حسین علیہ السلام کے اہداف ۱۸۰

اہم ترین واجب اور امام حسین علیہ السلام ۱۸۴

معاشرتی انحرافات کی اقسام..۱۸۶

یزید کا برسرِاقتدار آنا اور قیام کا آغاز ۱۸۹

قیامِ امام حسین علیہ السلام کا مقصد خود آپؑ کی زبانی...۱۹۴

چھٹا باب: حضرت زینب کبریٰ علیہا السلام کی سیاسی اور مجاہدانہ زندگی ۲۰۳

زینب کبریٰ علیہا السلام کی تحریک ۲۰۵

زینب کبریٰ علیہا السلام کربلا کی شیر دل خاتون..۲۰۷

کربلا میں حضرت زینب علیہا السلام کا کردار ۲۱۰

حضرت زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا کے خطبات ۲۱۳
اسیری کے دوران امام زین العابدین علیہ السلام کا کردار ۲۱۵
اسیری کے بعد امام زین العابدین علیہ السلام کا کردار ۲۱۹
واقعۂ کربلا کے بعد کے اجتماعی اور سیاسی حالات ۲۲۱
شیعہ خفیہ تنظیموں کا وجود ۲۲۳
واقعۂ حَرّہ کا پس منظر ۲۲۶
لوگوں کی اسلامی و قرآنی تعلیمات سے دوری ۲۳۰

ساتواں باب: حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی سیاسی اور مجاہدانہ زندگی ۲۳۵

امام زین العابدین علیہ السلام کی شخصیت اوربنیادی مقاصد ۲۳۷
امام زین العابدین علیہ السلام کے اہداف اور مقاصد ۲۴۸
امامؑ کے بیانات، سیاسی جدوجہد کا منہ بولتا ثبوت ۲۵۵
ائمہ اطہار علیہم السلام کی تحریک کے تیسرے مرحلے کا آغاز ۲۷۵
امام زین العابدین علیہ السلام کی درباری علماء پر سخت تنقید ۲۸۴

آٹھواں باب: حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی سیاسی اور مجاہدانہ زندگی ۲۹۹

فکری اور تنظیمی تعمیر و ترقی کا دور ۳۰۱
اسلامی معارف و احکام میں تحریفات کا مقابلہ ۳۰۲
تنظیم سازی کی بھرپور کوششیں ۳۰۶
امام محمد باقر علیہ السلام کا ضمیر فروش علماء کے خلاف ردِّعمل ۳۱۰
امام محمد باقر علیہ السلام کے اپنے شیعوں کے ساتھ روابط ۳۱۳
امام محمد باقر علیہ السلام کی شام طلبی ۳۱۷
امام محمد باقر علیہ السلام کی اسارت اور رہائی ۳۲۰
امام محمد باقر علیہ السلام کا مسلح قیام سے گریز ۳۲۳
حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی وصیت ۳۲۷
امام محمد باقر علیہ السلام کی شہادت کے بعد مجموعی حالات ۳۳۰

امام جعفر صادق علیہ السلام کی امامت کا آغاز..۳۳۳

نواں باب: حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی سیاسی اور مجاہدانہ زندگی..................۳۳۷

امام جعفر صادق علیہ السلام کے حالات زندگی میں ابہامات کا پہلو..............................۳۳۹

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی شخصیت کے پوشیدہ پہلو.................................۳۴۱

عباسی خلفاء کے مدِّمقابل اپنی امامت کا اعلان...۳۴۵

امام جعفر صادق علیہ السلام کی امامت کی طرف دعوت...۳۴۹

شیعہ فقہ کے مطابق احکامِ دین کی تبلیغ..۳۵۵

خلیفۂ وقت کے مدِّمقابل امامؑ کا موقف..۳۵۸

خفیہ نظریاتی اور سیاسی تنظیموں کا وجود..۳۶۱

خفیہ تنظیمیں...۳۶۳

شہادت امام حسین علیہ السلام کے بعد شیعوں کی منظّم سرگرمیاں..................................۳۶۹

دسواں باب: حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی سیاسی اور مجاہدانہ زندگی..................۳۷۳

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی امامت کا دور..۳۷۵

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی زندگی میں تقیہ کا اصول اور انتھک جدّ و جہد......................۳۷۹

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی جلاء وطنی اور بار بار اسارت...۳۸۲

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی زندگی، جُہد مسلسل کا نمونہ..۳۸۵

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو فدک کی پیشکش اور امامؑ کا جواب..................................۳۸۹

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی مظلومانہ شہادت..۳۹۲

گیارہواں باب: حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی سیاسی اور مجاہدانہ زندگی..................۳۹۷

امام علی ابن موسیٰ الرضا علیہ السلام کی امامت کا آغاز...۳۹۹

امام رضا علیہ السلام کی ولایتِ عہدی اور مامون کے مقاصد...۴۰۰

امام رضا علیہ السلام کی تدابیر اور اقدامات..۴۰۶

مامون کی شکست اور امام رضا علیہ السلام کی شہادت..۴۱۲

بارہواں باب: امام محمد تقی، امام علی نقی اور امام حسن عسکری علیہم السلام کی سیاسی اور مجاہدانہ زندگی... ۴۱۵

طویل المدّت پروگرام کے تحت وسیع بنیاد پر تنظیمی سرگرمیاں ۴۱۷

حضرت امام علی نقی علیہ السلام کا سیاسی دور ۴۱۸

حضرت امام علی نقی علیہ السلام کا بچپنا ۴۲۰

حضرت امام علی نقی علیہ السلام کی سامراء آمد ۴۲۲

ائمہ طاہرین علیہم السلام کی خلفاء سے جنگ کا سبب ۴۲۴

امام علی رضا علیہ السلام کی خراسان آمد کے اثرات ۴۲۶

امام علی رضا علیہ السلام کی شہادت کے بعد تنظیمی سرگرمیوں میں تیزی ۴۲۸

تیرہواں باب: حضرت امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی حکومت اور آپؑ کا انتظار ۴۳۱

عقیدۂ مہدویت ۴۳۳

عقیدۂ مہدویت کی بنیاد ۴۳۴

انتظارِ فَرَج کا مفہوم ۴۳۶

رول ماڈل انسانی معاشرے کی تشکیل ۴۳۹

امام زمانہؑ کی عالمی حکومت ۴۴۴

ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں؟ ۴۴۸

غلط پروپیگنڈے کا ازالہ ۴۵۱

امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف سے توسُّل ۴۵۵

علمی مقابلہ ۴۵۸

سوالات: ۴۵۹

فردی خصوصیات ۴۶۸

جواب نامہ ۴۶۸

علمی سروے ۴۶۹

علمی سروے ۴۶۹

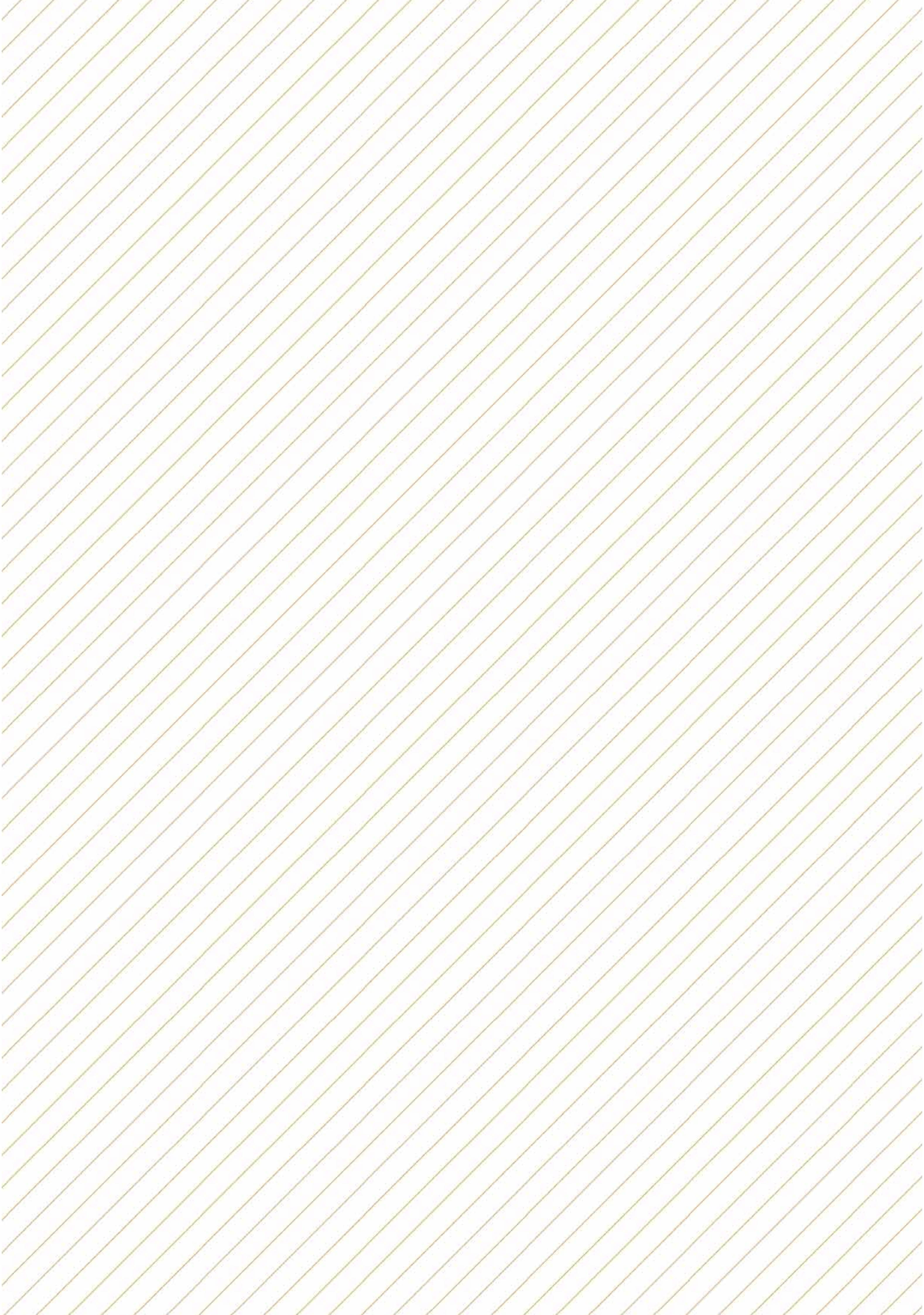

پیش گفتار

عَنْ عَبْدِ السَّلَامِ الْهَرَوِيِّ، عَنِ الرِّضَا علیہ السلام، قَالَ:

«رَحِمَ اللّٰهُ عَبداً أَحيَا أَمرَنَا»، قُلْتُ: كَيْفَ يُحْيِي أَمْرَكُمْ؟ قَالَ: «يَتَعَلَّمُ عُلُومَنَا وَيُعَلِّمُهَا النَّاسَ، فَإِنَّ النَّاسَ لَوْ عَلِمُوا مَحَاسِنَ كَلَامِنَا لَاتَّبَعُونَا».

(عیون اخبار الرضاعلیہ السلام ، ج ۱، ص ۳۰۷)

جناب عبدالسلام بن صالح ہرویؒ (اباصلتؒ) روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت امام رضاعلیہ السلام کے محضرِ مبارک میں تھا تب حضرتؑ نے ارشاد فرمایا:

”خداوند عالم اس شخص پر رحم فرمائے جو ہمارے امر (مکتب اہلِ بیتؑ اور تشیّع) کو زندہ کرتا ہے“۔ راوی کہتے ہیں: میں نے پوچھا: (مولاؑ) آپؑ کا امر کس طرح زندہ کرے؟ امامؑ نے فرمایا: ”ہمارے علوم و معارف کو سیکھے اور دوسرے لوگوں کو سیکھائے؛ کیونکہ اگر لوگ ہمارے کلام کی خوبصورتی کو جان لیں تو ضرور ہماری پیروی کریں گے۔“

خداوند بزرگ و برتر کے ہم انسانوں پر الطاف میں سے ایک لطف یہ ہے کہ اُس نے ہمارے درمیان ائمہ معصومین علیہم السلام کو قرار دیا ہے تاکہ ان معصوم ہستیوںؑ کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ہم معنوی و الٰہی زندگی گزارنے کا طریقہ سیکھیں اور اُن کی مفید فرمائشات پر عمل کرکے ابدی سعادت کا سامان کر سکیں۔

سر زمین مشہد مقدس بہشت کا وہ ٹکڑا ہے جس نے رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرزند اور آسمان امامت و ولایت کے آٹھویں درخشاں ستارے کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے اور ہر سال ایران اسلامی اور دنیا بھر سے لاکھوں عقیدت مند زائرین اس ملکوتی بارگاہ کی زیارت سے مشرف ہوتے ہیں تاکہ اپنے تشنہ لب نفوس کو معارف اہل بیت علیہم السلام کے زُلال و خالص

چشمے سے سیراب کریں۔

اس بارگاہِ منورہ کے خدمتگزاروں کے مجموعے ”آستان قدس رضوی“ کا ہر ایک فرد کسی نہ کسی طرح حضرت امام رضا علیہ السلام کے زائرین گرامی کی خدمت میں مشغول ہے تاکہ وہ اطمینانِ خاطر اور آسودگی کے ساتھ زیارت کے فریضے کو انجام دے سکیں اور اس آسمانی و نورانی بارگاہ سے مکمل طور پر بہرہ مند ہو سکیں۔ اسی سلسلے میں ”آستان قدس رضوی کی مدیریت زائرین غیرایرانی“ نے بھی ہمیشہ کوشش کی ہے کہ مختلف اندازسے اہلِ بیت علیہم السلام اور بالخصوص حضرت امام رضا علیہ السلام کی راہ و روش اور سیرت و زندگی کو اس مکتب کے دوستوں اور چاہنے والوں کے لیے پیش کرے۔

اس مدیریت زائرین غیرایرانی کے تمام اقدامات، انقلابِ اسلامی کے رہبر فرزانہ حضرت آیت اللہ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی کی فرمائشات کو تحقُّق بخشنے، آستان قدس رضوی کے محترم متولی کے اوامر کو بجالانے، آستان قدس رضوی کے بیس سالہ نصب العین کی سند کو تطبیق دینے اور غیرایرانی زائرین کی بصیرت افزائی اور معنوی رُشد و ارتقاء کی ضرورتوں کے پیشِ نظر اسلامی فرہنگ و ثقافت اور تمدن کو فروغ دینے کی غرض سے کیے گئے ہیں۔

حضرت امام رضا علیہ السلام کے غیرایرانی زائرین کی خدمت رسانی کے سلسلے میں اس ادارے کی بین الاقوامی سطح پر کی جانے والی کوششوں کے کچھ نمونے درج ذیل ہیں: مخصوص ثقافتی پروگراموں کا انعقاد، حلقہ ہائے معرفت، تخصّصی اجلاس، علمی سیمینارز، تعلیمی کلاسز اور ورکشاپس، علمی و ثقافتی مقابلہ جات، شب ہائے شعر، مشرف بہ اسلام ہونے کے مراسم، مہارت دینے اور ہم فکری کے جلسات، خطوط کے جوابات، دنیا بھر کے گوشے گوشے میں کتابوں اور ثقافتی پروڈیکٹس کی ترسیل، شرعی اور اعتقادی سوالات کی جوابدہی، انٹرنیٹ کے ذریعے رضوی ٹاک پر بحث و مذاکرہ اور خالص اسلامی معارف کا دنیا کی مختلف رائج اور زندہ زبانوں میں تالیف و ترجمہ کرکے شائع کرنا۔

عصر حاضر میں اسلام کی آواز دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ رہی ہے تاکہ دُور دراز کے درماندہ اور اپنی اصل کو فراموش کر دینے والے انسانوں کو بھی اُن کی حقیقت کی طرف پلٹائے اور اسلام طلبی و حق کے متلاشی دلوں کا بلند اور انسان ساز معارف کی طرف رجحان، سارے جہان میں بڑی تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے۔ اُمید ہے کہ عصر حاضر میں اس کتاب کا مطالعہ حق جویان کے لیے مفید واقع ہوگا اور اہل بیت عصمت و طہارت علیہم السلام کے زائرین اور چاہنے والوں کی معرفت بڑھانے میں مؤثر اقدام قرار پائے گا اور پروردگار عالم کی رضایت حاصل کرے گا۔

اَللَّهُمَّ صَلِّ عَلى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ، وَمَتِّعْني بِهُدًي صالِحٍ لااَسْتَبْدِلُ بِهِ، وَطَريقَةِ حَقٍّ لا اَزيغُ عَنْها، وَنِيَّةِ رُشْدٍ لااَشُكُّ فيها، وَعَمِّرْني ما كانَ عُمْري بِذْلَةً في طاعَتِكَ[۱]

پروردگارا! محمد و آل محمد علیہم السلام پر درود و سلام بھیج اور مجھے ہدایت کے ایسے شائستہ راستے کی راہنمائی فرما کہ میں اس کے علاوہ کسی اور راستے کی خواہش نہ کروں اور مجھے ایسے حق کے راستے کی راہنمائی فرما کہ میں اس سے (باطل کی طرف) رُخ نہ پھیروں اور مجھے ایسی کامل نیت عطا فرما کہ میں اس میں (کسی قسم کا) شک نہ کروں اور مجھے ایسی طولانی عمر عنایت فرما کہ جسے میں تیری اطاعت و بندگی میں صرف کروں۔

مدیریتِ زائرین غیر ایرانی آستان قدس رضوی

---

[۱] صحیفہ سجادیہ کی پہلی دعا سے ماخوذ

مقدّمہ

ائمہ معصومین علیہم السلام کی غربت اور مظلومیت خود ان کی ظاہری حیات تک محدود نہیں رہی بلکہ سینکڑوں سال گزر جانے کے باوجود، آج بھی ان کی سیرت کے اہم ترین بلکہ اصلی ترین پہلوؤں کی طرف لوگوں کی عدم توجہ کی وجہ سے ان کی تاریخی مظلومیت کا سلسلہ جاری ہے۔ یقیناً گذشتہ صدیوں میں بے مثال کتابیں اور مقالے لکھے گئے اور ان کے ذریعے ان بزرگ ہستیوں کی زندگیوں سے متعلق روایات، مجموعوں کی صورت میں آنے والی نسلوں کے لیے بطورِ یاد گار جمع کی گئی ہیں لیکن ائمہ معصومین علیہم السلام کی ڈھائی سو سالہ زندگی میں "جانکاہ سیاسی جدّ و جہد" کا جو عنصر ہے وہ ان کی سوانح حیات کے مختلف علمی اور معنوی پہلوؤں سے متعلق بے شمار احادیث اور روایات کے انبار گم ہو کر رہ گیا ہے۔

ائمہ معصومین علیہم السلام کی زندگی کو ہمیں درسِ حیات اور اسوۂ عمل کے طور پر دیکھنا چاہیے، نہ کہ صرف ایک شاندار اور قابلِ فخر یادگار عنوان سے اس کا مطالعہ کریں اور یہ (کام) ان بزرگ ہستیوں کی روش اور طرزِ سیاست پر توجہ دیئے بغیر ممکن نہیں ہے۔

مجھے ذاتی طور پر ائمہ معصومین علیہم السلام کی زندگی کے اس پہلو سے خاصی دلچسپی رہی ہے اور مجھے اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی جھجک نہیں کہ میرے ذہن میں یہ خیال ۱۹۷۱ء کے سخت ترین آزمائش اور مشکلات کے ایام میں پیدا ہوا۔ اگرچہ اس سے قبل بھی اعلائے کلمۂ توحید اور حکومتِ الٰہی کے قیام کے سلسلے میں ائمہ طاہرین علیہم السلام کا مجاہدانہ کردار اور ان کی قربانیاں اور فداکاریاں میرے پیشِ نظر تھیں، لیکن وہ نکتہ جو اس دور میں اچانک میرے ذہن میں نمودار ہوا وہ یہ تھا کہ ان بزرگوں کی زندگی، مجموعی طور پر ایک مسلسل اور طویل تحریک ہے جو سال ۱۱ھ ق سے شروع ہو کر ڈھائی سو سال تک مسلسل جاری رہی اور سال ۲۶۰ھ ق میں غیبت صغریٰ کے آغاز پر ختم ہوئی ہے۔

یہ تمام ہستیاں ایک ہی زنجیر کی کڑیاں اور ایک ہی شخصیت ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان سب کا راستہ اور مقصد ایک ہی ہے۔ پس امام حسن علیہ السلام، امام حسین علیہ السلام اور امام زین العابدین علیہ السّلام کی زندگیوں کا الگ الگ جائزہ لینے اور پھر لامحالہ اس خطرناک

غلط فہمی کا شکار ہونے کے بجائے کہ ان تینوں اماموں کی زندگیوں کا ظاہری فرق، ان میں ٹکراؤ اور تضاد کی نشاندہی کرتا ہے، ہمیں چاہیے کہ تمام ائمہ اطہار علیہم السلام کی زندگیوں کو ملا کر ایک ایسے انسان کی زندگی فرض کریں جس نے ڈھائی سو سال عمر پائی ہو اور جو سال ۱۱ھ ق سے لے کر سال ۲۶۰ھ ق تک ایک ہی منزل کی سمت مسلسل گامزن رہا ہو۔

یوں اس عظیم اور معصوم ہستی کا ایک ایک عمل قابلِ فہم اور لائقِ توجیہ ہو جائے گا۔ ہر انسان جو عقل و حکمت کا مالک ہو، وہ اگرچہ معصوم نہ ہو تب بھی اسے ایک طویل مدت جدّ و جہد کے دوران مختلف قسم کے موقّف اپنانے ہوتے ہیں، ممکن ہے کبھی وہ سختی سے پیش آنے کو ضروری سمجھے، کبھی نرمی کا برتاؤ کرے اور کبھی ممکن ہے کسی مصلحت کی وجہ سے پیچھے ہٹ جائے، لیکن ان لوگوں کی نظر میں جو اس کی حکمتِ عملی سے واقف ہیں، اس پیچھے ہٹ جانے کو بھی (درحقیقت) آگے ہی کی طرف پیش قدمی سمجھا جائے گا۔

اس نظریے کے مطابق امیر المؤمنین امام علیعلیہ السّلام کی زندگی، امام حسنعلیہ السّلام کی زندگی، امام حسینعلیہ السّلام کی زندگی اور دوسرے آٹھ اماموںؑ کی زندگی جو دو سو ساٹھ ہجری تک جاری رہی، ایک مسلسل جدّ و جہد سے عبارت ہے۔ اس نکتے کی جانب میں اسی سال (۱۹۷۱ء میں) متوجہ ہوا اور اسی نظریے سے ان حضراتؑ کی سوانح حیات کا مطالعہ شروع کیا اور جتنا آگے بڑھتا چلا گیا میری اس سوچ کی صداقت عیاں ہوتی چلی گئی۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ اہل بیتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یعنی ائمہ معصومین علیہ السلام کی پوری زندگی سیاسی جدّ و جہد سے عبارت ہے، اس قابل ہے کہ اس کو ایک مستقل عنوان کے تحت زیرِ بحث لایا جائے۔ میں یہاں اس موضوع کو قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی چیز سیاسی جدّ و جہد یا جانکاہ سیاسی جدّ و جہد، جسے ہم ائمہ طاہرین علیہم السلام کی جانب نسبت دیتے ہیں اس سے ہماری مراد کیا ہے؟ مراد یہ ہے کہ ائمہ علیہم السلام کی مجاہدانہ کوششیں محض یہی علمی، اعتقادی اور کلامی نہ تھیں جس طرح آپ تاریخ اسلام کے اس دور میں کلامی تحریکوں کی مثالیں مشاہدہ کرتے ہیں، جیسے معتزلہ و اشاعرہ وغیرہ کی تحریکیں۔ ائمہ اطہار علیہم السلام کی علمی نشستیں، درسی حلقے، بیانِ حدیث، نقلِ معارف اسلامی اور فقہی احکام کی

تشریح و توضیح وغیرہ صرف اس لیے نہ تھیں کہ علمِ فقہ یا علمِ کلام سے متعلق اپنے مکتب کی حقانیت ثابت کی جائے اوراپنے مدّمقابل کو لاجواب اور ساکت کریں، بلکہ ائمہ طاہرین علیہم السلام کے مقاصد اس سے کہیں بلند تھے۔

اسی طرح یہ جدّ و جہد اس قسم کا مسلحانہ قیام بھی نہ تھی جیسا کہ جناب زید شہید اور ان کی اولاد یا بنی الحسن اور آل جعفر کے بعض افراد نیز اسی قبیل کے دوسرے لوگوں کے یہاں، ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی حیات کے دوران نظر آتا ہے، ائمہ طاہرین علیہم السلام نے اس قسم کا کوئی مسلحانہ جہاد نہیں کیا۔ البتہ (یہاں پر یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ) ائمہ معصومینعلیہم السّلام نے قیام کرنے والے تمام لوگوں کی بطورِ مطلق مخالفت بھی نہیں کی، اگرچہ بعض کی مخالفت کی ہے لیکن اس مخالفت کا سبب ان کا مسلحانہ قیام نہ تھا بلکہ کچھ دوسری وجوہات تھیں۔ بعض کی بھر پور تائید بھی کی ہے بلکہ بعض قیام کرنے والوں کی پشت پناہی اور مدد بھی کی ہے۔ اس سلسلے میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی یہ حدیث قابلِ توجہ ہے جس میں آپؑ فرماتے ہیں:

''لَوَدِدْتُ أَنَّ الْخَارِجِيَّ مِنْ آلِ مُحَمَّدٍ خَرَجَ وَعَلَيَّ نَفَقَةُ عِيَالِهِ''

”مجھے یہ پسند ہے کہ آل محمدؐ میں سے کوئی قیام کرے اور اس کے اہل و عیال کے اخراجات میں پورے کروں۔“

اس پیشکش میں مالی امداد، آبرو کی حفاظت، خفیہ جگہیں مہیّا کرنا اور اسی طرح کی دوسری مدد بھی شامل ہے، لیکن جہاں تک میری معلومات ہیں وہ یہ کہ ائمہ معصومین علیہم السلام نے امامِ وقت کی حیثیت سے کبھی بنفسِ نفیس مسلحانہ قیام میں شرکت نہیں کی۔ ائمہ معصومینعلیہم السّلام کی سیاسی جدّ و جہد سے مراد نہ تو مذکورہ علمی مقابلہ ہے اور نہ ہی دوسری نوعیت کا مسلحانہ قیام، بلکہ اس سے مراد سیاسی مقصد کے تحت جدّ و جہد ہے اور وہ سیاسی مقصد ”حکومتِ اسلامی کا قیام“ ہے جس کو ہم اپنی زبان میں ” حکومتِ علوی“ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی رحلت کے بعد سے ۲۶۰ ہجری تک ائمہ طاہرین علیہم السلام کی مسلسل یہ کوشش رہی کہ اسلامی معاشرے میں ایک الٰہی حکومت قائم کریں اور یہی ان کا بنیادی مقصد تھا البتہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہر امام اپنے ہی دور میں اسلامی حکومت قائم کرنے کے خواہشمند تھے۔

ممکن ہے یہ جدّ و جہد درمیانی مدّت یا مستقبلِ بعید یا حتی کہ بعض حالات میں مستقبلِ قریب میں اسلامی حکومت کے قیام سے متعلق رہی ہو، جیسا کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے دور میں کی جانے والی کوششیں آئندہ کم سے کم مدّت میں اسلامی حکومت کے قیام کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ چانچہ جب مسیّب ابن نجبہ وغیرہ نے امام حسن علیہ السلام سے پوچھا کہ آپؑ نے کیوں خاموشی اختیار کر رکھی ہے؟ تو جواب میں امامؑ جو جملہ ارشاد فرمایا وہ اسی طرف اشارہ ہے، آپؑ نے فرماتے ہیں:

’’وَإِنْ أَدْرِي لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَكُمْ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ‘‘

اور نہیں معلوم یہ شاید تمہاری آزمائش ہو اور ایک معین وقت کا سامانِ زیست۔

میری نظر میں امام زین العابدین علیہ السلام کے دور میں یہ کوششیں، درمیانی مدّت کے لیے تھیں جس کے ثبوت اور شواہد موجود ہیں جو آئندہ صفحات میں پیش کیے جائیں گے اور امام محمد باقر علیہ السلام کے دور میں اس بات کا بہت زیادہ احتمال ہے کہ مستقبلِ قریب میں اسلامی حکومت کے قیام کی کوشش کی گئی۔ البتہ امام علی رضا علیہ السلام کی شہادت کے بعد کی جانے والی کوششوں کے سلسلے میں اس بات کا زیادہ گمان ہے کہ یہ کوششیں مستقبلِ بعید کے لیے رہی ہوں۔ مختصر یہ کہ ’’اسلامی حکومت کب قائم ہو‘‘ اس لحاظ سے ہر امام کی جدّ و جہد کا طریقۂ کار مختلف ہو سکتا ہے لیکن یہ طے ہے کہ اسلامی حکومت کے قیام کے لیے سیاسی جدّ و جہد اور کوششیں ہمیشہ جاری رہی ہیں۔

ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی تمام سرگرمیاں سوائے ان روحانی اور معنوی اُمور کے جو ایک بندہ اپنے خدا سے قُربت اور عرفانی مراحل کی تکمیل کے سلسلے میں انجام دیتا ہے (بَیْنَهُ وَبَیْنَ رَبِّهِ) یعنی درس و تدریس، حدیث کا بیان اور علم کلام کی موشگافیاں، مخالفین سے

علمی اور سیاسی مناظرے، جلا وطنی، مختلف گروہوں کی حمایت یا مخالفت وغیرہ، سب کچھ اسی مقصد کے لیے تھا کہ ایک اسلامی حکومت قائم کی جاسکے، یہی ہمارا دعوی ہے۔

(۱۹۸۸/۰۲/۰۱ء)

حقیقتاً کیا ائمہ معصومین علیہم السلام کی زندگی کا سیاست سے کوئی تعلق تھا بھی یا نہیں؟ کیا ائمہؑ کی زندگی کا مقصد صرف یہ تھا کہ اپنے شاگردوں، مریدوں اور چاہنے والوں کے ایک گروہ کو اپنے اطراف جمع کریں اور انہیں نماز، زکات، حج وغیرہ کے احکام بتائیں اور اسلامی اخلاقیات، معارف، اصول دین اور عرفان وغیرہ جیسی چیزیں ان کے لیے بیان کریں اور بس؟! نہیں، بلکہ ان کاموں کے علاوہ بھی ائمہ طاہرین علیہم السلام کی زندگی کا ایک رُخ ہے اور یہ وہی ان کی سیاسی زندگی ہے۔

یہ ایک انتہائی اہم بات ہے جس کا واضح ہونا ضروری ہے۔ البتہ اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ استدلالی بحث کی گنجائش نہیں ہے، لہٰذا میں یہاں پر بعض شہ سرخیوں اور عمدہ مطالب کو بیان کرتا ہوں تاکہ جو حضرات اس موضوع پر تحقیق کرنا چاہتے ہیں وہ ان کے تناظر میں روایات اور تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کریں اس وقت انہیں یہ معلوم ہو سکے گا کہ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اور ہمارے دوسرے ائمہ طاہرین علیہ السلام کی زندگی کے وہ کونسے گوشے ہیں جو اب تک مبہم اور ناشناختہ رہے ہیں۔

ائمہ معصومین علیہم السلام نے جب یہ محسوس کیا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے اہداف پر عمل نہیں ہو رہا ہے، یعنی ''وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ'' پر عمل نہیں ہو سکا ہے اور جب دیکھا کہ ایک مثالی اسلامی نظام تشکیل نہیں پا رہا ہے، ایک ایسا اسلامی معاشرہ جیسا کہ انبیائے الٰہی علیہم السلام چاہتے تھے، بلکہ صدرِ اسلام کے بعد مکمل طور پر اسلامی تعلیمات کو فراموش کر دیا گیا ہے اور نبوّت و امامت کی جگہ سلطنت نے لے لی ہے، قیصر و کسریٰ، اسکندروں، بدمعاشوں اور تاریخ کے دیگر ظالم و جابر طاغوتیوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی اور خلافت کے لباس میں بنو اُمیہ اور بنو عباس کے نام سے حکومتِ اسلامی پر قبضہ کر لیا ہے اور حکمرانوں کی خواہش کے مطابق قرآن کریم کی تفسیر بیان کی جانے لگی ہے اور لوگوں کے اذہان درباری علماء کو دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے، جو

دنیاوی طمع و لالچ میں حکمرانوں کی گود میں سر رکھے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے ائمہ معصومینعلیہم السّلام نے بھی ایک جامع پروگرام مرتّب کیا۔

میں کہتا ہوں کہ ہمارے تمام ائمہ اطہار علیہم السلام کی زندگی یعنی امیر المومنین علیہ السلام سے لے کر امام حسن عسکریعلیہ السّلام تک کی ڈھائی سو سالہ مدّت کو ایک انسان کی طویل زندگی فرض کرنا چاہیے؛ یعنی ایک ڈھائی سو سالہ انسان، کیونکہ یہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں بلکہ ''كُلُّهُمْ نُوْرٌ وَاحِدٌ'' ان میں سے اگر کسی ایک نے کچھ فرمایا ہے تو درحقیقت وہ سب کی ترجمانی ہے، اسی طرح اگر کسی نے کوئی عمل انجام دیا ہے تو ایسے ہی ہے جیسے سب نے اسے انجام دیا ہو۔ ان ڈھائی سو سالوں میں ائمہ معصومین علیہم السلام نے جو بھی کام انجام دیئے ہیں گویا وہ ایک ہی انسان نے ایک ہی ہدف کی خاطر ایک ہی نیت سے مگر مختلف طریقوں سے انجام دیئے ہیں۔

ائمہ اطہار علیہم السلام نے جب یہ احساس کیا کہ اسلام غربت کا شکار ہو چکا ہے اور ایک (صحیح) اسلامی معاشرہ تشکیل نہیں پا سکا ہے تو انہوں نے چند چیزوں کو اپنا اصولی اور بنیادی ہدف قرار دیا، ان میں سے ایک اسلامی تعلیمات کو ان کی اصلی حالت میں لوگوں کے سامنے بیان کرنا تھا۔

جو لوگ گذشتہ کئی سالوں پر محیط طویل عرصے سے اقتدار پر قابض تھے، ان کی نظر میں اسلام ایک ناقابلِ برداشت چیز تھی۔پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسلام، قرآن کا اسلام، جنگ بدر و حُنَین کا اسلام، عیش و عشرت کا مخالف اسلام، امتیازی سلوک کا مخالف اسلام، ایسا اسلام جو مستضعفین کا حامی ہو، ایسا اسلام جو استکباری طاقتوں کو ملیا میٹ کرنے والا ہو، ایسے اسلام کی انہیں کوئی ضرورت نہیں تھی، جو یہ چاہتے تھے کہ فرعونی شکل میں موسوی لباس زیب تن کریں یا نمرودی صورت میں لباسِ ابراھیمی پہنیں، لیکن ایسا کرنا ان کے لیے ناممکن نہ تھا، اس لیے وہ اسلام میں تحریف کرنے پر مجبور تھے کیونکہ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ایک دم لوگوں کے دل و دماغ سے اسلام کو نکال سکیں کیونکہ اب بھی بہت سے مومن افراد موجود تھے لہٰذا وہ مجبور تھے کہ اسلام کو اس کی روح اور اس کی اصل ماہیت سے آہستہ آہستہ ہٹا دیا جائے۔

بالکل وہی کام جس کے آپ گواہ ہیں، جو پچھلی استکباری حکومت بظاہر اسلامی تعلیمات کے حوالے سے کیا کرتی تھی۔ یہ استکباری حکومت بظاہر اسلامی تعلیمات کی مخالف نہیں تھی لیکن وہ روحِ اسلام کی مخالف تھی، اسلام کے تصوُّرِ جہاد کی مخالف تھی، اسلام کے تصوُّرِ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی مخالف تھی، حقائق اسلام کو بیان کرنے کی مخالف تھی، لیکن اسلام کے ان ظواہر کے ساتھ کہ جو اُن کی گائے اور گوسفند کو کوئی نقصان نہ پہنچائے، مخالفت نہیں کرتی تھی۔ ایسی ہی صورتِ حال خلفائے بنو اُمیہ اور بنو عباس کے زمانے میں بھی تھی۔ انہوں نے اسلام کو اس کی روح اور حقیقت سے خالی کرنے کے لیے بعض قلم فروشوں اور ضمیر فروشوں کی خدمات حاصل کیں اور اُنہیں بھاری رقوم دے کر جعلی حدیثیں اختراع کرنے اور اپنی تعریف و توصیف میں قصیدے لکھوانے شروع کر دیئے اور وہ قلم فروش پیسے لے کر کتابیں لکھتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ جب سلیمان بن عبد الملک کا انتقال ہوا تو ایک عالمِ دین (میں ان کا نام نہیں لینا چاہتا) کی کتابیں جانوروں پر لاد کر سلیمان بن عبد الملک کے خزانے سے باہر نکالی گئی تھیں، یعنی یہ کتاب نویس عظیم محدّث اور مشہور و معروف عالم دین، جن کا نام بہت سی اسلامی کتابوں میں ملتا ہے۔ ان صاحب نے یہ ساری کتابیں سلیمان بن عبد الملک کے لیے لکھی تھیں۔ اب آپ ہی بتائیں کیا جو کتابیں سلیمان بن عبد الملک کے لیے لکھی گئی ہوں کیا ایسے شخص سے آپ یہ توقّع رکھ سکتے ہیں کہ ان میں کوئی ایسی بات لکھی گئی ہو جو اسے پسند نہ ہو؟

وہ سلیمان بن عبد الملک جو لوگوں پر ظلم کرتا تھا، شراب پیتا تھا، کفار اور مشرکین سے گہرے تعلقات رکھتا تھا، مسلمانوں کے ساتھ سختی سے پیش آتا تھا، لوگوں کے درمیان ناانصافی سے کام لیتا تھا، غریبوں کو دبا کر رکھتا تھا اور لوگوں کی جائیدادیں ان سے چھین لیتا تھا۔ ذرا سوچیں ایسا آدمی آخر کس قسم کے اسلام کو پسند کرتا ہوگا؟ یہ وہ درد تھا جو ابتدائی سالوں میں ہی اسلامی معاشرے کو لاحق ہو گیا تھا جس کا ائمہ معصومین علیہم السلام کو بخوبی ادراک تھا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی یہ گراں قیمت میراث یعنی اسلامی تعلیمات جنہیں رہتی دنیا تک باقی رہنا تھا تاکہ ہر دور کے انسان کی ہدایت کر سکیں وہ تحریف کا

شکار ہو گئی ہیں۔

ائمہ معصومین علیہم السّلام کے اہم مقاصد میں سے ایک مقصد، صحیح اسلامی تعلیمات سے لوگوں کو روشناس کرانا، اسلام کی صحیح تفسیر بیان کرنا نیز انہیں تحریف کا شکار ہونے سے بچاتے ہوئے تحریف کرنے والوں کو بے نقاب کرنا تھا۔

آپ دیکھیں کہ ائمہ معصومین علیہم السلام نے اپنے اقوال اور فرامین کے ذریعے کئی ایک مقامات پر درباری علماء اور محدّثین کی بتائی ہوئی باتوں کو مسترد کرتے ہوئے صحیح حقائق بیان فرمائے ہیں اور یہ ائمہ اطہار علیہم السلام کے اہم اور بنیادی مقاصد میں سے ایک مقصد تھا۔

اب دیکھیں کہ اس کام کا بھی ایک سیاسی پہلو ہے، یعنی جب ہمیں یہ پتا چلے کہ تحریف کا کام حکومتی کارندوں کے کہنے پر ہو رہا ہے اور یہ قلم فروش علماء حکمرانوں کی خواہش پر تحریف کر رہے ہیں، ایسے میں اگر کوئی آگے بڑھ کر ان تحریفات کو روکنے کی کوشش کرے تو فطری بات ہے کہ اسے حکمرانوں کے کام میں مداخلت سمجھا جائے گا۔

جیسا کہ آج کل بعض اسلامی ملکوں میں بعض قلم فروش علماء نما افراد حکومتی کارندوں کے اشاروں پر مسلمانوں کے درمیان اختلافات پیدا کرنے کے لیے کتابیں لکھ رہے ہیں یا اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے چہرے کو بگاڑ کر پیش کرتے ہیں، اب اگر ان ممالک میں کوئی آزاد منش صاحب علم پیدا ہو جائے اور وحدتِ اسلامی و اتحاد بین المسلمین کے موضوع پر کوئی کتاب لکھے تو یہ ایک سیاسی عمل تصوّر ہو گا کیونکہ حقیقت میں یہ حکومتی پالیسیوں کے خلاف کام ہے۔ ائمہ معصومین علیہم السلام کا ایک اہم کام یہی تھا؛ یعنی اسلام کے احکام کو صحیح اور درست انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔

اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اُس دور کے اسلامی معاشرے میں اسلامی احکام بتانے والا کوئی نہ تھا کیونکہ عالمِ اسلام کے گوشہ و کنار میں ایسے لوگ موجود تھے جو قرآن مجید اور احادیث نبویؐ کی تعلیم دیتے تھے۔ بعض محدّثین کو تو ہزاروں حدیثیں یاد تھیں اور ان کا تعلق صرف مکہ و مدینہ، کوفہ اور بغداد سے نہیں، بلکہ پورے عالمِ اسلام سے تھا۔ آپ تاریخ اُٹھا کر دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ خراسان میں فلاں جوان عالم کئی ہزار احادیث

پر مشتمل کتاب تالیف کرتا ہے اور طبرستان میں فلاں عالم پیغمبر اسلام ﷺ اور صحابہ کرام سے کئی ہزار احادیث نقل کرتا ہے۔ احادیث موجود تھیں، احکام اسلامی بھی بیان کیے جاتے تھے، لیکن جو چیز بیان نہیں ہوتی تھی وہ اسلامی معاشرے کے اُمور سے متعلق اسلامی تعلیمات اور قرآن مجید کی صحیح اور درست تفسیر تھی اور ائمہ معصومین علیہم السّلام اسی کام کو روکنا چاہتے تھے جو ان کی اہم ذمہ داریوں میں سے ایک تھا۔

دوسرا اہم مسئلہ ”امامت“ کی وضاحت کرنا تھا۔ امامت یعنی اسلامی معاشرے کی حاکمیت، ایک اہم مسئلہ جو اُس دور کے مسلمانوں پر واضح نہیں تھا اور عملی و نظریاتی لحاظ سے یہ مسئلہ تحریف کا شکار ہو کر رہ گیا تھا کہ اسلامی معاشرے کی حاکمیت کس کے ہاتھ میں ہونی چاہیے؟ نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ جو لوگ دینِ اسلام کے اکثر احکامات پر عمل نہیں کرتے تھے اور بہت سے محرّمات کو کھلے عام انجام دیتے تھے، وہ بھی پیغمبر اسلام ﷺ کی جانشینی کا دعوی کرتے تھے اور آپؐ کی مسند پر بیٹھ جاتے تھے اور انہیں کوئی شرم بھی نہیں آتی تھی۔ یعنی ایسا نہیں تھا کہ لوگ انہیں نہ جانتے ہوں، بلکہ لوگ دیکھ رہے تھے کہ ایک شخص خلیفہ بھی کہلاتا ہے اور نشے کی حالت میں مست ہو کر جامع مسجد جاکر لوگوں کے آگے کھڑا ہوکر نماز جمعہ پڑھاتا ہے اور لوگ بھی اس کی اقتداء کرتے ہیں۔

لوگ جانتے تھے کہ یزید ابن معاویہ مختلف اخلاقی بیماریوں میں مبتلا ہے اور گناہانِ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود جب ان سے یزید کے خلاف قیام کرنے کے لیے کہا جاتا تو وہ کہتے تھے کہ ہم نے یزید کی بیعت کر رکھی ہے لہٰذا ہم اس کے خلاف قیام نہیں کر سکتے۔

لوگوں کے سامنے مسئلہ امامت واضح نہیں تھا۔ لوگ یہ سوچتے تھے کہ ان تمام اخلاقی بیماریوں میں مبتلا شخص، گناہوں کا مرتکب اور ظالم و جابر انسان بھی مسلمانوں کا امام اور اسلامی معاشرے کا حاکم بن سکتا ہے کیونکہ لوگوں کی نظر میں امامت کوئی اہم مسئلہ نہیں تھا۔

کسی بھی سوسائٹی میں حکومت کی اہمیت اور اس سوسائٹی کی سمت کے تعیُّن کے لیے حاکم کے اثرات کے حوالے سے یہ ایک بہت ہی مشکل اور عالمِ اسلام کے لیے بڑا خطرناک مسئلہ تھا، اس لیے ائمہ معصومین علیہم السّلام لوگوں کو دو باتیں بتانا ضروری سمجھتے تھے:

ایک یہ کہ لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ امام اور حاکمِ اسلامی کو درج ذیل شرائط اور خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے۔ وہ معصوم ہو، متقی ہو، عالم ہو، روحانی شخصیت ہو، لوگوں سے اچھا برتاؤ رکھنے والا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کرنے والا ہو۔ امام یعنی حاکمِ اسلامی کی ان خصوصیات سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔

دوسری بات یہ کہ اس شخص کو معین کریں کہ آج کے زمانے میں جس شخص کے اندر یہ شرائط اور خصوصیات پائی جاتی ہیں وہ کون ہے؟ اس لیے اپنا تعارف کراتے تھے۔ یہ بھی ائمہ معصومین علیہم السلام کا ایک بہت بڑا کارنامہ تھا اور آپ دیکھ لیں کہ یہ ایک اہم ترین سیاسی اور تبلیغاتی کاموں میں سے تھا۔ ائمہ معصومین علیہم السلام کا ان مذکورہ دو کاموں کے علاوہ اگر کوئی اور کام نہ ہوتا، تب بھی یہ کہنے کے لیے کہ “ائمہ اہل بیت علیہم السّلام کی زندگی اول سے لے کر آخر تک مکمل طور پر سیاسی تھی”، یہی دو کام کافی ہیں۔

ادھر جب ائمہ معصومین علیہم السلام قرآن کی تفسیر بیان فرماتے، تو معارفِ اسلامی کو بھی بیان کرتے تھے درحقیقت یہ بھی ایک طرح سے سیاسی عمل انجام دیتے تھے۔ جب امام کی خصوصیات کے بارے میں بات کرتے تو وہ بھی ایک سیاسی عمل ہوتا تھا؛ یعنی ائمہ معصومین علیہم السّلام کی جملہ تعلیمات کا اگر مذکورہ بالا دو خصوصیات اور دو عناوین میں خلاصہ کیا جائے، تب بھی ائمہ علیہم السلام کی زندگی ایک سیاسی زندگی ہی ہوتی، لیکن ائمہ معصومین علیہم السلام نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے علاوہ بھی کم از کم امام حسن علیہ السلام کے دور ہی سے حکومت کو اپنے قبضہ میں لینے کی نیت سے خفیہ طور پر ایک وسیع سیاسی اور انقلابی تحریک کا آغاز کیا۔ ائمہ معصومین علیہم السّلام کی سیرت پر کام کرنے والے محققین کے لیے کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے کہ ائمہ معصومین علیہم السلام اس قسم کی ایک تحریک چلا رہے تھے۔

ائمہ طاہرین علیہم السلام کی زندگی کے جس پوشیدہ گوشے کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ائمہ معصومین علیہم السّلام جیسے امام جعفر صادق علیہ السّلام، امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام اور دیگر ائمہ معصومین علیہم السّلام کی زندگی کے بارے میں لکھی گئی کتابوں میں اس اہم نکتے کو بیان نہیں کیا گیا ہے۔

ائمہ معصومین علیہم السلام کی سیاسی تحریک، وسیع اور منظم جدّ و جہد پر بہت سارے شواہد موجود ہونے کے باوجود، یہ پہلو تشنہ رہا ہے اور لوگوں کو اس خبر نہیں تھی اور یہی بات ائمہ علیہم السلام کی زندگی کو سمجھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ائمہ علیہم السّلام نے اس کام کا آغاز کیا تھا اس پر بہت سارے دلائل موجود ہیں۔

پس تمام قارئینِ کرام کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ہمارے سارے ائمہ معصومین علیہم السّلام جب امامت کے منصب پر فائز ہوتے تھے تو سب سے پہلے جو کام انجام دیتے وہ حکومت کو اپنے قبضے میں لینے کے لیے سیاسی جدّ و جہد کا آغاز ہوتا تھا۔ ائمہ معصومین علیہم السّلام کی یہ سیاسی جدّ و جہد بھی ان لوگوں کی سیاسی جدّ و جہد کی طرح ہوتی تھی جو ایک منظم نظام کی تشکیل کے لیے کیا کرتے ہیں اور ائمہ اطہار علیہم السّلام بھی اسی طرح کی جدّ و جہد کیا کرتے تھے۔

(۱۲/۰۴/۱۹۸۸ء)

ائمہ معصومین علیہم السلام کی پوری زندگی میں ظالم حکمرانوں کے ساتھ ان کے جن اختلافات کاِ آپ مشاہدہ کرتے ہیں ان کی بنیاد یہی مسئلہ امامت اور حکومت ہے۔ جنہوں نے ہمارے ائمہ علیہم السّلام کی مخالفت کی، انہیں زہر دیا، قتل کیا، انہیں زندانوں میں قید کیا اور انہیں محاصرے میں زیرِ نظر رکھا، یہ سب لڑائیاں ائمہ علیہم السلام کی حکومت پر دعوے کی وجہ سے تھیں۔ اگر ائمہ علیہم السّلام حکومت کا دعوی نہ کرتے اور دوسری طرف سے علومِ اولین و آخرین کا دعوی کرتے، تب بھی خلفاء کو اُن پر کسی قسم کا کوئی اعتراض نہ ہوتا اور اگر ہوتا تو بھی اتنا شدید اختلاف نہ ہوتا۔ اصل مسئلہ ہی یہی ہے لہٰذا آپ دیکھ لیں کہ ائمہ اطہار علیہم السلام نے اپنے دعوت ناموں اور تبلیغی پیغامات میں لفظِ امام اور مسئلۂ امامت کو بہت ہی بڑا حساس مسئلہ قرار دیا ہے۔ یعنی جب امام جعفر صادق علیہ السلام بھی اسلامی حاکمیت اور

سیاسی طاقت کا دعوی کرنا چاہتے ہیں تو فرماتے ہیں: ''أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ كَانَ الْاِمَامَ'' امامؑ عرفات کے میدان میں لوگوں کے درمیان کھڑے ہوکر فرماتے ہیں: ''إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ كَانَ الْاِمَامَ'' اے لوگو! بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی امام تھے۔ یعنی لوگوں کے امام، رہبر، حاکم اور پیشوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ ''ثُمَّ كَانَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ ثُمَّ الْحَسَنُ ثُمَّ الْحُسَيْنُ . . .'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد علی ابن ابی طالب علیہما السلام امام تھے ان کے بعد امام حسن علیہ السلام اور ان کے بعد امام حسین علیہ السلام۔ ۔ ۔ یہاں تک کہ اپنے آپ تک پہنچتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں بھی امام ہوں۔ یعنی ائمہ معصومین علیہ السلام اور آپ کے اصحاب کا اپنے مخالفین کے ساتھ جس مسئلے پر کشمکش ور اختلاف تھا وہ یہی ولایتِ مطلقہ و عامہ اور لوگوں پر حکومت اور سیاسی طاقت کا مسئلہ تھا، معنوی مراتب کے بارے میں تو ان کا ائمہ طاہرین علیہ السلام سے کوئی اختلاف ہی نہ تھا۔

اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ خلفاء کے زمانے میں جو زاہد منش اور متقی لوگ تھے، جو اہلِ علم اور مفسرینِ قرآن کے نام سے معروف تھے، ان لوگوں کی نہ صرف یہ کہ خلفاء مخالفت نہیں کرتے تھے بلکہ ان سے اچھا سلوک کیا کرتے تھے اور ان سے اپنی عقیدت کا اظہار بھی کرتے تھے اور ان کے پاس جاکر اپنے لیے وعظ و نصیحت کی درخواست بھی کرتے تھے کیوں؟ اس لیے کہ وہ خلفاء کے مقابلے میں سیاست کے دعویدار نہیں تھے۔ ورنہ کیا حسنِ بصری، ابن شُبرُمہ اور عمرو ابن عُبَید جیسے لوگ، خلفاء کے لیے قابلِ قبول ہوتے؟ یہ وہ لوگ تھے جو زہد و تقویٰ، روحانیت و معنویت، علم تفسیر اور علمِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وارث ہونے کے دعویدار تھے، لیکن خلفاء کی طرف سے ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جاتی تھی کیوں؟ اس لیے کہ ان کا سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا، لیکن ائمہ معصومین علیہ السلام کا بنو اُمیہ اور بنو عباس کے خلفاء سے جس مسئلے پر اختلاف تھا وہ یہی امامت اور ولایت کا مسئلہ تھا، یعنی آج ہم امامت کا جو معنی بیان کرتے ہیں وہی ان میں وجہِ نزاع تھا۔

(۱۹/۰۷/۱۹۸۶ء)

پیامبر اکرم

صلی الله علیه و آله و سلم

بعثتِ خاتم الانبیاء ﷺ، بیداری کا آغاز

پیغمبر اکرم ﷺ کا اہم ترین کام حق اور حقیقت کی طرف دعوت اور اِس دعوت کی راہ میں جہاد تھا۔ آپؐ اس دور کی تاریک دنیا کو اپنے مدِّمقابل دیکھ کر گھبرائے نہیں، حالانکہ آپؐ مکہ میں تنہا تھے یا آپؐ کے ساتھ مسلمانوں کی ایک مختصر تعداد تھی، جبکہ آپؐ کے مقابلے میں متکبر عربوں کے سردار اور قریش کے بڑے بڑے سرکش اور ضدی لیڈر تھے، جو انتہائی بداخلاق ہونے کے ساتھ ساتھ ظاہری و مادی طاقت اور ہر طرح کے وسائل سے بھی لیس تھے یا آپؐ کا سامنا ایسے عوام الناس سے تھا جو علم و معرفت سے بالکل بے بہرہ تھے۔ ایسے ماحول میں بھی آپؐ پریشان نہیں ہوئے، بلکہ اپنی سچی بات کا مسلسل اعلان کرتے ہوئے اپنے موقف کو واضح کرتے رہے۔ آپؐ نے اپنی توہین کا سامنا کیا، رنج و مشقت برداشت کی، اپنی جان کے لیے خطرات مول لیے، تب جاکر لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو دائرۂ اسلام میں داخل کر سکے۔

اور اسی طرح جب مدینہ میں آپؐ نے اسلامی حکومت قائم کی اور خود اس حکومت کی باگ ڈور سنبھالی، تو مختلف دشمنوں سے آپؐ کا آمنا سامنا ہوا، کہیں اسلحہ سے لیس عرب کے مختلف وحشی گروہ تھے، جو حجاز اور یمامہ[1] کے اطراف میں پھیلے ہوئے تھے اور آپؐ نے اسلام کی دعوت کے ذریعے ان کی اصلاح کرنی تھی، جبکہ وہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کر رہے تھے، تو کہیں وقت کی دو بڑی سلطنتوں، یعنی ایران اور روم کے بادشاہوں کی طرف آپؐ نے خطوط ارسال فرما کر انہیں دینِ اسلام کی طرف دعوت دی جو آپؐ کے خلاف تھیں، آپؐ نے اسلام کی تبلیغ و ترویج کے لیے بحث و مباحثے کیے، ادلہ و براہین پیش کیے، جنگیں لڑیں اور بہت سی سختیاں برداشت کیں، اقتصادی بائیکاٹ کا سامنا کیا، یہاں تک کہ بعض اوقات اہلِ مدینہ دو تین دنوں تک بھوکے

---

[1] سر زمین عرب میں نجد اور بحرین کے درمیان کا ایک وسیع و عریض علاقہ جس میں بے شمار دیہات، قلعے، چشمے اور باغات پائے جاتے تھے۔

رہنے پر مجبور ہوتے تھے، چاروں طرف سے مصیبتوں نے آپؐ کو گھیرے ہوئے تھا۔

ایسے حالات میں کچھ لوگ پریشان ہو جاتے تھے، تو کچھ افراد کے قدم ڈگمگانے لگتے تھے، کچھ لوگ اعتراض کرنے لگتے تھے جبکہ کچھ حضور اکرم ﷺ سے اسلام دشمن عناصر کے ساتھ نرمی اور ملائمت اختیار کرنے کی سفارشیں کرتے تھے؛ لیکن آپؐ دعوت و جہاد کے میدان میں کبھی پیچھے نہ ہٹے اور پوری قوت و سرفرازی کے ساتھ اسلامی معاشرے کو عزت و اقتدار کی بلندی تک پہنچایا۔ جنگوں میں حضور اکرم ﷺ کی اسی استقامت و پائیداری اور آپؐ کی دعوت کی بدولت، آنے والے برسوں میں یہ اسلامی حکومت دنیا کی منفرد طاقت کی شکل میں تبدیل ہوگئی۔

(۱۹۹۱/۰۹/۲۷ء)

رسول اکرم ﷺ نے اپنی ایک متواتر اور مشہور حدیث میں فرمایا: ''بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ''[1] ''مجھے مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہے۔'' بعثت کا بنیادی مقصد اور ہدف ہی یہ تھا کہ اخلاقی عظمتیں اور انسان کی روحانی فضیلتیں دنیا میں عام ہو جائیں اور انسان اپنے کمال کو پہنچے۔ جب تک کوئی شخص اِن اخلاقی عظمتوں کا بذاتِ خود مالک نہ ہو، اللہ تعالیٰ اسے ایسی عظیم اور سنگین ذمہ داری نہیں سونپتا ہے، لہٰذا بعثت رسول اکرم ﷺ کے آغاز ہی میں اللہ تعالیٰ آپؐ سے مخاطب ہوکر ارشاد فرماتا ہے: ''وَ إِنَّكَ لَعَلَى خُلُقٍ عَظِيمٍ''[2] پیغمبر اسلام ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی وحی کے لیے مناسب اور شائستہ بنانے اور سنوارنے کا آغاز، بعثت سے پہلے ہی ہوا تھا۔ چنانچہ روایات میں ہے کہ آپؐ جب اپنی جوانی کے دور میں تجارت کیا کرتے تھے تو اِس تجارت سے حاصل ہونے والی تمام آمدنی کو راہِ خدا میں بطورِ صدقہ غریبوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔

اسی زمانے کی بات ہے یعنی پیغمبر اسلام ﷺ تکامل کے آخری مراحل میں تھے اور ابھی نزولِ وحی کا آغاز نہیں ہوا تھا، یعنی اس وقت آپؐ مبعوث بہ رسالت نہیں ہوئے

---

[1] ۔ شرح اصول کافی، ملا صدرا، ج۱، ص۴۲۰

[2] ۔ یقیناً آپؐ خلق عظیم کے مالک ہیں۔ (سورہ قلم، آیت ۴)

تھے، آپؐ ”حرا“ کی پہاڑی پر جا کر اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا بغور جائزہ لیتے تھے، آپؐ آسمان، ستاروں، زمین اور زمین میں بسنے والی تمام مخلوقات کو جو مختلف طریقوں اور احساسات کے ساتھ زندگی گزارتی ہیں، کا دقّت کے ساتھ مشاہدہ فرماتے اور ان سب میں اللہ کی نشانیوں کی تجلی پاتے تھے، جس کے نتیجے میں روز بروز حق کے مقابلے میں خضوع اور اوامر و نواہی اور ارادہ الٰہی کے مقابلے میں آپؐ کے دل کے خشوع میں اضافہ ہوتا جاتا تھا اور آپؐ کے وجودِ مبارک میں اخلاقیات کی جڑیں روز بروز مضبوط ہوتی جاتی تھیں۔ روایت میں ہے کہ ”كَانَ أَعْقَلَ النَّاسِ وَأَكْرَمَهُمْ“ یعنی ”پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعثت سے قبل ہی لوگوں میں سب سے زیادہ عقلمند اور محترم تھے۔“ آپؐ روزانہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کے مشاہدے سے فیضیاب ہوتے تھے یہاں تک کہ آپؐ چالیس سال کی عمر کو پہنچ گئے: ”فَلَمَّا اسْتَكْمَلَ أَرْبَعِينَ سَنَةً وَنَظَرَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ إِلَىٰ قَلْبِهِ فَوَجَدَهُ أَفْضَلَ الْقُلُوبِ وَأَجَلَّهَا وَأَطْوَعَهَا وَأَخْشَعَهَا وَأَخْضَعَهَا“؛ یعنی چالیس سال کی عمر میں آپؐ کا قلبِ مبارک سب کے دلوں سے زیادہ نورانی، خاشع اور وحیِ الٰہی کو قبول کرنے کے لیے سب سے زیادہ شائستہ و سزاوار تھا۔ ”أَذِنَ لِأَبْوَابِ السَّمَاءِ فَفُتِحَتْ وَمُحَمَّدٌ يَنْظُرُ إِلَيْهَا“؛ یعنی جب آپؐ معنویت اور روحانیت کے اعتبار سے کمال کے اِس درجے پر پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر آسمانوں اور عالمِ غیب کے دروازے کھول دیئے اور آپؐ کی آنکھوں کے سامنے معنوی اور غیبی جہانوں کے دروازوں کو کھول دیا۔ ”وَأَذِنَ لِلْمَلَائِكَةِ فَنَزَلُوا وَمُحَمَّدٌ يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ“[1] آپؐ فرشتوں کو دیکھتے تھے، ان سے گفتگو کرتے تھے اور ان کی باتوں کو سنتے تھے یہاں تک کہ جبرئیل امینؑ آپؐ پر نازل ہوئے اور کہا: ”اِقْرَأْ“[2] یہاں سے آپؐ پر وحی کا آغاز ہوا۔

اللہ تعالیٰ کی یہ بےمثال مخلوق اور انسانِ کامل، نزولِ وحی سے پہلے ہی کمال کے اِس مرحلے پر پہنچ چکے تھے۔ آپؐ نے اپنی بعثت کے آغاز ہی سے ایک کثیر الجہتی جہاد کا آغاز فرمایا اور اپنی زندگی کے باقی تئیس (۲۳) سالوں میں انتہائی مشکلات کے ساتھ اِس جہاد کو آگے بڑھایا۔ آپؐ کا جہاد اپنے نفس اور ان لوگوں کے خلاف تھا جو

۱۔ بحار الانوار، ج۱۷، ص۳۰۹

۲۔ پڑھو۔ (سورہ علق، آیت۱)

حقیقت سے بالکل بے خبر تھے اور آپؐ کا جہاد اس (وحشت زدہ اور) تاریک ماحول کے خلاف تھا کہ جس کے بارے میں امیر المومنین امام علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں: ''فِي فِتَنٍ دَاسَتْهُمْ بِأَخْفَافِهَا وَوَطِئَتْهُمْ بِأَظْلَافِهَا وَقَامَتْ عَلَى سَنَابِكِهَا''[۱] ہر طرف سے فتنوں نے لوگوں کو دبا کر رکھا تھا، دنیا طلبی، شہوت رانی، ظلم و دست درازی اور دیگر اخلاقی برائیاں انسانوں کے وجود میں رچ بس چکی تھیں، طاقتور لوگوں کے ہاتھ بغیر کسی روک ٹوک کے کمزوروں کی طرف اُٹھ رہے تھے۔ استحصال اور ظلم و ستم کا یہ ماحول صرف مکہ مکرمہ یا جزیرۃ العرب تک محدود نہ تھا، بلکہ اُس دور کی تہذیب و تمدن کے دو بڑے گھوارے، یعنی روم اور ایران کا بھی یہی حال تھا۔ آپ تاریخ اُٹھا کر دیکھئے کہ پورے عالمِ بشریت پر ظلم کے بادل چھائے ہوئے تھے۔

لہٰذا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعثت کے آغاز، یعنی نزولِ وحی کی ابتداء سے ہی اِن بڑی طاقتوں کے خلاف ناقابلِ تصوّر حدّ تک مسلسل جدّ و جہد کرتے رہے، دوسری طرف وحیِ الٰہی بھی مسلسل ایک ایسے چشمے کی مانند جو کسی ہموار زمین پر جاری ہو، آپؐ کے قلبِ مبارک پر نازل ہو رہی تھی اور آپؐ کو توانائی فراہم کر رہی تھی۔ چنانچہ آپؐ بھی اس دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا کرنے کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور اس میں کامیاب بھی ہوئے۔

اُمتِ مسلمہ کے جسم کے ابتدائی خلیوں کی بنیاد خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکی دور کے اِن مشکل ایام میں اپنے مضبوط دستِ مبارک سے رکھی تھی، اس عمارت کے وہ مضبوط اور مستحکم ستون کہ جن پر اس عظیم الشان عمارت کو قائم ہونا تھا، آپؐ کی دعوت پر سب سے پہلے ایمان لانے والے وہ مومنین تھے، جن کے اندر اتنی عقل، بہادری اور نورانیت پائی جاتی تھی کہ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس پیغام کو سمجھیں اور اس کو اپنے دلوں میں جگہ دیں۔

---

[۱] یہ لوگ ایسے فتنوں میں مبتلا تھے جنہوں نے انہیں اپنے پیروں تلے روند دیا تھا اور اپنے محکم سُموں سے کچل دیا تھا اور خود اپنے پنجوں کے بل کھڑے ہو گئے تھے۔ (نہج البلاغہ، خطبہ نمبر ۲)

''فَمَنْ يُرِدِ اللهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلام''[1]

پیغمبر اسلام ﷺ کے قدرت مند ہاتھوں سے ان الٰہی معارف و الٰہی احکامات و تعلیمات کی طرف لوگوں کے دل مائل ہوئے اور ان کے دلوں کے دروازے اور ذہنوں کے دریچے کھل گئے اور وقت گزرنے کے ساتھ یہ ارادے مضبوط اور مستحکم تر ہوتے چلے گئے۔

مکی دور میں مومنین کی اس قلیل تعداد (جس میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا) نے جن مشکلات اور تکالیف کا سامنا کیا، ہم ان کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ ایک ایسے ماحول میں جہاں کے تمام امتیازات اور خصوصیات جاہلانہ رسوم و رواج پر مشتمل تھیں، جہاں بے جا تعصّبات، کینہ و حسد، بے جا غیرتمندی، اندھی دشمنیاں، سنگدلیاں، بدبختیاں، ظلم و جور، شہوانی خواہشات اور دیگر برائیوں نے لوگوں کی زندگیوں کو جکڑ رکھا تھا۔ پھر یکایک اِس خاردار اور پتھریلی زمین پر ایسے سرسبز (اور پھلدار) پودے اُگنے لگے کہ جس کے بارے میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں: ''وَإِنَّ الشَّجَرَةَ الْبَرِّيَّةَ أَصْلَبُ عَوْداً وَأَقْوَىٰ وَقُوداً''[2] کوئی بڑے سے بڑا طوفان بھی ان نو نہالوں، ننھے پودوں اور ان درختوں کو جو اس پتھریلی زمین پر اپنی جڑیں مضبوطی سے گاڑ کر رُشد کر چکے تھے، نہیں ہلا سکا۔ اسی طرح تیرہ سال گزر گئے پھر انہیں مضبوط اور توانا ستونوں پر اسلامی، مدنی اور نبویؐ معاشرے کی بنیاد رکھی گئی۔

اسلامی نظام کی بنیاد

اُمت سازی صرف سیاست نہیں، بلکہ سیاست خود اُمت سازی کا ایک حصّہ ہے۔ اُمت سازی جیسا اہم کام ایک ایک فرد کی تعلیم و تربیت سے عبارت ہے: ''هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَ

---

[1] ۔ پس خدا جسے ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے سینے کو اسلام کے لیے کشادہ کر دیتا ہے۔ (سورہ انعام، آیت ۱۲۵)

[2] ۔ جنگلی درختوں کی لکڑی سخت اور آگ شعلہ دار ہوتی ہے۔ (نہج البلاغہ، خطبہ نمبر ۴۵)

الْحِكْمَةَ''[۱] ''يُزَكِّيهِمْ'' یعنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ایک آدمی کی تربیت کرتے تھے اور ہر ایک کے ذہن و عقل کو علم و دانش کی تلقین فرماتے تھے۔ ''وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ'' حکمت ایک درجہ بالا تر ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ آپؐ لوگوں کو صرف احکام اور قوانین سکھاتے تھے، بلکہ آپؐ انہیں حکمت بھی سکھاتے تھے اور دنیا کے حقائق کے بارے میں ان کی آنکھوں کو کھولتے تھے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دس سال تک اس طریقہ کار پر عمل کرتے رہے ایک طرف تو سیاسی اور حکومتی اُمور کی دیکھ بھال، اسلامی مملکت کی سرحدوں کی حفاظت، اسلام کی تبلیغ و ترویج، مدینہ کے باہر سے لوگوں کے اجتماعی اور انفرادی طور پر اسلام کی نورانی تعلیمات سے بہرہ ور ہونے کی راہ ہموار کرنا اور دوسری طرف ان میں سے ایک ایک فرد کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنا۔ ان تمام کاموں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

کچھ لوگ اسلام کو ایک انفرادی مسئلہ قرار دیتے ہوئے سیاست کو اسلام سے الگ سمجھتے ہیں، جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کے آغاز پر یعنی مکہ کی دشوارترین زندگی سے چھٹکارا پاتے ہی جو پہلا کام انجام دیا، وہ سیاست ہی تھا۔

ایک اسلامی معاشرے کا وجود، اسلامی نظامِ حکومت کا قیام، افواجِ اسلامی کا قیام اور دنیا کے بڑے بڑے سیاستدانوں (اور حکمرانوں) کے نام خطوط لکھنا، اس دور کے عظیم سیاسی اُمور ہی تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سیاست کو اسلام سے الگ کیا جائے؟ یہ کیونکر ممکن ہے کہ سیاست کو اسلام کے نظامِ ہدایت کے علاوہ کسی اور نظام کے حوالے کیا جائے؟

''الَّذِينَ جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِينَ''[۲]

''جن لوگوں نے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔''

---

[۱] ۔ وہ (خدا) جس نے مکہ والوں میں ایک رسول بھیجا جو انہیں میں سے تھا، وہ اُن پر آیات کی تلاوت کرتا تھا، ان کے نفوس کو پاکیزہ بناتا تھا اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا تھا۔ (سورہ جمعہ، آیت ۲)

[۲] ۔ سورہ حجر، آیت ۹۱

''یُؤْمِنُ بِبَعْضِ الْکِتَابِ وَیَکْفُرُ بِبَعْضٍ''[١] یعنی قرآن کی عبادی تعلیمات پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن اس کی سیاسی تعلیمات پر ایمان نہیں رکھتے۔ ''لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتَابَ وَالْمِیزَانَ لِیَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ''[٢] یہ قسط کیا ہے؟ قسط یعنی معاشرے میں اجتماعی عدل و انصاف قائم کرنا اور یہ کام کون کر سکتا ہے؟ عدل و انصاف پر مبنی معاشرے کا قیام، ایک سیاسی عمل ہے جو کہ اس ملک کے حکمرانوں اور مسئولین کا کام ہے اور یہی انبیا علیہم السلام کا ہدف بھی تھا۔ نہ صرف ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ، حضرت موسیٰ علیہ السلام ، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام کا مقصد اور ہدف، سیاست اور اسلامی نظام کا قیام رہا ہے۔

مدینہ کے دس سالہ دورِ حکومت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت، پوری تاریخ انسانیت کا درخشاں ترین دور ہے (اور یہ کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہے)۔ لہٰذا ضروری ہے کہ تاریخ بشریت کے اس مختصر مگر متحرک اور حیران کن حدّ تک مؤثر دور کو سمجھا جائے۔ مدنی زندگی کا یہ دس سالہ دور آپؐ کی تئیس (٢٣) سالہ مدتِ رسالت کا دوسرا حصہ ہے، جبکہ تیرہ سالہ مکی دور آپؐ کے دورانِ رسالت کا پہلا حصہ یا اس دوسرے حصے کے لیے تمہید کی حیثیت رکھتا تھا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدنی زندگی کا دس سالہ دور، جو اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنے نیز ہر زمانے اور ہر جگہ بسنے والے انسانوں کے سامنے اسلامی حاکمیت کا ایک رول ماڈل پیش کرنے کا دور ہے، یہ ایک ایسا کامل نمونہ اور رول ماڈل ہے کہ اس کی دنیا میں کہیں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ لیکن اس کامل نمونے کو دیکھ کر کچھ خصوصیات کی پہچان حاصل کی جاسکتی ہے اور وہ خصوصیات انسانوں اور مسلمانوں کے لیے نشانِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور انہیں خصوصیات کو دیکھ کر کسی بھی نظام اور انسان کے بارے میں فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کا مقصد اُس فاسد اور ظالمانہ نظام کے خلاف نبرد آزما ہونا

---

[١] ۔ قرآن کی بعض آیتوں پر تو ایمان لے آئے اور بعض کو قبول نہ کرے۔ (تحف العقول، ص۴۸۵)

[٢] ۔ بیشک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا ہے تاکہ لوگ انصاف کے ساتھ قیام کریں۔ (سورہ حدید، آیت۲۵)

تھا جو اُس دور کے سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی میدانوں میں مستحکم تھا۔ آپؐ کا مقصد صرف کفار مکہ سے نمٹنا ہی نہیں تھا بلکہ یہ ایک عالمی مسئلہ تھا۔ آپؐ کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ جہاں کہیں بھی زمین ہموار نظر آتی وہاں اس اُمید کے ساتھ اسلامی عقیدے کا بیج بوتے تھے کہ وقت آنے پر یہ بیج ایک سرسبز پودے کی شکل اختیار کر لے گا۔

آپؐ کا ہدف یہ تھا کہ آزادی، بیداری اور انسانی خوش بختی کا یہ پیغام ہر شخص تک پہنچ جائے اور (ظاہر ہے کہ) یہ کام ایک رول ماڈل نظام کو وجود میں لائے بغیر ممکن نہ تھا، لہٰذا آپؐ مدینہ تشریف لائے تاکہ ایک رول ماڈل نظام وجود میں لا سکیں اور یہ کہ اس نظام کو کب تک چلایا جا سکتا ہے یا بعد میں آنے والے لوگ کس حد تک خود کو اس نظام سے وابستہ رکھ سکتے ہیں، وہ انہیں پر منحصر ہے۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام تو ایک مثال قائم کرنا اور اسے تمام انسانوں اور تاریخ کے سامنے پیش کرنا ہے۔

نظام مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اہم خصوصیات

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو نظام قائم کیا، وہ کئی خصوصیات کا حامل تھا مگر ان میں سے ذیل کی سات خصوصیات زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔

پہلی خصوصیت؛ ایمان اور معنویت ہے۔ یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قائم کردہ نظام میں ایمان اور معنویت کو ایک ایسے محرک اور مشین کی حیثیت حاصل ہے جو حقیقت میں اِس نظام کو آگے بڑھانے والا ہے، جو لوگوں کے دل و ذہن کے سرچشمے سے پھوٹتا ہے اور انسان کے ہاتھ پیر اور دیگر اعضاء و جوارح کو صحیح راستے پر قائم رکھتا ہے۔ پس نبویؐ نظام کی پہلی خصوصیت لوگوں میں ایمان اور معنویت کی روح پھونکنا اور ان کے عقائد کو استحکام بخشنا ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کام کا آغاز مکہ سے کیا اور مدینہ میں اس کے پرچمِ اقتدار کو پوری طاقت کے ساتھ بلند کیا۔

دوسری خصوصیت؛ عدل و انصاف ہے۔ یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قائم کردہ نظام میں قوانین کے نفاذ کا حقیقی معیار عدل و انصاف اور کسی کا لحاظ کیے بغیر، حق کو اس کے حقدار

تک پہنچانا ہے۔

تیسری خصوصیت؛ علم اور معرفت ہے۔ نبویؐ نظام میں ہر چیز کی بنیاد علم و معرفت اور آگہی و بیداری پر قائم ہے۔ یہاں آنکھیں بند کر کے آگے بڑھنے کی بالکل بھی گنجائش نہیں۔ لہٰذا یہاں پر لوگوں کو علم ومعرفت کے ذریعہ قوتِ فیصلہ عطا کرتے ہوئے انہیں ایک کار آمد کارکن بنایا جاتا ہے، نہ کہ انہیں ایک بےمقصد اور ناکارہ آدمی بنایا جاتا ہے۔

چوتھی خصوصیت؛ اخوت اور بھائی چارگی ہے۔ نبویؐ نظام میں خرافات، ذاتی مفادات اور نفسانی خواہشات کی بنیاد پر ہونے والے جھگڑوں کو بُرا سمجھا جاتا ہے اور ان کے خلاف جہاد کیا جاتا ہے کیونکہ یہاں اخوت، بھائی چارگی اور ہمدردی کا ماحول پایا جاتا ہے۔

پانچویں خصوصیت؛ اخلاق اور کردار کی اصلاح ہے۔ جس کے ذریعے یہ نظام ہر قسم کی اخلاقی برائیوں سے انسان کو پاک و صاف کرتا ہے اور اسے تمام آلودگیوں سے نجات دیتا ہے اور اسے ایک بااخلاق اور پاک و پاکیزہ انسان بناتا ہے: ''وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ''[1] یہاں تزکیۂ نفس کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یعنی نبی اکرم ﷺ اپنے بہترین طریقۂ تربیت کے ذریعے آدمی کو انسان بناتے تھے۔

چھٹی خصوصیت؛ عزت اور اقتدار ہے۔ نبویؐ نظام اور اسلامی معاشرہ کسی سے وابستہ نہیں ہوتا اور نہ ہی غیروں کے سامنے دستِ سوال پھیلاتا ہے، اسے اپنی عزت اور اپنے اقتدار سے بڑا پیار ہے، وہ اپنی مصلحتوں کی تعیین خود کرتا ہے اور پھر اپنے اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے شاہراہِ نجات پر گامزن ہو جاتا ہے۔

ساتویں خصوصیت؛ کام، کوشش اور مسلسل جدّ و جہد ہے۔ اسلامی معاشرے اور نبویؐ نظام میں ٹھہراؤ اور جمود کا کوئی تصوّر نہیں ہے، بلکہ یہاں تو مسلسل جدّ و جہد، کوشش اور کام کا رواج ہے۔ یہاں ایسا مرحلہ ہی نہیں آتا جہاں ٹھہر کر انسان یہ کہہ سکے کہ کام ختم ہوگیا اب تو بس آرام کیا جائے! البتہ اس کام اور جدّ و جہد میں ایک

---

[1] ۔ انہیں پاک و پاکیزہ بناتے ہیں اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔ (سورہ آل عمران، آیت ۱۶۴)

لذت اور خوشی پائی جاتی ہے۔ اِس کام میں تھکن، سستی اور ملال کا گزر بھی نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ایسا کام ہے جو انسان کے اندر ایک سرور اور شوق پیدا کرتا ہے۔

پیغمبر اکرم ﷺ ایک ایسے نظام کو مکمل طور پر عملی جامہ پہنا کر ہمیشہ کے لیے بطورِ نمونہ تاریخ کے پیشِ نظر رکھنے کے ارادے سے مدینہ میں داخل ہوئے، تاکہ آپؐ کے بعد رہتی دنیا تک تاریخ کا کوئی بھی شخص کبھی بھی اور کہیں بھی اس طرح کا نظام وجود میں لا سکے اور لوگوں کے دلوں کو اس جانب متوجہ کر سکے تاکہ لوگ ایک اچھے معاشرے کی جانب بڑھ سکیں۔ البتہ ایک ایسے نظام کو وجود میں لانے کے لیے درج ذیل مضبوط اعتقادی اور انسانی بنیادوں کی ضرورت ہے۔

اول: سب سے پہلے صحیح عقائد اور فکرِ سلیم کا ہونا ضروری ہے تاکہ ان صحیح افکار پر اِس نظام کی بنیاد رکھی جا سکے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے تیرہ سالہ مکی دور میں ان عقائد اورافکار کو کلمۂ توحید، انسانی عزت اور دیگر اسلامی معارف کے قالب میں بیان فرمایا اور اس کے بعد مدینہ منورہ میں اپنی زندگی کے آخری لمحات تک، ایک ایک مسلمان کو ان عقائد اور افکار کی تعلیم دیتے رہے، جنہیں اِس نظام میں بنیادی حیثیت حاصل تھی۔

دوم: انسانی بنیادوں اور ستونوں کی کہ جن کے دوش پر اِس عظیم الشان عمارت کی بنیاد رکھنی تھی، لازمی ضرورت تھی کیونکہ اسلامی نظام کا وجود کسی ایک فرد سے وابستہ نہیں ہے، لہٰذا پیغمبر اسلام ﷺ مکہ مکرمہ میں بہت سارے ایسے انسانی ستون وجود میں لائے اور انہیں تیار کیا۔ (مکہ مکرمہ میں) پیغمبر اسلام ﷺ کے عظیم صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد (جن کے مقام و مرتبے میں فرق ضرور تھا) موجود تھی، جو پیغمبر اسلام ﷺ کے تیرہ سالہ سخت ترین مکی دور کی جدّ و جہد اور کوششوں کا نتیجہ تھی۔ کچھ ایسے لوگ بھی موجود تھے جو ہجرتِ رسول اکرم ﷺ سے پہلے ہی آپؐ کا پیغام سن کر یثرب میں ایمان لا چکے تھے۔ جیسے سعد ابن معاذ اور ابو ایوب انصاری اور دوسرے بہت سارے افراد۔ اس کے بعد مدینہ تشریف لاتے ہی پیغمبر اسلام ﷺ نے لوگوں کی تربیت کا فریضہ انجام دینا شروع کیا، جس کے نتیجے میں دن بہ دن شائستہ، شجاع، مدبّر، مومن، بامعرفت اور حکیم افراد مدینہ میں ظاہر ہوتے گئے جہاں ہر ایک کا کردار اِس بلند و بالا عمارت میں ایک اہم

اور مستحکم ستون کی حیثیت رکھتا تھا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدینہ ہجرت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مدینہ ہجرت کرنا (آپؐ کے ہجرت کرنے سے پہلے اِس شہر کو یثرب کہا جاتا تھا اور آپؐ کے تشریف لانے کے بعد اس کا نام "مدینۃ النبیؐ" پڑ گیا) ایسا ہی تھا جیسے موسمِ بہار کی ہوا کا ملائم جھونکا جس نے اس پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور سب کو یہ احساس ہونے لگا تھا کہ یقیناً کوئی تبدیلی آچکی ہے۔ لہٰذا لوگوں کے دل و دماغ متوجہ اور بیدار ہونے لگے اور جب لوگوں کو اس بات کا پتہ چلا کہ آپؐ "قُبا" کے مقام پر تشریف لا چکے ہیں (قُبا مدینہ کے قریب ایک جگہ ہے جہاں آپؐ نے پندرہ دن قیام کیا) تو اہلِ مدینہ کے دلوں میں آپؐ کی زیارت کا اشتیاق بڑھنے لگا، بعض لوگ آپؐ کے دیدار کی خاطر قُبا گئے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کرنے کے بعد مدینہ لوٹ آئے اور بعض مدینہ ہی میں آپؐ کا انتظار کرنے لگے اور جب آپؐ مدینہ تشریف لائے تو اس شوقِ زیارت نے لوگوں کے دلوں میں ایک طوفان برپا کر دیا اور انہیں تبدیل کرکے رکھ دیا۔ لوگوں کو یکایک یہ احساس ہونے لگا کہ اِس عظیم شخصیت کی رفتار اور گفتار کی وجہ سے ان کے عقائد، احساسات، قبائلی تعصُّبات اور ان سے وابستگیاں ختم ہو چکی ہیں اور وہ ایک جدید دروازے سے حقائقِ عالم اور اخلاقی معارف سے روشناس ہو چکے ہیں۔ یہ وہ طوفان تھا کہ جس نے پہلے تو (مدینہ کے) لوگوں کے دلوں میں انقلاب پیدا کر دیا اور بعد میں مدینہ کے اطراف میں بھی پھیلنے لگا پھر اس نے مکہ کے قلعوں کو تسخیر کر دیا اور آخر کار دور دراز کے علاقوں میں بھی قدم رکھنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ اُس دور کی دو عظیم طاقتوں کے مرکز تک پہنچ گیا اور جہاں بھی گیا اِس انقلاب نے لوگوں کے دل ہلا دیئے اور ان کے وجود میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔

صدرِ اول کے مسلمانوں نے ایران اور روم کو اپنے ایمان کی طاقت سے فتح کیا اور جن علاقوں کو فتح کیا وہاں کے لوگوں کے دل بھی مسلمانوں کو دیکھ کر ایمان کے نور سے منوّر ہو جاتے تھے۔ تلواریں تو صرف اس لیے تھیں کہ ان کے ذریعے راستے کی رکاوٹوں اور

دولت و طاقت کے نشے میں چور حکمرانوں کو ہٹایا جائے، ورنہ لوگوں کی اکثریت نے ہر جگہ اس انقلابی پیغام کو قبول کر لیا تھا اور اس دور کے دو سپر طاقتیں، یعنی ایران اور روم مکمل طور پر اسلامی نظام اور اسلامی مملکت کا حصّہ بن چکی تھیں۔ یہ سب کچھ چالیس سال کے عرصے میں ہو چکا تھا، جن میں سے شروع کے دس برسوں میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہ نفس نفیس موجود تھے، جبکہ باقی تیس برس کا تعلق آپؐ کی وفات کے بعد سے ہے۔

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ پہنچتے ہی اپنے کام کا آغاز فرمایا۔ آپؐ کی زندگی کا ایک حیرت انگیز شاہکار یہ بھی ہے کہ آپؐ نے اِن دس برسوں میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں ہونے دیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ آپؐ نے کبھی بھی معنویت و ہدایت اور تعلیم و تربیت کی نور افشانی میں ذرّہ برابر تامل سے کام نہیں لیا۔ آپؐ کا سونا جاگنا، کوچہ و بازار میں آنا جانا، عبادت و بندگی، گھریلو زندگی اور آپؐ کے وجودِ مبارک سے متعلق ہر شئ ایک درس کا عنوان رکھتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیّبہ میں عجیب برکت پائی جاتی ہے! ایسی بابرکت زندگی جس نے پوری تاریخ کو اپنی طرف متوجہ کیے رکھا اور پوری تاریخ پر اثر انداز رہی۔ میں بارہا عرض کر چکا ہوں کہ مساوات و برابری، اخوت و برادری، عدل و انصاف اور انسان دوستی جیسی بہت سی مقدّس تعلیمات، جن کے تقدّس کو انسان صدیوں بعد سمجھ پایا ہے، ان کا تقدّس آئینِ محمدیؐ کے صدقے میں برقرار ہوا ہے۔

دوسرے ادیان کی تعلیمات میں یاتو ایسی اعلیٰ صفات کا وجود ہی نہیں تھا یا کم از کم انہیں ظہور و عروج نہیں ملا تھا۔ آپؐ نے یہ سارے کام اپنی دس سالہ حکومت کے دوران انجام دیئے تھے۔ آپؐ کی زندگی کتنی بابرکت تھی! آپؐ نے مدینہ پہنچتے ہی اپنی پوزیشن کو واضح کر دیا تھا۔ جس اونٹنی پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سوار تھے جب وہ مدینہ میں داخل ہوئی تو لوگ اس کے اردگرد جمع ہوگئے۔ اس دور میں مدینہ مختلف محلوں میں تقسیم تھا اور ہر محلے میں متعدد گھرانے اور گلی کوچے تھے اور ہر محلہ کسی نہ کسی قبیلے سے متعلق تھا، جس میں کچھ بزرگ ہستیاں بھی تھیں۔ لوگوں میں کسی کا تعلق قبیلہ ''اوس'' سے تو کسی کا قبیلہ ''خزرج'' سے تھا۔ جب آپؐ کی اونٹنی یثرب میں داخل ہوئی تو جس قبیلے اور محلّے سے گزرتی تھی اس قبیلے کے بزرگ آگے بڑھ کر اونٹنی کی مہار تھام کر کہتے تھے: اے

اللہ کے رسول ﷺ! یہیں ٹھہر جائیے۔ ہمارا گھر، ہماری زندگی، ہماری دولت و ثروت سب آپؐ پر نثار۔

حضور ﷺ فرماتے تھے: اُونٹنی کے سامنے سے ہٹ جائیے: ”إِنَّهَا مَأمُورَةٌ“ کیونکہ یہ حکم کے مطابق چل رہی ہے۔ لہٰذا اسے جانے دیجئے۔ لوگ اُونٹنی کے سامنے سے ہٹ جاتے اور وہ دوسرے محلے پہنچ جاتی تو یہاں بھی قبیلے کے سردار، بزرگ، بوڑھے اور جوان آگے بڑھ کر آپؐ کی اونٹنی کی مہار تھام کر کہتے: اے اللہ کے رسول ﷺ! یہیں پر اُتر جائیے یہ آپؐ ہی کا گھر ہے آپؐ جو چاہیں آپؐ کو فراہم کیا جائے گا۔ ہم سب آپؐ کی خدمت کے لیے تیار ہیں۔ آپؐ پھر فرماتے: راستے سے ہٹ جائیے اور اُونٹنی کو آگے بڑھنے دیجئے: ”إِنَّهَا مَأمُورَةٌ“ اسی طرح آپؐ کی اونٹنی مختلف گلیوں اور محلوں سے ہوتی ہوئی بنی نجار کے محلے تک پہنچ گئی، حضور اکرم ﷺ کی والدہ ماجدہ (جناب آمنہ علیہا) کا تعلق بھی اسی قبیلے سے تھا، جس کی وجہ سے قبیلہ بنی نجار کا شمار آپؐ کے ننھیال میں ہوتا تھا۔ لہٰذا اس قبیلے کے لوگوں نے آگے بڑھ کر کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم آپؐ کے رشتہ دار ہیں، ہماری جانیں آپؐ پر قربان ہوں۔ آپؐ ہمارے ہاں اُتر جائیے، آپؐ نے فرمایا: نہیں ”إِنَّهَا مَأمُورَةٌ“ سامنے سے ہٹ جائیے اور راستہ دیجئے، سواری حکم کی پابند ہے۔ یہاں تک کہ اونٹنی چلتے چلتے مدینہ کے غریب محلے میں جاکر بیٹھ گئی۔ سب دیکھنا چاہتے تھے کہ یہ کس کا گھر ہے! لوگوں نے دیکھا کہ یہ ابو ایوب انصاری کا گھر ہے، یعنی مدینہ کے غریب اور نادار لوگوں میں سے ایک شخص کا گھر ہے۔ ابو ایوب انصاری اور ان کے اہلِ خانہ باہر آئے اور حضورؐ کا سامان اُٹھایا اور اندر لے گئے۔ نبی رحمت ﷺ بھی ایک مہمان کی حیثیت سے ان کے گھر میں داخل ہوئے۔ حضور اکرم ﷺ نے مدینہ کے قبائل کے سرداروں اور رئیسوں کی دعوت مسترد کرتے ہوئے اپنی اجتماعی پوزیشن کو واضح کردیا اور سب سمجھ گئے کہ سرورِ کائنات ﷺ کا معیارِ معاشرت مال و منال، جاہ و جلال، قوم و قبیلہ، رشتہ داری وغیرہ نہ اب ہے اور نہ ہی آئندہ کبھی ہوگا۔ آپؐ نے پہلے مرحلے میں ہی یہ واضح کردیا کہ اجتماعی معاملات میں لوگوں سے آپؐ کا سلوک کس بنیاد پر استوار ہوگا اور آپؐ معاشرے کے کس طبقے کے حامی و طرفدار ہوں گے اور آپؐ کا

۱۔ بحار الانوار، ج۱۹، ص۱۰۹

وجود کس طبقے کے لیے زیادہ مفید ہوگا۔ سب نبی کریمﷺ کے وجودِ پُرنور اور آپؐ کی تعلیمات سے بہرہ مند ہوں گے، مگر جو طبقہ معاشرے میں محروم و مظلوم تھا وہ اب زیادہ آپؐ کی رحمت (اور توجہ) کا حقدار ہوگا تاکہ اس کی محرومیوں اور مظلومیت کی تلافی ہو سکے۔

ابو ایوب انصاری کے گھر کے سامنے بیکار زمین کا ایک ٹکڑا تھا۔ آپؐ نے دریافت کیا کہ یہ زمین کس کی ہے؟ کہا گیا کہ یہ زمین دو یتیم بچوں کی ملکیت ہے۔ آپؐ نے اپنی جیب سے رقم دے کر وہ زمین خرید لی اور فرمایا: یہاں مسجد تعمیر ہوگی۔ مسجد یعنی اسلام کی عبادی، اجتماعی، حکومتی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز؛ یعنی لوگوں کے اجتماع اور اکٹھے ہونے کی جگہ۔ اسلامی معاشرے کو ایسے مرکز کی ضرورت تھی لہٰذا مسجد کی تعمیر شروع ہوگئی۔ آپؐ نے مسجد کی زمین کے لیے کسی سے درخواست نہیں کی، کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا، بلکہ خود اپنی رقم خرچ کی۔ اگرچہ ان دو بچوں کے سر پر باپ کا سایہ نہ تھا اور ان کا کوئی دوسرا حمایتی اور طرفدار بھی نہ تھا، مگر سرورِ کائناتﷺ نے ایک مہربان باپ اور شفیق سرپرست کا کردار ادا کرتے ہوئے ان کے حق کا مکمل لحاظ رکھا۔

پھر جب مسجد کی تعمیر شروع ہوئی تو سب سے پہلے خود پیغمبر رحمتﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے زمین کی کھدائی شروع کی۔ صرف اعزازی اور نمائشی طور پر نہیں، بلکہ حقیقی معنوں میں محنت کی اور پسینہ بہایا۔ آپؐ تعمیراتی کاموں میں اس طرح مصروف تھے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے لوگ بھی یہ کہتے ہوئے تعمیر کے کاموں میں مشغول ہو گئے کہ نبی اکرمﷺ کام کریں اور ہم بیٹھے رہیں؟! اس لیے سب کی انتھک محنتوں کے نتیجے میں مسجد کی تعمیر بہت جلد مکمل ہوگئی۔ نبی اکرمﷺ جیسی عظیم اور قدرت مند ہستی نے اپنے عمل سے یہ واضح کر دیا کہ اگرچہ قوم کی رہبری میرے اختیار میں ہے مگر اس کا مقصد سلطنت و حکمرانی نہیں ہے، اگر یہ طے ہو کہ معاشرے میں کوئی کام انجام پائے تو اس میں ضروری ہے کہ اس قوم کا رہبر بھی دوسرے لوگوں کی طرح اپنا خون پسینہ بہائے۔

اس کے بعد آپؐ نے سیاسی معاملات اور حکومتی اُمور سے متعلق اپنے منصوبے کا آغاز فرمایا، جب انسان ان تمام چیزوں کا بغور مطالعہ کرتا ہے تو بخوبی سمجھتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی قوی عزم اور مضبوط سوچ کار فرما ہے، جو علی الظاہر وحیِ الٰہی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ آج اگر کوئی شخص ان دس برسوں کا قدم بہ قدم مطالعہ کرنا چاہے تو وہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکتا اور اگر انسان ایک ایک واقعے کا الگ سے جائزہ لے تو بھی کچھ نہیں سمجھ پاتا ہے۔ لہٰذا یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کام کی ترتیب کیا ہے اور کس طرح یہ سارے اُمور بہترین طریقے اور ہوشیاری کے ساتھ منظّم اور صحیح طور پر انجام پائے ہیں۔

پہلا کام اتحاد کی فضاء کو ایجاد کرنا تھا کیونکہ مدینہ میں بسنے والے تمام لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے، ان کی اکثریت نے اسلام قبول کیا تھا لیکن کچھ لوگ اب بھی غیر مسلم تھے۔ ان کے علاوہ بھی مدینہ میں تین اہم یہودی قبائل، یعنی بنی قینقاع، بنی نضیر اور بنی قریظہ رہائش پذیر تھے اور ہر قبیلے کا ایک خاص قلعہ تھا؛ یعنی یہ قبیلے اپنے مخصوص قلعوں میں، جو تقریباً مدینہ سے جڑے ہوئے تھے زندگی گزارتے تھے۔ یہ قبائل کوئی سو دو سو سال پہلے مدینہ میں آکر آباد ہوئے تھے، لیکن یہ لوگ یہاں آکر کیوں آباد ہوئے تھے؟ یہ خود ایک تفصیلی بحث ہے۔ جب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ میں وارد ہوئے اس وقت مدینہ میں ان یہودیوں کو چند امتیازات حاصل تھے۔

پہلا امتیاز یہ تھا کہ مدینہ کی اصل دولت و ثروت، بہترین کھیت، بہترین تجارت، یعنی سونا چاندی اور جواہرات کی صنعتیں وغیرہ ان یہودیوں کے اختیار میں تھیں۔ مدینہ کے اکثر لوگ بوقت ضرورت اِن کے دست نگر ہوا کرتے تھے، ان سے قرض لیتے اور پھر سُود کے ساتھ اسے واپس کرتے تھے، یعنی مدینہ کی اقتصادیات پر یہودیوں کا قبضہ تھا۔

دوسرا یہ کہ تہذیب و ثقافت اور مدنیت کے لحاظ سے بھی یہودی، مدینہ کی دیگر قوموں پر برتری رکھتے تھے۔ ظاہر ہے اہل کتاب ہونے کی بنیاد پر وہ مختلف علوم اور دینی تعلیمات سے آشنائی رکھتے تھے، لہٰذا فکری لحاظ سے وہ دوسروں پر تسلط رکھتے تھے۔ اگر آج کی اصطلاح میں کہاجائے تو یہ لوگ اُس زمانہ کا ”روشن خیال“ طبقہ کہلاتے

تھے؛ لہٰذا دوسرے افراد کو احمق، بےوقوف اور حقیر جانتے تھے اور اگر کہیں کوئی خطرہ محسوس کرتے تو وہاں دب بھی جاتے تھے، لیکن طبیعی طور پر اپنے آپ کو برتر سمجھتے تھے۔

تیسرا امتیاز ان کا یہ تھا کہ دور دراز کے علاقوں سے بھی تعلقات رکھتے تھے، لہٰذا یہ ایک ایسی قوم نہیں تھی جو صرف مدینہ کے اندر محدود ہو۔ مدینہ کے یہودیوں کے ان امتیازات اور ان کی اِس حیثیت کے پیشِ نظر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ اپنے تعلقات کی حدود و شرائط کا تعیُّن کریں، جب آپؐ مدینہ میں داخل ہوئے تو بغیر کسی معاہدے اور لوگوں سے کسی بھی قسم کا کوئی تقاضا کیے بغیر، یہ واضح ہوگیا کہ اس معاشرے کی قیادت آپؐ کے پاس ہے، یعنی آپؐ کی شخصیت اور نبوی عظمت نے طبیعی طور پر تمام لوگوں کو آپؐ کے مقابلے میں سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیا اور سب پر یہ بات عیاں ہو گئی کہ محمدؐ عربی ایک ایسے رہبر اور قائد ہیں کہ جو کہتے ہیں سب کو اس پر عمل کرنا ہوتا ہے، لہٰذا آپؐ نے ایک ایسا میثاقِ عام اور عہد نامہ سامنے رکھا جو سب کے لیے قابلِ قبول تھا۔ اِس میثاق میں اجتماعی رہن سہن، لین دین کے معاملات، اختلافات، دیت اور مخالفین، یعنی یہودیوں اور دیگر غیر مسلموں کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تعلقات وغیرہ جیسے مسائل سے متعلق شرائط اور قواعد درج تھے۔ یہ سب مفصّل طور پر تاریخ کی قدیمی کتابوں میں موجود ہے۔

اس کے بعد اگلا انتہائی اہم قدم، اخوت اور بھائی چارگی کا قیام تھا۔ طبقاتی نظام، بے جا تعصُّبات، قبائلی غرور اور معاشرے کے مختلف طبقات کے درمیان دشمنی اور نفرت، اس دور کے متعصّب اور جاہل معاشرے کے لیے کسی بلا سے کم نہ تھی، لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کے درمیان اخوت اور بھائی چارگی کا رشتہ قائم کرکے ان تمام مسائل کو اپنے پیروں تلے کچل دیا۔ آپؐ نے ایک قبیلے کے سردار کو ایک انتہائی غریب اور متوسط طبقے کے شخص کا بھائی بناتے ہوئے فرمایا: ”آج سے تم دونوں آپس میں بھائی ہو۔“ اور انہوں نے بھی بھائی چارگی کے اس رشتے کو خوشی خوشی قبول کر لیا۔

خاندان کے بزرگوں، قبائل کے سرداروں اور آزاد شدہ مسلم غلاموں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا۔ آپؐ کے اِس عمل نے اجتماعی اتحاد و ہمدردی کی راہ میں موجود تمام رکاوٹوں کو ختم کر دیا۔ جب مسجد کے لیے ایک مؤذّن کے انتخاب کی باری آئی تو آپؐ نے تمام رئیسوں، امیروں، خوش الحانوں اور خوبصورت شکل افراد کو چھوڑ کر بلال حبشی کو بطورِ مؤذّن معین کیا۔ آپؐ نے اپنے اس طریقۂ انتخاب کے ذریعے واضح کر دیا کہ یہاں محض ظاہری خوبصورتی، خوش الحانی، خاندانی امتیازات اور قبائلی شرف کی کوئی حیثیت نہیں ہے، بلکہ یہاں معیار صرف اسلام و ایمان، راہِ خدا میں جہاد اور ایثار و فداکاری جیسے اعلیٰ اخلاقی فضائل ہیں۔

غور کیجیے کہ سرور کائنات ﷺ نے کس طرح عملی طور پر انسانی اقدار کو سربلندی عطا کی۔ آپؐ نے اپنے قول سے زیادہ اپنے عمل، سیرت اور کردار کے ذریعے لوگوں کے دلوں کو متاثر کیا ہے۔

اسلامی نظام کی دشمنوں سے حفاظت

اس کام کو عملی جامہ پہنانے کے تین مراحل تھے۔ پہلا مرحلہ اِس نظام کی بنیاد رکھنا تھا جو مذکورہ کاموں کے ذریعے انجام پایا۔ دوسرا مرحلہ اس نظام کی حفاظت کا تھا۔ ایک زندہ اور موجود چیز جو رشد و کمال کی طرف بڑھ رہی ہو اگر طاقتور حلقوں کو پتہ چلے تو طبیعی طور پر اسے اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہیں اور یقیناً اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ اب اگر پیغمبر اسلام ﷺ کمالِ ہوشیاری کے ساتھ اِس نوزائدہ نظام کو اس کے دشمنوں سے بچانے میں کامیاب نہ ہو سکیں تو یہ نظام تباہ و برباد ہو سکتا ہے اور آپؐ کی تمام زحمتیں رائیگاں جا سکتی ہیں، اس لیے اِس نظام کی حفاظت ضروری تھی۔ تیسرا مرحلہ اس عمارت کی تعمیر ہے۔ صرف بنیاد رکھنا کافی نہیں، بلکہ یہ پہلا قدم ہے لہٰذا اِن تینوں مرحلوں کو بالترتیب انجام دینا ضروری تھا۔

البتہ اِس نظام کے پہلے مرحلے یعنی بنیاد رکھتے ہوئے بھی دشمن سے بچ کے رہنے اور اس کے بعد اس کی حفاظت بھی ضروری تھی۔ اسی طرح اس نظام کی بنیاد ہی میں لوگ

اور ان کے اجتماعی مسائل پر بھرپور توجہ دی گئی ہے اور اس کے بعد بھی ان پر خاصی توجہ دی جاتی رہی۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی تیزبین نگاہوں سے دیکھا کہ اس نوزائدہ اسلامی معاشرے کو پانچ اصلی دشمنوں کی طرف سے خطرات لاحق ہیں۔

پہلا دشمن ارد گرد کے قبائل تھے۔ بعض اوقات دشمن چھوٹا اور بےاہمیت ہوتا ہے مگر اس سے غفلت برتنا نقصان دہ ثابت ہوتا ہے کیونکہ ممکن ہے یہی چھوٹا دشمن کچھ مدت کے بعد بڑے دشمن کی شکل اختیار کر لے۔ یہ دشمن کون ہے؟ یہ اطراف مدینہ کے کچھ ایسے قبائل تھے جنہیں وحشی کہنا نامناسب نہ ہوگا۔ ان کی پوری زندگی جنگ و خونریزی، قتل و غارتگری اور ایک دوسرے کے خلاف کاروائیوں سے عبارت تھی۔

مدینہ میں قابلِ اطمینان اجتماعی نظم و ضبط کے باوجود، امن کی خاطر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ضروری تھا کہ اِن قبائل کے حوالے سے کوئی فیصلہ کریں، لہٰذا آپؐ نے ہر اُس قبیلے سے امن وسلامتی کا معاہدہ کیا جس میں ذرہ برابر بھی مروت و مردانگی پائی جاتی تھی۔ ابتدا میں انہیں اسلام کی طرف دعوت نہیں دی، بلکہ انہیں اپنے کفر و شرک پر باقی رہنے دیا اور معاہدہ صرف امن کی بحالی کے لیے کیا۔

آپؐ اپنے اس معاہدے کے پابند رہے لیکن جب ان لوگوں نے ہی معاہدہ توڑ دیا تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی انہیں سبق سکھانے کی تدبیر کی۔ تاریخ اسلام کے متعدد سریوں[1] کا تعلق انہیں معاہدہ شکن شریر اور غیر قابلِ اعتماد قبائل سے ہے۔ جن لوگوں کو نصیحت کی زبان راس نہیں آتی، ان کے فتنوں کی آگ کو صرف زورِ بازو سے ہی خاموش کیا جا سکتا ہے۔ اس اصول کے تحت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طاقت استعمال کرکے ان کی گستاخیوں اور امن مخالف سرگرمیوں کا خاتمہ کیا اور انہیں خاموش بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔

دوسرا دشمن مکہ مکرمہ میں موجود مشرکین تھے، مکہ کو مرکزیت حاصل تھی۔ اگرچہ یہاں پر قانونی طور پر کسی ایک کی حکومت نہیں تھی، مگر کچھ متکبر، طاقتور اور بااثر

---

[1] ۔ ”سریہ“ اس لشکر کو کہتے ہیں جس کے سپاہیوں کی تعداد ۴۰۰ سے کم ہو اور اصطلاح میں یہ لفظ ”غزوہ“ کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے، یعنی سریہ اس جنگ کو کہا جاتا ہے جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہ نفس نفیس شریک نہ ہوئے ہوں۔

سرداروں کے ایک گروہ کی داداگیری ضرور چلتی تھی۔ ان کے آپس میں خلفشار اور اختلافات تو تھے لیکن اس جدید اور نئے دین کے مقابلے میں ان کا اتحاد مثالی تھا۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ والوں کو ایک بڑے خطرے کی شکل میں دیکھ رہے تھے اور عملاً بھی ایسا ہی ہوا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ محسوس کیا کہ اگر وہ اس انتظار میں رہیں کہ یہ لوگ خود آپؐ کے پیچھے چلے آئیں گے تو یقیناً دشمن کو ایک بہترین موقع مل جائے گا، لہٰذا آپؐ خود ہی ان کے پیچھے چلے گئے، البتہ آپؐ سیدھے مکہ کی طرف نہیں گئے بلکہ ان کا ایک تجارتی قافلہ جو مدینے کے قریب سے گزر رہا تھا اسے آپؐ کے حکم سے روک لیا گیا۔ جنگ بدر کی ابتداء اسی سے ہوئی جب آپؐ نے تجارتی قافلے کو روکا تو وہ بھی تعصّب اور کینہ کے مارے آپؐ کے خلاف جنگ کے لیے میدان میں اُتر آئے۔

(۲۰۰۱/۰۵/۱۸ء)

اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق مسلمانوں کو پہلے ہی یہ خبر ملی تھی کہ وہ کافروں کے اس گروہ کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائیں گے اور یہ ہجرت کے دوسرے سال کا واقعہ ہے کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ اپنا تجارتی سامان لے کر مدینہ کے راستے شام سے مکہ جارہا تھا جب یہ قافلہ مدینہ کے قریب پہنچا تو مسلمان سپاہیوں نے اسے گھیر لیا۔ جب کفار مکہ کو اس بات کی اطلاع ملی تو ان کا ایک مسلح گروہ اپنے ساتھیوں کو بچانے کے لیے مدینہ کی طرف روانہ ہوا۔

ادھر اکثر مسلمانوں کی یہ خواہش تھی کہ وہ اس تجارتی قافلے کو جن کے پاس اپنے دفاع کا کوئی خاص انتظام نہ تھا گرفتار کریں، لیکن حکمِ خدا یہ تھا کہ مسلمان قریش کے مسلح گروہ سے مقابلہ کریں:

”وَ إِذْ يَعِدُكُمُ اللهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ“[۱]

---

[۱] اور اس وقت کو یاد کرو جب خدا تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دو گروہوں میں سے ایک تمہارے لیے بہرحال ہے اور تم چاہتے تھے کہ تمہارے لیے وہ غیر مسلح (تجارتی) گروہ ہو۔ (سورہ انفال، آیت۷)

مسلمان اِس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ اِس جنگ میں وہ کامیاب ہونے والے ہیں لیکن انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ وہ اس مسلح گروہ کو شکست دینے والے ہیں، بلکہ وہ شام سے لوٹنے والے اِس قافلے کو گرفتار کرنے کو ہی اپنی کامیابی سمجھتے تھے۔ لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا راستہ تبدیل کیا اور آپؐ انہیں قریشِ مکہ کے مسلح گروہ سے مقابلہ کے لیے لے گئے اور ان کے تجارتی قافلے کو جانے دیا۔ ”بدر“ نامی جگہ پر مسلمانوں اور قریشِ مکہ کے درمیان مقابلہ ہوا۔

اب اس کی کیا وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے رُخ کو تجارتی قافلے کی طرف سے موڑ کر قریشِ مکہ کے اس مسلح گروہ کی طرف کر دیا؟ اِس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان صرف قریب کے ہدف کو دیکھتے تھے جبکہ ارادہ اور مشیتِ الٰہی ایک دور کے ہدف کے تعاقب میں تھی۔

”وَيُرِيدُ اللهُ أَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ“[1] یعنی اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ پوری کائنات میں حق چھا جائے۔ ”لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ“[2] یعنی اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ باطل مٹ جائے کیونکہ وہ طبیعتاً زوال پذیر ہی ہوتا ہے۔ باطل ایک ساتھ اُلٹ جائے۔ کیا یہ طے نہیں ہے کہ اسلام تمام شیطانی اور طاغوتی طاقتوں کو سرنگوں کر دے؟ کیا یہ طے نہیں کہ ملتِ اسلامیہ ”لِتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ“[3] کا مصداق بن جائے؟ کیا یہ طے نہیں کہ اسلام کا پرچم، بشری اور انسانی اقدار کی بلندی پر لہرایا جائے؟ تو پھر یہ کب، کیسے اور کیونکر ہوگا؟

اُس وقت کے مسلمان دل ہی دل میں یہ سوچ رہے تھے اگر آج ہم اس دولت مند قافلے کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوئے تو اتنا مال ہمارے ہاتھ لگ جائے گا کہ جس سے اسلام کے نئے نظام کو ایک نئی قوت ملے گی اور ان کی یہ سوچ صحیح بھی تھی لیکن ان کی اس سوچ سے بہتر ایک سوچ یہ بھی تھی کہ آج ہم نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع اور

---

[1] ۔ اللہ اپنے کلمات کے ذریعہ حق کو ثابت کرنا چاہتا ہے۔ (سورہ انفال، آیت۷)

[2] ۔ تاکہ حق ثابت ہو جائے اور باطل فنا ہو جائے چاہے مجرموں کو جتنا بھی برا لگے۔ (سورہ انفال، آیت۸)

[3] ۔ تاکہ تم دوسرے لوگوں کے اعمال پر گواہ بن جاؤ۔ (سورہ بقرہ، آیت۱۴۳)

پیروی میں اس قدر ترقی کی ہے اور ہم اتنے آگے بڑھ چکے ہیں کہ اب ہم معاشرے کے مستضعف اور محروم طبقے اور دنیا کے تاریک و ظالم نظام کو بدلنے کا سوچ رہے ہیں۔

کیونکہ اس تالاب میں اتنا پانی موجود ہے کہ اس میں لہریں پیدا کی جاسکیں اور ان لہروں کے ذریعے ان نونہالوں، درختوں اور خشک زمینوں کو سیراب کیا جا سکے۔ اگر یہ طے ہے کہ اسلام کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار ہو، اگر یہ طے ہے کہ اسلام کا پیغام اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ غریب اور مستضعف علاقوں کی طرف پھیل جائے، اگر یہ طے ہے کہ ظالموں اور ستمگروں کے محل ایک ایک ہو کر زمین بوس ہو جائیں، تو ضروری ہے کہ کسی ایک نکتے سے کام کا آغاز کیا جائے۔ صدرِ اول کے مسلمان اپنے تمام تر اخلاص کے باوجود یہ نہیں جانتے تھے کہ آغاز کہاں سے ہو؛ لہٰذا اللہ تعالیٰ اس موقع پر ان کی راہنمائی فرماتا ہے۔ وہ مسلمان جو اس قافلے کو لوٹنے آئے تھے انہیں با دلِ نخواستہ ایک جنگ کی طرف دھکیلتا ہے تاکہ اس ناخواستہ جنگ میں جنگی وسائل کی کمی کے باوجود، اپنے ایمان کے بل بوتے پر ایک ہی دن میں دشمن کو شکست دے سکیں اور اسلام کے پیغام کو آگے بڑھنے اور لوگوں میں اس کو راسخ کرنے کا راستہ ہموار کر سکیں اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا راستہ ہموار کرکے لوگوں کو یہ سمجھا سکیں کہ یہ اسلام ہے، اس کا کسی سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ ''لِیُحِقَّ الْحَقَّ وَیُبْطِلَ الْبَاطِلَ'' اے مسلمانوں ہم نے تمہیں اچانک اس بڑے لشکر کے ساتھ جنگ کا حکم دیا تاکہ وہ تمہارے ہاتھوں زخموں کا مزہ چکھ لیں اور انہیں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا احساس ہو جائے۔

(۰۳/۱۰/۱۹۸۰ء)

جنگ بدر میں جب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مجاہدینِ اسلام کو کامیابی ملی تو دشمن نے جو آسانی کے ساتھ دستبردار ہونے والا نہ تھا، جنگِ اُحد کا فیصلہ کر لیا۔ جنگ اُحد میں بھی شروع میں تو مسلمانوں نے اپنے اتحاد اور اتفاق کے بل بوتے پر دشمن کو شکست دی، لیکن کامیابی حاصل کرنے کے فوراً بعد وہ پچاس مسلمان، جنہیں حضور اکرم ﷺ نے پہاڑی درّے کی پہرہ داری پر مقرّر کیا تھا اس بات کے پیشِ نظر کہ کہیں وہ مالِ غنیمت جمع کرنے میں دوسروں سے پیچھے نہ رہ جائیں، اپنی ذمہ داری چھوڑ کر مالِ غنیمت جمع

کرنے میں لگ گئے۔ صرف دس مسلمان سپاہی پہاڑی درّے پر بیٹھ کر اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے۔ دشمن نے اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کوہِ اُحد کے پیچھے اور اس درّے کی جانب سے جہاں مسلمان سپاہیوں کی تعداد بہت کم تھی، مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ دشمن کا یہ حملہ مسلمانوں کے لیے بہت ہی خطرناک ثابت ہوا، اگرچہ اس وقت بھی اسلام کو شکست نہیں ہوئی، لیکن ایک تو اسلام کو کامیابی دیر سے ملی اور دوسری بات یہ کہ اس غفلت کے نتیجے میں اسلام کو سید الشہداء حضرت حمزہؓ جیسے شجاع اور بہادر کمانڈر کی قربانی دینی پڑی۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عبرت کے ساتھ ساتھ غور و فکر کی بھی دعوت دیتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے اپنے وعدے پر عمل کیا، ہم نے کہا تھا کہ تمہیں دشمن پر کامیابی حاصل ہوگی سو ہوگئی، لیکن اس کے بعد تمہارے اندر درج ذیل تین خصلتیں پیدا ہو گئیں، جن کی وجہ سے تمہیں نقصان اُٹھانا پڑا۔ وہ تین خصلتیں یہ ہیں: پہلی یہ کہ ”تَنَازَعۡتُمۡ فِي الۡأَمۡرِ“ تم نے آپس میں اختلافات کا شکار ہوتے ہوئے اپنی صفوں کو درہم برہم کر دیا، دوسری یہ کہ ”فَشِلۡتُمۡ“ تم سستی کا شکار ہوگئے، یعنی پہلے والا جوش و جذبہ باقی نہیں رہا اور تیسری یہ کہ ”عَصَيۡتُمۡ“[1] یعنی تم نے پیغمبر اسلامﷺ اور اپنے کمانڈروں کے حکم کو ٹھکرایا اور ان کے دستورات پر عمل نہیں کیا۔ پس جب تمہارے اندر یہ تین خصلتیں پیدا ہوئیں تو دشمن کو یہ موقع ملا کہ وہ پیچھے سے تم پر حملہ کر سکے اور اسلام کے عزیز ترین سپاہیوں کو خاک و خوں میں غلطاں کرے، جس کے نتیجے میں ملتِ اسلامیہ کو ایک شجاع اور بہادر شخص سے ہاتھ دھونا پڑا۔

(۱۹/۰۵/۱۹۸۰ء)

مشرکینِ مکہ نے آپؐ سے جو آخری جنگ کی، وہ جنگ خندق تھی۔ (جس کا شمار انتہائی اہم جنگوں میں ہوتا ہے) مشرکینِ مکہ نے اپنی اس شرمناک سازش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یہودیوں اور دیگر بہت سارے بت پرست قبائل کی مدد حاصل کی۔ وہ چاہتے تھے کہ مدینہ منورہ پر ایک بڑا اور فیصلہ کن حملہ کرکے اسلام کی اس تازہ حکومت کا خاتمہ کر دیں اور رسول خداﷺ اور ان کے دو چار سو وفادار اور جانثاروں کو شہید کرکے اسلام کا نام و نشان مٹا دیں، لیکن ان کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی جب حضور اکرمﷺ کو اس سازش کا پتہ چلاتو آپؐ نے خندق کھدوائی۔ جس جگہ سے مدینے پر حملے کا خطرہ تھا وہاں پر

---

[1] سورہ آل عمران، آیت ۱۵۲

تقریباً چالیس میٹر چوڑی خندق کھودی گئی۔

رمضان المبارک کا مہینہ تھا بعض روایات کے مطابق سخت سردی کا موسم تھا اس سال بارشیں نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کے محصولات کی بھی خاصی کمی ہوگئی تھی، لہٰذا بے شمار مشکلات کا سامنا تھا۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ خود حضور اکرمﷺ بنفسِ نفیس خندق کھودنے میں مصروف تھے۔ جب خندق کی کھدائی کا کام شروع ہوا تو آپؐ وہاں موجود تھے اور دیکھتے تھے کہ جب بھی ان میں سے کوئی تھک جاتا یا کام صحیح طریقے سے انجام نہیں دے پاتا، تو آپؐ آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے اوزار لے لیتے اور خود کام کرنا شروع کر دیتے تھے، یعنی آپؐ صرف حکم نہیں چلاتے تھے بلکہ بنفسِ نفیس لوگوں کے درمیان موجود ہوتے تھے اورکام کرتے تھے۔ مشرکینِ مکہ نے جب مدینے کے اطراف میں کھدی ہوئی خندق کو دیکھا اور انہیں یہ احساس ہوا کہ وہ خندق پار نہیں کر سکتے ہیں تو مایوس ہوکر واپس لوٹ گئے۔ اس موقع پر آپؐ نے فرمایا: مشرکینِ مکہ کا ہم پر یہ آخری حملہ تھا آج کے بعد وہ ہم پر حملہ نہیں کر سکیں گے بلکہ اب ہماری باری ہے ہم مکہ مکرمہ جاکر ان پر حملہ کریں گے۔

اس سے اگلے سال پیغمبر اسلامﷺ نے فرمایا کہ ہم عمرہ ادا کرنے مکہ مکرمہ جانا چاہتے ہیں۔ صلحِ حدیبیہ کا واقعہ، جو تاریخ اسلام کا بڑا پُرمغز اور پُرمعنی واقعہ ہے، اس کا تعلق بھی اسی زمانے سے ہے۔ آنحضرتؐ عمرے کے قصد سے مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے۔ مشرکین نے دیکھا کہ حضور اکرمﷺ ایسے مہینہ میں مکہ کی طرف آرہے ہیں جو قابلِ احترام ہے کہ جس میں جنگ نہیں کی جا سکتی، کیونکہ مشرکین بھی اِن مہینوں کا احترام کرتے تھے۔ لہٰذا سوچنے لگے کہ کیا کیا جائے؟ آپؐ کو آنے دیا جائے یا روک دیں؟ اگر آنے دیتے ہیں تو پھر مقابلہ کی کیا صورت ہو؟ کیا ماہِ حرام میں بھی جنگ کی جائے؟ کس طرح جنگ کی جائے؟ اس طرح کے ڈھیروں سوال ان کے ذہنوں میں اُٹھ رہے تھے۔ آخر کار فیصلہ یہ ہوا کہ حضرت محمدﷺ کو مکہ مکرمہ میں داخلے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور موقع ملتے ہی مسلمانوں کا قتلِ عام کر دیا جائے گا۔

لیکن رسول خداﷺ کی اعلیٰ تدبیر کے نتیجے میں یہی کفارِ مکہ آنحضرتؐ کے ساتھ

معاہدہ کرنے پر مجبور ہوئے، جس کے مطابق یہ طے پایا کہ آپؐ آئندہ سال مکہ میں عمرہ بجا لاسکتے ہیں۔ یہ معاہدہ آپؐ کے دائرہ تبلیغ کی مزید وسعت کا سبب بنا۔ دنیا اسے ”صلح“ کے نام سے جانتی ہے، لیکن خداوند کریم نے اسے ''فتح'' کا عنوان دیا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے: ''إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحاً مُّبِيْناً''[1] ''بے شک ہم نے آپؐ کو کھلی فتح عطا کی ہے۔“ اگر صحیح اور مستند تاریخ کی طرف رجوع کیا جائے تو صلحِ حدیبیہ کے حوالے سے بڑے حیرت انگیز حقائق سامنے آئیں گے۔ صلح کے دوسرے سال حضور اکرمؐ عمرے کی ادائیگی کے لیے تشریف لے گئے اور دشمنانِ اسلام کی مخالفتوں کے باوجود آپؐ کی شان و شوکت میں مزید اضافہ ہوتا رہا۔

اِس سے اگلے برس یعنی ہجرت کے آٹھویں سال جب کفارِ مکہ نے معاہدہ توڑا تو سرور کائناتؐ نے مکہ فتح کر لیا۔ ایسی عظیم فتح ملی جو آپؐ کے اقتدار کا مکمل اظہار تھی۔ پورے واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرمؐ نے قدرت و تدبیر، صبر و حوصلے، عزم و استقلال اور ثبات و استحکام کے ذریعے اپنے دشمن کو سر اُٹھانے کو موقع بھی نہ دیا اور آپؐ اپنے الٰہی اغراض و مقاصد کی راہ میں روز افزوں ترقی کے مراحل طے کرتے رہے۔

مدینہ منوّرہ کے یہودیوں کے ساتھ آپؐ کا برتاؤ

تیسرے دشمن، یہودی تھے۔ یہ ایسے ناقابلِ اطمینان لوگ تھے جنھوں نے وقتی طور پر مسلمانوں کے ساتھ مدینہ میں ہی مل جل کر رہنے کا عہد کیا تھا مگر پھر بھی ایذاء رسانی، خلل اندازی اور تخریب کاری سے باز نہیں آتے تھے۔ سورۂ بقرہ کا ایک اہم حصّہ اور بعض دیگر سورتیں یہودیوں کے ساتھ آنحضرتؐ کی ثقافتی جنگ کے بیان پر مشتمل ہیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ مدینہ منورہ کے یہودی خود ایک تہذیب و ثقافت کے حامل تھے، آگاہ و ہوشیار تھے، کمزور عقیدے کے حامل افراد کے دل و دماغ کو متاثر کر دیتے تھے، سازشیں کرتے، لوگوں کو نااُمید اور مایوس کرتے تھے اور لوگوں کو ایک دوسرے

---

[1] ۔ سورہ فتح، آیت ۱

کی جان کا دشمن بنا دیتے تھے۔ یہ یہودی آنحضرتؐ کے ایسے دشمن تھے جن کی دشمنی منظّم اور منصوبہ بندی پر استوار تھی۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے ان کے ساتھ حتی المقدور نرمی برتی، لیکن جب پانی سر سے اُونچا ہوا تو انہیں کیفر کردار تک پہنچادیا۔ آپؐ نے بغیر کسی وجہ کے یکدم انہیں سزا نہیں دی، بلکہ ان تینوں یہودی قبیلوں میں سے ہر ایک نے معاہدے کی شدید خلاف ورزی کی، تو اپنے کیے کا نتیجہ بھی انہیں بھگتنا پڑا۔

سب سے پہلے جب بنی قینقاع نے حضور اکرم ﷺ سے خیانت کی، تو آپؐ نے اُن سے فرمایا: ”اب تمہیں مدینہ چھوڑنا ہوگا۔“ وہ مدینے سے نکال دیئے گئے اور ان کی جائیداد وغیرہ مسلمانوں کے حصّے میں آئی۔

دوسرا قبیلہ بنی نضیر تھا، جس نے معاہدے کو توڑا (ان کی خیانت کی داستان بڑی اہم ہے) ان کو بھی رسول اکرم ﷺ نے اپنے کچھ اموال کے ساتھ مدینہ چھوڑنے کا حکم دیا لہٰذا وہ بھی مجبور ہو کر چلے گئے۔

تیسرا قبیلہ، بنی قریظہ کا تھا جنہیں حضورؐ نے امان دیتے ہوئے مدینہ میں رہنے کی اجازت دی۔ انہیں مدینہ سے نہیں نکالا، بلکہ ان سے یہ معاہدہ کیا کہ وہ جنگِ خندق میں اپنے محلوں سے دشمن کو مدینہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے، لیکن انہوں نے احسان فراموشی کا ثبوت دیتے ہوئے سرور کائنات ﷺ پر حملہ کے لیے دشمن سے معاہدہ کر لیا اور آپؐ سے کیے گئے معاہدے پر باقی نہ رہے۔ مدینہ کے ایک حصّہ میں رسول اکرم ﷺ نے مدینہ کی حفاظت کے لیے خندق کھدوائی تھی اور دوسری جانب اِن یہودیوں کا محلہ تھا جہاں سے دشمن کو روکنا ان کے ذمے لگایا تھا، لیکن ان خیانت کاروں نے معاہدے پر عمل کے بجائے، پیٹھ پر خنجر مارنا چاہا اور دشمن کے ساتھ مل کر سازش کر لی کہ ایک ساتھ مدینہ میں داخل ہو کر مسلمانوں پر حملہ کریں گے۔ مگر ان کی یہ سازش مخفی نہ رہ پائی۔ اس سازش کے آشکار ہونے تک مدینہ کے محاصرہ کو تقریباً ایک مہینہ گزر چکا تھا۔

رسول اکرم ﷺ نے ان کی اس ناپاک سازش کا مقابلہ اپنی حکیمانہ تدبیر سے کیا، جس

کی بنیاد پر خود قریش اور ان یہودیوں کا ایک دوسرے سے اعتماد اُٹھ گیا اور ان کی ساری سازشیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ یہ پورا ماجرا تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبردست جنگی تدبیر اور سیاسی فراست کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ آپؐ نے انہیں یہیں روکے رکھا تاکہ کوئی نقصان نہ پہنچائیں، جب قریش اور ان کے حلیفوں کو شکستِ فاش ہوگئی اور وہ خندق کے آس پاس سے مکہ کی طرف واپس پلٹ گئے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ کے اندر مسجد میں نمازِ ظہر ادا کرنے کے بعد فرمایا کہ نمازِ عصر بنی قریظہ کے قلعوں کے سامنے پڑھی جائے گی، سب مسلمان وہاں چلیں۔ ایک شب کا بھی وقفہ کیے بغیر آپؐ نے مسلمانانِ مدینہ کے ہمراہ بنی قریظہ کو محاصرہ میں لے لیا۔ پچیس دن تک محاصرہ اور مقابلہ جاری رہا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے ان کے سپاہیوں کو قتل کر دیا گیا کیونکہ ان کی خیانتیں آشکار تھیں اور قابلِ اصلاح نہ تھیں۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ساتھ یہ رویّہ اختیار کیا اور اسلام و مسلمین کے سر سے بنی قریظہ، بنی نضیر اور خیبر کے یہودیوں کی دشمنی کا آسیب اعلیٰ انسانی اخلاق کے ساتھ، قدرت، حکمت اور تدبیر کے ذریعے دور کر دیا۔ اِن تمام واقعات میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی ایک مقام پر بھی معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کی۔ دشمن بھی اس بات کے معترف ہیں کہ معاہدہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں بلکہ خود یہودیوں نے توڑا تھا۔

چوتھے دشمن، منافقین تھے۔ یہ لوگ عوام کے درمیان رہتے تھے، زبانی طور پر تو ایمان کا اقرار کیا کرتے تھے مگر ان کے دل ایمان سے خالی تھے۔ یہ انتہائی پست، کینہ پرور، تنگ نظر اور دشمن کا ساتھ دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہنے والے افراد تھے۔ یہودیوں اور منافقوں میں ایک بڑا فرق یہ تھا کہ منافقین کی اسلام دشمنی منصوبہ بندی کے ساتھ نہیں تھی۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حملہ کی تاک میں رہنے والے منصوبہ ساز دشمن کو امان نہیں دیتے تھے اور اس کے ساتھ وہ رویّہ اختیار کرتے تھے جو آپؐ نے یہودیوں کے ساتھ اختیار کیا، لیکن جو دشمن منصوبہ بندی نہیں کرتے تھے اور جن کی بے ایمانی، خباثت اور ہٹ دھرمی انفرادی تھی، نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں برداشت کر لیا کرتے تھے۔

عبد اللہ ابن اُبَی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ تقریباً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے آخری سال تک زندہ رہا، لیکن آپؐ نے اس کے ساتھ سخت رویّہ اختیار نہیں کیا۔ سب مسلمان جانتے تھے کہ وہ منافق ہے، اِس کے باوجود آپؐ نے اس کے ساتھ دیگر مسلمانوں جیسا ہی سلوک روا رکھا، ہمیشہ بیت المال سے اس کے حقوق ادا کیے اور اس کی جان و مال کو محفوظ رکھا جبکہ اس جیسے منافقین اپنی خباثتوں سے باز نہیں آتے تھے اور سورۂ بقرہ کا ایک حصّہ انہیں کی مذمت میں نازل ہوا ہے۔

جب بھی منافقین کے کسی گروہ نے منصوبہ بندی کے ساتھ تحریک شروع کی، تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اس کا مقابلہ کیا۔ ایک مرتبہ ان لوگوں نے منافقانہ سازشوں کے لیے ضرار نامی مسجد کو مرکز بنایا۔ اسلامی حکومت سے باہر روم کے قلمرو میں موجود ابو عامر راہب جیسے شخص سے رابطہ برقرار کیا تاکہ رومیوں کے ذریعہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر لشکر کشی کی جائے۔ اس منصوبہ بندی کے ساتھ کی جانے والی دشمنی کا مقابلہ کرنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجدِ ضرار منہدم کرا دی اور فرمایا کہ یہ عمارت مسجد نہیں، بلکہ یہ اللہ اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا گڑھ ہے۔

اسی طرح منافقین کے ایک گروہ نے اپنے کفر کا اظہار کرتے ہوئے مدینہ منورہ سے باہر ایک لشکر تیار کر لیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا مقابلہ کیا اور فرمایا کہ اگر وہ نزدیک آئیں گے تو ان کے ساتھ جنگ کی جائے گی۔ خود مدینہ منورہ میں بھی منافقین موجود تھے لیکن اللہ کے رسولؐ نے منصوبہ ساز دشمنوں کی طرح ان کے ساتھ سلوک نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے آپؐ نے منصوبہ ساز منافقین کے مقابلے میں سخت رویّہ اختیار کیا، لیکن دیگر منافقین کے ساتھ نرم سلوک روا رکھا کیونکہ ان کا خطرہ انفرادی تھا۔ اکثر و بیشتر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے نیک سلوک کے ذریعہ انہیں شرمندہ ہونے پر مجبور کر دیتے تھے۔

پانچواں دشمن وہ تھا، جو ہر مسلمان اور مومن کے باطن میں موجود تھا اور یہی دشمن سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ دشمن ہمارے اندر بھی موجود ہے۔ نفسانی خواہشات، خود غرضی، ضلالت و گمراہی کی طرف رجحان اور ایسی لغزشیں جن کا سبب خود انسان فراہم کرتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس دشمن کا بھی زبردست مقابلہ کیا۔ اس دشمن سے

مقابلے کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس مقابلے میں شمشیر اور تیر و تبر سے کام نہیں لیا جاتا، بلکہ تعلیم و تربیت، تزکیہ نفس اور خوفِ الٰہی کے اسلحوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ مسلمان لشکر سخت جنگ کرکے لوٹا تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”مرحبا ہو تم پر کہ تم لوگوں نے جہادِ اصغر تو سر کر لیا اور اب جہادِ اکبر باقی رہ گیا ہے۔“ سب کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس سے بڑا کونسا جہاد ہو سکتا ہے؟ لہٰذا پوچھا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! جہادِ اکبر کیا ہے؟ ہم نے اتنی سخت جنگ لڑی، بڑی زحمتیں اُٹھائیں، صعوبتیں جھیلیں، مصیبتیں برداشت کیں، اب اس سے بڑھ کر جہاد کیا ہو سکتا ہے؟! آپؐ نے فرمایا: ”وہ ہے نفس کے ساتھ جہاد“[1] جب قرآن میں ارشادِ الٰہی ہوتا ہے: ''اَلَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ''[2] تو اِس آیت میں جن کے دلوں میں مرض بتایا گیا ہے وہ سب کے سب منافق نہیں ہیں، بلکہ یوں کہا جائے تو بہتر ہے کہ منافقین بھی اس آیت کے مصداق ہیں، یعنی عین ممکن ہے کہ ایک شخص منافق نہیں، بلکہ مومن ہے مگر اس کے دل میں ”مرض“ پایا جاتا ہو۔ یہ کون سا مرض ہے؟ یہ کیسی بیماری ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اخلاقی اور کردار کی کمزوریاں، نفسانی خواہشیں اور مختلف قسم کی خود غرضیاں ہیں کہ اگر ان سے پرہیز نہ کیا گیا اور ان کا مقابلہ نہ کیا گیا تو انسان ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا ظاہر تو مومنوں جیسا ہو گا لیکن دل ایمان سے خالی ہو گا اور اسی کو اسلام کی اصطلاح میں ''منافق'' کہا جاتا ہے۔

اگر خدانخواستہ ہمارا اور آپ کا دل ایمان سے خالی ہو جائے، جبکہ ظاہری شکل و شمائل مومنوں جیسے ہوں، اگر ہم کردارِ ایمانی اور اعتقادی حدود سے تجاوز کر جائیں، جبکہ ہماری زبانیں حسبِ سابق مومنوں جیسی باتیں کر رہی ہوں، تو یہی نفاق ہے۔ یہ ایک اسلامی معاشرے کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ قرآن کریم میں اِس سلسلے میں ارشادِ الٰہی ہوتا ہے:

---

[1] ''مَرْحَباً بِقَوْمٍ قَضَوُا الْجِهَادَ الْأَصْغَرَ وَ بَقِيَ عَلَيْهِمُ الْجِهَادُ الْأَكْبَرُ قِيْلَ: يَا رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! وَ مَا الْجِهَادُ الْأَكْبَرُ؟ قَالَ: جِهَادُ النَّفْسِ'' (وسائل الشیعہ، ج۱۱، ص۱۱۲)

[2] سورہ توبہ، آیت۱۲۵

''ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِينَ أَسَآؤُوا السُّوٓآی أَن كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللّٰهِ وَكَانُوا بِهَا يَسْتَهْزِؤُونَ''[1]

اس کے بعد بُرائی کرنے والوں کا انجام بُرا ہو۔ وہ بُرا کیا ہے؟ وہ خدا کی نشانیوں کا جھٹلانا ہے۔ ایک اور مقام پر ان لوگوں کے متعلق جنہوں نے اس عظیم فریضے (اللہ کی راہ میں خرچ) پر عمل نہیں کیا، ارشاد ہوتا ہے:

''فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقاً فِي قُلُوبِهِمْ إِلَى يَوْمِ يَلْقَوْنَهُ بِمَآ أَخْلَفُواْ اللّٰهَ مَا وَعَدُوهُ وَبِمَا كَانُواْ يَكْذِبُونَ''[2]

جن لوگوں نے اس عظیم ذمہ داری (راہِ خدا میں انفاق) پر عمل نہیں کیا، انہوں نے خدا کے ساتھ وعدہ خلافی کی ہے اس لیے ان کے دل میں نفاق پیدا ہو گیا۔ اسلامی معاشرے کے لیے یہ ایک انتہائی خطرناک چیز ہے۔ آپ تاریخ اُٹھا کر دیکھیں، اسلامی معاشرے میں جو انحراف پیدا ہوا اس کی وجہ نفاق ہے۔ ممکن ہے کہ ایک مرتبہ باہر سے کوئی دشمن حملہ آور ہو جائے اور وہ شکست دے، مار دھاڑ کر دے لیکن وہ نابود نہیں کر سکتا، کیونکہ ایمان اپنی جگہ باقی رہتا ہے اور کسی نہ کسی موقع پر سر اُبھار لیتا ہے اور دوبارہ ایمان کا شجر سرسبز و شاداب ہوجاتا ہے۔ لیکن اگر کبھی یہ اندرونی دشمن حملہ آور ہو جائے تو وہ انسان کے دل کو ایمان کے نور سے خالی کر دیتا ہے اور اسے غلط راستے پر ڈال دیتا ہے۔ پس جہاں کہیں بھی انحراف دکھائی دے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کے پیچھے نفاق کار فرما ہے۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں اس دشمن کا بھی مقابلہ کیا ہے۔

---

[1] ۱ ۔ پھر اس کے بعد برائی کرنے والوں کا انجام برا ہی ہوا کہ انہوں نے خدا کی نشانیوں کو جھٹلایا اور وہ مسلسل خدا کی نشانیوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ (سورہ روم، آیت۱۰)

[2] ۲ ۔ تو (ان کے بخل نے) ان کے دلوں میں نفاق راسخ کردیا اس دن تک کے لئے جب وہ خدا سے ملاقات کریں گے اس وجہ سے کہ انہوں نے خدا سے کئے ہوئے اپنے وعدہ کی خلاف ورزی کی اور وہ مسلسل جھوٹ بولتے رہے۔ (سورہ توبہ، آیت۷۷)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کے پہلو

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ تدبّر اور غور و فکر کے بعد کوئی کام کرتے تھے اور ہر کام کو بروقت انجام دیتے اور کسی بھی کام کا وقت گزرنے نہیں دیتے تھے۔ انفرادی لحاظ سے آپؐ قناعت پسند اور پاک و پاکیزہ طبیعت کے مالک تھے، آپؐ کی شخصیت میں کسی بھی قسم کی کمزوری کا کوئی پہلو نہیں پایا جاتا تھا۔ آپؐ پاک و صاف اور عصمت کے مالک تھے؛ یہ چیز خود ہی معاشرے پر اثر انداز ہونے کا ایک بہترین سبب ہے۔ عمل زبان سے کہیں زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ آپؐ ہمیشہ صاف صاف بات کیا کرتے تھے اور کبھی دوغلی باتیں نہیں کرتے تھے۔ لیکن جب کبھی دشمن سے واسطہ پڑتا تھا تو ایسی سیاست سے کام لیتے کہ دشمن آپؐ کی تدبیر سے دھوکہ کھا جاتا تھا۔ چاہے سیاسی اعتبار سے ہو یا دفاعی لحاظ سے۔ آپؐ نے متعدد بار دشمن کو دھوکہ کھانے پر مجبور کر دیا۔ لیکن مسلمانوں اور عام لوگوں کے ساتھ سیدھی سیدھی بات کرتے تھے کبھی مبہم بات نہیں کرتے تھے اور بوقتِ ضرورت انتہائی نرمی کا بھی بھرپور مظاہرہ کرتے تھے؛ جیسا کہ عبد اللہ ابن اُبَی کے واقعے میں اس کا ذکر ملتا ہے جو کہ ایک تفصیلی واقعہ ہے۔ آپؐ جب کسی کے ساتھ کوئی وعدہ کرتے تو پھر ہرگز وعدہ خلافی نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اپنے دشمنوں اور کفارِ مکہ کے ساتھ بھی جو وعدے کیے انہیں نہیں توڑا، یہی وجہ ہے کہ سب لوگ جانتے تھے کہ اگر اس شخص کے ساتھ کوئی معاہدہ کیا جائے تو اس پر عمل درآمد ضرور ہوگا۔

دوسری طرف آپؐ نے اپنے پروردگار کے ساتھ راز ونیاز کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہونے دیا۔ بلکہ آپؐ ہر دن اپنے ربّ کے ساتھ اپنے رابطے کو مضبوط اور مستحکم کرتے رہے۔ یہاں تک کہ میدانِ جنگ کے عین وسط میں جب آپؐ اپنے سپاہیوں کو جنگی ہدایات دیتے اور انہیں جنگ کے لیے تیار کر رہے ہوتے تھے اور خود بھی اپنے ہاتھ میں تلوار لیے ہوئے ہوتے تھے، تو اچانک زانو کے بل زمین پر بیٹھ جاتے اور اپنے دونوں ہاتھوں کو اُٹھا کر چہرۂ اقدس کا رُخ آسمان کی طرف کرکے آنکھوں سے آنسو بہاتے ہوئے اپنے پروردگار کے حضور گڑگڑا کر یوں دعا مانگتے تھے: ”اے میرے پروردگار! ہماری مدد فرما، اے میرے اللہ! اپنے دشمنوں کے مقابلے میں ہمیں نصرت

و کامیابی عطا فرما۔"

یعنی نہ تو آپؐ کا اپنے پروردگار کے حضور گڑگڑانا اِس بات کا سبب بنتا تھا کہ آپؐ افرادی طاقت کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیتے اور نہ یہ افرادی طاقت پروردگار کے حضور گریہ و زاری میں رکاوٹ بنتی تھی، بلکہ بیک وقت آپؐ کی توجہ دونوں اُمور پر مرکوز ہوتی تھی۔ آپؐ کبھی دشمن سے خوفزدہ نہیں ہوتے تھے۔ امیر المومنین امام علیؑ (جو خود بھی بےمثال شجاعت اور بہادری کے عظیم مظہر تھے) فرماتے ہیں کہ دورانِ جنگ جب کبھی کوئی مشکل پیش آتی یا ہم دباؤ کا شکار ہوتے تو آپؐ کے دامن میں پناہ لیتے تھے۔ یعنی جب کوئی کسی مشکل میں پھنس جاتا تو آپؐ ہی کے دامنِ عافیت میں پناہ لیتا تھا۔

حضور اکرمﷺ نے دس سال حکومت کی، ان دس برسوں میں آپؐ نے جو کام انجام دیا، اگر انتہائی تیز ترین کام کرنے والے ایک گروہ کے حوالے کیا جائے تو وہ سو (۱۰۰) سالوں میں بھی اتنا کام نہیں کر سکتا، جتنا کام آپؐ نے اِن دس برسوں کے دوران انجام دیا۔ آج کے دور میں اگر ہم اپنے اُمور کا پیغمبر اکرمﷺ کے کاموں کے ساتھ موازنہ کریں تو بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ آپؐ نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ایک ایسی حکومت کی سربراہی، ایک ایسے معاشرے کی تشکیل، یعنی ایک ایسے رول ماڈل کا وجود میں لانا بذات خود آپؐ کے معجزات میں سے ہے۔

دس برسوں تک لوگوں نے شب و روز آپؐ کے ساتھ زندگی گزاری ہے، لوگ آپؐ کے گھر پر جاتے تھے اور آپؐ بھی لوگوں کے گھر تشریف لے جاتے تھے، مسجد میں ساتھ ساتھ ہوتے تھے، راستے میں ایک ساتھ چلتے تھے، ایک ساتھ سفر پر جایا کرتے تھے، ایک ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھے، ایک ساتھ بھوک اور پیاس کی تکلیفیں جھیلتے تھے، ایک ساتھ خوشی غمی میں شریک ہوتے تھے، آپؐ لوگوں کے ساتھ مذاق بھی کیا کرتے تھے، لوگوں کے درمیان کھیلوں کے مقابلے رکھواتے تھے اور خود بھی اِن مقابلوں میں شریک ہوتے تھے۔ جن لوگوں نے دس برس تک آپؐ کے ساتھ زندگی گزاری تھی ان کے دلوں میں ہر گزرتے دن کے ساتھ آپؐ کی محبت میں اضافہ اور آپؐ پر ایمان و اعتقاد

بڑھتا جاتا تھا۔ فتح مکہ کے دوران جب ابوسفیان حضرت عباس (حضور اکرم ﷺ کے چچا) کی مدد سے خفیہ طور پر آپؐ کی خدمت میں پہنچا تاکہ امان حاصل کرسکے، تو اُس نے بہ وقت فجر دیکھا کہ آپؐ وضو کر رہے ہیں جبکہ صحابہ کرام آپؐ کے گرد جمع ہیں تاکہ آپؐ کے وضو کے پانی کو گرنے سے پہلے ہاتھوں میں لینے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے سکیں۔ یہ دیکھ کر ابوسفیان نے کہا: میں نے قیصر و کسریٰ جیسے دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں کو دیکھا ہے لیکن کسی کی بھی اتنی عزت میں نے نہیں دیکھی۔ جی ہاں معنوی عزت ہی حقیقی عزت ہوا کرتی ہے۔ ''وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ''[1] مومنین بھی اگر اسی راہ پر چلیں تو عزت پا سکتے ہیں۔

(۱۸/۰۵/۲۰۰۱ء)

اسلامی نظام کا استحکام

غدیرِ خم کا واقعہ انتہائی اہم اور تاریخِ اسلام کا ایک سنہرا باب ہے۔ اِس واقعے کا دو پہلوؤں سے جائزہ لیا جا سکتا ہے، ان میں سے ایک پہلو کا تعلق اہلِ تشیع سے ہے، جبکہ دوسرے پہلو کا تعلق تمام اسلامی فرقوں سے ہے۔ لہٰذا اِس دوسرے پہلو کی روشنی میں تمام مسلمانوں کے دلوں میں اس احساس کا جاگنا ضروری ہے کہ عیدِ غدیر جو اس عظیم واقعے کی یاد دلاتی ہے اِس کا تعلق صرف اہلِ تشیع سے نہیں ہے۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ اس واقعے کا ایک پہلو اہلِ تشیع سے مخصوص ہے کیونکہ ان (اہلِ تشیع) کے عقیدے کے مطابق اس واقعے میں امیر المومنین امام علی علیہ السلام، حضور اکرم ﷺ کے توسط سے منصبِ امامت و خلافت پر فائز ہوئے اور اسی روز اور اسی واقعے کے دوران جب لوگوں نے آپؐ سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ آپؐ کا اعلان ہے یا اللہ تبارک و تعالیٰ کی جانب سے ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: ''مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ''[2] یعنی یہ حکم، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ دونوں کی طرف سے ہے۔ لہٰذا اِس لحاظ سے اہلِ تشیع

---

[1] ۔ ساری عزت تو اللہ، اس کے رسولؐ اور صاحبانِ ایمان کے لیے ہے۔ (سورہ منافقون، آیت۸)

[2] ۔ الاحتجاج علی اہل اللجاج، طبرسی، ج۱، ص۸۲

اس واقعے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق حضرت علی علیہ السلام کی خلافتِ بلافصل پر یہ سب سے بڑی دلیل ہے۔

اس واقعے کے استدلال اور استنباط پر تاریخ اسلام میں اب تک بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لہٰذا جس موضوع پر ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہوں اور ہزاروں مطالب بیان کیے گئے ہوں میں ان میں مزید کسی چیز کا اضافہ کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن اِس واقعے کا دوسرا پہلو جس کی اہمیت کسی بھی لحاظ سے اس کے پہلے پہلو سے کم نہیں ہے بلکہ شیعہ اور سنی دونوں فرقوں کے درمیان ایک مشترک امر ہے، میں اسے قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہوں۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ سال ۱۰ ہجری کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے آپؐ کے ہمراہ مدینہ منورہ اور جزیرۃ العرب کے دیگر علاقوں سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ حج بیت اللہ کے اِس سفر کے دوران حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات سے لے کر سیاسی اُمور، جنگی معاملات، اخلاقی، اعتقادی اور دیگر مسائل سے روشناس کرتے رہے۔ اِس موقعہ پر آپؐ سے منیٰ میں دو خطبے نقل ہوئے ہیں؛ ان میں سے ایک خطبہ آپؐ نے ۱۰ ذی الحجہ (عید الاضحیٰ) یا انہیں دنوں میں دیا؛ جبکہ دوسرا خطبہ ایامِ تشریق[۱] کے آخر میں دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں خطبے الگ الگ ہیں اور ایک نہیں ہیں۔ ان دونوں خطبات میں آپؐ نے تقریباً ان تمام اہم مطالب کو بیان فرمایا ہے جن پر مسلمانوں کو توجہ دینا بہت ضروری ہے۔ ان میں سے زیادہ تر مسائل کا تعلق سیاسی اُمور سے ہے۔ یہاں سے انسان بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ عالمِ اسلام میں آج بھی جو لوگ حج کو سیاسی معاملات سے الگ سمجھتے ہوئے اسے صرف نمازوں اور دعاؤں پر مشتمل ایک عام عبادت سمجھتے ہیں، وہ کس قدر اسلامی تعلیمات اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ طیّبہ سے لاعلم ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ان خطبات میں جن اُمور کی نشاندہی کی ہے وہ فریقین کی

---

[۱] ۔ ’’شرق‘‘ کا معنی واضح کرنا، مشرق کی طرف توجہ کرنا ہے، ایامِ تشریق ماہ ذی الحجہ کی ۱۱ تا ۱۳ تاریخ کو کہتے ہیں، جسے قرآن مجید نے ’’أَيَّامٍ مَعْدُوْدَاتٍ‘‘ کے نام سے یاد کیا ہے۔ (سورہ بقرہ، آیت ۲۰۳)

کتابوں میں موجود ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ سب سے پہلے آپؐ نے جہاد کے بارے میں گفتگو فرمائی اور کفار و مشرکین کے ساتھ جہاد کی اہمیت سے آگاہ کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ جہاد کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک پوری دنیا میں کلمہ ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' کی آواز نہیں گونج جاتی۔

اِس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کے درمیان اتحاد اور اتفاق کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے انہیں آپس میں لڑنے جھگڑنے سے منع فرمایا اور مسلمانوں کی وحدت پر زور دیا۔ آپؐ نے زمانۂ جاہلیت کے امتیازات کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے واضح کر دیا کہ اسلام کی نظر میں ان امتیازات کی کوئی حیثیت نہیں ہے، آپؐ نے فرمایا: ''أَلَا وَكُلُّ مَأْثُرَةٍ فِي الْجَاهِلِيَّةِ تَحْتَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ'' آگاہ ہو جاؤ! زمانہ جاہلیت کی تمام قدریں (اور امتیازات خیال کی جانے والی چیزیں) آج میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ یعنی آپؐ نے زمانۂ جاہلیت کے تمام امتیازات اور قدروں کی کلی طور پر نفی فرمائی۔ آپس کے لین دین کے حوالے سے زمانۂ جاہلیت کے جو قوانین مسلمانوں کے درمیان اب تک رائج تھے مثلاً اگر کوئی شخص کسی کو قرض دیتا تھا تو بعد میں اسے سُود سمیت وصول کرتا تھا، آپؐ نے اس قانون کو ختم کرتے ہوئے اعلان کیا کہ: ''أَلَا وَكُلُّ رِبًا فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَهُوَ تَحْتَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ''[۱] سب سے پہلے میں جس منافع کو ختم کر رہا ہوں، سب سے پہلے میں جس سُود کے حکم کو نسخ کر رہا ہوں وہ میرے چچا عباس کا دیا ہوا سُودی قرضہ ہے (کیونکہ وہ زمانۂ جاہلیت میں سُودی قرضہ دیتے تھے اور بہت سے لوگوں سے اس کے طلبگار تھے)۔ آپؐ نے فرمایا: آج میں نے اسے ختم اور نسخ کر دیا ہے۔

آپؐ نے اسلام کی نظر میں تقویٰ کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ایک بار پھر ارشاد فرمایا کہ سوائے تقویٰ اور پرہیزگاری کے کسی شخص کو دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ ائمۃ المسلمین یعنی مسلمانوں کے پیشواؤں اور راہنماؤں کی دینی اور سیاسی مسائل میں دلچسپی اور ان کی اصلاح کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے، اسے ایک واجب عمل قرار دیا اور یہ اعلان فرمایا کہ یہ تمام مسلمانوں کی شرعی ذمہ داری ہے کہ وہ

---

[۱] آگاہ ہو جاؤ! زمانۂ جاہلیت کا ہر قسم کا سُود آج میرے قدموں تلے ہے۔ (سیرۃ النبویہ، ج۲، ص۴۱۲)

اسلامی مملکت کے حکمرانوں کو اپنے نیک مشوروں سے آگاہ کرتے رہیں۔

آپؐ نے اِن خطبات میں عالمِ اسلام کو درپیش اہم سیاسی اور اجتماعی مسائل بیان کیے اور انہیں میں سے ایک حدیث ''ثقلین'' بھی ہے۔ جس میں آپؐ نے فرمایا: میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ''کِتَابَ اللهِ وَ عِتْرَتِی'' وہ گراں قدر چیزیں اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن مجید) اور میری عترت (یعنی میرے اہل بیتؑ) ہیں۔ یہ کہتے ہوئے آپؐ نے اپنے دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیوں کو آپس میں نزدیک کرتے اور ملاتے ہوئے فرمایا: یہ دونوں (یعنی قرآن و عترت) اِن دونوں کی طرح ہیں، یعنی جس طرح دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیوں میں کوئی فرق نہیں ہے، اسی طرح قرآن و عترت میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے ہاتھ اُٹھا کر شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی کو آپس میں ملاتے ہوئے فرمایا: یہ دونوں اِن دو انگلیوں کی طرح نہیں ہیں کہ جن میں سے ایک بڑی اور دوسری چھوٹی ہے۔ پس تم اِن دونوں سے متمسک رہو۔۔۔[1]

آپؐ نے عترت کی اہمیت بیان فرمائی اور فریضۂ حج کی انجام دہی کے فوراً بعد مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ دورانِ سفر غدیر خُم نامی ایک ایسے سہ راہے پر آپؐ رُک گئے جہاں سے مدینہ منورہ اور یمن کا راستہ جدا ہوتا تھا۔ راویوں نے لکھا ہے کہ اس وقت موسم اتنا گرم تھا کہ اگر گوشت کا کوئی ٹکڑا زمین پر رکھ دیا جاتا تو کباب بن جاتا۔ ایک ایسی کیفیت میں حضور اکرم ﷺ ایک اونچی جگہ تشریف فرما ہو جاتے ہیں تاکہ تمام لوگ آہستہ آہستہ جمع ہو سکیں اور جب آپؐ نے دیکھا کہ تمام لوگ جمع ہو گئے ہیں تو آپؐ نے ''مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهَذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ''[2] کا اعلان فرمایا اور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کا ہاتھ پکڑ کر اتنا بلند کیا کہ سارے لوگ دیکھ سکیں۔ متعدّد روایات میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے لوگوں کو دکھانے کے لیے حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ کو اتنا بلند کیا کہ دونوں

---

[1] ''إِنِّی قَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِی مَا إِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا، كِتَابَ اللهِ وَ عِتْرَتِی أَهْلَ بَيْتِی فَإِنَّ اللَّطِيفَ الْخَبِيرَ قَدْ عَهِدَ إِلَيَّ أَنَّهُمَا لَنْ يَفْتَرِقَا حَتَّى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ كَهَاتَيْنِ وَ جَمَعَ بَيْنَ مُسَبِّحَتَيْهِ وَ لَا أَقُولُ كَهَاتَيْنِ وَ جَمَعَ بَيْنَ الْمُسَبِّحَةِ وَ الْوُسْطَى فَتَسْبِقَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى فَتَمَسَّكُوا بِهِمَا لَا تَزِلُّوا وَ لَا تَضِلُّوا وَ لَا تَقَدَّمُوهُمْ فَتَضِلُّوا'' (الکافی، ج۲، ص۴۱۵)

[2] جس جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ مولا ہے۔ (کافی، ج۱، ص۴۲۰)

کی بغل کی سفیدی نظر آنے لگی۔ یہ اس واقعہ کا اجمالی پہلو ہے۔

اِس واقعے کا دوسرا پہلو جو میرے پیشِ نظر ہے (اس کا تعلق بین الاقوامی اسلامی اور بین الفِرَق اسلامی کی جہت سے ہے۔ جو صرف اہلِ تشیع سے مخصوص نہیں ہے) وہ پہلو یہ ہے کہ فرض کیجئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اِس اعلان میں، جو کہ یقیناً ہوا تھا اور یہ جملہ آپؐ کی زبانِ مبارک سے جاری ہوا تھا اگر بالفرض حضرت علی علیہ السلام کی خلافتِ بلافصل کا اعلان نہیں کیا تھا، تب بھی کم از کم اتنا تو ثابت ہے کہ آپؐ نے تمام مسلمانوں کو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اور اپنی عترتِ طاہرہؑ کے ساتھ دوستی اور محبت کا حکم دیا ہے اور اس لیے آپؐ نے اپنی عترتِ طاہرہؑ کو قرآن مجید کے ساتھ ساتھ قرار دیا ہے۔ آپؐ اپنے ''منیٰ'' کے خطبے میں اور حدیثِ ثقلین میں بھی (کہ حدیثِ ثقلین کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ظاہراً متعدّد بار بیان فرمایا ہے) اور اسی طرح حدیثِ غدیر اور واقعۂ غدیر میں بھی امیر المومنین علی علیہ السلام کی شخصیت کا تعارف کراتے ہیں۔ اس تاکید کی بنیادی وجہ ہی یہ ہے کہ مسلمان اہل بیت علیہم السلام کے ساتھ اپنا تعلق برقرار رکھیں۔ کیونکہ ہر زمانے میں انسانوں کو ایک کامل نمونے کی ضرورت ہے، اس لیے آپؐ چاہتے تھے کہ دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے آئندہ آنے والی نسلوں اور تمام مسلمانوں کے سامنے ایک انسانِ کامل کو مجسم صورت میں لوگوں کے سپرد کرکے جائیں تاکہ لوگوں سے یہ کہہ سکیں کہ اسلامی تربیت کے لیے ان کی طرف رجوع کریں، یعنی ایک مسلمان کو چاہیے کہ ایسی شخصیات کو اپنے لیے نمونہ عمل قرار دے جن کی طہارت اور پاکیزگی، جن کا علم، زُہد و تقویٰ، جن کے نیک اعمال، جن کی اللہ کے حضور عبادت، مسلمانوں کو درپیش مسائل سے جن کی آگاہی، جن کی قربانیاں، جن کی شجاعت اور بہادری کے بےمثال کارنامے اور اسی طرح اسلام کی خاطر اپنی جان پر کھیلنے کا عملی اظہار سب کے سامنے واضح ہو۔ یعنی آپؐ، امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو ایک رول ماڈل اور نمونے کے طور پر تمام مسلمانوں کے سامنے متعارف کراتے ہیں۔ وہ مسلمان چاہے اُس دور کے ہوں یا آئندہ آنے والے ہوں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ حضرت امیر المومنین امام علی علیہ السلام کے ساتھ اپنا تعلق جوڑے رکھیں۔ اب ہوا یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد عملی طور پر امیر المومنین امام علی علیہ السلام خلیفہ بلافصل نہیں بن سکے، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے پچیس سال بعد آپؑ خلیفہ و جانشین

بنے۔ پھر بھی آپؑ کے خلیفہ و جانشین بن تو گئے، یعنی آپؑ کا مقام امامت ثابت ہو کر رہا۔ آخر کار تمام مسلمانوں نے آپؑ کو اپنا حاکم اور پیشوا تسلیم کر ہی لیا۔ آپؑ کی یہی خصوصیت، یہی تعلق کہ جسے تمام مسلمان اپنا حاکم و سربراہ اور خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مانتے ہیں (ہاں البتہ شیعہ آپؑ کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلیفۂ بلافصل مانتے ہیں جبکہ بعض لوگ پچیس سال بعد خلیفہ تسلیم کرتے ہیں) اور ایک ایسی شخصیت کہ جسے تمام مسلمان جانشینِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مانتے ہوں، اُس کو تمام مسلمانوں کے لیے ایک کامل نمونہ اور رول ماڈل کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ اور باقی رہنا چاہیے۔ اسی طرح اُس کے اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان رابطے اور تعلقات بھی ہمیشہ قائم و دائم رہنے چاہئیں اور فکری، روحانی اور نظریاتی تعلقات کا تسلسل بھی قائم رہنا چاہیے۔

پس اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو امیر المومنین امام علی علیہ السلام کا تعلق صرف اہلِ تشیع سے نہیں، بلکہ آپؑ کا تعلق تمام مسلمانوں سے ہے، اسی طرح صرف امیر المومنین امام علی علیہ السلام ہی نہیں، بلکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سارے اہل بیتؑ اور ائمہ معصومین علیہم السلام جو امیر المومنین امام علی علیہ السلام کی اولاد ہیں، سب عترتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونے کے ناطے تمام مسلمانوں کے لیے انسانِ کامل کی حیثیت سے نمونۂ عمل ہیں۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن مجید اور اہل بیت علیہم السلام کے باہمی تعلق اور مسلمانوں اور عترت کے درمیان باہمی رابطے کو بیان فرما کر درحقیقت تحریفِ قرآن اور قرآن کے اصلی مفاہیم سے انحراف و دوری کے مسئلے سے بھی لوگوں کو آگاہ کر دیا ہے۔

کیونکہ جس معاشرے میں حکومتی اہل کار اپنی طاقت اور دولت کے بل بوتے پر اپنے مفادات حاصل کرنے کے لیے اسلامی تعلیمات اور قرآنی مفاہیم میں ردّ و بدل کرتے ہوں، مسلمانوں کو گمراہ اور مسلمانوں کے صحیح اسلامی احکامات اور تعلیمات سیکھنے اور سمجھنے کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہوں، وہاں مسلمانوں کو حقیقت سے باخبر رکھنے کے لیے ایک مرجع اور مرکز کا ہونا ضروری ہے کہ جو لوگوں کو بتائے کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ؟ تاکہ لوگوں کو گمراہی سے بچایا جا سکے اور یہ مرجع اور مرکز، اہل بیت علیہم السلام ہی ہیں۔

یہ وہ بات ہے کہ جسے دنیا کو آج سمجھنے کی ضرورت ہے۔ آج تمام مسلمان اِس بات کے محتاج ہیں کہ وہ اسلامی معارف کو اہل بیتؑ سے حاصل کریں، اُن کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ امیر المومنین علیؑ کے خلیفہ بلا فصل یا دیگر اماموں کی امامت کے قائل ہوں یا نہ ہوں۔ البتہ اہلِ تشیع اس حدیث (حدیثِ ثقلین) سے قطعی استفادہ کرتے ہوئے امیر المومنین امام علیؑ کے خلیفۂ بلافصل ہونے پر مکمل ایمان رکھتے ہیں، لیکن جو مسلمان امام علیؑ کو خلیفۂ بلافصل نہیں مانتے (یعنی برادران اہلِ سنت) انہیں بھی امام علیؑ اور دیگر ائمہ اہل بیتؑ سے اپنے فکری، عقیدتی اور شعوری رشتے کو ختم نہیں کرنا چاہیے۔ پس اِس پہلو کی روشنی میں غدیر کا واقعہ امیر المومنین امام علیؑ اور دیگر ائمہ طاہرینؑ کا تمام مسلمان فرقوں کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کا باعث اور تمام مسلمانوں سے متعلق ہے۔

(۱۴/۰۸/۱۹۸۷ء)

واقعۂ غدیر محض ایک تاریخی واقعہ نہیں۔ بلکہ یہ اسلام کی جامعیت کی ایک علامت ہے۔ اگر پیغمبر اسلامﷺ نے دس سال کے عرصے میں اپنی اور اپنے باوفا اصحاب کی انتھک کاوشوں اور کوششوں سے ایک بالکل ابتدائی اور تعصُّبات و خرافات سے آلودہ معاشرے کو ایک ترقی یافتہ اور مہذّب سماج میں تبدیل کر دینے کے بعد، اُمت کے سامنے اپنی رحلت کے بعد کے لیے کوئی منصوبہ اور نصب العین پیش نہ کیا ہوتا تو پیغمبر اسلامﷺ کا کام ناقص رہ جاتا۔ چونکہ زمانۂ جاہلیت کے تعصُّبات کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ ان کی بیخ کنی کے لیے ایک طویل مدت درکار تھی۔ ظاہری اعتبار سے سب ٹھیک ٹھاک تھا؛ لوگوں کا ایمان بھی مضبوط تھا۔ البتہ سب کا ایمان ایک جیسا نہیں تھا، ان میں سے کچھ لوگ پیغمبر اسلامﷺ کی رحلت سے ایک، دو سال قبل اسلام لائے تھے اور بعض لوگوں کے اسلام کو ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے ان میں سے بہت سے لوگ اسلام کی جنگی طاقت سے مرعوب ہو کر مسلمان ہوئے تھے۔

البتہ بہت سے لوگ اسلام کی جاذبیت اور معنویت سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے تھے مگر سب صدرِ اول کے سچے اور باوفا مسلمانوں جیسے نہیں تھے۔ لہٰذا جاہلیت کے تعصُّبات

کی روک تھام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اسلام کے صحیح راستے کی ہدایت کے لیے کوئی تدبیر اور انتظام ضروری تھا اگر یہ انتظام نہ ہوتا تو آپؐ کا کام ادھورا رہ جاتا؛ جیسا کہ سورہ مائدہ کی آیت اِس حقیقت کا واضح اعلان کر رہی ہے: ''اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي''[1] یہ اِس بات کی وضاحت ہے کہ اسلام کی نعمت، ہدایت کی نعمت، بنی نوع انسان کو صراط مستقیم کی طرف ہدایت کی نعمت، تب ہی پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کا لائحہ عمل معین ہو۔ یہ ایک طبیعی اور فطری بات ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غدیرِ خم کے موقع پر اِس عمل کو انجام دیا اور حضرت علی علیہ السلام کو اپنی جانشینی کے لیے نامزد کر دیا، جو ایمان اور گفتار و کردار میں ایک ممتاز، منفرد اور مثالی شخصیت کے حامل تھے اور سب مسلمانوں پر ان کی اطاعت اور پیروی کو لازم قرار دیا۔ البتہ یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذاتی اقدام نہیں تھا، بلکہ آپؐ کے دیگر احکامات اور فرمودات کی طرح یہ کام بھی وحیِ الٰہی کے ذریعہ انجام پایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی علیہ السلام کو عہدۂ امامت پر فائز کیا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کے اعلان کا واضح اور دوٹوک پیغام دیا۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر من و عن عمل کیا۔

غدیر ایک حقیقت کا نام ہے۔ واقعہ غدیر دینِ اسلام کی ہمہ گیری اور جامعیت کی عکاسی کرتا ہے۔ اسلام کے مستقبل کا ضامن ہے اور ان شرائط کو واضح کرتا ہے جو اُمتِ اسلامیہ کی زعامت اور قیادت کے لیے لازم ہیں۔ وہ کونسی شرائط ہیں؟ وہ وہی شرائط ہیں جو امیر المومنین امام علی علیہ السلام کی ذاتِ والا صفات میں جلوہ گر تھیں، یعنی پرہیزگاری، دینداری، دین کی غیر مشروط پابندی، خدا اور حق کے راستے کے سوا کسی کو خاطر میں نہ لانا، خدا کی راہ میں بےخوف و خطر چلنا، علم و عقل و تدبیر سے مزیّن ہونا، عزم و ارادہ کی طاقت سے آراستہ ہونا۔ غدیر ایک حقیقت ہے لیکن اس کا ایک اشارتی اور علامتی پہلو بھی ہے۔ امیر المومنین امام علی علیہ السلام کو انہیں خصوصیات کے پیش نظر نامزد کیا گیا۔ یہ خصوصیات اسلام کی زندگی کے مختلف ادوار میں اسلامی قیادت اور زعامت کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

---

[1] آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا ہے اور اپنی نعمتوں کو تم پر تمام کر دیا ہے۔ (سورہ مائدہ، آیت ۳)

اُمت ِاسلامیہ کے رہبروں اور حکومت کے ذمہ داراں کے لیے انہیں خصوصیات کا حامل ہونا ضروری ہے جو حضرت امیر المومنین امام علی علیہ السلام کے انتخاب میں کارفرما تھیں۔ غدیر انہیں امتیازات اور خصوصیات سے معمور ایک حقیقت کا نام ہے۔

(۲۰۰۷/۰۱/۰۸ء)

امیر المؤمنین علی
علیه السلام

امامت کا حقیقی مفہوم

امامت اپنے حقیقی معنی میں، انواع و اقسام کے نظاموں کے مقابلے میں جو درحقیقت انسانی کمزوریوں، خواہشات، غرور و تکبُّر اور حرص و طمع کے نتیجے میں وجود میں آتے ہیں، معاشرے کے نظم و نسق کے لیے ایک مثالی نظام کی مکمل تشکیل کا نام ہے۔ اسلام بشریت کے سامنے امامت کا نسخہ اور نظریہ پیش کرتا ہے؛ یعنی ایک ایسا انسان جس کا دل ہدایتِ الٰہی سے سرشار اور فیضیاب ہو، جو دینی اُمور کو سمجھتا اور پہچانتا ہو (یعنی صحیح راستے کے انتخاب کی صلاحیت رکھتا ہو) اور اس پر عمل درآمد کی طاقت بھی رکھتا ہو۔

جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہوتا ہے کہ ''یَا یَحْیَی خُذِ الْکِتَابَ بِقُوَّۃٍ''[1] اس کے ساتھ ہی اس کی نظر میں اپنی ذاتی زندگی اور خواہشات کوئی معنی نہ رکھتے ہوں، بلکہ دوسروں کی خواہشات، زندگی اور سعادت و کامرانی اُس کے لیے سب کچھ ہوں۔ جیسا کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے پانچ سال سے بھی کم مدتِ حکومت کے دوران اس کی عملی تصویر پیش کی۔

ذرا غور کیجئے کہ امیر المومنین علیہ السلام کی پانچ برس سے کم مدّت کی حکومت، ایک مثالی اور بشریت کے لیے ناقابلِ فراموش نمونے کی شکل میں صدیوں سے تاریخ کے صفحات ہر دمک رہی ہے۔ یہ غدیر کے واقعے کی حقیقی تفسیر اور اس کا اصلی درس ہے۔

(۰۳-۰۳-۲۰۰۲ء)

اسلامی تعلیمات میں اکثر موارد میں لفظِ امامت (جس کے معنی مطلق رہنمائی کے ہیں) کا اطلاق خاص مصداق پر ہوتا ہے اور وہ اجتماعی میدان میں فکری اور سیاسی رہبری و رہنمائی ہے۔ قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی یہ لفظ اپنے دیگر مشتقّات کے ساتھ استعمال ہوا ہے (جیسے امام اور ائمہ وغیرہ) تو ان تمام موارد میں اسی مخصوص معنی یعنی ''اُمت کی رہبری و رہنمائی'' کو مدّنظر رکھا گیا ہے۔ یعنی سیاسی رہبری یا دینی اور فکری پیشوائی یا دونوں طرح کی رہنمائی۔

---

[1] اے یحییٰ! (خدا کی) کتاب کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ (سورہ مریم، آیت ۱۲)

حضور اکرمﷺ کی رحلت کے بعد لوگوں کے درمیان فکری اور سیاسی لحاظ سے اختلافِ رائے کہ جس کے نتیجے میں اسلام کے پیروکاروں کے درمیان گروہ بندی اور فرقہ پرستی نے جنم لیا، اس کا اصل نقطۂ اختلاف بھی اُمت کی سیاسی رہبری اور قیادت کا مسئلہ ہی تھا اور لفظِ امامت و امام کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوئی اور یہ لفظ اپنے دیگر تمام معانی سے زیادہ ”سیاسی رہبری اور قیادت“ کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ یہ معنی دوسرے تمام معانی پر چھا گیا، یہاں تک کہ جب دوسری صدی ہجری میں کلامی مباحث کا دائرہ وسیع ہوا اور مختلف اسلامی افکار و نظریات کے درمیان حد بندیاں ہونے لگیں تو ان تمام کلامی مکاتبِ فکر کے اہم مسائل میں سے ایک، مسئلہ امامت تھا جس کے معنی سیاسی قیادت اور رہبری کے ہیں۔

مسئلہ امامت میں عام طور پر امام کی شرائط اور خصوصیات (یعنی معاشرے پر حاکم اور اس کی باگ ڈور سنبھالنے والے) کے بارے میں بحث کی جاتی تھی اور ہر کوئی اس مسئلے پر ایک خاص عقیدہ اور نظریہ رکھتا ہے۔ مکتبِ تشیع میں بھی (جس کے پیروکاروں کے درمیان امامت کا منصب، اسلام کے دوسرے تمام احکام ومسائل پر محیط ہے) امامت سے اسی معنی کو مراد لیا جاتا ہے اور امامت کے بارے میں مکتبِ تشیع کے نظریے کا درج ذیل جملوں میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے: امام اور اسلامی معاشرے کے حاکم کا انتخاب اور تعیُّن، خدا کی طرف سے ہوا اور پیغمبر اکرمﷺ کی طرف سے اس کا تعارف کرایا گیا ہو۔ رہبر اور پیشوا کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دین کے تمام اسرار و رموز سے آگاہ ہونے کے علاوہ مفسّرِ قرآن بھی ہو اور وہ ہر قسم کے خَلقی، خُلقی اور سبھی عیوب و نقائص سے پاک اور معصوم ہو اور اس نے پاک و پاکیزہ خاندان میں جنم لیا ہو وغیرہ۔

یوں پہلی اور دوسری صدی ہجری کے مسلمانوں کی نظر میں جہاں لفظِ امامت صرف سیاسی رہبری اور قیادت کے معنی میں استعمال ہوتا تھا، وہاں شیعوں کے مخصوص نظریے کے مطابق سیاسی رہبری کے علاوہ، فکری اور اخلاقی رہبری کے مفہوم کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے تھا۔

جب شیعہ کسی کو اپنا امام تسلیم کرتے تھے تو وہ اس سے صرف سیاسی اور اجتماعی مسائل کی دیکھ بھال کی توقّع نہیں کرتے تھے، بلکہ وہ اس سے فکری تربیت، دینی تعلیم اور تزکیہ نفس کی توقّع بھی رکھتے تھےاور اگر کوئی امامت کا دعویدار ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا تو وہ ایسے شخص کو ''امامِ برحق'' نہیں مانتے تھے۔ مکتبِ تشیع میں صرف سیاسی بصیرت، جنگی قدرت و طاقت اور کشور کشائی جیسی صفات پر (جنہیں دیگر مکاتبِ فکر میں قیادت کی صلاحیت کے لیے کافی سمجھا جاتا تھا) اکتفا نہیں کیا جاتا تھا۔

مکتبِ تشیع میں رائج امامت کے مفہوم کے مطابق، کسی معاشرے میں بسنے والے تمام لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اُمور کی بہترین انداز میں دیکھ بھال کی قدرتِ فائقہ کا حامل انسان ہی امامِ وقت کہلانے کا اہل ہو سکتا ہے، جو ایک ہی وقت میں لوگوں کے دینی معاملات بھی سدھارتا ہو اور ان کی اخلاقی تعلیم و تربیت اور سیاسی اُمور کی دیکھ بھال بھی کرتا ہو۔

پس اس گفتگو کی روشنی میں حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی امام ہیں کیونکہ جس معاشرے اور تہذیب کی بنیاد آپؐ نے اپنے (بابرکت) ہاتھوں سے رکھی تھی اس کا فکری اور سیاسی انتظام اور رہبریت بھی آپؐ ہی کے ہاتھ میں تھی اور آپؐ کی رحلت کے بعد بھی اُمت کو ایک امام کی ضرورت تھی تاکہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین (خلیفہ) کی حیثیت سے امامت کی ان بھاری ذمہ داریوں (منجملہ فکری اور سیاسی رہبریت) کو اپنے کاندھوں پر اُٹھا سکے۔ لہٰذا شیعوں کا یہ عقیدہ ہے کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق آپؐ کے بعد آپؐ کے جانشین اور خلیفہ (بلافصل) امیر المومنین علی بن ابیطالب علیہ السلام ہیں اور ان کے بعد یہ عہدہ آپؐ کے خاندان سے وابستہ دیگر ائمہ معصومین علیہم السلام کو یکے بعد دیگرے منتقل ہوتا رہا۔[1]

یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ خلافت اور اسلام کی حکومت میں ان تینوں مفاہیم یعنی ''سیاسی قیادت''، ''دینی تعلیم و تربیت'' اور ''تہذیبِ نفس'' کے باہمی امتزاج سے (امامت اور حکومتِ اسلامی کو تین پہلوؤں اور تین ابعاد پر مشتمل قرار دیا گیا ہے کہ جس

---

[1] اس سلسلے میں مزید تفصیلات کے لیے اس موضوع سے مربوط کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے۔

کی طرف موجودہ دور کے بعض مفکرین نے بھی اشارہ کیا ہے) یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے ان تینوں پہلوؤں کے درمیان جدائی کی نفی کرتے ہوئے انسانیت کے سامنے ان تینوں پہلوؤں پر مشتمل ایک جامع پروگرام پیش کیا ہے۔ لہٰذا اُمت کی قیادت اور رہبری سے مراد ان تینوں میدانوں میں قیادت اور رہبری ہے۔ بنابر ایں امامت کے اس وسیع معنی و مفہوم کے پیشِ نظر شیعوں کا یہ عقیدہ ہے کہ امام کا انتخاب اور تعیُّن، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونا چاہیے۔

پس ایسے سطحی نظریات اور عقائد کے برخلاف جنہوں نے امامت کو خلافت اور حکومت کے مقابلے میں لا کھڑا کیا ہے اور اس کو صرف ایک معنوی منصب اور روحانی و فکری عہدے تک محدود کر دیا ہے۔ مکتبِ تشیع میں امام پوری ”اُمت کا رہبر“ ہوتا ہے؛ یعنی دنیوی اُمور اور لوگوں کی انفرادی زندگی کے نظم و نسق اور اجتماعی اُمور سے مربوط تمام مسائل اور اسی طرح لوگوں کے روحانی اور معنوی مسائل کا حل اور فکری مشکلات اور عقائد اسلامی کی تفسیر و تشریح کی ذمہ داری بھی امام پر عائد ہوتی ہے۔ یہ واضح مطلب بھی امامت کے عقیدے سے وابستہ اکثر لوگوں کے لیے ایسا اجنبی بن چکا ہے کہ اس کے متعلق موجود سینکڑوں قرآنی آیات اور احادیث کے منابع سے چند ایک مثالوں کا تذکرہ فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

اصول کافی کی کتاب ”الحجّۃ“ میں حضرت امام علی رضاعلیہ السلام سے ایک طویل روایت نقل کی گئی ہے جس میں امامت کی شناخت، اس کے اوصاف اور خصوصیات بیان کی گئی ہیں جو انتہائی اہم اور دلچسپ ہیں، ان میں سے بعض جو امامت کے بارے میں ہیں: امامت دین کی باگ ڈور، نظامِ مسلمین کی درستی، دنیا کی آبادی کی ضامن، مومنین کی عزت و سربلندی، پیغمبروں کا مقام و مرتبہ، جانشینوں کی میراث، خدا اور رسولؐ کی خلافت و جانشینی ہے۔ نیز امام کے بارے میں بیان ہوا ہے کہ امام عمومی دولت و ثروت میں اضافہ کرنے والا، حدود اور احکامِ الٰہی کا جاری کرنے والا، اسلام کی سرحدوں کا محافظ، تمام مخلوقات کے درمیان اللہ کا امین، بلند مقام پر چمکتا ہوا چراغ(ہدایت)، اللہ کے راستوں کو روشن و ظاہر کرنے والا، حریمِ الٰہی کا مدافع، منافقین

کو غیظ و غضب میں ڈالنے والا، کفر کی بنیاد کو ویران کرنے والا، مومنین کو عزت دینے والا، قیادت کا لائق و تجربہ کار، سیاسی اُمور کا ماہر، حکم الٰہی کے اِجراء کے لیے کمر بستہ ہو، اللہ کے بندوں کا خیر خواہ اور دینِ خدا کا محافظ ہوتا ہے۔[۱]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ایک اور روایت میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ: وہ تمام امتیازات اور خصوصیات جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل تھیں حضرت علی علیہ السلام اور دیگر ائمہ طاہرین علیہم السلام بھی ان خصوصیات کے حامل تھے۔[۲]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ہی سے منقول ایک روایت میں ''أوصیاء'' کی اطاعت اور فرمانبرداری کے واجب ہونے کا ذکر کرتے ہوئے، وضاحت کی گئی ہے کہ ''أوصیاء'' وہی ہیں جنہیں قرآنِ کریم نے ''اولی الامر'' کے نام سے یاد کیا ہے۔[۳]

---

[۱] ''اَلْاِمَامَةَ زِمَامُ الدِّیْنِ وَنِظَامُ الْمُسْلِمِیْنَ وَصَلَاحُ الدُّنْیَا وَعِزُّ الْمُؤْمِنِیْنَ إِنَّ الْإِمَامَةَ أُسُّ الْاِسْلَامِ النَّامِی وَفَرْعُهُ السَّامِی بِالْإِمَامِ تَمَامُ الصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ وَالصِّیَامِ وَالْحَجِّ وَالْجِهَادِ وَتَوْفِیْرُ الْفَیْءِ وَالصَّدَقَاتِ وَإِمْضَاءُ الْحُدُوْدِ وَالْأَحْكَامِ وَمَنْعُ الثُّغُوْرِ وَالْأَطْرَافِ اَلْإِمَامُ یُحِلُّ حَلَالَ اللهِ وَیُحَرِّمُ حَرَامَ اللهِ وَیُقِیْمُ حُدُوْدَ اللهِ وَیَذُبُّ عَنْ دِیْنِ اللهِ وَیَدْعُو إِلَىٰ سَبِیْلِ رَبِّهِ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَالْحُجَّةِ الْبَالِغَةِ اَلْإِمَامُ كَالشَّمْسِ الطَّالِعَةِ الْمُجَلِّلَةِ بِنُوْرِهَا لِلْعَالَمِ وَهِیَ فِی الْأُفُقِ بِحَیْثُ لَا تَنَالُهَا الْأَیْدِی وَالْأَبْصَارِ اَلْإِمَامُ الْبَدْرُ الْمُنِیْرُ وَالسِّرَاجُ الزَّاهِرُ وَالنُّوْرُ السَّاطِعُ وَالنَّجْمُ الْهَادِی فِی غَیَاهِبِ الدُّجَی وَأَجْوَازِ الْبُلْدَانِ وَالْقِفَارِ وَلُجَجِ الْبِحَارِ''؛ امامت دین کی مہار، نظام مسلمین کا ذریعہ، اُمور دنیا کی درستی اور مومنین کی عزّت ہے۔ بیشک امامت ترقی کرنے والے اسلام کی بنیاد اور اس کی بلند شاخ ہے، نماز، زکات، روزے، حج اور جہاد کا کامل ہونا، مالِ غنیمت اور صدقات کی افزائش، حدود اور احکامِ الٰہی کا جاری کرنا اور (اسلام کی) سرحدوں اور ان کے اطراف کی حفاظت، امام ہی کے وسیلے سے ہوتی ہے؛ امام ہی حلالِ الٰہی کو حلال اور حرامِ الٰہی کو حرام کرتا ہے اور حدودِ الٰہی کو قائم کرتا ہے اور (دشموں سے) دینِ خدا کا دفاع کرتا ہے اور لوگوں کو اپنے پروردگار کے راستے کی طرف حکمت، عمدہ نصیحت اور کامل وبلیغ حجت کے ساتھ بلاتا ہے۔ امام ایسے چڑھتے سورج کی مانند ہے جو اپنے نور سے تمام عالم کو جگمگا دیتا ہے، حالانکہ وہ بلند اُفق (مقام) پر ہے کہ لوگوں کے ہاتھ اور ان کی نگاہیں وہاں تک نہیں پہنچ سکتیں۔ امام روشن چاند، ضیاء بار چراغ، جگمگاتا نور اور ہدایت کرنے والا ایسا ستارہ ہے جو ضلالت کی تاریکیوں میں، شہروں اور صحراؤں کے راستوں اور سمندروں کی گہرائیوں میں راہ بتاتا ہے۔ (الکافی، ج۱، ص۲۰۰)

[۲] '' جَرَی لَهُ مِنَ الْفَضْلِ مِثْلُ مَا جَرَی لِمُحَمَّدٍ... وَلَقَدْ حَلَمَتْ عَلَى مِثْلِهِ حَمُولَهُ... وَكَذَلِكَ یَجْرِی الْأَئِمَّةُ الْهُدَی وَاحِداً بَعْدَ وَاحِدٍ'' (الکافی، ج۱، ص۱۹۶)

[۳] ''یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُواْ أَطِیعُواْ اللهَ وَأَطِیعُواْ الرَّسُولَ وَأُوْلِی الأَمْرِ مِنكُمْ''؛ ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، رسولؐ اور صاحبانِ امر کی اطاعت کرو۔ (سورۂ نساء، آیت۵۹)

مختلف کتابوں کے متعدّد ابواب میں موجود سینکڑوں روایات میں واضح طور پر امام اور امامت کو مکتبِ تشیع کے نظریے کے مطابق "حق حکمرانی" اور " اُمتِ مسلمہ کے اُمور کا منتظم" مراد لیتے ہوئے، ائمہ معصومین علیہم السلام کو حکومت کا حقیقی وارث قرار دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک غیرجانبدار محقق کے سامنے اس میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے کہ جب اہل بیت طاہرین علیہم السلام نے امامت کا دعویٰ کیا ہے تو ان کا یہ دعویٰ فکری اور روحانی مقام سے کہیں بالاتر، یعنی حقِ حکومت کا دعویٰ بھی ہے اور ان کی وسیع دعوت درحقیقت حکومتی معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے سیاسی اور عسکری قیام کی دعوت رہی ہے۔[1]

ائمہ اطہار علیہم السلام کی زندگی میں حصولِ اقتدار کی جدّوجہد

اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ کہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے لے کر حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام تک ہمارے ان آٹھ اماموں نے صرف اور صرف احکامِ الٰہی اور دینی معارف کی تبلیغ پر توجہ دی ہے اور اپنے زمانے کے سیاسی حالات سے لاتعلق رہے ہیں تو یقیناً اس شخص نے ان اماموں کی زندگیوں کا گہرا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ ان ہستیوں کی حیاتِ مبارکہ سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ اور اسلام میں امامت کے معنی اور مکتبِ تشیع جس فلسفۂ امامت کا قائل ہے اس کے مطابق، اس سے ہٹ کر کسی صورت میں ان الفاظ کا اطلاق قابلِ قبول نہیں ہو سکتا ہے۔

اگر ائمہ معصومین علیہم السلام کی طرف سے مبارزہ اور چیلنج کے حوالے سے کوئی ایک جملہ نہ بھی ہوتا، تب بھی ہم یقین سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان بزرگوں نے ضرور مبارزہ کیا ہے مگر ان کے مبارزات اور جدّوجہد سے متعلق خبریں ہم تک نہیں پہنچی ہیں اور ہم ان سے بے خبر ہیں۔ (کیونکہ) یہ ہو ہی نہیں سکتا ہے کہ ہم اسلام میں (نہ صرف شیعہ مکتب میں) امامت کے معانی کو سمجھیں، اس پر ایمان رکھیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی قبول کریں کہ مثلاً ایک سو پچاس سال یا اس سے زیادہ عرصہ تک

---

[1] پیشوائے صادق، ص۶۹۔۷۴

ہمارے ائمہ اطہار علیہم السلام ہاتھ پر ہاتھ دھرے اپنے گھروں میں آرام سے بیٹھے رہے ہوں اور اس بات پر خوش ہوں کہ وہ احکامِ قرآن اور معارفِ اسلامی کا درس دیتے ہیں اور کوئی سیاسی جدوجہد نہیں کرتے۔ یہ بات کسی صورت میں صحیح نہیں ہے۔ البتہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ائمہ علیہم السلام مسلسل جہاد کرتے رہے ہیں تو ہمیں یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ زمانے کے اعتبار سے جہاد کی بھی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں، کبھی تو جہاد علمی، ثقافتی، سیاسی میدانوں میں تنظیموں اور پارٹیوں کو تشکیل دے کر کیا جاتا ہے تو کبھی (میدانِ جنگ میں جا کر) قتل و غارت کے ذریعے ہوتا ہے، یعنی ہر زمانے میں جہاد کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں۔

(۳۱-۰۷-۱۹۸۷ء)

ممکن ہے کہ بعض لوگ یہ اعتراض کریں کہ ائمہ معصومین علیہم السلام حصولِ اقتدار کے لیے کیونکر جدّوجہد کر سکتے ہیں جبکہ وہ علمِ الٰہی کے ذریعے یہ جانتے تھے کہ وہ اس مقصد تک پہنچ نہیں سکیں گے۔ جی ہاں تاریخ نے بھی یہ ثابت کر دیا ہے کہ ائمہ معصومین علیہم السلام کی طرف سے اقتدار حاصل کرنے نیز معاشرے اور نظام کو اپنی خواہش اور ذمہ داری کے مطابق چلانے کی کوششیں بارآور نہیں ہوئیں، لیکن اس کے باوجود ائمہ معصومین علیہم السلام نے علمِ غیب کے ذریعے یہ جانتے ہوئے بھی اس کام میں کیونکر ہاتھ ڈالا؟ تو اس سوچ اور فکر کے جواب میں ہم کہیں گے کہ یہ جاننا کہ وہ اپنے مقصد تک نہیں پہنچ سکیں گے ان کی ذمہ داری کو انجام دینے میں رکاوٹ نہیں بنتا ہے۔

آپ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ طیّبہ کا مطالعہ کیجئے، آپؐ یہ جانتے تھے کہ جنگ احد میں شکست کھانے والے ہیں، آپؐ جانتے تھے کہ جن لوگوں کو آپؐ نے پہاڑی درّے پر مامور کیا ہے وہ وہاں نہیں رکیں گے، بلکہ مال غنیمت کے لالچ میں نیچے اُتر آئیں گے۔ اسی طرح جب حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبیلہ بنی ثقیف کی ہدایت اور اہل مکہ کی شرارت آمیز حرکتوں سے نجات کی غرض سے طائف تشریف لے جارہے تھے تو آپؐ کو بخوبی معلوم تھا کہ طائف کے باسی پتھروں سے آپؐ کا استقبال کریں گے اور اتنے پتھر برسائیں

گے کہ جس کی وجہ سے آپؑ کی پنڈلیاں لہولہان ہو جائیں گی اور آپؑ کو مجبوراً واپس لوٹنا پڑے گا۔

تمام ائمہ معصومین علیہم السلام ان تمام باتوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ امیر المومنین علی علیہ السلام کو بھی یہ معلوم تھا کہ اکیس رمضان کو شہید ہونے والے ہیں، لیکن اس کے باجود ماہ رمضان المبارک سے کچھ ہی دن پہلے آپؑ نے کوفہ کے باہر ایک وسیع و عریض فوجی چھاونی قائم کی تاکہ امیرِ شام کے ساتھ جنگ کی تیاری کی جا سکے۔ اگر امیر المومنین علیہ السلام کا شہادت کی تاریخ سے باخبر ہونا اس بات کا سبب بن جاتا کہ آپؑ معمول کے مطابق اپنے اُمور انجام نہ دیں تو پھر آپؑ نے یہ فوجی چھاونی کیوں قائم کی؟ اور یہ لشکر کیوں بنایا؟ اور لوگوں سے کوفہ کے باہر انتظار کیوں کرایا؟ اس کا کیا فائدہ تھا؟ پس ائمہ طاہرین علیہم السلام کا یہ جاننا کہ وہ منصبِ اقتدار تک نہیں پہنچ سکتے، اس بات کا سبب بن نہیں سکتا ہے کہ وہ اپنی جدّوجہد کو ترک کردیں، بلکہ ائمہ معصومین علیہم السلام ایک ایسے شخص کی طرح جو آئندہ کے حالات سے مکمل طور پر لاعلم ہے اور اپنے مقصد و ہدف تک پہنچنے کے لیے بڑھ چڑھ کر کوشش کرتا ہے، اپنی کوششیں جاری رکھتے ہیں۔

(۱۲۔۰۴۔۱۹۸۵ء)

تاریخِ امامت کے چار ادوار

امامت کی تحریک جس کا آغاز سب سے پہلے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے دن (یعنی ۲۸صفر ۱۱ہجری) سے ہوا اور حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کی شہادت (یعنی ۸ربیع الاول ۲۶۰ہجری) تک مسلسل جاری رہی۔ اس پورے عرصے میں امامت کی یہ تحریک تقریباً چار مختلف ادوار سے گزری ہے اور ان میں سے ہر دور اپنے زمانے کے امام کا معاشرے پر مسلّط سیاسی قوتوں کے ساتھ برتاؤ کے لحاظ سے، مختلف اور منفرد دور ہے۔

پہلا دور: امامت کا پہلا دور خاموشی یا وقت کے حکمرانوں کے ساتھ امامؑ کے تعاون کا دور ہے۔ اسلام کا جدید اور نومولود معاشرہ، ایک طاقتور اور (مسلمانوں کے ہاتھوں) زخم

خوردہ بیرونی دشمن کی موجودگی اور داخلی طور پر ایسے تازہ مسلمانوں کی موجودگی میں کہ جن کے دلوں میں اسلامی احکام اور معارف صحیح طریقے سے سموئے بھی نہ تھے، کسی بھی صورت میں باہمی اختلافات اور محاذ آرائی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ایسے میں ایک معمولی سا رخنہ بھی اسلامی معاشرے کے اس نومولود وجود کی بنیادوں کو ہلا کر اسے تباہی کے دہانے پر پہنچا سکتا تھا۔ دوسری طرف حق و حقیقت سے انحراف کا پہلو بھی اس قدر نمایاں نہ تھا کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام جیسی شخصیت کے لیے ناقابلِ تحمل ہو (جو مکتبِ اسلام اور اسلامی معاشرے کے لیے سب سے زیادہ دردمند اور عظیم انسان تھے) اور چونکہ ان وجوہات سے حضور اکرم ﷺ پہلے ہی سے باخبر تھے اس لیے آپؐ نے اپنے اس ممتاز اور برگزیدہ شاگرد کو نصیحت کی تھی کہ وہ ایسے حالات میں صبر و تحمل کا دامن تھامے رکھیں۔

امامت کا یہ دور حضرت رسول اکرم ﷺ کی رحلت (یعنی سن ۱۱ ہجری) سے لیکر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے ظاہری خلافت پر فائز ہونے تک (یعنی سن ۳۵ ہجری تک) کے پچیس سالوں پر محیط ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اہل مصر کے نام اپنے ایک خط میں اس درمیانی وقفے (فترت) میں اپنی حالت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

’’فَأَمْسَكْتُ يَدِي حَتَّى رَأَيْتُ رَاجِعَةَ النَّاسِ قَدْ رَجَعَتْ عَنِ الْإِسْلَامِ يَدْعُونَ إِلَى مَحْقِ دِينِ مُحَمَّدٍ ﷺ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ- فَخَشِيتُ إِنْ لَمْ أَنْصُرِ الْإِسْلَامَ وَأَهْلَهُ أَنْ أَرَى فِيهِ ثَلْماً أَوْ هَدْماً تَكُونُ الْمُصِيبَةُ بِهِ عَلَيَّ أَعْظَمَ مِنْ فَوْتِ وِلَايَتِكُمْ . . . فَنَهَضْتُ فِي تِلْكَ الْأَحْدَاثِ‘‘[1]

(جب خلافت کو مجھ سے چھین لیا گیا) تو میں نے (خاموشی اختیار کرتے ہوئے) کنارہ کشی اختیار کر لی، یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ (لوگوں کا) ایک گروہ جو اسلام سے خارج ہو چکا تھا وہ لوگوں کو اسلام محمدیؐ کی نابودی کی دعوت دے رہا ہے (ایسے میں) مجھے یہ خوف محسوس ہوا کہ اگر میں اسلام اور مسلمانوں کی مدد نہ کروں تو

۱۔ نہج البلاغہ، خط نمبر ۶۲

اسلام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گا اور میرے لیے یہ مصیبت حکومت و خلافت کو خیر باد کہنے سے بھی زیادہ سخت تھی۔ ۔ ۔ پس میں (ان بحرانوں کا خاتمہ کرنے کے لیے) ان حالات میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

حضرت علی علیہ السلام کی زندگی کے یہ پچیس سال، اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ محبت اور ان کے لیے دلسوزی کی وجہ سے حکومتی معاملات میں کسی نہ کسی طرح شراکت اور وقت کے خلفاء کی مدد اور ان کی حمایت میں گزرے۔ آپؑ کی طرف سے مملکت کے سیاسی، دفاعی اور دیگر سماجی معاملات کے حوالے سے وقت کے حکمرانوں کے سوالات کے جوابات اور دیگر اُمور میں ان کی راہنمائی کے جو تذکرے نہج البلاغہ اور حدیث و تاریخ کی دوسری کتابوں میں نقل کیے گئے ہیں وہ امامؑ کی زندگی کے اس پہلو کے ناقابلِ تردید ثبوت ہیں۔

دوسرا دور: یہ دور امامؑ کے اقتدار کا دور ہے۔ امامت کا یہ دور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی چار سال نو مہینے (کی ظاہری) خلافت اور حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے دور خلافت کے چند مہینوں پر مشتمل ہے۔ جو تمام تر کوتاہیوں، افسردگیوں اور بے شمار مشکلات کے باوجود جن سے کوئی بھی انقلابی حکومت بچ نہیں سکتی ہے، اسلامی حکومت کے ایک درخشندہ ترین باب کی حیثیت سے نمایاں ہے۔

تاریخ بشریت میں سب سے زیادہ اسی دور میں انسان کے فطری رویّوں، عدالتِ اجتماعی اور اسلامی تعلیمات کے گوناگوں پہلوؤں پر انتہائی قاطعیت، جرأت مندی اور صراحت کے ساتھ عمل کیا گیا ہے۔ ائمہ معصومین علیہم السلام کی زندگی کا یہ دورانیہ اسلامی طرزِ حکومت اور عدالتِ اجتماعی کے قیام کا ایک یادگار اور بہترین نمونہ ہے جس کی جانب ائمہ اطہار علیہم السلام پوری دو صدیوں تک لوگوں کو دعوت دیتے ہوئے ایسی ہی حکومت کے قیام کی جدوجہد کرتے رہے۔

چنانچہ شیعیانِ امیر المومنین علیہ السلام اس دور کو بڑی عظمت کے ساتھ یاد کرتے ہیں اور اسے کھو دینے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بعد کی حکومتوں کا اس کے ساتھ موازنہ کرکے ان سے اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔

امامت کا یہ دور، غیر تربیت یافتہ اور انحراف و گمراہی کے شکار لوگوں کے درمیان ایک مثالی اسلامی اور انقلابی حکومت کے قیام کے لیے ایک بہترین درس اور تجربہ تھا۔ اس دن سے بعد میں آنے والے ائمہ معصومین علیہم السلام نے طویل المدت پالیسیوں کو اپناتے ہوئے لوگوں کی تعلیم و تربیت اور انہیں اپنی تحریک سے وابستہ کرنے کے لیے ضروری اور سخت قسم کے دشوار کاموں کے آغاز کو اپنے لیے ضروری قرار دیا۔

تیسرا دور: تاریخِ امامت کا یہ بیس سالہ دور امام حسن علیہ السلام کی معاویہ کے ساتھ صلح (سن۴۱ہجری) سے لیکر واقعہ کربلا (یعنی سن۶۱ہجری) تک محیط ہے۔ امام حسن علیہ السلام کی معاویہ کے ساتھ صلح کے ساتھ ہی شیعوں کی نیم مخفی کاروائیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ جس کا بنیادی مقصد بھی کسی مناسب وقت میں حکومتِ اسلامی کو خاندانِ نبوت کی طرف لوٹا دینا تھا اور بظاہر یہ موقع بہت زیادہ دور بھی نہ تھا، بلکہ امیرِ شام کی زندگی کے خاتمے پر اس بات کی صاف اُمید دکھائی دے رہی تھی۔ لہٰذا تاریخ امامت کے اس تیسرے دور کو ”اسلامی حکومت کی تشکیل کے لیے مختصر مدّت کی جدّوجہد کا دور“ کہا جا سکتا ہے۔[1]

چوتھا اور آخری دور: یہ دور سابقہ راہ و روش کو طویل مدت کے لیے جاری رکھنے سے عبارت ہے جو تقریبا دو سو سال تک کئی دفعہ کامیابی و کامرانی کے دہانے پر پہنچتے پہنچتے پھر ناکامیوں سے ہمکنار ہوتا رہا (گویا کامیابیوں اور شکست پر مشتمل کئی مراحل سے گزرتا رہا) یہ نظریاتی میدان میں یقینی کامیابیوں کے ساتھ ساتھ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق سینکڑوں تدابیر، اخلاص و فداکاریوں کے ہزاروں جلووٴں سے مزیّن اسلامی تعلیمات کی عظمتوں کے جوہر دکھانے سے عبارت ہے۔[2]

ائمہ معصومین علیہم السلام کی زندگی کے جس اہم ترین پہلو پر شایانِ شان توجہ نہیں دی گئی، وہ ان ہستیوں کی ”جانکاہ سیاسی جدّوجہد“ کا پہلو ہے۔ پہلی صدی کے دوسرے نصف کے آغاز پر جب خلافتِ اسلامی نے ملوکیت کی شکل اختیار کر لی اور مسندِ امامت

---

[1] ا۔ اس موضوع پر میں نے اپنی متعدد تقاریر میں حوالوں کے ساتھ مفصّل گفتگو کی ہے۔ (مصنف)

[2] ۲۔ پیشوائے صادق، ص۱۶۔۱۹

پر بادشاہت بیٹھ گئی تو ائمہ اطہار علیہم السلام نے وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق اپنی سیاسی جدّوجہد کا آغاز کیا۔

اس جدّوجہد کا سب سے بڑا مقصد نظریۂ امامت کی بنیادوں پر اسلامی حکومت قائم کرنا تھا، البتہ ائمہ معصومینؑ اور صاحبانِ وحی کے مخصوص نظریات کے مطابق دینی مسائل کی تفسیر و تاویل نیز تحریف شدہ معارفِ اسلام اور دینی احکام کی وضاحت کرنا بھی اہل بیت طاہرین علیہم السلام کے اغراض ومقاصد اور اہم اہداف میں شامل تھا، لیکن حتمی دلائل کے مطابق اہل بیت علیہم السلام کا جہاد ان مقاصد تک محدود نہیں تھا بلکہ ان کا سب سے بڑا مقصد ”اسلامی نظامِ عدل و انصاف پر مبنی علوی حکومت“ قائم کرنا تھا۔

جتنی بڑی تکلیفیں، سخت سے سخت مصیبتیں ائمہ اطہار علیہم السلام اور ان کے طرفداروں نے اپنی رنج و غم اور ایثار و قربانی سے بھرپور زندگیوں میں برداشت کیں، وہ صرف اسی اہم مقصد کے حصول کے لیے تھیں اور اسی انقلابی نصب العین اور اہم مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ائمہ اطہار علیہم السلام نے کربلا کے ہولناک اور جانگداز واقعے کے بعد، امام زین العابدین علیہ السلام کے دورِ حیات سے ہی اس طویل مدّت نصب العین پر عمل شروع کر دیا تھا، یہی وجہ ہے کہ کربلا کے ہولناک حادثے اور امام علی رضا علیہ السلام کی جانشینی کے درمیان ایک سو چالیس سالہ دور میں ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی انقلابی تحریک سے وابستہ لوگوں، یعنی شیعوں کو خلفاء اور ان کے حکومتی کارندے ہمیشہ اپنے سب سے بڑے اور خطرناک دشمنوں میں شمار کرتے تھے۔

اس دوران کئی مرتبہ مناسب مواقع پیدا ہوئے اور ایسا لگتا تھا کہ شیعوں کی جدّوجہد جس کو ”علوی تحریک“ کا نام دیا جا سکتا ہے، بڑی کامیابی سے ہمکنار ہو جائے گی لیکن ہر بار آخری اور فیصلہ کن فتح اور کامیابی کی راہ میں دشواریاں پیش آتی رہیں اور شاید سب سے بڑا اور کاری زخم اس وقت لگتا تھا جب اس تحریک کے اصلی بانی اور مرکزی محور یعنی اس دور کے امامؑ کو قید خانے میں ڈال دیا جاتا یا ان کو شہید کر دیا جاتا تھا اور جب ان کے بعد دوسرے امامؑ کی باری آتی تھی تو اس وقت اس قدر سخت گیری اور بحران کا عالم ہوتا تھا کہ حالات کو دوبارہ معمول پر لانے میں کافی وقت درکار ہوتا تھا۔

ائمہ اطہار علیہم السلام ان سخت اور کٹھن طوفانی حالات میں بھی، عقلمندانہ اور شجاعانہ انداز سے تشیع کی اس چھوٹی لیکن گہری اور پائیدار تحریک کو دشوار اور خطرناک راہوں سے گزارتے رہے اور نہ صرف یہ کہ بنو اُمیہ اور بنو عباس کے خلفاء اماموںؑ کو شہید کرکے بھی کسی زمانے میں امامت کی تحریک کو ختم نہ کر سکے، بلکہ یہ تیز دھار خنجر ہمیشہ اہلِ خلافت کے سینوں میں چبھتا ہوا محسوس ہوتا رہا اور کبھی نہ ختم ہونے والے خوف کی صورت میں ان لوگوں کا سکونِ قلب چھنتا رہا۔

(۰۹-۰۸-۱۹۸۴ء)

امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہما السلام کی شخصیت

حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کا وجودِ مبارک مختلف جہتوں اور گوناگوں حالات و واقعات کے لحاظ سے تمام بنی نوعِ انسان کے لیے ایک نہ بھُلایا جانے والا اور دائمی سبق ہے۔ خواہ آپؑ کا انفرادی اور ذاتی عمل ہو، جیسے محرابِ عبادت میں آپؑ کی عبادت اور بندگی ہو، آپؑ کی مناجات ہوں، آپؑ کا زُہد و تقویٰ اور یادِ خدا میں کھو جانا ہو یا اپنے نفس، شیطان اور مادی و نفسانی خواہشات کے خلاف آپؑ کا جہاد، گویا آپؑ کی زندگی کے ہر میدان میں آپؑ کی زبانِ مبارک سے جاری ہونے والا یہ جملہ آج بھی فضائے عالم میں گونج رہا ہے: ”یَا دُنْیَا ... غُرِّي غَیْرِي“[۱] اے دنیا کی لذّتو، اے جاذب نظر اور پُرفریب جلوؤ، اے ہوا و ہوس جو دنیا کے طاقتور انسانوں کو اپنے جال میں پھنساتی ہو! جاؤ کسی اور کو دھوکہ دو علیؑ تمھارے جال میں پھنسنے والا نہیں ہے۔ لہٰذا ہر بیدار ذہن رکھنے والا انسان امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی زندگی کے ایک ایک لمحے سے آپؑ کا خدا سے تعلق و معنویت و روحانیت کا نہ بھُلایا جانے والا سبق حاصل کر سکتا ہے۔

آپؑ کی زندگی کا ایک دوسرا پہلو حق اور عدل و انصاف کے لیے جہاد ہے۔ یعنی جس دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رسالت کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اُٹھایا اس وقت سے ایک مجاہد، مومن اور فداکار جو ابھی نوجوان تھے، ہمیشہ آپؐ کے شانہ بشانہ موجود رہے اور وہ نوجوان

۱۔ نہج البلاغہ، کلمات قصار ۷۷

علیؑ ہی تھے۔ اس وقت سے لیکر پیغمبر اسلام ﷺ کی بابرکت زندگی کے آخری لمحات تک امیر المومنینؑ اسلام کی حفاظت اور بقاء کے لیے مسلسل جہاد کرتے رہے اور لمحہ بھر کے لیے بھی فارغ نہیں رہے۔

آپؑ نے اس راہ میں کس قدر زحمتیں اُٹھائیں، کس قدر اپنی جان کے لیے خطرات مول لیے اور حق اور عدل و انصاف کے قیام میں جمے رہے۔ جب کوئی میدان میں ثابت قدم نہیں رہ سکتا تھا تب بھی آپؑ میدان میں ثابت قدم رہتے تھے، جب لوگ میدان میں اُترنے سے کتراتے تھے تب آپؑ میدان میں اُترتے تھے، جب سختیاں اور مشکلات کوہِ گراں بن کر راہِ خدا میں جہاد کرنے والوں کے حوصلے پست کردیتیں تو علیؑ کی بلند شخصیت ہی مجاہدینِ اسلام کو حوصلہ اور تسلّی دیتی تھی۔

آپؑ کی نظر میں زندگی کا معنی و مفہوم ہی یہی تھا کہ خدا نے جو قوت و طاقت اور صلاحیتیں آپؑ کو عطا کی ہیں ان سب سے اعلائے کلمۂ حق کے لیے استفادہ کیا جائے اور حق کو زندہ رکھا جائے۔ جی ہاں! علیؑ کی قوتِ ارادی اور جہاد کی برکت سے ہی آج حق زندہ ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں اگر آج دنیا میں حق، عدل اور انسانیت جیسی اصطلاحات کی کوئی قدر و قیمت ہے اور روزبروز انہیں تقویت مل رہی ہے تو یہ بھی امیر المومنین علیؑ کی قربانیوں اور فداکاریوں کا ہی نتیجہ ہے۔

تاریخ بشریت میں علی بن ابی طالبؑ جیسی شخصیات بہت ہی کم گزری ہیں اگر وہ بھی نہ ہوتیں تو آج انسانی قدریں بھی موجود نہ ہوتیں، انسانیت ان خوبصورت اورجاذبِ نظر عنوانات سے عاری ہوتی۔ انسان کے نزدیک زندگی، تمدّن، ثقافت اور اعلیٰ انسانی اہداف و مقاصد نامی اصطلاحات کی کوئی اہمیت نہ ہوتی، بلکہ انسانیت ایک وحشتناک درندگی اور خوفناک حیوانیت کی شکل میں تبدیل ہو چکی ہوتی۔ آج پوری انسانیت اپنے اعلیٰ اہداف اور مقاصد کی حفاظت پر امیر المومنینؑ اور آپؑ جیسے عظیم انسانوں کی زحمتوں اور ان کے کردار کی مرہونِ منت ہے اور یہ سب آپؑ کے جہاد کا اثر ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام کا اندازِ حکومت

امیر المومنین علی علیہ السلام کی زندگی کا ایک اور پہلو آپؑ کا اندازِ حکومت ہے۔ جب اس عظیم اور بزرگ ہستی نے نظامِ حکومت کو اپنے ہاتھ میں لیا تو اس مختصر سی مدت میں وہ کارنامے انجام دیئے کہ اگر سالہا سال بھی دنیا کے لکھاری لکھتے رہیں، تصویر کشی کرنے والے اس کی تصویر کشی کرتے رہیں اور مورّخین قلم چلاتے رہیں پھر بھی جو کچھ لکھا جائے، کہا جائے یا اس کی تصویر کشی کی جائے کم ہے، امیر المومنین علیہ السلام کے دورِ حکومت میں آپؑ کا طرزِ زندگی خود ہی ایک قیامت ہے، آپؑ نے تو حکومت کا معنی ہی بدل کر رکھ دیا۔ آپؑ ایک الٰہی حکومت کا مظہر تھے۔ آپؑ مسلمانوں کے درمیان مجسم آیاتِ قرآنی اور ''أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ''[1] کے کامل مصداق اور مجسمۂ عدلِ مطلق تھے۔ آپؑ فقیروں اور غریبوں کو اپنے قریب رکھتے تھے: ''كَانَ يُقَرِّبُ الْمَسَاكِيْنَ''[2] معاشرے کے پسماندہ اور محروم افراد کا خاص خیال رکھتے تھے اور جو لوگ مال و ثروت کی وجہ سے خود کو ناحق بڑا اور بزرگ ظاہر کیے ہوئے تھے، آپؑ انہیں مٹی کے برابر سمجھتے تھے آپؑ کی نظر میں جو چیز قیمتی تھی وہ ایمان، تقویٰ، اخلاص و جہاد اور انسانیت سے عبارت تھی۔ آپؑ نے اسی طرزِ تفکر کے ساتھ پانچ سال سے بھی کم عرصہ حکومت کی۔ صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی لکھنے والے امیر المومنین علیہ السلام کی خوبیاں لکھ رہے ہیں مگر پھر بھی ابھی تک بہت کم لکھا گیا ہے اور اچھے اچھے مصنّفین اور دانشور اس باب میں اپنی عاجزی و ناتوانی کا اعتراف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

(۳۰۔۰۱۔۱۹۹۱ء)

آپؑ کی سب سے بڑی خصوصیت تقویٰ ہے۔ آپؑ کی کتاب ''نہج البلاغہ'' تقویٰ پر مشتمل ایک کتاب ہے آپؑ کی پوری زندگی بھی تقویٰ پر مبنی ہے۔

(۰۸۔۰۱۔۱۹۹۹ء)

۱۔ وہ کفار کے لیے سخت ترین اور آپس میں انتہائی رحمدل ہیں۔ (سورہ فتح، آیت۲۹)

۲۔ شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، ج۱۸، باب۷۵، ص۲۲۶

قرآن مجید کی یہ آیت ''وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ''[1] بھی آپؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ اس آیت سے مراد امیر المومنین علی علیہ السلام کی ذات ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی جان، یعنی اپنا سب سے قیمتی اور عزیزترین سرمایہ دے کر رضائے الٰہی خرید لیتے ہیں وہ رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر ایسا کرتے ہیں۔ ''وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِي'' یعنی اپنی جان، اپنے نفس کا سودا کرتے ہیں ''ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ'' اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لیے؛ اس کے علاوہ کوئی اور مقصد یا دُنیوی ہدف ان کے مدّ نظر نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی ذاتی دلچسپی یا مفاد پیشِ نظر ہوتا ہے وہ صرف اور صرف رضائے الٰہی کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ لہٰذا اللہ بھی آپؑ کی اس فداکاری اور ایثار کے مقابلے میں مناسب و شائستہ انعام و اکرام سے نوازے گا؛ کیونکہ ''وَاللّٰهُ رَؤُفٌ بِالْعِبَادِ'' اللہ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے۔ اس آیتِ کریمہ کا کامل مصداق علی بن ابی طالب علیہما السلام ہیں۔ میں اس پہلو کو بھی بیان کرتا ہوں۔

آپ تاریخ اُٹھا کر امیر المومنین علیہ السلام کی زندگی کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ آپؑ اپنے بچپن سے، جب آپؑ نو یا تیرہ سال کی عمر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوّت پر ایمان لائے اور مکمل فہم و فراست اور شعور کے ساتھ حقیقت کو پہچان کر اس سے متمسک ہونے سے لے کر اس وقت تک جب آپؑ نے انیس رمضان المبارک کی صبح محرابِ عبادت میں اپنی جان راہِ خدا میں قربان کر دی، یعنی لقائے الٰہی کے شوق میں خوشی خوشی اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی، تقریباً ان پچاس، باون یا ترپین سالوں میں، یعنی دس سال سے لیکر تریسٹھ سال تک کے آپؑ کے کردار میں ایک تسلسل پایا جاتا ہے اور وہ تسلسل ایثار و قربانی اور اپنی جان کے لیے خطرات کو مول لینا ہے۔ اس پچاس سالہ تاریخ میں امیر المومنین علیہ السلام نے جن حالات کا سامنا کیا وہ ابتدا سے لیکر آخر تک مسلسل ایثار و قربانی سے بھرپور ہیں، یہ ہمارے لیے ایک درس ہے۔ میں اور آپ جیسے لوگ جو ہمیشہ یا علیؑ کہتے رہتے ہیں اور دنیا میں علی علیہ السلام کے چاہنے والوں کے نام سے معروف ہیں ہمیں چاہیے کہ ہم امیر المومنین علیہ السلام سے درس حاصل کریں۔ صرف علی علیہ السلام کی محبت

---

[1] سورہ بقرہ، آیت ٢٠٧

یا علی علیہ السلام کے فضائل کی شناخت کافی نہیں ہے۔ ایسے لوگ بہت تھے جو دل سے علی علیہ السلام کے فضائل کا اعتراف کرتے تھے ان میں سے بعض لوگ تو علی علیہ السلام کو ایک پاکیزہ اور معصوم انسان بھی مانتے تھے، لیکن ان کے کردار اور علی علیہ السلام کے کردار میں فرق تھا کیونکہ وہ علی علیہ السلام کی خصوصیات کو اپنا نہیں سکتے تھے؛ یعنی وہ اپنی ذات اور خود پسندی کے حصار میں پھنسے ہوئے تھے اور امیر المومنین علیہ السلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی ذات کے حصار میں گرفتار نہیں تھے۔ لفظ ”میں“ کی آپؑ کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ آپؑ کے ہاں جس چیز کی اہمیت تھی وہ ذمہ داریاں، اہداف اور جہاد فی سبیل اللہ اور اللہ تعالیٰ کی ذات تھی۔

امیر المومنین علیہ السلام کی فداکاری

امیر المومنین علیہ السلام اپنے بچپن میں ہی شہر مکہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر ایمان لے آئے، اس کے ساتھ ہی آپؑ کو کافروں کی طرف سے ایذاء رسانی، تضحیک و تمسخر اور اہانت کا سامنا کرنا پڑا، آپ ذرا ایک ایسے شہر کا تصوّر کیجئے جس کے باسی طبیعی طور پر تشدُّد پسند، تہذیب و تمدّن سے عاری، نرم مزاجی اور سنجیدگی سے تہی دامن، سخت مزاج، جھگڑالو، فسادی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپس میں لڑنے جھگڑنے والے اور اپنے باطل عقائد کے حق میں شدید تعصّب برتتے ہوں، اس قسم کے ناموافق معاشرے میں ایک عظیم انسانؐ نے ایک عظیم انقلابی نظریہ پیش کیا۔

ایک ایسا نظریہ جو اس معاشرے کے عقائد اور آداب و رسوم سمیت تمام چیزوں سے متصادم تھا۔ فطری بات ہے اس معاشرے کے تمام لوگ اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو جائیں گے۔ چناچہ معاشرے کے مختلف طبقات اور عوام نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کی۔ اب ایک ایسے انسان کی حمایت کرتے ہوئے اس کے پیغام پر لبیک کہنا اور اپنی جان کی بازی لگاتے ہوئے اس کی حفاظت پر ڈٹ جانا اور اس سے وابستہ ہونے کا مطلب اپنی جان کے لیے خطرات مول لینا تھا اور امیر المومنین علیہ السلام نے اپنی جان کے لیے خطرات مول لیے۔ یہی آپؑ کے ایثار و فداکاری کا پہلا ثبوت تھا۔ آپؑ تیرہ سال تک سخت ترین

حالات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ڈٹے رہے۔

یہ بات صحیح ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجبوری نیز قریش اور مکہ والوں کے دباؤ کے تحت ہجرت فرما رہے تھے لیکن اس ہجرت کا مستقبل تابناک تھا۔ سب جانتے تھے کہ یہ ہجرت کامیابیوں اور فتوحات کا پیش خیمہ ہے۔ جب ایک تحریک مشکلات و مصائب کے مرحلے سے نکل کر عزّت و سکون کے مرحلے میں داخل ہو رہی ہو، اس وقت عام طور پر سب کی کوشش ہوتی ہے کہ جلد سے جلد موقع سے فائدہ اُٹھائیں اور اگر ہو سکے تو معاشرے میں کوئی عہدہ یا مقام حاصل کر لیں۔ لیکن امیر المومنین علیہ السلام اس اہم موڑ پر رات کی تاریکی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر سونے کی تیاری کر رہے ہیں تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس گھر اور اس شہر سے باہر نکل سکیں۔

اس رات بستر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سونے والے کا قتل ہونا تقریباً قطعی اور یقینی تھا، اب چونکہ میں اور آپ سارے واقعے کو جانتے ہیں اور یہ علم بھی رکھتے ہیں کہ اس واقعے میں امیر المومنین علیہ السلام شہید نہیں ہوئے تھے، لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس وقت بھی سب جانتے تھے، نہیں ایسا نہیں ہے، مسلم بات یہ ہے کہ ایک تاریک رات میں ایک خاص جگہ پر طے یہ ہوا تھا کہ ایک شخص قتل کیا جائے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر کسی کی موجودگی ضروری بھی تھی تاکہ جب جاسوسوں کی وہاں نظر پڑے تو وہ یہ خیال کریں کہ وہاں کوئی موجود ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی مکہ سے نکلنے میں کامیاب ہوں۔ کون حاضر ہے؟ اگرچہ امیر المومنین علیہ السلام کا یہ ایثار اپنی ذات میں خود ایک غیر معمولی اور عظیم کارنامہ ہے لیکن اس ایثار کا خاص وقت اس کی اہمیت میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ یہ وقت کونسا ہے؟ یہ وہ وقت ہے جب مشکلات کا دور ختم ہو رہا ہے۔ اب وقت آپہنچا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ میں جاکر حکومت تشکیل دیں، مدینہ کے لوگ ایمان لا چکے ہیں اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منتظر ہیں۔ سب کو اس بات کا علم ہے، لیکن عین اسی لمحے امیر المومنین علیہ السلام اس جانثاری کا مظاہرہ کرتے ہیں؛ اس قسم کا عظیم اقدام وہی کر سکتا ہے جو ہر قسم کے ذاتی مفاد یا غرض سے ماوراء ہو۔

آنحضرتﷺ کے مدینہ پہنچتے ہی آپؐ کی نوخیز اور نئی حکومت رات دن جہاد میں مشغول ہوگئی، ہر وقت جنگ کا سامنا رہتا تھا اور یہ اس قسم کی حکومت کا خاصّہ بھی ہے۔ جنگ بدر سے بھی پہلے لڑائیوں اور جنگوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا جو آپؐ کی زندگی کے آخری ایام تک جاری رہا، ان دس سالوں کے دوران رسول اکرمﷺ نے کفار (اور مشرکین) کے انواع و اقسام کے قبیلوں کے ساتھ درجنوں جنگیں لڑیں، ان تمام مراحل اور خطرناک لحظات میں امیر المومنینؑ آپؐ کے نگہبان، فدائی اور جانباز محافظ کے طور پر لشکر کی صف اول میں موجود رہتے تھے جیسا کہ خود امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

''وَلَقَدْ وَاسَيْتُهُ بِنَفْسِي فِي الْمَوَاطِنِ الَّتِي تَنْكُصُ فِيهَا الْأَبْطَالُ وَتَتَاخَّرُ فِيهَا الْأَقْدَامُ''[۱]

"میں نے ان مواقع پر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر رسول خداﷺ کی مدد کی جہاں بڑے بڑے پہلوانوں، سورماؤں اور بہادروں کے قدم لڑکھڑا جاتے اور وہ پیچھے ہٹ جاتے تھے۔"

سخت ترین مواقع پر بھی امیر المومنینؑ ڈٹے رہتے تھے۔ آپؑ کو خطرے کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ ایسے مواقع پر کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں اپنی جان بچانی چاہیے تاکہ آئندہ اسلام کی خدمت کر سکیں، لیکن امیر المومنینؑ نے اس قسم کی تاویلات و توجیہات کے ذریعے کبھی اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دیا، کیونکہ امیر المومنینؑ کی عظیم شخصیت فریب کھانے والی نہیں تھی اس لیے ہر قسم کے خطرناک مراحل میں آپؑ صفِ اول میں موجود رہتے تھے۔

رسول اکرمﷺ کی رحلت سے خلافتِ ظاہری تک

جب حضرت رسول اکرمﷺ کا دور اپنے اختتام کو پہنچا اور آپؐ رحلت فرما گئے تو اس کے ساتھ ہی امیر المومنینؑ کی زندگی کا تیس سالہ تلخ ترین دور شروع ہوا۔ جبکہ وہ دور

---

[۱] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۷

بہت پُرلطف اور شیرین تھا جب پیغمبر اسلامؐ زندہ تھے اور آپؐ ان کے زیرِ سایہ جہاد کرتے تھے۔ لیکن آپؐ کی رحلت کے ساتھ ہی یہ دور اپنے اختتام کو پہنچا اور ایک تلخ دور کا آغاز ہوا۔ کیونکہ اس کے بعد وقفے وقفے سے فتنوں کے بادل اس طرح تاریکی سے ہمکنار کرنے لگے کہ آنکھوں کو کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا اور جو لوگ راہِ راست پر چلنا چاہتے تھے ان کے لیے ایک ایک قدم اُٹھانا دشوار تھا۔ ان سنگین حالات میں بھی امیر المومنینؑ نے ایثار و فداکاری کے عظیم ترین باب رقم کیے۔

حضور اکرمؐ کی رحلت کے بعد امیر المومنینؑ اپنی ذمہ داریاں نبھانے میں مصروف ہو گئے، آپؑ اس بات سے بالکل بھی غافل نہ تھے کہ (سقیفہ بنی ساعدہ میں) ایک اجلاس ہو رہا ہے جو عالمِ اسلام کے آئندہ کی حکومت اور مسلمانوں کے اقتدار کی تقدیر کا فیصلہ کرنے والا ہے۔ آپؑ کی نظر میں یہ کوئی اہم مسئلہ نہ تھا بلکہ آپؑ کو تو اپنی ذات کی بھی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

جب خلافت کا فیصلہ ہو چکا اور لوگوں نے ابو بکر کی بیعت کر لی، جو ہونا تھا ہو چکا تو امیر المومنینؑ کنارہ کش ہو گئے۔ آپؑ کی طرف سے کوئی ایسا جملہ، کوئی گفتگو اور کوئی بیان سامنے نہیں آیا جو حکومتِ وقت سے ٹکراؤ اور محاذ آرائی کی نشاندہی کرتا ہو۔

البتہ آپؑ نے ابتدائی دنوں میں یہ کوشش ضرور کی کہ جو چیز آپؑ کی نظر میں صحیح ہے وہ انجام پائے اور حقدار کو مسندِ خلافت پر بٹھایا جائے، لیکن جب آپؑ نے دیکھا کہ لوگ بیعت کر چکے ہیں اور بات ختم ہوگئی ہے کیونکہ ابو بکر مسلمانوں کے خلیفہ بن گئے ہیں، تو اب آپؑ نے ایک ایسے انسان کا موقف اپنایا کہ جس کی طرف سے اپنے تمام تر تحفّظات اور اعتراضات کے باوجود، حکومتِ وقت کو کسی بھی قسم کا خطرہ یا نقصان پہنچنے کا امکان نہ ہو۔ آپؑ کے اس تاریخی کردار کو دنیا جانتی ہے کہ امیر المومنینؑ نے اس دوران، جبکہ ابھی اُس حکومت کو کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا شاید کچھ ہی مہینے ہوئے تھے، فرمایا:

’’لَقَدْ عَلِمْتُمْ أَنِّي أَحَقُّ النَّاسِ بِهَا مِنْ غَيْرِي‘‘

”یقیناً تم لوگوں کو معلوم ہے کہ میں تمام لوگوں سے زیادہ خلافت کا حقدار ہوں۔“

''وَاللهِ لَأُسْلِمَنَّ مَا سَلِمَتْ أُمُورُ الْمُسْلِمِينَ''

”اللہ کی قسم! جب تک مسلمانوں کے اُمور سلامتی کے ساتھ چلتے رہیں گے اور جب تک میں یہ دیکھوں کہ کسی پر ظلم نہیں ہو رہا ہے، اس وقت تک میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش بیٹھا رہوں گا۔“

''وَلَمْ يَكُنْ فِيهَا جَوْرٌ إِلَّا عَلَيَّ خَاصَّةً''[1]

”جب تک میرے سوا دوسروں پر ظلم نہ ہو رہا ہو، معاشرے میں ظلم و جور کی حکمرانی نہ ہو اور ظلم صرف میرے اُوپر ہو رہا ہو تب تک میں کسی سے سروکار نہیں رکھوں گا اور کوئی مزاحمت یا اعتراض نہیں کروں گا۔“

کچھ ہی عرصے بعد شاید ابھی چند مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ لوگوں کے مرتدّ ہونے کا سلسلہ شروع ہوا، شاید اس کے پیچھے بھی مختلف سازشیں کارفرما تھیں۔ بعض عرب قبائل نے یہ احساس کیا کہ اب چونکہ پیغمبر اسلام ﷺ یعنی مسلمانوں کے رہبر اور قائد موجود نہیں ہیں، لہٰذا اب موقع ہے کوئی اعتراض اور اشکال کیا جائے یا جنگ چھیڑی جائے، شاید اس کے پیچھے منافقین کی سازشیں کارفرما تھیں۔ آخر کار ”رِدّہ“ کا واقعہ پیش آیا، یعنی بعض مسلمانوں کے مرتدّ ہونے سے ردّہ کی جنگ کا آغاز ہوا۔ جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی تو امیر المومنین علیہ السلام نے دیکھا کہ یہ کنارہ کشی کا وقت نہیں ہے لہٰذا آپؑ میدان میں اُتر گئے اور اسلام کا دفاع کرنے لگے اور فرمایا: ''فَأَمْسَكْتُ يَدِي''یعنی جب خلافت کا مسئلہ پیش آیا اور ابوبکر مسلمانوں کا خلیفہ بن گیا تو میں نے ہاتھ کھینچ لیا اور کنارہ کش ہو کر بیٹھ گیا:

''حَتَّى رَأَيْتُ رَاجِعَةَ النَّاسِ قَدْ رَجَعَتْ عَنِ الْإِسْلَامِ يَدْعُونَ إِلَى مَحْقِ

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۷۴

دِیْنِ مُحَمَّدٍ - صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ- فَخَشِيْتُ . . .''[۱]

''یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ دین سے پھرنے والے کچھ لوگ دینِ محمدﷺ کو مٹانے پر کمربستہ ہو گئے ہیں تو پھر میں میدان میں اُتر آیا۔''

امیر المومنینؑ ایک فعال کارکن کی صورت میں میدانِ عمل میں اُترے اور تمام اجتماعی اُمور میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ امیر المومنینؑ خلفاء کے پچیس سالہ دور میں اپنے فعال کردار کو وزارت کے عنوان سے یاد کرتے ہیں۔ عثمان کے قتل کے بعد جب لوگ امیر المومنینؑ کی بیعت کرنے آئے تو آپؑ نے فرمایا:

''میرا وزیر ہونا، امیر ہونے سے بہتر ہے۔ مجھے حسب سابق وزیر ہی رہنے دو۔''[۲]

یعنی امامؑ اپنے پچیس سالہ کردار کو وزارت کا نام دیتے ہیں، کیونکہ آپؑ برسراقتدار خلفاء اور حکمرانوں کی مدد کرتے رہے تھے۔ یہ ایک زبردست اور عظیم ایثار تھا۔ انسان یہ دیکھ کر سچ مچ حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ امیر المومنینؑ نے اس معاملے میں کس قدر درگذر اور ایثار کا ثبوت دیا تھا۔ اس پورے پچیس سالہ دور میں امامؑ نے حکومت کا تختہ اُلٹنے، بغاوت کرنے، مقابلہ کرنے اور حکومت پر قبضہ کرنے کی کوئی فکر یا کوشش نہیں کی۔

رسول اکرمﷺ کی رحلت کے وقت امیر المومنینؑ تقریباً بتّیس تینتیس سال کے جوان تھے۔ آپؑ کی جوانی اور جسمانی قوت جوبَن پر تھی، جوانی کا جوش و جذبہ عروج پر تھا۔ آپؑ لوگوں کے درمیان محبوب تھے، ذہین و فطین تھے، بے پناہ علم کے حامل تھے اور ایک انسان میں جتنے کمالات ممکن ہیں، وہ سب آپؑ کے اندر بدرجہ اَتم موجود تھے، اگر آپؑ کوئی باغیانہ اور مخالفانہ اقدام کرنا چاہتے تو یقیناً کرسکتے تھے لیکن آپؑ نے ان پچیس سالوں میں اسلامی معاشرے کے عمومی اور کلی مصالح و مفادات کی حمایت و حفاظت اور خدمتِ خلق کے علاوہ کوئی قدم نہیں اُٹھایا۔ باوجود اس کے کہ اسلامی نظام کی مسندِ اقتدار

---

[۱] نہج البلاغہ، خط نمبر ۶۲

[۲] ''وَ اَنَا لَکُمْ وَزِیْراً خَیْرٌ لَکُمْ مِنِّی اَمِیْراً''۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۹۲)

پر وہ خلفاء براجمان تھے کہ جن سے تاریخ میں کوئی چیز سنی نہیں گئی (کہ انہوں نے امیر المومنین علیہ السلام کی کوئی شکایت کی ہو۔) یہاں بہت سے عظیم اور دلچسپ واقعات موجود ہیں لیکن میں ان تاریخی واقعات کو اس وقت ذکر نہیں کرنا چاہتا۔

خلیفہ دوم کی رحلت کے بعد جب چھ رکنی شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کی دعوت دی گئی تو آپؑ نے ناراضگی کا اظہار نہیں کیا، بلکہ اس میں شریک ہوئے۔ آپؑ نے یہ نہیں کہا کہ یہ میرے مقابلے کے لوگ نہیں ہیں طلحہ و زبیر کہاں، عبد الرحمٰن بن عوف اور عثمان کہاں اور میں کہاں؟ یہ شوریٰ خلیفہ دوم کی وصیت کے مطابق وجود میں آئی تھی تاکہ یہ افراد مل بیٹھ کر کسی ایک کو خلیفہ مقرر کر سکیں۔

ان چھ افراد میں سے آپؑ کے خلیفہ بننے کے امکانات سب سے زیادہ تھے اور عبد الرحمٰن بن عوف کے ووٹ کو فیصلہ کن حیثیت حاصل تھی۔ یعنی امیر المومنین علیہ السلام کے دو ووٹ تھے ایک اپنا اور دوسرا زبیر کا، اور عثمان کے بھی دو ووٹ تھے اپنا اور طلحہ کا اور عبد الرحمٰن بن عوف کے بھی دو ووٹ تھے ایک اپنا اور دوسرا سعد بن ابی وقاص کا، لہٰذا عبد الرحمٰن کے ووٹ کو فیصلہ کن حیثیت حاصل تھی؛ اگر وہ امیر المومنین علیہ السلام کو ووٹ دیتا تو آپؑ خلیفہ بن جاتے اور اگر عثمان کو ووٹ دیتا تو وہ خلیفہ بن سکتے تھے۔

عبد الرحمٰن بن عوف نے سب سے پہلے امیر المومنین علیہ السلام سے مخاطب ہو کر آپؑ کے سامنے یہ شرط رکھی کہ آپؑ کو اللہ کی کتاب یعنی قرآن مجید، سنتِ رسولؐ اور سیرتِ شیخین یعنی ابو بکر اور عمر کی سیرت پر عمل کرنا ہوگا۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: ”نہیں! مجھے اللہ کی کتاب اور سنتِ رسولؐ پر عمل کی شرط تو قبول ہے لیکن شیخین کا طرزِ عمل ان دونوں کا اجتہاد تھا جس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے، میں تو اپنے اجتہاد پر عمل کروں گا“۔ اس موقع پر آپؑ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے اقتدار کی منزل تک پہنچ سکتے تھے، لیکن امیر المومنین علیہ السلام نے ایک لمحے کے لیے بھی ایسا کرنا گوارا نہ کیا جس کے نتیجے میں آپؑ کو اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس موقع پر بھی آپؑ نے ایثار سے کام لیا اور اپنی ذاتی پسند کو اپنے پیروں تلے روند ڈالا۔ کیونکہ آپؑ نے کبھی بھی اپنے ذاتی مفادات کی خاطر اصولوں کے سودے کا سوچا بھی نہیں تھا۔

جب عثمان کے دورِ حکومت کے بارہ سال گزر چکے تو ان پر اعتراضات کی شرح میں اضافہ ہونے لگا۔ اعتراضات کرنے والوں میں سے اکثریت کا تعلق مصر سے تھا جبکہ کچھ لوگ عراق، بصرہ اور دیگر مقامات سے بھی آئے ہوئے تھے۔ یوں ان کی کافی بڑی تعداد جمع ہوگئی تھی، انہوں نے عثمان کے گھر کا محاصرہ کیا ہوا تھا اور خلیفہ کی جان خطرے میں پڑ گئی تھی۔ ان حالات میں امیر المومنین علیہ السلام جیسے شخص کو کیا کرنا چاہیے تھا؟

وہ شخص جو اپنے آپ کو خلافت کا اصلی حقدار سمجھتا ہو، جسے پچیس سال تک اپنے مسلمہ حق سے محروم رکھا گیا ہو اور جسے موجودہ حکمران پر اعتراض بھی ہو، وہی شخص اب دیکھ رہا ہو کہ خلیفہ کا گھر محاصرہ میں ہے تو آپ سوچیں کہ اس کا موقف کیا ہونا چاہیے؟ عام لوگ بلکہ بڑی بڑی شخصیات ان حالات میں کیا طرزِ عمل اختیار کرتی ہیں؟ وہی طرزِ عمل جو طلحہ، زبیر اور عائشہ نے اختیار کیا تھا یا دیگر لوگوں نے جو قتلِ عثمان کے واقعے میں کسی نہ کسی طرح ملوث تھے۔

عثمان کا قتل تاریخ اسلام کے اہم ترین سانحات میں سے ایک ہے۔ نہج البلاغہ اور تاریخ اسلام کے دوسرے مآخذ سے خوب واضح ہوتا ہے کہ انہیں کن لوگوں نے قتل کیا اور اس قتل کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما تھے۔ جن افراد نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے عثمان سے اپنی عقیدت کے اظہار کا سہارا لیا اور ان کی حمایت کا ڈھنڈورا پیٹا تھا، انہوں نے ہی لوگوں کو اکسایا اور خلافت کی پشت پر خنجر گھونپ دیا۔

عمرو عاص سے جب پوچھا گیا کہ عثمان کو کس نے قتل کیا؟ تو اُس نے (ایک صحابی کا نام لیکر) کہا: فلاں نے تلوار بنائی، فلاں نے اس کی دھار کو تیز کیا اور فلاں نے تلوار کو زہر سے مسموم کیا اور فلاں نے اس تلوار سے عثمان پر وار کر دیا اور حقیقت میں بھی ایسا ہی تھا۔

اس سانحے میں امیر المومنین علیہ السلام نے کمالِ اخلاص کے ساتھ وہ کردار ادا کیا جسے آپ اپنی شرعی اور اسلامی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ تاریخ کی مسلمہ حقیقتوں میں سے ایک یہ ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام نے حسنین علیہما السلام کو جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دو گراں بہاء گوہر اور

یاد گار تھے، عثمان کی حفاظت کے لیے بھیجا خلیفہ کا گھر محاصرے میں تھا اور کھانے پینے کی چیزیں اندر لے جانے کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔ اِن حالات میں امامؑ نے خلیفہ کے گھر کے اندر سامانِ خورد و نوش بھیجا۔ آپؑ نے بار بار ان لوگوں کے ساتھ مذاکرات کیے جو عثمان سے ناراض تھے تاکہ ان کے غیظ و غضب کو کم کیا جا سکے اور جب انہوں نے عثمان کو قتل کر دیا تو حضرت علیؑ بہت سخت ناراض ہوئے۔ اس موقع پر بھی آپؑ نے کسی قسم کی خواہش، خود خواہی اور خود غرضی کا احساس نہیں ہونے دیا جو کہ ہر انسان کے اندر موجود ہوتی ہے، امیر المومنینؑ کے وجودِ مبارک میں اس چیز کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیا۔

قتلِ عثمان کے بعد امیر المومنینؑ ایک معروف و معتبر شخصیت، ایک موقع پرست فرد یا ایک نجات بخش لیڈر کے طور پر حصولِ اقتدار کے لیے آگے بڑھ سکتے تھے، جبکہ لوگ بھی آپؑ کو چاہتے تھے لیکن امیر المومنینؑ نے اقتدار کی طرف توجہ مبذول نہیں کی اور قدرت و حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے کوئی اوچھا اقدام نہیں کیا۔ امیر المومنینؑ کا باطن کس قدر عظیم ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں: ''دَعُونِي وَالْتَمِسُوا غَيْرِي'' ''اے لوگو! مجھے چھوڑ دو اور کسی دوسرے کو تلاش کرو۔'' اگر تم کسی اور کو حکومت کے لیے منتخب کرو گے تو میں اس کے وزیر یا مدد گار کے طور پر کام کروں گا۔ یہ وہ باتیں ہیں جو امیر المومنینؑ نے ان دنوں میں بیان فرمائیں لیکن لوگوں نے اسے قبول نہیں کیا، حقیقت میں بھی وہ امیر المومنینؑ کے علاوہ کسی اور کو مسندِ اقتدار پر دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔

خلافتِ ظاہری کا زمانہ

تمام مسلمان علاقوں نے امیر المومنینؑ کی بیعت کر لی تھی۔ تاریخ اسلام میں امیر المومنینؑ کی بیعت کی طرح کسی کی بیعت نہیں ہوئی۔ صرف شام والوں نے آپؑ کی

ا۔ نہج البلاغہ، خطبہ ٩٢

بیعت نہیں کی۔ اس کے علاوہ تمام مسلمان علاقوں اور بڑے بڑے صحابہ نے آپؑ کی بیعت کی تھی۔ صحابہ میں سے چند ایک نے (جن کی تعداد دس سے بھی کم تھی) امیر المومنین علیہ السلام کی بیعت سے انکار کیا تھا۔ امیر المومنین علیہ السلام نے انہیں مسجد میں طلب کیا اور ان میں سے ہر ایک سے پوچھا کہ وہ بیعت کیوں نہیں کر رہے۔ بیعت نہ کرنے والوں میں عبد اللہ بن عمر، سعد بن ابی وقاص اور چند دوسرے لوگ شامل تھے۔ جب امیر المومنین علیہ السلام نے ان سے بیعت نہ کرنے کی وجہ پوچھی تو ہر کسی نے کوئی نہ کوئی عذر یا بہانہ پیش کیا۔ بعد میں بعض نے بیعت کر لی، لیکن بعض افراد نے جن کی تعداد بہت ہی کم تھی پھر بھی بیعت نہ کی۔ امامؑ نے انہیں آزاد چھوڑ دیا۔

ان کے علاوہ دیگر تمام بڑے بڑے مشہور صحابہ جیسے طلحہ اور زبیر وغیرہ آپؑ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے۔ بیعت لینے سے پہلے امیر المومنین علیہ السلام نے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''وَاعْلَمُوا'' جان لو ''أَنِّي اِنْ اَجَبْتُكُمْ'' اب جب تم اصرار کر رہے ہو کہ میں حکومت کی ذمہ داریوں کو سنبھالوں ''رَكِبْتُ بِكُمْ''[1] اور اگر میں تمہارا مطالبہ مان لوں تو یہ خیال نہ کرنا کہ میں کل فلاں مشہور لوگوں یا سرکردہ افراد یا معروف چہروں اور شخصیات کے دباؤ میں آؤں گا۔ یہ مت سوچنا کہ میں فلاں فلاں کی پیروی یا تقلید کروں گا اور دوسروں کی روش پر چلوں گا ایسا ہرگز نہ ہوگا، بلکہ ''وَاعْلَمُوا أَنِّي اِنْ اَجَبْتُكُمْ رَكِبْتُ بِكُمْ مَا أَعْلَمُ'' میں اسلام کے بارے میں اپنے فہم، اپنے علم و دانش اور اپنی صوابدید کے مطابق تمہیں چلاؤں گا۔ امیر المومنین علیہ السلام نے یوں لوگوں پر اتمامِ حجت کرنے کے بعد خلافت کی ذمہ داریوں کو قبول کیا۔ البتہ اس موقع پر بھی امیر المومنین علیہ السلام مختلف مصلحتوں اور حالات کو مدّنظر رکھتے ہوئے نرم رویّہ اختیار کر سکتے تھے اور لوگوں کے دل موہ لے سکتے تھے لیکن آپؑ نے دو ٹوک ارادے کے ساتھ فیصلہ کن طریقے سے اسلامی اصولوں اور دینی اقدار پر عملدرآمد پر زور دیا۔

یہی وجہ ہے کہ اتنے سارے دشمن علی علیہ السلام کے سامنے صف بستہ ہوگئے۔ امیر المومنین علیہ السلام نے ایک محاذ پر دھوکہ بازوں، فریب کاروں اور مال و دولت کے پجاریوں

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۹۲

سے جنگ لڑی تو دوسرے محاذ پر آپؑ کا مقابلہ اسلام کے جانے پہچانے اور معتبر چہروں سے تھا اور تیسرے محاذ پر آپؑ کا سامنا ایسے لوگوں سے تھا کہ جنھوں نے تقدّس کا نقاب اُوڑھا ہوا تھا، جو بظاہر بڑے عبادت گزار تھے لیکن حقیقت میں وہ روحِ اسلام اور تعلیماتِ اسلامی سے ناآشنا تھے اور امیر المومنین علیہ السلام کے مقام و منزلت کو بھی نہیں پہچانتے تھے اور یہ انتہائی سخت دل اور بداخلاق لوگ تھے۔

امیر المومنین علیہ السلام نے تین محاذوں پر تین الگ الگ نظریات کے حامل لوگوں؛ یعنی ناکثین، قاسطین اور مارقین سے جنگ کی ہے۔ ان میں سے ہر ایک واقعہ درحقیقت آپؑ کے اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل، ایثار اور خود خواہی سے دوری کا واضح ثبوت ہے اور آخر کار آپؑ نے اسی راستے پر جامِ شہادت نوش فرمایا۔ اس لیے آپؑ کے بارے میں کہا گیا کہ امام علی علیہ السلام کو ان کے عدل و انصاف نے خاک و خوں میں غلطاں کیا ہے۔

اگر امیر المومنین علیہ السلام چاہتے تو مصلحت پسندی سے کام لیتے ہوئے عدل و انصاف کو پسِ پشت ڈال دیتے اور اسلامی اصولوں اور دینی اقدار پر اپنی شخصیت اور شان و مقام کو ترجیح دیتے، تو آپؑ کا شمار مقتدر ترین اور کامیاب ترین خلفاء میں ہوتا اور کسی کو آپؑ کے مقابلے میں آنے کی ہمت بھی نہ ہوتی، لیکن امیر المومنین علیہ السلام چونکہ حق و باطل کا معیار ہیں، لہٰذا جو بھی آپؑ کی پیروی کرتے ہوئے آپؑ کو حق مانتا ہے اور آپؑ ہی کی سیرت پر عمل کرنا چاہتا ہے وہ حق پر ہے اور جو بھی آپؑ کو نہیں مانتا وہ باطل پر ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام ایسی ہی شخصیت کا نام ہے۔ اس لیے آپؑ نے اپنی ذمہ داریوں کو نبھاتے وقت ذرّہ برابر بھی خود خواہی اور شخصی مفادات کو مدّ نظر نہیں رکھا، بلکہ آپؑ نے جس راستے کا انتخاب کیا تھا ہمیشہ اسی پر ہی چلتے رہے۔ لہٰذا حقیقت میں امیر المومنین علیہ السلام میزانِ حق ہیں۔ یہ ہے امیر المومنین علیہ السلام کی زندگی۔ ''وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللهِ'' کی آیت صرف آپؑ کی شہادت سے متعلق نہیں ہے کہ آپؑ نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان قربان کر دی (بلکہ) آپؑ نے تو اپنی پوری

زندگی کو اللہ کے لیے وقف کر رکھا تھا۔

(۲۸_۰۴_۱۹۸۹ء)

اس اہم نکتے پر توجہ مرکوز رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اسلامی اصول اور دینی اقدار جو اسلام کے گوشہ نشینی کے دور میں اور ایک چھوٹے سے اسلامی معاشرے کے لیے وضع کیے گئے تھے وہ اصول ایک ترقی یافتہ اور وسیع اسلامی معاشرے کے لیے کارآمد بھی ہیں۔ اسلامی اصول، عدالتِ اسلامی، انسانیت کا احترام، جہاد کا جذبہ، اسلامی اور اخلاقی اقدار جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں وحی الٰہی کی صورت میں نازل ہو چکے تھے اور آپؐ ہی کے ذریعے ممکن حد تک اسلامی معاشرے پر نافذ ہو چکے تھے، لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور کا اسلامی معاشرہ کتنا وسیع تھا؟ دس سال تک تو اسلامی معاشرہ صرف مدینہ تک محدود تھا جو چند ہزار افراد پر مشتمل تھا اور اس کے بعد جب مکہ اور طائف کو فتح کر لیا گیا تب بھی اسلامی مملکت ایک چھوٹے سے علاقے تک محدود تھی جس کے پاس محدود مال و دولت، وسائل کی انتہائی کمی اور ہر طرف غربت ہی غربت تھی، ایک ایسے معاشرے میں اسلامی اقدار کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس دنیا سے رخصت ہوئے پچیس سال بیت چکے ہیں۔ ان پچیس سالوں میں مملکتِ اسلامیہ کوئی دو گنا یا تین گنا یا دس گنا نہیں، بلکہ تقریباً سو گنا وسعت پیدا کر چکی ہے؛ یعنی جب امیر المومنین امام علی علیہ السلام مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے تو اس وقت وسطی ایشیاء سے لیکر شمالی افریقہ (یعنی مصر) تک کے علاقے حکومتِ اسلامی کی عملداری میں داخل ہو چکے تھے۔ اسلامی حکومت کی ہمسایہ دو سپر پاور طاقتوں یعنی ایران اور روم میں سے ایک مکمل طور پر منہدم ہوگئی تھی اور ایران کے تمام علاقے اسلامی حکومت کے زیرِ تسلّط آچکے تھے، جبکہ (مملکتِ) روم کے بھی اہم علاقے جیسے فلسطین کے اطراف کے علاقے، موصل اور دیگر مقامات، اسلام کے قلمرو میں داخل ہو چکے تھے۔ ایک ایسی وسیع سرزمین حکومتِ اسلامی کے زیرِ تسلّط تھی، اس لحاظ سے حکومتِ اسلامی کا خزانہ بھرا ہوا تھا اب فقر وغربت اور غذائی قلت کا کوئی مسئلہ درپیش نہ تھا، سونے کا کاروبار رواج پا چکا تھا، پیسوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ بہت سارا مال و دولت حاصل ہو چکا

تھا۔ حکومتِ اسلامی مالدار ہو چکی تھی۔ بہت سے لوگ حد سے زیادہ مال و دولت کے مالک بن چکے تھے۔ اگر ہم حضرت علی علیہ السلام کو ان کے درمیان سے الگ کر دیں تو ممکن تھا کہ تاریخ یوں فیصلہ کرتی کہ اسلامی اصول اور نبویؐ اقدار اچھے تو تھے مگر وہ صرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس مختصر دور اور اس غریب معاشرے کے لیے تھے لیکن اس کے بعد جب اسلامی معاشرہ وسیع ہو کر مختلف تہذیبوں سے مل گیا، ایران، روم اور دیگر تہذیبوں کے اثرات لوگوں کی زندگیوں میں داخل ہو چکے اور مختلف اقوام و قبائل کے لوگ اسلام کی چھتری تلے آگئے، تو ایسے میں وہ اصول اور قوانین ناکافی ہیں پھر ان اصولوں کے ذریعے اسلامی معاشرے کو چلایا نہیں جا سکتا ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام کا عادلانہ دورِ حکومت

امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے پانچ سالہ دورِ حکومت میں اپنے عمل، اپنی سیرت اور طرزِ حکومت کے ذریعے یہ ثابت کر دیا کہ اگر نظامِ حکومت علی علیہ السلام جیسے مقتدر خلیفہ کے ہاتھ میں ہو تو پھر توحید، عدل و انصاف، لوگوں کے درمیان مساوات اور برابری جیسے نبویؐ دور کے اصول اب بھی قابلِ اِجراء ہیں۔ یہ امیر المومنین علیہ السلام کا ایک ایسا کارنامہ ہے جسے تاریخ نے محفوظ کر دیا ہے۔ اگرچہ حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد اس طریقہ کار کو آگے نہیں بڑھایا گیا، لیکن آپؑ نے یہ ثابت کر دیا کہ اگر مملکتِ اسلامی کا سربراہ، اسلامی معاشرے کے قائدین اور مسئولین، اگر راسخ عقیدے کے ساتھ عمل کرنا چاہیں تو انہی اصولوں کو ایک وسیع و عریض مملکت پر بھی لاگو کر سکتے ہیں اور انہیں لوگوں کے لیے فائدہ مند بھی بنا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مدینہ منورہ جیسے ایک ایسے معاشرے میں عدل و انصاف سے کام لینا، جہاں کی کل آبادی دس سے پندرہ ہزار افراد پر مشتمل تھی اور ایسے معاشرے میں عدل و انصاف سے کام لینا، جہاں کی آبادی لاکھوں بلکہ کروڑوں نفوس پر مشتمل ہو جیسے امیر المومنین علیہ السلام کا دور، تو ان دونوں میں بڑا فرق ہے لیکن حضرت علی علیہ السلام نے اس کام کو عملاً کرکے دکھایا۔ میں یہاں پر امیر المومنین علیہ السلام کے چند اقدامات کا تذکرہ کروں گا جو خود آپؑ ہی کے بیانات اور احکامات سے واضح ہو جاتے ہیں، اگرچہ آپؑ کی زندگی

میں ایسی ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔

لوگوں نے جب آپؑ کے ہاتھوں پر بیعت کرنی چاہی تو آپؑ نے اسے قبول نہیں کیا، لیکن جب لوگوں کا اصرار بڑھ گیا، چھوٹے بڑے قبائل کے سردار، صحابہ کرامؓ سب نے کہا: علی علیہ السلام کے علاوہ ہمیں کوئی اور قبول نہیں، یہ سب حضرتؑ کی خدمت میں پہنچے اور آپؑ کو مجبور کرنے لگے تو آپؑ نے فرمایا: اگر ایسا ہی ہے تو پھر مسجد چلتے ہیں، مسجد میں جاکر آپؑ منبر پر تشریف لے گئے اور ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ اپنے اس خطبے میں آپؑ نے اپنا مدّعا بیان کرتے ہوئے فرمایا: ”اگر میں جہاں کہیں پر بھی دیکھوں کہ بیت المال سے، منتخب اور اثر و رسوخ رکھنے والے معزّز لوگوں کو بغیر استحقاق کے کچھ دیا گیا ہے تو میں اسے واپس بیت المال میں لوٹاؤں گا۔“ آپؑ نے فرمایا: ان چند سالوں میں جنہوں نے بغیر استحقاق کے بیت المال میں سے کوئی چیز اپنے لیے اُٹھائی ہے تو میں اسے واپس لے لوں گا ”لَوۡوَجَدۡتُهُ قَدۡ تُزُوِّجَ بِهِ النِّسَآءُ“ اگرچہ اسے اپنی عورتوں کا مہر قرار دیا گیا ہو یا ”وَمُلِکَ بِهِ الۡإِمَآءُ“ اور اس رقم سے اپنے لیے کنیزیں خریدی گئی ہوں ”لَرَدَدۡتُهُ“[1] میں ان رقوم کو بیت المال میں واپس لوٹاؤں گا۔ لوگوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ میرا طریقہ کار یہ ہے۔

کچھ ہی دنوں کے بعد آپؑ کی مخالفت شروع ہو گئی۔ البتہ معاشرے کا مظلوم اور مستضعف و محروم طبقہ تو دعا کر رہا تھا کہ یہ سلسلہ باقی رہے، لیکن بااثر طبقہ اور وہ لوگ جو اپنے آپ کو اس کا حقیقی مخاطب سمجھ رہے تھے، ظاہر ہے کہ وہ اس بات سے ناراض تھے۔ لہٰذا انہوں نے ایک اجلاس بلایا اور کہنے لگے کہ یہ علی علیہ السلام کیا کرنا چاہتے ہیں؟ ولید بن عقبہ (یہ وہی شخص تھا جو عثمان کے دورِ خلافت میں کوفہ کا گورنر تھا) ان لوگوں کی نمائندگی کرتے ہوئے امام علی علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا اور کہا: اے علیؑ! آپؑ سے ہماری بیعت مشروط ہے: ”نَحۡنُ نُبَایِعُکَ الۡیَوۡمَ عَلَی أَنۡ تَضَعَ عَنَّا مَا أَصَبۡنَاهُ مِنَ الۡمَالِ فِي أَیَامِ عُثۡمَانَ“[2] ہماری شرط یہ ہے کہ ہمارے پاس جو مال و دولت ہے آپؑ اسے ہاتھ نہیں لگائیں گے اور آپؑ کے دورِ خلافت سے پہلے ہم نے جو جائیدادیں حاصل کی ہیں آپؑ کا اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ ولید بن عقبہ کے بعد طلحہ اور زبیر بھی آگئے۔ البتہ

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۵

[2] بحار الانوار، ج ۳۲، ص ۱۹

طلحہ و زبیر اور ولید بن عقبہ کے معاملے میں فرق ہے۔

ولید بن عقبہ کا شمار نو مسلموں میں ہوتا تھا اس کے خاندان کا تعلق اسلام اور انقلاب کے مخالفین سے تھا جو اسلام کے خلاف کئی جنگیں لڑ چکے تھے لیکن جب اسلام غالب آگیا توپیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے آخری دور میں اس نے بھی بنو اُمیہ کے دوسرے افراد کی طرح اسلام قبول کیا تھا، لیکن طلحہ و زبیر کا شمار سابقینِ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریبی اصحاب میں ہوتا تھا، وہ بھی امیر المومنین علیہ السلام کی خدمت میں پہنچ گئے اور گلہ وشکوہ کرتے ہوئے کہنے لگے: ''اِنَّکَ جَعَلْتَ حَقَّنَا فِي الْقَسْمِ کَحَقِّ غَيْرِنَا'' آپؑ نے بیت المال کی تقسیم میں ہمیں دوسروں کے برابر قرار دیا ہے۔ ''وَسَوَّيْتَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ مَنْ لَا يُمَاثِلُنَا'' اور ہمیں ان لوگوں کے برابر سمجھا ہے جو کسی بھی لحاظ سے ہم جیسے نہیں ہیں۔ یہ کونسا طریقہ ہے؟ آخر آپؑ (ہمارے لیے) فرق کے قائل کیوں نہیں ہیں؟ ''مَنْ لَا يُمَاثِلُنَا فِيمَا أَفَاءَ اللهُ تَعَالٰى بِأَسْيَافِنَا وَرِمَاحِنَا''[۱] یہ جو بیت المال ہے ہماری ہی تلواروں اور ہمارے ہی نیزوں کے ذریعہ ملا ہے۔ ہم ہی نے اسلام کو ترقی دی ہے۔ ہم ہی نے زحمتیں برداشت کیں ہیں اور اب آپؑ ہمیں ان لوگوں کے برابر قرار دے رہے ہیں جو تازہ مسلمان ہوئے ہیں، عجمی ہیں اور جن کا تعلق مفتوحہ علاقوں سے ہے؟

امیر المومنین علیہ السلام نے ولید بن عقبہ کو کیا جواب دیا اسے میں نے کہیں نہیں دیکھا، کیونکہ تاریخ نے اسے محفوظ نہیں کیا ہے لیکن دوسرں کو جواب دیا ہے۔ آپؑ منبر پر تشریف لے گئے اور بہت ہی تند وتیز لہجے میں جواب دیا۔ آپؑ نے بیت المال کے برابر تقسیم کرنے کے حوالے سے فرمایا: ''فَإِنَّ ذَلِکَ أَمْرٌ لَمْ أَحْكُمْ فِيهِ بَادِئَ بِدْءٍ'' اس طریقہ کار کا بنیاد گزار میں تو نہیں ہوں ''قَدْ وَجَدْتُ أَنَا وَأَنْتُمَا رَسُولَ اللهِ يُحْكَمُ بِذَلِکَ''[۲] میں اور آپ سب نے دیکھا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی طرح کیا کرتے تھے، میں نے کوئی نیا کام تو نہیں کیا ہے بلکہ میں تو آپؐ کی اسی روش پر عمل کر رہا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ وہی اقدار اور بنیادی و عملی عقائد آج کے معاشرے میں بھی نافذ کروں۔ حضرت علی علیہ السلام نے انہیں نافذ بھی کر دیا اور اس کی قیمت بھی چکائی۔

۱۔ بحار الانوار، ج۳۲، ص۲۱

۲۔ بحار الانوار، ج۳۲، ص۲۲

آپؑ نے اپنے اس کام کی قیمت کو تین جنگوں کی صورت میں ادا کیا۔ یہ بات تو واضح ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام خلافت کو اپنا حق سمجھتے تھے، لیکن جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد ایسا نہ ہو سکا تو آپؑ نے اپنے اس مسلمہ حق کے دفاع کے لیے کسی قسم کی جدّوجہد نہیں کی اور پچیس سال تک صبر کیا۔ اگر کوئی دوسرا شخص بھی اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہتا تو آپؑ اسے بھی خاموش کرا دیتے تھے: ''إِنَّکَ لَقَلِقُ الْوَضِیْنَ تُرْسِلُ فِي غَیْرِ سَدَدٍ... وَدَعْ عَنْکَ نَھْباً صِیْحَ فِي حَجَرَاتِهِ''[1] امیر المومنین علیہ السلام سے منسوب اس قسم کے واقعات بہت زیادہ ہیں۔ آپؑ نے اس معاملے پر پچیس سال تک کوئی ردّ عمل ظاہر نہیں کیا، لیکن ایک ایسے مسئلے پر جو بظاہر اس پہلے والے مسئلہ (خلافت) سے کمتر دکھائی دیتا ہے، یعنی مسئلہ عدالتِ اجتماعی، مسئلہ احیائے اقدار نبویؐ اور اسلامی اصولوں کے احیاء کے لیے آپؑ نے تین جنگیں؛ یعنی جنگ جمل، جنگ صفین اور جنگ نہروان لڑی ہیں۔ آپ اندازہ کیجیے کہ امیر المومنین علیہ السلام کی نظر میں یہ کتنا اہم کام تھا۔ یہی امیر المومنین علیہ السلام کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس بارے میں امیر المومنین علیہ السلام کا ایک اور فرمان بھی موجود ہے اگر ہم علوی معارف سے آشنا ہو جائیں تو بُرا نہیں ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں: ''لَا تَمْنَعَنَّکُمْ رِعَایَةُ الْحَقِّ لِأَحَدٍ عَنْ إِقَامَةِ الْحَقِّ عَلَیْهِ''[2] یعنی اگر کوئی انسان مومن ہے، کوئی مجاہد فی سبیل اللہ ہے، اس نے زحمتیں اُٹھائی ہیں، محاذ جنگ پر رہا ہے، بڑے بڑے کار نامے انجام دیئے ہیں؛ تو ایسے شخص کے حقوق کا احترام کرنا تم پر واجب ہے اور اگر کسی موقع پر یہی شخص کوئی خطا کرے اور کسی کا حق ضائع کر دے تو اس کے سابقہ کارناموں کو اس خطا کی سزا دینے میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے؛ لہٰذا مسائل کو ایک دوسرے سے الگ الگ کریں۔ اگر کوئی اچھا آدمی ہے، کوئی اہم شخصیت ہے، اس کا ماضی شاندار رہا ہے، اس نے اسلام اور مملکت کے لیے زحمتیں اُٹھائی ہیں تو بہت اچھا، اس کا حق محفوظ ہے اور وہ ہمارے لیے قابلِ احترام ہے۔ لیکن اگر یہی شخص کوئی خطا کر بیٹھے تو اس کی گزشتہ اچھائیوں کی وجہ سے اس کی اس خطا کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ یہی

---

[1] ۱۔ تم بہت کم حوصلہ ہو اور غلط راستے پر چل پڑے ہو۔۔۔ اور اس لوٹ مار کا ذکر چھوڑو جس کا شور چاروں طرف مچا ہوا تھا۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۱۶۲)

[2] ۲۔ غرر الحکم و درر الکلم، ص۶۹

امیر المومنین علیہ السلام کی منطق ہے۔

نجاشی نامی ایک شاعر جس کا شمار امیر المومنین علیہ السلام کے چاہنے والوں اور آپؑ کے مداحوں میں ہوتا تھا جس نے جنگ صفین میں اپنے بہترین اشعار کے ذریعے لوگوں کو معاویہ کے خلاف جنگ پر اُبھارا تھا، جو اخلاص، ولایت پذیری اور اپنے سابقہ کارناموں کی وجہ سے مشہور تھا۔ اس نے ایک مرتبہ ماہ رمضان المبارک میں شراب نوشی کی اور جب امیر المومنین علیہ السلام کو اطلاع ملی تو آپؑ نے فرمایا: شراب نوشی کی سزا تو معیّن ہے اسے لایا جائے تاکہ اس پر حدّ جاری کی جا سکے۔ امیر المومنین علیہ السلام نے لوگوں کے سامنے اُس پر شراب نوشی کی حدّ جاری کی اور اسے کوڑے مارے۔

نجاشی کے خاندان اور اس کے قبیلہ والوں کو جب پتا چلا تو وہ امیر المومنین علیہ السلام کی خدمت میں پہنچ گئے اور کہنے لگے: یا علیؑ! آپؑ نے تو ہمیں بے آبرو کر دیا، وہ تو آپؑ کے چاہنے والوں اور دوستوں میں سے تھا، یعنی آج کی اصطلاح میں آپؑ ہی کی پارٹی کا تھا۔ آپؑ نے فرمایا: میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا ہے ایک مسلمان نے ایک غلط کام کیا تھا جس کی وجہ سے اُس پر ایک حدّ الٰہی واجب ہوگئی تھی اور میں نے اس حدّ کو جاری کر دیا ہے۔

البتہ نجاشی نے امیر المومنین علیہ السلام کے ہاتھ سے کوڑے کھانے کے بعد کہا: اگر ایسا ہے تو پھر آج کے بعد میں معاویہ کے بارے میں شعر کہوں گا یہ کہہ کر وہ امیر المومنین علیہ السلام سے جدا ہو گیا اور معاویہ کے کیمپ سے ملحق ہو گیا۔

اس موقع پر امیر المومنین علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ ہمیں افسوس ہوا کہ نجاشی ہمارے ہاتھ سے نکل گیا اسے روکنا چاہیے۔ نہیں! بلکہ آپؑ نے فرمایا: اگر وہ جارہا ہے تو جانے دو، البتہ نہ جاتا تو بہتر تھا۔ یہ تھی امیر المومنین علیہ السلام کی منطق اور آپؑ کا طریقہ کار۔ آپؑ نے نجاشی کے دوستوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''فَهَلْ هُوَ إِلَّا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ اِنْتَهَکَ حُرْمَةً مِنْ حُرُمِ اللّٰهِ فَأَقَمْنَا عَلَيْهِ حَدّاً كَانَ كَفَّارَتَهُ''[1] یعنی ہمارے حدّ جاری کرنے سے اس

---

[1] ا۔ کیا وہ مسلمانوں میں سے نہیں ہے؟ اس نے حکم الٰہی کی حرمت کو پامال کیا تھا اور ہم نے بھی ایک حد کو جو اس کا کفارہ ہے اس پر جاری کیا ہے۔ (الحیاۃ، مترجم: احمد آرام، ج۲، ص۷۱۴)

کے گناہ جھڑ گئے۔

قبیلہ بنی اسد، جو حضرت علی علیہ السلام کے رشتہ دار بھی تھے ان کے ایک شخص پر کوئی حدّ واجب ہو گئی تھی، اس قبیلہ کے بعض لوگ جو امیر المومنین علیہ السلام کے چاہنے والے تھے، کہنے لگے کہ جا کر اس مسئلے کو حل کرتے ہیں اور وہ پہلے حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے تاکہ آپؑ کو امام علیؑ کے پاس واسطہ اور سفارش قرار دیں۔

امام حسن علیہ السلام نے فرمایا: میرے جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، آپ لوگ خود ہی چلے جائیں کیونکہ میرے بابا آپ سب کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ لوگ خود ہی حضرتؑ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ہمارے لیے یہ مشکل درپیش ہے، لہٰذا ہماری مدد کیجیے۔ حضرتؑ نے فرمایا: جو کام میرے اختیار میں ہوگا میں اسے ضرور انجام دوں گا۔ یہ لوگ خوشی خوشی وہاں سے نکل گئے راستے میں جب ان کی ملاقات امام حسن علیہ السلام سے ہوئی تو آپؑ نے پوچھا کہ آپ کے کام کا کیا ہوا؟ کہنے لگے الحمد للہ اچھا ہو گیا حضرتؑ نے ہم سے وعدہ کیا ہے۔

امام حسن علیہ السلام نے پوچھا کہ حضرتؑ نے تم سے کیا وعدہ کیا ہے؟ کہنے لگے کہ ہم سے وعدہ کیا ہے کہ جو کام ان کے اختیار میں ہوگا وہ ضرور کریں گے۔ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام مسکراتے ہوئے کہنے لگے: تو پھر جاؤ جاکر حدّ جاری کروانے کی تیاری کرو۔ بعد میں جب امیر المومنین علیہ السلام نے اس شخص پر حدّ جاری کی تو وہ لوگ آکر اعتراض کرنے لگے: یاعلی علیہ السلام ! اس شخص پر کیوں حدّ جاری کی ہے؟ آپؑ نے فرمایا: حدّ تو میرے اختیار میں نہیں ہے یہ حکمِ الٰہی ہے میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ جو کچھ میرے اختیار میں ہوگا وہ انجام دوں گا اور حدّ میرے اختیار میں نہیں ہے۔[۱] جبکہ بنی اسد امیر المومنین علیہ السلام کے چاہنے والوں اور مخلصوں میں سے تھے یہ حضرت علی علیہ السلام کا طرزِ زندگی تھا۔

---

[۱] دعائم الاسلام، ج۲، ص۴۴۳

امیر المومنین علیہ السلام کی سادہ زندگی

آپؑ کے اور آپؑ کے بچوں کے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور ان کی معیشت کے بارے میں بہت سی باتیں نقل کی گئی ہیں، راوی کہتا ہے کہ ایک دن میں نے دیکھا کہ حسنین علیہما السلام بیٹھے کھانا کھا رہے تھے، ان کا کھانا روٹی، سرکہ اور سبزی پر مشتمل تھا۔ میں نے کہا: اے شہزادو! آپ امیر المومنین علیہ السلام کے بیٹے ہو، آپؑ کا تعلق حکمران گھرانے سے ہے، بازار میں کھانے پینے کی اتنی ساری چیزیں دستیاب ہیں: ''وَ فِي الرَّحْبَةِ مَا فِيهَا'' یعنی رحبہ (کوفہ کے نزدیک ایک جگہ کا نام ہے) میں بھی اتنا کچھ موجود ہے کہ لوگ وہاں سے استفادہ کرتے ہیں اور آپ شہزادوں کا کھانا یہ ہے؟ حسنین علیہما السلام نے راوی کی طرف رخ کرکے کہا: ''مَا اَغْفَلَکَ عَنْ اَمِيْرِالْمُؤْمِنِيْنَ''[1] یعنی تم امیر المومنین علیہ السلام کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، جاؤ جا کر ان کی زندگی کو دیکھ لو! حضرتؑ کا اپنے اہل خانہ کے ساتھ بھی یہی سلوک تھا۔

آپ نے حضرت زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا کا ابو رافع سے (ایک گلوبند) امانت لینے کا واقعہ سنا ہوگا اور اسی طرح جناب عقیل کا واقعہ بھی سنا ہوگا کہ وہ حضرتؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور آپؑ سے مدد مانگی تھی: ''صَاعٌ مِنْ بُرٍّ'' وہ تھوڑی اضافی گندم چاہتے تھے، لیکن حضرتؑ نے دہکتا ہوا لوہا اُٹھایا اور ان کے قریب لے جا کر ڈرایا اور ان کی درخواست قبول نہیں کی۔ عبد اللہ بن جعفر جو آپؑ کے بھتیجے اور داماد یعنی حضرت زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا کے شوہر نامدار تھے، حضرتؑ کی خدمت میں آکر عرض کرتے ہیں: چچا جان! میں تنگ دست ہو گیا ہوں اور گھریلو ساز و سامان فروخت کرنے پر مجبور ہوں، لہٰذا میری مدد کیجئے، لیکن آپؑ نے ان کی درخواست کو قبول نہیں کیا اور فرمایا: کیا تم مجھ سے یہ کہنا چاہتے ہو کہ تمہارا چچا جاکر چوری کرے اور لوگوں کا مال اُٹھا کر تمہیں دے دے۔

امیر المومنین علی علیہ السلام نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کی طرح اپنے زمانے کی ایک ترقی یافتہ، وسیع، متمدّن اور دولتمند حکومت کے ذریعے ایک معاشرے پر اسلامی حکومت

---

[1] ١۔ المناقب، ج٢، ص١٠٨

کی سمت کو معیّن اور واضح کر دیا۔ اس دور میں ہر شعبے میں ترقی ہوئی تھی، لیکن حضرت علی علیہ السلام نے اپنے عمل کے ذریعے یہ ثابت کر دیا کہ اس صورت میں بھی انھی اصولوں کو زندہ رکھا جا سکتا ہے اور یہ امیر المومنین علیہ السلام کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ معنویت، عدالت، جہاد، لوگوں کی اصلاح، نیک اور شائستہ منتظمین کی تربیت جیسے اصولوں سے آپؑ کی زندگی پُر ہے، جن کے بارے میں آپ حضرات متعدّد بار مختلف روایتوں اور داستانوں میں سن چکے ہیں۔ یہ تمام چیزیں اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ تمام حالات میں ان اصولوں پر عمل کیا جا سکتا ہے اور یہ ایک مسلم حقیقت بھی ہے۔ اسلامی اصول سے مراد حضرتؑ کا وہ لباس نہیں، جو لباس امیر المومنین علیہ السلام پہنتے تھے کہ آج ہم بھی وہی لباس پہننا شروع کر دیں؛ بلکہ اسلامی اصولوں سے مراد، عدالت، توحید، لوگوں سے عدل و انصاف، لوگوں کے حقوق کا احترام، کمزوروں کی مدد، دین اور اسلام کے مخالفین کا مقابلہ، حق اور حقیقت کے اصولوں کی پابندی اور اُن کا دفاع وغیرہ ہیں، یہ سب وہ چیزیں ہیں جو ہر دور میں قابل اِجراء ہیں۔

البتہ آج جب ہم یہ باتیں کر رہے ہیں تو حقیقت میں انسانیت کی اس بلند ترین چوٹی کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ کیا کوئی شخص امیر المومنین علیہ السلام جیسا بننے کا تصوّر بھی کر سکتا ہے؟ نہیں، کوئی بھی شخص آپؑ جیسا نہیں بن سکتا۔ امام زین العابدین علیہ السلام جو حضرت علی علیہ السلام کے پوتے تھے اور امامت و عصمت کے مقام پر بھی فائز تھے، جب آپؑ سے پوچھا گیا کہ آپؑ اتنی زیادہ عبادت کرتے ہیں، تو آپؑ نے فرمایا: ہماری عبادت کہاں اور امیر المومنین علی علیہ السلام کی عبادت کہاں؟ یعنی امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں علیؑ کے ساتھ موازنہ کے قابل نہیں ہوں۔ جبکہ امام زین العابدین علیہ السلام اور ہمارے آج کے زمانے کے بہترین عابدوں اور زاہدوں کے درمیان بھی ہزاروں فرسخ کا فاصلہ ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام جنھوں نے نمونہ، عظمت کی بلند چوٹی اور حرکت کے رُخ کی نشاندہی کرتے ہوئے سمت کا تعیُّن کر دیا ہے۔ اب جہاں تک ہم سے ہو سکے اسلامی نظام اور نظامِ عدل و انصاف پر چلتے ہوئے لوگوں کے اُمور کی دیکھ بھال کریں، انسانی

حقوق کا احترام کریں اور ظالم کے مقابلے میں مظلوم کی حمایت کریں۔

کیونکہ پوری تاریخ میں انسانوں کی مشکلات یہی چیزیں رہی ہیں، بشریت ہمیشہ انہی مشکلات میں گرفتار رہی ہے اور آج بھی گرفتار ہے۔ اقوام انہی زور اور زبردستیوں سے نقصانات اُٹھاتی ہیں اور ان کی زندگیاں دُشوار ہو جاتی ہیں۔ اسلام، امیر المومنین علیہ السلام کی منطق اور حکومتِ علویؑ کی منطق ایسی چیزوں کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کرنے سے عبارت ہے، چاہے ایسے ظالم کسی ایک معاشرے کے اندر طاقت کے استعمال کے ذریعہ ظلم و جور کا بازار گرم کرنا چاہتے ہوں یا عالمی اور بین الاقوامی سطح پر کوئی ایسا کام کرنا چاہتے ہوں۔

(۰۵-۱۱-۲۰۰۴ء)

حضرت علی علیہ السلام کی زندگی میں اقتدار، مظلومیت اور کامیابی

اس عظیم اور بزرگوار شخصیت کی زندگی میں تین عناصر جو بظاہر ایک دوسرے سے کوئی زیادہ میل نہیں کھاتے، جمع ہوگئے ہیں۔ وہ تین عناصر درج ذیل ہیں: اقتدار، مظلومیت اور کامیابی۔

آپؑ کے اقتدار سے مراد آپؑ کی فولادی قوتِ ارادی، آپؑ کا عزم مصمّم، آپؑ کا مشکل سے مشکل فوجی اور جنگی میدانوں میں سرگرمِ عمل ہو کر عالی ترین اسلامی اور انسانی مفاہیم کی طرف ذہنوں اور فکروں کی ہدایت کرتے ہوئے مالک اشترؓ، عمار، ابن عباس اور محمد بن ابی بکر جیسے افراد کی تربیت کرنا اور تاریخ بشریت میں ایک انقلاب کی بنیاد ڈالنا ہے۔ ان بزرگوار کا مظہرِ اقتدار، منطق کی حاکمیت، فکر و سیاست کی بالادستی، اقتدارِ حکومت جو کہ آپؑ کے شجاع و توانا بازو کا اقتدار تھا۔

امیر المومنین علیہ السلام کی ذاتِ والا صفات میں کہیں بھی کوئی کمزوری نہیں پائی جاتی، مگر اس کے باوجود آپؑ تاریخ کے مظلوم ترین انسان ہیں۔ آپؑ کی زندگی کے ہر پہلو میں مظلومیت نمایاں تھی، آپؑ نوجوانی کے دوران بھی مظلوم واقع ہوئے تھے، جوانی میں

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد سے مظلوم تھے، بڑھاپے میں مظلوم تھے، شہادت کے بعد بھی برسہا برس تک منبروں سے آپؑ کو بُرا بھلا کہا جاتا رہا، جھوٹی تہمتیں لگائی گئیں یہاں تک کہ آپؑ کی شہادت بھی مظلومانہ تھی۔

تمام اسلامی آثار میں دو شخصیات ایسی ہیں جن کو ''ثَارَاللہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ البتہ فارسی زبان میں ہمارے پاس اس عربی لفظ ''ثار'' کا کوئی متبادل لفظ نہیں پایا جاتا، جس کو ہم پیش کر سکیں۔ عربی میں اس وقت لفظِ ''ثار'' استعمال ہوتا ہے جب کسی خاندان کا کوئی فرد ظلم و ستم کے ذریعے قتل کر دیا جاتا ہے اور مقتول کا خاندان خون بہا کا مالک ہوتا ہے اسی کو ''ثار'' کہتے ہیں کہ یہ خاندان والے خون بہا کا حق رکھتے ہیں، اگر اس کے معنی میں کہیں خونِ خدا کہا جاتا ہے تو یہ لفظِ ''ثار'' کی ایک ناقص اور بہت نارسا تعبیر ہے، اس کا مکمل مفہوم اس سے واضح نہیں ہوتا، تاریخ اسلام میں دو لوگوں کا نام آیا ہے کہ جن کے خون بہا کا حق خدا کو ہے، ان میں سے ایک امام حسین علیہ السلام ہیں اور دوسری شخصیت آپؑ کے والد گرامی امیر المومنین امام علی علیہ السلام ہیں: ''یَا ثَارَ اللّٰہِ وَابْنَ ثَارِہِ''، یعنی آپؑ کے والد بزرگوارؑ کے خون بہا کا حق بھی خداوند کریم کو ہے۔

اور تیسرا عنصر امیر المومنین امام علی علیہ السلام کی کامیابی ہے کہ سب سے پہلے آپؑ اپنی زندگی کے ان تمام دشوارترین حالات، جو آپؑ پر مسلّط کیے گئے تھے، میں کامیاب ہوئے؛ یعنی دشمن اپنے تمام تر کمرتوڑ محاذوں کے باوجود آپؑ کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور نہ کر سکا بلکہ خود دشمن کو ہی آپؑ کے ہاتھوں شکست کھانی پڑی۔ آپؑ کی شہادت کے بعد بھی روز بروز آپؑ کی درخشاں حقیقت اور شخصیت آشکار ہوتی چلی گئی، بلکہ آپؑ کی زندگی کی تابندگی سے بھی زیادہ آشکار ہوگئی۔

آج آپ دنیا پر نظر ڈالیں تو نہ صرف دنیائے اسلام، بلکہ پوری دنیا میں علی علیہ السلام کے گن گانے والے موجود ہیں یہاں تک کہ جو لوگ اسلام کو نہیں مانتے وہ بھی علی بن ابی طالب علیہما السلام کو تاریخ کی ایک درخشاں شخصیت کے طور پر قبول کرتے ہیں اور یہ وہی درخشاں حقیقت ہے جس کی تابندگی آشکار ہوئی ہے۔ یہ وہ انعام ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آپؑ کی مظلومیت کے صلے میں عطا فرمایا ہے۔ آپؑ کی وہ مظلومیت، آپؑ

کا گلا گھونٹنے کی وہ کوششیں، آپؑ پر ناروا تہمتیں لگا کر خورشید کے چہرے کو دُھندلا کرنے کی کوششیں اور ان تمام چیزوں کے مقابلے میں آپؑ نے جس صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا، آخر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ انعام تو ہوگا۔ آپؑ کے لیے اللہ کا انعام یہ ہے کہ ہم تاریخ بشریت میں کوئی ایسا چہرہ نہیں دکھا سکتے جو آپؑ سے زیادہ تابناک، درخشاں اور تمام لوگوں کے لیے قابل قبول ہو۔

شاید آج تک امیر المومنین علیہ السلام کے بارے میں لکھی گئی کتابوں میں، سب سے زیادہ محبت آمیز اور عاشقانہ انداز کی کتابیں اکثر غیر مسلموں کی لکھی ہوئی ہیں، مجھے یاد ہے کہ تین عیسائی مصنّفین نے حضرت علی علیہ السلام کی مدح و ستائش میں جو کتابیں لکھی ہیں وہ واقعاً عاشقانہ انداز میں لکھی گئی ہیں۔ امیر المومنین علیہ السلام سے محبت اور عقیدت روز اول ہی سے شروع ہوئی؛ یعنی آپؑ کی شہادت کے بعد سے، جب آپؑ کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے کا بازار گرم تھا، حکومتِ شام سے وابستہ صاحبانِ اقتدار اور ان کے پیروکار جن کے دلوں کا، علیؑ کی تلوار اور عدالت نے خون کر دیا تھا وہ آپؑ کے خلاف سرگرمِ عمل تھے۔ آپؑ سے اظہارِ محبت کا آغاز اسی وقت سے شروع ہوا تھا، میں یہاں پر اس سلسلے میں ایک مثال آپ کی خدمت میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

جب انسان تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے تو ان حقائق کو سمجھ سکتا ہے۔ خاندانِ زبیر میں سوائے مصعب بن زبیر کے سب لوگ علی علیہ السلام سے بُغض و عناد رکھتے تھے، مصعب بن زبیر ایک شجاع اور سخی آدمی تھا جس نے کوفہ میں حضرت مختار کے ساتھ جنگ کی اور بعد میں عبد الملک سے بھی جنگ لڑی، اس کے علاوہ آل زبیر کے تمام لوگ پشت در پشت حضرت علی علیہ السلام سے بُغض و عناد رکھتے تھے۔ عبد اللہ بن عروہ بن زبیر کے بیٹے نے اپنے باپ کے سامنے امیر المومنین علیہ السلام کی بدگوئی کی، جب لڑکے نے بُرا بھلا کہا تو اس کے باپ نے ایک جملہ کہا اگرچہ وہ جملہ مکمل طور پر علی علیہ السلام کے حق میں تو نہیں، مگر اس میں ایک اہم نکتہ موجود ہے جسے میں بیان کرنا چاہتا ہوں (وہ یہ ہے) عبد اللہ اپنے بیٹے سے کہتا ہے: ’’وَاللهِ مَا بَنَى النَّاسُ شَيْئاً قَطُّ إِلَّا هَدَمَهُ الدِّيْنُ وَلَا بَنَى الدِّيْنُ شَيْئاً

فَاسۡتَطَاعَتِ الدُّنۡیَا هَدَمَهُ''[۱] خدا کی قسم! دین نے جس چیز کی بنیاد ڈالی یعنی جس چیز کی دین پر بنیاد رکھی گئی، اہلِ دنیا نے لاکھ اسے مٹانے کی کوشش کی مگر اسے نہ مٹا سکے؛ یعنی بلا وجہ ہی زحمت کی۔ اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا۔ علی علیہ السلام کو بدنام کرنے اور ان کے چہرے کو غبارآلود کرنے کی خوامخواہ کوشش نہ کرو (کیونکہ) علی علیہ السلام کے ہر کام کی بنیاد دین اور ایمان پر ہے۔ پھر مزید کہتا ہے: ''أَلَمۡ تَرَ إِلَی عَلِيٍّ کَیۡفَ تُظۡهِرُ بَنُوۡ مَرۡوَانَ مِنۡ عَیۡبِهِ وَ ذَمِّهِ وَاللهِ لَکَأَنَّمَا یَأۡخُذُوۡنَ بِنَاصِیَتِهِ رَفۡعاً إِلَی السَّمَآءِ'' ذرا دیکھو کہ بنو مروان کس طرح ہر موقع و مناسبت پر منبر سے علی علیہ السلام کی عیب جوئی اور بدگوئی کرتے ہیں! مگر ان کی یہ عیب جوئی اور بدگوئی آپؑ کے درخشان چہرے کو اور بھی روشن کرتی ہے۔ یعنی لوگوں کے ذہن میں ان کے اس عمل کا برعکس اثر پڑتا ہے۔ علی علیہ السلام کے مقابلے میں بنو اُمیہ ہیں: ''وَمَا تَرَیٰ مَا یَنۡدِبُوۡنَ بِهِ مَوۡتَاهُمۡ مِنَ الۡمَدِیۡحِ وَاللهِ لَکَأَنَّمَا یَکۡشِفُوۡنَ بِهِ عَنِ الۡجِیۡفِ''[۲] بنو اُمیہ اپنے آباء واجداد کی تعریفیں کرتے پھرتے ہیں مگر وہ ان کی جتنی ستائش کرتے ہیں، ان کے متعلق لوگوں کی نفرت مزید بڑھتی جاتی ہے۔ یہ باتیں تقریباً حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے کوئی تیس سال بعد کی ہیں، یعنی امیر المومنین علیہ السلام اپنی تمام تر مظلومیت کے باوجود اپنی زندگی میں بھی، تاریخ میں بھی اور لوگوں کے اذہان و افکار میں بھی کامیاب رہے ہیں۔

آپؑ کی مظلومیت کے ساتھ آپؑ کی حکومت کا جو خاتمہ ہوا اس کا خلاصہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ آپؑ کے دورِ حکومت میں (جس کی مدت پانچ سال سے بھی کم تھی) تین قسم کے گروہوں نے آپؑ کے مقابلے میں صف آرائی کی: قاسطین، ناکثین اور مارقین۔ اہلِ تشیع اور اہلِ سنت دونوں کی کتابوں میں امیر المومنین علیہ السلام سے یہ روایت نقل کی گئی ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

''أُمِرۡتُ أَنۡ أُقَاتِلَ النَّاکِثِیۡنَ وَ الۡقَاسِطِیۡنَ وَ الۡمَارِقِیۡنَ''[۳] اور (ان لوگوں کے) یہ

---

[۱] ۔ نثر الدر، ج۳، ص۱۸۶

[۲] ۔ نثر الدر، ج۳، ص۱۸۶

[۳] ۔ میں ناکثین، قاسطین اور مارقین کے ساتھ جنگ پر مامور کیا گیا ہوں۔ (بحار الانوار، ج۴۴، ص۳۶)

نام بھی آپؑ نے خود ہی رکھے ہیں۔ قاسطین کے معنی ستمگر اور ظالم کے ہیں، عربی قاعدے کے لحاظ سے جب لفظ ''قسط'' مجرد استعمال ہوگا (جیسے: قَسَطَ یَقْسِطُ، یعنی جَارَ یَجُوْرُ، ظَلَمَ یَظْلِمُ) تو یہ ظلم کرنے کے معنی میں ہوگا اور اگر یہی مادّہ ثلاثی مزید اور باب اِفعال میں لے جایا جائے تو پھر عدل و انصاف کا معنی دے گا، جیسے: ''أَقْسَطَ یُقْسِطُ'' یعنی عدل و انصاف۔ لہٰذا اگر لفظِ ''قِسط'' کو بابِ افعال میں لے جایا جائے تو عدل و انصاف کے معنی میں ہوگا اور اگر ثلاثی مجرد استعمال ہو (جیسے قَسَطَ یَقْسِطُ) تو پھر اس کے خلاف معنی دے گا یعنی ظلم و جور۔ یہاں قاسطین، ظلم و جور کے معنی میں استعمال ہوا ہے، یعنی ستمگر اور ظلم کرنے والے۔

حضرتؑ نے ان کا نام ظالم رکھا ہے، یہ کون لوگ تھے؟ یہ ان لوگوں کا گروہ تھا جنہوں نے مصلحتاً اور ظاہراً اسلام قبول کیا تھا اور یہ لوگ علویؑ حکومت کو تو سرے سے مانتے ہی نہیں تھے، امیر المومنین علیہ السلام نے ان کے ساتھ جو کچھ بھی کیا اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ یہ لوگ شام کے حاکم اور گورنر معاویہ بن سفیان کے حمایتی تھے، ان کا اہم لیڈر خود معاویہ تھا اس کے بعد مروان بن حکم اور اس کے بعد ولید بن عقبہ تھے۔

یہ لوگ ایک محاذ پر اکٹھے تھے اور امام علی علیہ السلام کے ساتھ کسی بھی صورت میں تعاون کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ آپؑ کی حکومت کے آغاز ہی میں مُغیرہ بن شُعبہ، عبد اللہ بن عباس اور کچھ دوسرے لوگوں نے امیر المومنین علیہ السلام سے کہا تھا: اے امیر المومنین علیہ السلام! انہیں کچھ عرصے کے لیے اپنے منصب اور مقام پر رہنے دیجئے۔

مگر حضرتؑ نے ان کی اس رائے کو قبول نہیں کیا۔ اس وقت ان لوگوں نے سمجھا کہ شاید آپؑ کو سیاست نہیں آتی؛ لیکن بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ آپؑ کو مشورہ دینے والے یہ لوگ خود بے خبر تھے، کیونکہ امیر المومنین علی علیہ السلام کچھ بھی کرتے معاویہ آپؑ کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس کی کھوپڑی میں وہ دماغ ہی نہیں تھا جو علویؑ حکومت کو قبول کر سکے۔ اگرچہ آپؑ سے پہلے والے ان میں سے بعض کو برداشت کرتے آئے تھے۔

معاویہ کے مسلمان ہونے سے لیکر امیر المومنین علیہ السلام سے جنگ کرنے تک کوئی تیس سال سے کم مدت کا عرصہ گزر گیا تھا۔ معاویہ اور اس کے حامیوں نے سالہا سال شام پر حکومت کی تھی اور لوگوں میں اثر و نفوذ پیدا کیا تھا اور اپنے لیے ایک مرکز بنا لیا تھا۔ اب وہ شروع کا دور نہیں تھا کہ انہیں نو مسلم کہہ کر روکا ٹوکا جاتا، بلکہ انہوں نے اپنی جگہ مستحکم کر لی تھی۔ اس بنا پر وہ کسی بھی صورت میں علویؑ حکومت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور حکومت کو اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتے تھے؛ لوگوں نے بعد میں اس کا تجربہ بھی کر لیا اور دنیائے اسلام نے ان کی حکومت کا مزہ بھی خوب چکھا۔

وہی معاویہ جو امام علی علیہ السلام سے چپقلش اور رقابت کے دوران بعض اصحاب کے ساتھ بڑی محبت اور نرمی و ملائمت سے پیش آتا تھا، بعد میں اسی کی حکومت نے ان کے ساتھ سخت رویّہ اپنایا، یہاں تک کہ یزید کا زمانہ آیا اور واقعہ کربلا رونما ہوا۔ اس کے بعد مروان، عبد الملک، حجاج بن یوسف ثقفی اور یوسف بن عمر ثقفی جیسے خونخوار لوگ حاکم بنے جو اسی حکومت وامارت کا ایک تلخ نتیجہ تھا؛ یعنی یہی حکومتیں جن کے جرائم کے بیان سے تاریخ کانپتی ہے (جیسے حجاج کی حکومت) اسی حکومت کا ثمرہ تھیں جس کی بنیاد معاویہ نے رکھی تھی اور اس طرح کے مقاصد کے لیے امیر المومنین علیہ السلام سے جنگ کی تھی۔ یہ تو ابتداء ہی سے معلوم تھا کہ ان لوگوں کا کیا ارادہ ہے اور وہ کیا چاہتے ہیں، یعنی یہ لوگ دنیا پرستی، خود غرضی اور اپنی خواہشات پر مبنی ایک دُنیوی حکومت چاہتے تھے، جیسا کہ بنو اُمیہ کی حکومت میں لوگوں نے اس چیز کو اچھی طرح محسوس کیا تھا۔

البتہ میں یہاں کوئی اعتقادی یا کلامی بحث نہیں کر رہا ہوں، بلکہ تاریخی حقائق آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں اور یہ کوئی شیعہ تاریخ بھی نہیں ہے بلکہ تاریخ ”ابن اثیر“ تاریخ ”ابن قتیبہ“ وغیرہ سے ہے جن کی اصل عبارتیں میں نے لکھی ہوئی ہیں اور میں نے جو لکھا وہ محفوظ بھی ہے اور یہ وہ باتیں ہیں جو مسلماتِ تاریخ میں سے ہیں جن میں شیعہ سنی کے درمیان فکری اختلاف کی کوئی بات نہیں ہے۔

دوسرا گروہ جس نے امیر المومنین علیہ السلام کے ساتھ جنگ کی وہ ناکثین تھے، ناکثین یعنی توڑنے والے اور یہاں پر اس سے بیعت توڑنے والے لوگ مراد ہیں جو پہلے تو امام علی علیہ السلام کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے لیکن بعد میں انہوں نے اسے توڑ ڈالا۔ یہ لوگ مسلمان تھے اور اس پہلے والے گروہ (قاسطین) کے مقابلے میں یہ اپنے ہی آدمی تھے۔

البتہ یہ ایسے لوگ تھے جو حکومت علی بن ابی طالب علیہما السلام کو اسی حد تک قبول کرنے کو تیار تھے جہاں تک خود ان کو اس سے خاطر خواہ فائدہ پہنچے، یعنی ان سے رائے اور مشورہ لیا جائے، انہیں حکومتی سطح پر ذمہ داریاں دی جائیں، انہیں حاکم بنایا جائے، جو مال و ثروت ان کے ہاتھوں میں ہے اس کے بارے میں کوئی باز پرس نہ کی جائے، یہ نہ پوچھا جائے کہ اسے کیسے اور کہاں سے حاصل کیا ہے؟! یہ گروہ امیر المومنین علیہ السلام کو (خلیفہ) مانتا تھا، یہ نہیں تھا کہ آپؑ کو (بطورِ خلیفہ) نہ مانتے ہوں، لیکن اس گروہ کی طرف سے یہ شرط تھی کہ ان مذکورہ چیزوں کے ساتھ کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے، یہ نہ کہا جائے کہ یہ مال و دولت کیوں جمع کی ہے، کہاں سے اکٹھی کی ہے، اسے کیوں کھا رہے ہو، کیوں لے دے رہے ہو اور اور دوسرے اس قسم کے سوالات نہیں ہونا چاہیے! لہٰذا پہلے تو ان کی اکثریت نے بیعت کی تھی، البتہ کچھ لوگوں نے بیعت نہیں کی، جیسے سعد بن ابی وقاص اور بعض دوسروں نے شروع ہی سے بیعت نہیں کی تھی، لیکن جناب طلحہ و زبیر اور دیگر بزرگ اصحاب آپؑ کی خلافت کو تسلیم کرتے ہوئے آپؑ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے، لیکن جب تین چار ماہ بعد انہوں نے دیکھا کہ اس حکومت کے ساتھ نہیں چلا جا سکتا، کیونکہ (ان کے گمان میں) یہ ایک ایسی حکومت تھی جو دوست اور آشنا کو نہیں جانتی تھی، جو اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے امتیازی حق کے قائل نہیں تھی، جو اسلام لانے میں پہل کرنے والوں کے لیے کسی حق کی قائل نہیں تھی۔ (اگرچہ سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے خود امام علی علیہ السلام ہی تھے۔) احکامِ الٰہی اور حدود کے اِجراء میں کسی کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔ ان لوگوں نے جب ان چیزوں کو دیکھا تو کہا: نہیں جناب! اس شخص کے ساتھ تو ہم نہیں چل سکتے؛ لہٰذا یہ لوگ آپؑ سے الگ ہوئے اور جنگ جمل کے اس فتنے کو بھڑکا دیا جو حقیقت میں ایک فتنہ تھا۔ انہوں نے ام المومنین عائشہ کو بھی اپنے ساتھ

ملا لیا۔ بہت سارے لوگ اس جنگ میں کام آگئے، البتہ فتح و کامرانی امیر المومنین علیہ السلام ہی کو نصیب ہوئی اور آپؑ نے معاملے کو صاف کر دیا۔ یہ بھی ایک (دوسرا) محاذ تھا جس نے ایک مدت تک امیر المومنین علیہ السلام کو مشغول کیے رکھا۔

تیسرا گروہ مارقین کا تھا "مارق" یعنی گریز کرنے والا۔ ان کی وجہ تسمیہ یہ بتائی گئی ہے کہ یہ لوگ دین سے اس طرح نکل گئے تھے جس طرح ایک تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔ جب آپ تیر کو کمان میں رکھ کر پھینکتے ہیں تو وہ کمان سے باہر نکل جاتا ہے اور کمان سے گریزاں ہوتے ہوئے اس سے دور چلا جاتا ہے؛ اسی طرح یہ لوگ بھی دین سے دور ہوگئے تھے۔ البتہ وہ ظواہرِ دین سے متمسک بھی تھے اور دین کا نام بھی لیتے تھے، یہ وہی خوارج تھے۔ یہ ایسے لوگوں کا گروہ تھا جو اپنی کج فکری اور انحراف (جو ایک انتہائی خطرناک چیز ہے) کی بنیاد پر کاموں کو انجام دیتے تھے۔

وہ دین کو علی بن ابی طالب علیہما السلام (جو مفسرِ قرآن اور علمِ کتاب کے حقیقی معلم بھی تھے) سے حاصل کرنے کی بجائے، اپنے غلط سلط طریقوں سے حاصل کرتے تھے۔ البتہ ایسے لوگ ہر معاشرے میں پائے جاتے ہیں، لیکن ان کے با قاعدہ ایک گروہ کی شکل میں نمودار ہونے یعنی آج کی اصطلاح میں ایک پارٹی کی شکل اختیار کرنے کے لیے سیاست کی ضرورت تھی اور اس سیاست کے لیے وہ کہیں اور سے راہنمائی لیتے تھے۔

اہم بات یہ ہے کہ اس چھوٹے سے گروہ کے افراد کے سامنے جب آپؑ کچھ کہتے تو وہ فوراً آپؑ کے لیے قرآن مجید کی ایک آیت تلاوت کرتے تھے۔ کبھی یہ امیر المومنین علیہ السلام کی نمازِ جماعت کے درمیان آجاتے تھے اور کنایتاً آپؑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کوئی آیت پڑھتے تھے۔ آپؑ کے خطبے کے درمیان کھڑے ہو جاتے تھے اور اشارے کنائے میں کوئی آیت تلاوت کرتے تھے، ان کا مشہور نعرہ "لَا حُكْمَ إِلَّا لِلّٰهِ"[1] تھا؛ یعنی ہم آپؑ کی حکومت کو قبول نہیں کرتے، ہم تو صرف خدا کی حکومت کو مانتے ہیں۔

یہ ایسے لوگ تھے کہ جن کا ظاہر ایسا تھا، لیکن ان کی پالیسیاں اور انہیں چلانے کا کام حکومتِ شام اور بزرگانِ قاسطین (یعنی عمروعاص اور معاویہ) انجام دیتے تھے اور

---

[1] حکمرانی کا حق تو صرف خدا کو ہے۔

وہیں سے ہی انہیں سیاسی طور پر ہدایات ملتی تھیں، کیونکہ ان لوگوں کے آپس میں روابط تھے۔ جیسا کہ مختلف قرائن اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اشعث ابن قیس (مارقین کا سردار) ایک بے ایمان شخص تھا اور کچھ کمزور عقیدہ رکھنے والے بیچارے اور کمزور افراد اس کے پیچھے چل پڑے تھے۔

پس جس تیسرے گروہ سے امیر المومنین علیہ السلام کو سامنا کرنا پڑا، وہ مارقین تھے البتہ آپؑ کو اس گروہ کے مقابلے میں بھی کامیابی ملی اور جنگ نہروان میں آپؑ نے انہیں زبردست شکست دی؛ لیکن معاشرے میں ان کا وجود باقی رہا اور آخر کار انہیں کے ہاتھوں امیر المومنین علیہ السلام کو جام شہادت نوش کرنا پڑا۔

خوارج کی پہچان میں غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ بعض لوگ خوارج کو خشک مقدّسوں سے تشبیہ دیتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بحث مقدّس مآب یا خشک مقدّس ہونے کی نہیں ہے، کیونکہ مقدّس مآب لوگ تو کسی گوشے میں بیٹھ کر نمازوں اور دعاؤں میں مشغول رہتے ہیں؛ جبکہ خوارج ایسے لوگ نہیں تھے، بلکہ یہ ایسے لوگوں کا ایک گروہ تھا جو فتنہ و فساد کو بھڑکاتا، بحران پیدا کرتا اور لڑنے جھگڑنے کے لیے میدان میں کود پڑتا تھا اور امیر المومنین علیہ السلام جیسی (عظیم) شخصیت سے جنگ کے لیے تیار تھا، البتہ اس گروہ کے اس کام کی بنیاد غلط تھی، ان کی جنگ غلط تھی، اس کے اسباب غلط تھے اور ہدف باطل تھا۔ یہ وہ تین گروہ تھے جن کے ساتھ امیر المومنین علیہ السلام نے جنگ کی اور ان جیسے لوگوں سے امام علی علیہ السلام کو سامنا کرنا پڑا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ، آپؐ کی حکومت اور امیر المومنین علیہ السلام کے دورِ حکومت میں جو خاص فرق تھا، وہ یہ تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیّبہ میں محاذ معیّن تھے، ایک طرف ایمان کا محاذ تھا تو دوسری طرف کفر کا محاذ تھا۔ جہاں تک منافقین کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں مسلسل آیاتِ قرآنی لوگوں کو خبردار اور ہوشیار کرتی رہتی تھیں اور ان کی نشاندہی کرتی تھیں اور ان کے مقابلے میں مومنین کو قوت فراہم کرتی تھیں اور ان منافقین کو نفسیاتی طور پر کمزور کرتی تھیں؛ یعنی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دورِ حیات اور اسلامی نظام میں ساری چیزیں واضح تھیں، صفیں معیّن اور ایک دوسرے کے

مقابلے میں کھڑی تھیں کوئی نظامِ کفر، طاغوت اور جاہلیت کی صف میں موجود تھا، تو کوئی ایمان، اسلام، توحید اور معنویت کی صف میں تھا۔

البتہ اُس دور میں بھی ہر طرح کے لوگ موجود تھے مگر صفیں مشخّص اور معیّن تھیں، لیکن امیر المومنین علیہ السلام کے دور میں مسئلہ یہ تھا کہ صفیں واضح نہیں تھیں کیونکہ دوسرے گروہ یعنی ناکثین میں ایسے افراد موجود تھے جن کا شمار جانے پہچانے لوگوں میں ہوتا تھا، جنہیں دیکھ کر لوگ شک و تردید کا شکار ہو جاتے تھے جیسے زبیر اور طلحہ وغیرہ۔ یہ زبیر وہ شخص تھا جس کا شمار آپؑ کے دور میں اکابر صحابہ اور اہم شخصیات میں ہوتا تھا اور وہ آپؑ کا پھوپھی زاد بھائی اور آپؑ کے قریبی لوگوں میں سے تھا۔

یہاں تک کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد بھی اس کا شمار ان لوگوں میں سے ہوتا تھا جنھوں نے امیر المومنین علیہ السلام کا دفاع کرتے ہوئے سقیفہ کے اجتماع پر اعتراض کیا تھا۔ جی ہاں! ہر ایک کی قسمت کا فیصلہ اس کا آخری انجام کر دیتا ہے، خدا ہم سب کی عاقبت بخیر کرے۔

کبھی کبھار دنیا طلبی، مختلف حالات اور دنیا کے رنگ برنگ جلوے، انسان پر اثر انداز ہوتے ہیں اور یہ بعض شخصیات کے اندر ایسی تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں کہ انسان، عوام تو عوام خواص کے بارے میں بھی شک و تردید کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے واقعاً یہ بہت سخت دور تھا۔

جن لوگوں نے امیر المومنین علیہ السلام کا ساتھ دیا اور دشمن کے مقابلے میں اُٹھ کھڑے ہوئے اور دشمن سے جنگ کی، انہوں نے واقعاً بہت ہی بصیرت اور سمجھ داری کا مظاہرہ کیا تھا۔ میں نے کئی بار حضرت علی علیہ السلام کی ایک روایت بیان کی ہے، آپؑ فرماتے ہیں: ”لَا یَحْمِلُ هَذَا الْعَلَمَ إِلَّا أَهْلُ الْبَصَرِ وَ الصَّبْرِ“[1] لٰہذا پہلے مرحلے میں سمجھ داری

---

[1] ۔ پرچمِ ولایت اہل بصیرت اور صبر رکھنے والوں کے علاوہ کوئی دوسرا اُٹھانے کی قابلیت ہی نہیں رکھتا۔ (نہج

اور بصیرت کی ضرورت ہے، (کیونکہ) ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کے غلط رویّوں کے مقابلے میں جو اسلام کے داعی بھی تھے اور امیر المومنین علیہ السلام سے جنگ بھی کرتے اور بے بنیاد اور غلط باتیں بھی کرتے تھے، امیر المومنین علیہ السلام کی مشکلات اور مسائل کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

صدرِ اسلام میں بھی بہت سی غلط سوچ اور افکار زیر بحث لائی جاتی تھیں، لیکن ان کے مقابلے میں (فوراً ہی) قرآن کی آیت نازل ہوتی اور ایسے افکار کو واضح طور پر ردّ کرتی تھی، چاہے وہ مکی دور ہو یا مدنی۔ آپ غور کیجئے کہ سورہ بقرہ جو ایک مدنی سورہ ہے جب انسان اس میں غور کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زیادہ تر آیات پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہودیوں اور منافقین کے ساتھ مقابلے اور اسلام کے خلاف ان کی ریشہ دوانیوں کو بے نقاب کرتے ہوئے ان کی جزئیات تک کو بیان کرتی ہیں۔

یہاں تک کہ اس وقت مدینہ کے یہودی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو روحانی اذیت پہنچانے کے لیے جو طریقہ کار اختیار کرتے تھے، قرآن مجید اسے بھی بیان فرماتا ہے، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: ''لَا تَقُولُواْ رَاعِنَا''[1] اس طرح کی اور باتوں کو بھی بیان فرماتا ہے، مثلاً سورہ اعراف ایک مکی سورہ ہے اس میں ایک مفصّل گفتگو کرتے ہوئے خرافات اور توہمات سے جنگ کی ترغیب دیتا ہے۔

چنانچہ حقیقی محرمات کو گوشت کی انواع و اقسام کے مقابلے میں حلال و حرام قرار دینے اور حقیقی محرمات کو بیکار اور ہیچ سمجھنے پر بات کی گئی ہے: ''قُلۡ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الۡفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنۡهَا وَمَا بَطَنَ''[2] یہ چیزیں حرام ہیں نہ کہ وہ جسے تم نے اپنے لیے

البلاغہ، خطبہ ۱۷۳)

[1] ۱۔ اللہ تعالیٰ مومنین کو یہودیوں کی طرف سے تمسخر اور استہزاء سے بچانے کے لیے انہیں حکم دیتا ہے کہ اے ایماندارو! تم (رسولؐ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہو تو) ''رَاعِنَا'' (ہماری رعایت کیجئے) نہ کہا کرو بلکہ ''أُنۡظُرۡنَا'' (ہم پر توجہ فرمائیے) کہا کرو۔ (سورہ بقرہ، آیت ۱۰۴)

[2] ۲۔ (اے رسولؐ) آپ (صاف) کہہ دیجئے کہ میرے پروردگار نے تو تمام بدکاریوں کو خواہ ظاہری ہوں یا باطنی حرام کیا ہے۔ (سورہ اعراف، آیت ۳۳)

حرام قرار دیا ہے جیسے سائبہ[1] اور بحیرہ[2] وغیرہ۔ قرآن کریم ایسے افکار کا کھلم کھلا مقابلہ کرتا ہے، لیکن امیر المومنین علیہ السلام کے دور میں ان کے مخالفین بھی اسی قرآن سے استفادہ کرتے ہوئے قرآن کی انہیں آیات کو پیش کرتے تھے۔ لہٰذا اس لحاظ سے امیر المومنین علیہ السلام کو بہت سی مشکلات اور مسائل کا سامنا تھا۔

امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے مختصر دورِ حکومت کو اس قسم کے سخت اور مشکل حالات میں گزارا ہے۔ ان لوگوں اور حالات کے مقابلے میں حضرت علی علیہ السلام کا اپنا ایک محاذ تھا جو حقیقت میں ایک مضبوط محاذ تھا، جس میں عمار یاسر، مالک اشتر، عبد اللہ ابن عباس، محمد ابن ابی بکر، میثم تمار اور حجر بن عدی جیسے لوگ موجود تھے۔ یہ ایسی مومن، آگاہ اور بابصیرت شخصیات تھیں جو لوگوں کی فکری ہدایت میں بہت اثر و رسوخ رکھتی تھیں اور یہ آپؑ کے زمانۂ حکومت کا ایک خوبصورت ترین دور بھی تھا (البتہ یہ خوصورتی اور حسن انہیں بزرگ افراد کی کوششوں کا نتیجہ تھا اور اس لحاظ سے کہ ان شخصیات کو جس رنج و الم اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، ایک تلخ ترین دور بھی تھا) یہ تاریخ کا وہ منظر ہے کہ ان حضرات نے کوفہ اور بصرہ کا رخ کیا تھا، جب طلحہ و زبیر اور ان جیسے لوگوں نے صف آرائی کرتے ہوئے بصرہ پر قبضہ کر لیا اور وہ کوفہ کی جانب پیش قدمی کر رہے تھے، تو امیر المومنین علیہ السلام نے حضرت امام حسن علیہ السلام اور بعض دیگر اصحاب کو روانہ فرمایا۔ انہوں نے ان لوگوں سے جو مذاکرات کیے، مساجد میں لوگوں کے اجتماعات سے جو خطاب کیے، لوگوں سے مناظرے کیے، وہ سب صدرِ اسلام کی تاریخ کے پُرمغز، حسین و زیبا اور ہیجان انگیز آثار میں شمار ہوتے ہیں۔

آپ ملاحظہ کیجئے کہ امیر المومنین علیہ السلام کے دشمنوں نے جن شخصیات پر سب سے زیادہ حملے کیے ہیں، وہ یہی حضرات تھے۔ مالک اشتر، عمار یاسر، محمد ابن ابی بکر کے خلاف سب سے زیادہ سازشوں کے جال بچھائے گئے اور ان تمام لوگوں کے خلاف بھی جو شروع دن سے امیر المومنین علیہ السلام کے ساتھ تھے اور اپنے اخلاص و ایمان اور محبت کا امتحان دے چکے

---

[1] ”سائبہ“ اس اونٹ کو کہا جاتا ہے جسے بتوں کے لیے نذر کرکے آزاد چھوڑدیا جاتا تھا۔

[2] ”بحیرہ“ اس اونٹنی کو کہا جاتا ہے جس نے پانچ مرتبہ بچے جنے ہوں اور اس کا آخری بچہ نر ہو۔

تھے اور اپنی بصیرت اور قوتِ ایمانی کو عملاً ثابت کر چکے تھے۔ ان کی جانب دشمن کی طرف سے انواع و اقسام کے بہتانوں اور تہمتوں کے تیر پھینکے جاتے تھے اور دشمن ان کی جان کے درپے ہوتے تھے، اس لیے ان میں سے اکثر لوگ شہید کر دیئے گئے، عمار یاسر جنگ صفین میں شہید ہوئے، جبکہ مالک اشتر اور محمد ابن ابی بکر شامیوں کی سازشوں کے ذریعے شہید ہوئے اور جو حضرات باقی بچے تھے وہ بھی بعد میں انتہائی بےرحمانہ اور سفّاکانہ طریقوں سے شہید کر دیئے گئے۔

یہ تھیں امیر المومنین علیہ السلام کی زندگی اور آپؑ کے طرزِ حکومت کے متعلق چند باتیں۔ اگر ہم اس کا خلاصہ کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ آپؑ کی حکومت ایک مقتدر، مستحکم اور کامیاب حکومت ہونے کے ساتھ ایک مظلوم حکومت بھی تھی امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے زمانے میں بھی دشمنوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا اور اپنی مظلومانہ شہادت کے بعد بھی تاریخ میں ایک مشعل کی طرح ہمیشہ روشن رہے۔ البتہ اس دوران آپؑ کے دل کو خون کر دینے والے حادثات، آپؑ کی محنتیں، مشقتیں اور واقعات بھی تاریخ کا حصّہ ہیں۔

(۰۸-۰۱-۱۹۹۹ء)

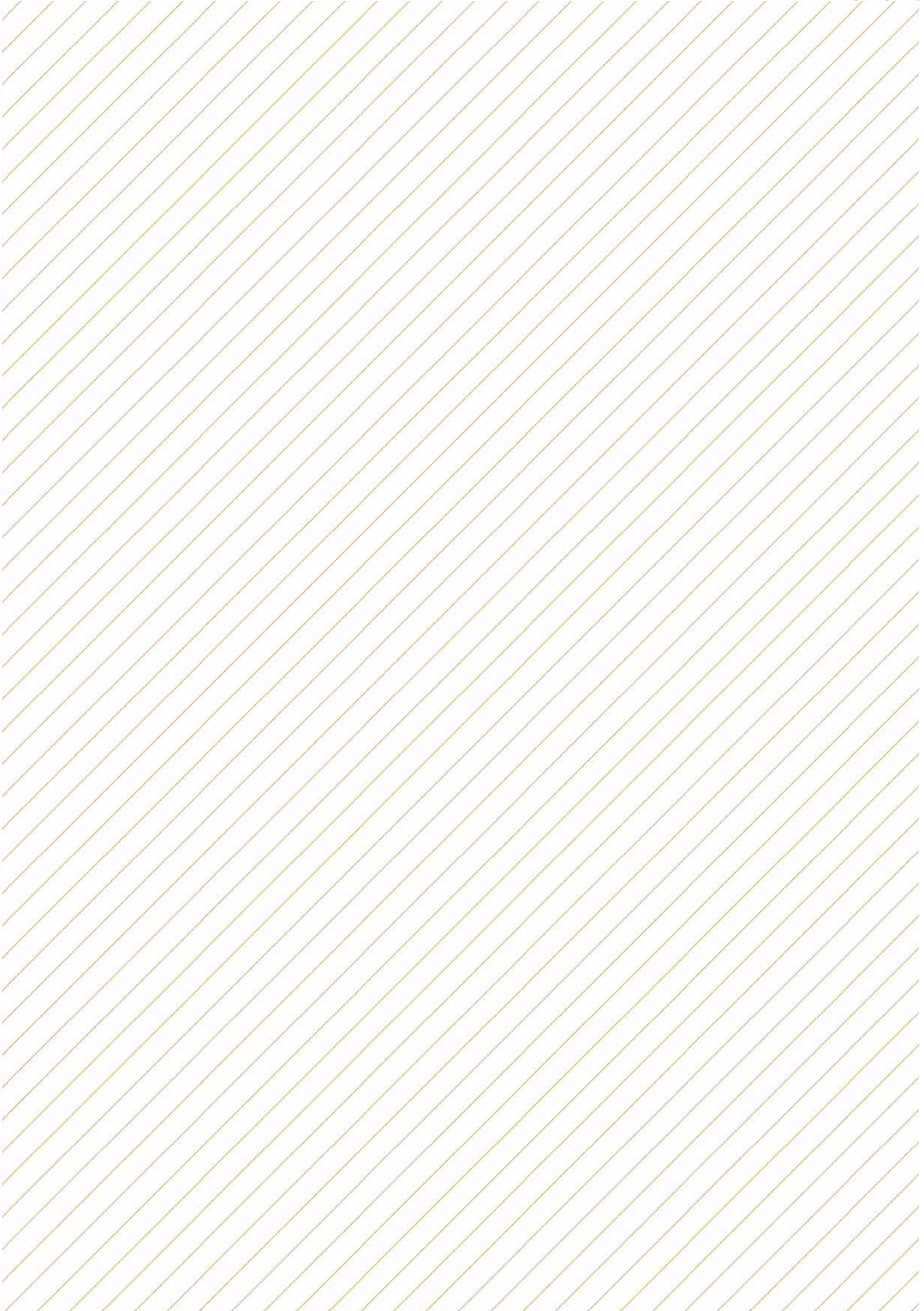

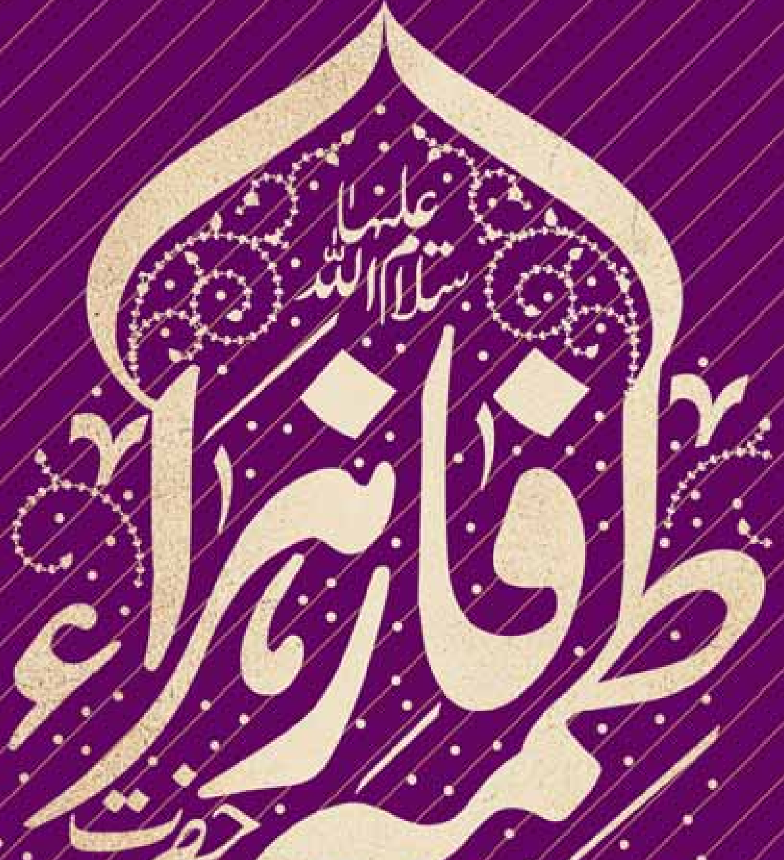
سلام الله علیها
فاطمه زهراء
حضرت

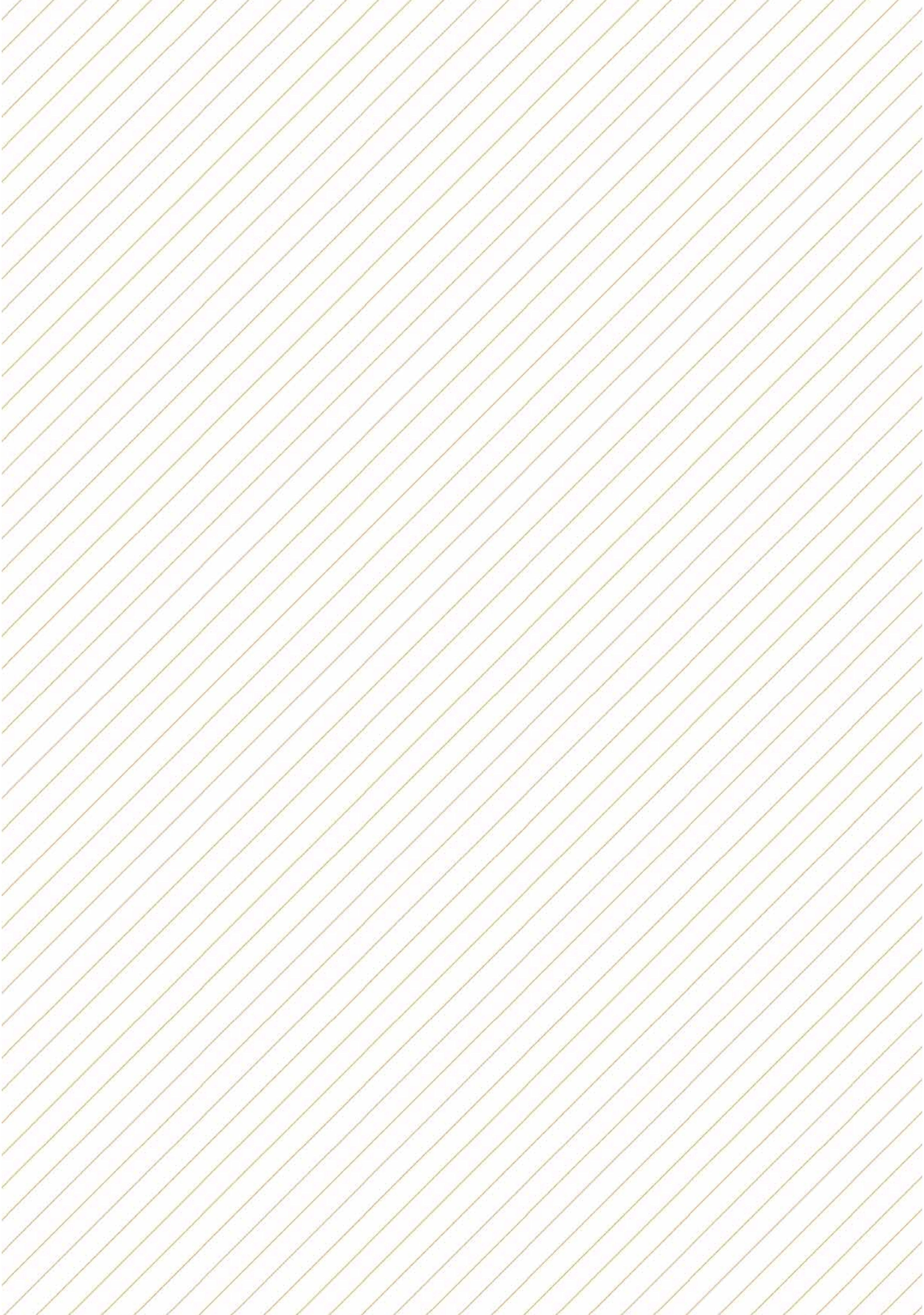

حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام

حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کا فیض انسانوں سے بھری اِس دنیا کے کسی چھوٹے سے گروہ تک محدود نہیں۔ اگر حقیقت بین اور منطقی نگاہوں سے دیکھا جائے تو پوری انسانیت حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کی احسان مند نظر آتی ہے اور یہ کوئی مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے، جیسا کہ پوری انسانیت، اسلام، قرآن، انبیائے الٰہی علیہم السلام اور رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات کی رہینِ منت ہے۔ تاریخ میں ہمیشہ سے ایسا ہو رہا ہے، آج بھی ایسی ہی صورتِ حال ہے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اسلام اور حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کی معنویت کا نور مزید واضح ہوتا جائے گا اور بشریت اسے بہتر انداز میں محسوس کرے گی۔

ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ خود کو پیغمبر اعظم ﷺ کے خاندان سے منسوب ہونے کے لائق بنائیں۔ البتہ خاندانِ رسالت، ان کے اعزاء اور ان کی ولایت سے سرشار لوگوں سے منسوب ہونا بہت مشکل کام ہے۔ جیسا کہ ہم زیارت میں پڑھتے ہیں: ''ہم آپؑ کی محبت اور دوستی سے سرشار ہیں۔'' یہ جملہ ہمارے کاندھوں پر عائد ذمہ داریوں میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔

یہ خیرِ کثیر، جس کو خوش خبری خداوند عالم نے سورۂ کوثر میں رسول اکرم ﷺ کو دی، چنانچہ ارشادِ اقدس الٰہی ہے: ''إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ''[1] اس کی تفسیر حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام ہیں۔ در اصل وہ ان تمام نیکیوں اور بھلائیوں کا سرچشمہ ہیں جو دینِ محمدی ﷺ کے آبشاروں سے تمام انسانیت اور تمام خلقِ خدا کو نصیب ہوتی ہیں۔ بہت سے لوگوں نے ان کمالات کو چھپانے اور ان سے انکار کرنے کی کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہوئے (کیونکہ اللہ کا وعدہ ہے): ''وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ''[2] ہمیں خود کو اس منبعِ نور سے

---

[1] بے شک ہم نے آپؐ کو خیر کثیر عطا کیا ہے۔ (سورہ کوثر، آیت ۱)

[2] اور اللہ اپنے نور کو مکمل کر کے رہے گا اگرچہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار لگے۔ (سورہ صف، آیت ۸)

قریب کرنا چاہیے اور نور کے مرکز سے قُربت کا لازمی نتیجہ، نورانی ہونا ہے۔ ہمیں صرف محبت کے ذریعے ہی نہیں، بلکہ عمل سے بھی نورانی ہونا چاہیے۔

یہ وہ عمل ہے جس کا تقاضا ہماری محبت و ولایت اور ہمارا ایمان کرتا ہے کہ ہمیں اس عمل کے ذریعے اس خاندان کا حصہ اور اس سے منسوب ہونا چاہیے۔ علی علیہ السلام کے گھر کا قنبر بننا آسان کام نہیں ہے؛ ''سَلْمَانُ مِنَّا اَهلُ الْبَیتِ''[1] کی منزل تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔

ہم اہل بیت علیہم السلام کے پیروکار اور ان سے محبت کرنے والے، ان سے یہ توقّع رکھتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنوں میں اور اپنی چوکھٹ پر بیٹھنے والوں میں شمار کریں اور وہ کہیں کہ فلاں ہماری درگاہ کے خاک نشینوں میں سے ہے۔ ہمارا دل چاہتا ہے کہ اہل بیت علیہم السلام ہمارے بارے میں ایسا سوچیں، لیکن یہ کوئی آسان بات نہیں ہے۔ یہ صرف دعویٰ کرنے کے بل بوتے پر ملنے والی چیز نہیں، اس کے لیے عمل، قربانی، ایثار اور ان کی اتّباع ضروری ہے۔

قارئین کرام! ذرا ملاحظہ کیجیے کہ حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام نے اپنی مختصر زندگی میں بے پناہ فضائل حاصل کیے، آپؑ کتنی کم سنی میں اتنی فضیلتوں تک پہنچ گئیں؟ بہت چھوٹی عمر میں، اٹھارہ برس، بیس برس، پچیس برس روایتیں مختلف ہیں۔ یہ ساری فضیلتیں یوں ہی حاصل نہیں ہوئیں، بلکہ ''اِمْتَحَنَکِ اللهُ الَّذِی خَلَقَکِ قَبلَ اَنْ یَخْلُقَکِ فَوَجَدَکِ لِمَا اِمْتَحَنَکِ صَابِرَةً''[2] خداوند عالم نے حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کا امتحان لیا، خداوند عالم کا نظام، حساب کتاب کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ عطا کرتا ہے، حساب سے عطا کرتا ہے۔ اسے اپنی اس خاص کنیز کی قربانیوں، فداکاریوں اور معرفت کا بخوبی علم تھا، اس لیے اللہ نے انہیں اپنی بے پناہ فیوضات کا سرچشمہ قرار دیا۔

(۲۶۔۱۲۔۱۹۹۱ء)

---

[1] یعنی سلمان ہم اہل بیتؑ میں سے ہے۔ (الکافی، ج۲، ص۲۵۴)

[2] جس خدا نے تجھے خلق کیا ہے اس نے خلق کرنے سے پہلے تجھے آزمایا اور اس آزمائش میں تجھے صابر و کامیاب پایا۔ (روضۃ المتقین فی شرح من لا یحضرہ الفقیہ، ج۵، ص۳۴۳)

میں نے ایک روایت میں پڑھا ہے کہ حضرت فاطمہ زہراء علیہاالسلام کے نور کی تابندگی سے آسمان کے فرشتوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں: ''زَهَرَ نُوْرُهَا لِمَلَائِکَةِ السَّمَاءِ''[1] ہم اس چمکتے ہوئے نور سے کیا استفادہ کر سکتے ہیں؟ ہم اس درخشاں ستارے کے ذریعے اللہ تعالیٰ اور اس کی بندگی کی راہوں کو تلاش کر سکتے ہیں، جو صراط مستقیم ہے، جس راستے کو فاطمہ زہراء علیہاالسلام طے کر کے اس اعلیٰ مقام پر پہنچ چکی ہیں، ہم بھی اس راستے کو ڈھونڈ سکتے ہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ نے آپؑ کے خمیر کو پاک و پاکیزہ قرار دیا ہے تو اس کی دلیل بھی یہی ہے ہے اللہ تعالیٰ اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ یہ عظیم ہستی عالمِ ناسوت (عالم مادہ) میں بھی امتحان کو کامیابی کے ساتھ طے کرنے والی ہے: ''اِمْتَحَنَکِ اللهُ الَّذِی خَلَقَکِ قَبْلَ اَنْ یَخْلُقَکِ فَوَجَدَکِ لِمَا اِمْتَحَنَکِ صَابِرَةً'' اصل بات یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی خمیر پر اپنا خصوصی لطف و کرم کرتا ہے تو اس خمیر کے بارے میں جانتا ہے کہ یہ امتحان سے کیسے عہدہ برآ ہونے والا ہے، ورنہ بہت سارے ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کا خمیر تو اچھا تھا، لیکن کیا وہ سب کے سب امتحانِ الٰہی میں کامیاب ہو گئے؟ حضرت فاطمہ زہراء علیہاالسلام کی زندگی کا یہ وہ حصہ ہے کہ ہم اپنی نجات اور بخشش کے لیے جس کے محتاج ہیں۔ شیعہ اسناد سے یہ حدیث وارد ہوئی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''یا فَاطِمَةُ اِعْمَلِي فَاِنِّي لَاأُغْنِي عَنْکِ مِنَ اللهِ شَيْئاً''[2]

اسے میوہ دل، اے میری بیٹی فاطمہ! اللہ کے حکم پر عمل کرو۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں میں تمہیں کسی چیز سے بے نیاز نہیں کر سکتا۔

یعنی اپنی آخرت کا بندوبست خود ہی کرلو اور حضرت فاطمہ علیہاالسلام بچپن سے لیکر اپنی مختصر عمر کے آخر تک اپنی (عاقبت کی) فکر میں رہتی تھیں۔ ذرا ملاحظہ کیجئے کہ حضرت فاطمہ زہراء علیہاالسلام نے بچپن سے لیکر شہادت کی اپنی مختصر زندگی کس طرح بسر کی ہے؟ اپنی شادی

---

[1] آپؑ کا نور آسمان کے فرشتوں کے لیے ایسے چمکتا تھا (جیسے ستاروں کی روشنی اہل زمین کے لیے) (بحار الانوار، ج۴۳، ص۱۷۳)

[2] التعجب من اغلاط العامة فی مسئلة الامامة، ص۹۴

سے قبل کہ جب آپؑ ایک چھوٹی سی لڑکی تھیں، تو نور و رحمت کے پیغمبرؐ، دنیائے نور کو متعارف کرانے والی عظیم شخصیت اور عظیم عالمی انقلاب کے رہبر و منتظم کے ساتھ کہ جن کا انقلاب تا قیامت باقی رہے گا، جس دن سے آپ ﷺ نے پرچمِ توحید بلند کیا، حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام نے ایسا برتاؤ کیا کہ آپؑ کی کنیت ''اُمُّ اَبِیھَا''[۱] اپنے بابا کی ماں پڑ گئی۔ یہ آپؑ کی خدمت، کام، محنت و مشقت اور لازوال جدوجہد کی روشن دلیل ہے، ورنہ بغیر کسی وجہ کے تو آپؑ کو ''اُمُّ اَبِیھَا'' نہیں کہا گیا؛ خواہ وہ مکہ کے شب و روز ہوں یا شعبِ ابی طالبؑ کے اقتصادی اور معاشی بائیکاٹ کے سخت ترین ایام یا وہ تکلیف دہ وقت جب آپؑ کی والدہ حضرت خدیجہ علیہا السلام، حضرت رسول اکرم ﷺ کو تنہا چھوڑ گئیں اور پیغمبر اکرم ﷺ کے قلبِ مبارک کو مختصر عرصے میں دو صدمے اُٹھانے پڑے، یعنی حضرت خدیجہ علیہا السلام اور حضرت ابوطالب علیہ السلام کی پے در پے وفات۔ ایسے کڑے اور مشکل وقت میں حضرت زہراء علیہا السلام آگے بڑھیں اور اپنے ننھے ہاتھوں سے رسول اکرم ﷺ کے چہرۂ مبارک پر پڑے غم و اندوہ کے گرد و غبار کو صاف کیا اور اپنے بابا کی تسلی خاطر کا سبب بنیں۔ حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کی جدوجہد یہاں سے شروع ہوئی او آپؑ کو ان ایام میں اِس لقب سے نوازا گیا۔ ذرا غور کیجیے کہ حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کی شخصیت اور جدوجہد کا یہ پہلو کتنا تابناک ہے۔

(۲۳۔۱۱۔۱۹۹۳ء)

حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کی سیاسی اور مجاہدانہ زندگی

حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام چھ، سات سال کی تھیں (کیونکہ آپؑ کی تاریخ ولادت میں اختلاف ہے) کہ شعبِ ابی طالبؑ کا مرحلہ درپیش ہوا۔ صدرِ اسلام کی تاریخ میں شعبِ ابی طالبؑ بے حد سخت اور دُشوار دور تھا؛ یعنی پیغمبر اسلام ﷺ کی تبلیغِ دین شروع ہو

---

۱. کُنَّاهَا اُمُّ الْحَسَنِ وَاُمُّ الْحُسَیْنِ وَاُمُّ الْمُحَسِّنِ وَاُمُّ الْأَئِمَّةِ وَاُمُّ اَبِیْهَا و۔۔۔

حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کی کنیتیں درج ذیل ہیں: اُم الحسن، اُم الحسین، اُم المحسن، اُم الائمہ اور اُم ابیھا وغیرہ
(بحار الانوار، ج۴۳، ص۱۶)

چکی تھی اور آپؐ نے اپنی نبوت کا آشکارا اعلان کر دیا تھا اور رفتہ رفتہ اہلِ مکہ بالخصوص نوجوان اور غلام، آپؐ کے گرویدہ ہوتے جارہے تھے اور اکابرینِ طاغوت جیسے ابولہب اور ابوجہل وغیرہ کو محسوس ہونے لگا تھا کہ ان کے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ اور آپؐ کے اردگرد جمع ہونے والے افراد کو مکہ سے باہر نکال دیا جائے اور انہوں نے بعد میں بھی ایسا ہی کیا۔

ان میں سے بہت سے لوگوں کو، جن میں درجنوں خاندان شامل تھے خود پیغمبر اکرم ﷺ اور آپؐ کے قریبی رشتہ دار، یہاں تک کہ حضرت ابوطالب علیہ السلام (جن کا شمار قریش کے بزرگوں میں ہوتا تھا) سمیت بہت سے بچے اور بوڑھے شامل تھے، مکہ سے باہر نکال دیا۔ اب یہ لوگ جاتے تو کہاں جاتے؟

اتفاقاً حضرت ابوطالب علیہ السلام کے پاس مکہ کے قریب ایک چھوٹا سا پہاڑی درّہ تھا۔ جس کا نام شعبِ ابی طالبؑ تھا، "شعب" پہاڑی درّے کو کہا جاتا ہے۔ طے ہوا کہ وہیں چلے جاتے ہیں۔ آپ ذرا سوچیں کہ مکہ میں دن کو دھوپ کی شکل میں آگ برستی تھی، لیکن رات کو کڑاکے کی سردی پڑتی تھی۔ یعنی موسم ناقابلِ برداشت تھا۔

ان لوگوں نے اس ویرانے میں تین سال کاٹ دیئے۔ کتنی سختیاں اور صعوبتیں برداشت کیں اور کس قدر بھوک کی شدّت جھیلی ہے، یہ تو خدا ہی جانتا ہے۔ پیغمبر اکرم ﷺ کی زندگی کا انتہائی سخت دور یہی تھا۔ اس عرصے میں پیغمبر اکرم ﷺ کی ذمہ داری صرف لوگوں کی ہدایت و رہنمائی نہیں تھی، بلکہ آپؐ کو سختیاں جھیلنے والے ان لوگوں کے سامنے بھی اپنے دشمن کا دفاع کرنا تھا۔

آپ جانتے ہیں کہ جب حالات صحیح ہوتے ہیں تو وہ لوگ جو کسی رہبر اور راہنما کا ساتھ دیتے ہیں، وہ سب حالات سے خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ ان کو خوش رکھے انہوں نے ہماری حالت بدل کر رکھ دی، لیکن جب کوئی مشکل وقت آجاتا ہے تو سب تذبذب کا شکار ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں: اس نے ہمیں پھنسا دیا ہے۔ ہم تو ان مسائل میں اُلجھنا ہی نہیں چاہتے تھے! لیکن جن لوگوں کا ایمان مضبوط ہوتا ہے وہ ان مشکلات کا ڈٹ کر مقالہ کرتے ہیں۔ آخرکار ان تمام سختیوں کا بوجھ پیغمبر اسلام ﷺ

کے کاندھوں پر پڑا۔

انہی دنوں جب پیغمبر اسلام ﷺ انتہائی سخت حالات سے دوچار تھے، حضرت ابوطالب علیہ السلام، پیغمبر اکرم ﷺ کے مددگار تھے اور ان سے آپؐ کی اُمیدیں وابستہ تھیں، اسی طرح حضرت خدیجہ علیہا السلام جو پیغمبر اسلام ﷺ کی ایک اور بہت بڑی مددگار تھیں، ایک ہفتے کے اندر یہ دونوں ہستیاں دنیا سے رخصت ہو گئیں! یہ بڑا عجیب سانحہ تھا، یعنی پیغمبر اسلام ﷺ بالکل بے سہارا اور تنہا ہوکر رہ گئے تھے۔

مجھے نہیں معلوم کہ آپ نے کبھی کسی گروہ یا تنظیم کے سربراہ کے طور پر کام کیا ہے کہ نہیں، تاکہ آپ سمجھ سکیں کہ ایک گروہ کی قیادت کتنا مشکل کام ہے؟ ایسے حالات میں واقعاً انسان لاچار ہو جاتا ہے۔ اب آپ ان حالات میں جناب فاطمہ زہراء علیہا السلام کے کردار کو دیکھ لیجئے۔ جب انسان تاریخ کا مطالعہ کرے تو اس قسم کی باتوں کو ادھر ادھر کے کونوں سے ضرور دیکھنا چاہیے، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تاریخ میں اس حوالے سے کوئی الگ باب نہیں کھولا گیا ہے۔

فاطمہ زہراء علیہا السلام نے پیغمبر اسلام ﷺ کے لیے (ایک دلسوز) ماں، ایک مشیر اور ایک جانثار کا کردار ادا کیا، یہی وجہ تھی کہ حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کے لیے ''اُمّ اَبیھا'' یعنی اپنے بابا کی ماں کہا گیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب آپؑ چھ، سات سال کی ایک بچی تھیں۔ البتہ یہ بات بھی ہے کہ عرب ماحول اور گرم علاقوں میں لڑکیوں کی جسمانی اور ذہنی نشونما تیزی سے ہوتی ہے، اس لحاظ سے آپؑ آج کی دس بارہ سالہ لڑکی کے برابر رہی ہوں گی۔ تو یہ احساس ذمہ داری اور فرض شناسی ہے۔ کیا ایک نوجوان لڑکی کے لیے یہ بات نمونہ عمل نہیں کہ وہ اپنے گرد و پیش کے مسائل کے بارے میں جلدی اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرے؟ اور اپنے وجود میں پنہاں جوش و نشاط کے اس خزانے کو بروئے کار لاتے ہوئے، باپ کے چہرے سے جو اس وقت مثلاً تقریبا پچاس سال کا ہو چکا ہے اور بڑھاپے کی سمت گامزن ہے، غم و غصے کے غبار کو جھاڑے، کیا یہ ایک نوجوان کے لیے بہترین نمونہ عمل نہیں ہے؟ یہ بہت ہی اہم بات ہے۔

(۲۷-۴-۱۹۹۸ء)

حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کا معنوی مقام

اس زمانے میں اور ایسے ماحول میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ایسی بیٹی کی تربیت کی کہ یہ بیٹی لیاقت و شائستگی کی اس منزل پر پہنچ گئی کہ خدا کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے ہاتھوں کے بوسے لیتا ہے! حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کے ہاتھوں پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بوسے کو جذباتی معاملے پر ہرگز محمول نہ کریں۔ یہ سوچنا کہ چونکہ وہ آپؐ کی بیٹی تھیں اور آپؐ کو ان سے بڑی محبت و اُنسیت تھی، لہٰذا صرف اسی وجہ سے آپؐ ان کے ہاتھوں کو وسہ دیتے تھے، بالکل غلط اور سطحی فکر ہے۔

اس بے مثال اور گراں قدر شخصیت کے مالک اور زیورِ عدل و حکمت سے آراستہ اسلام کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے جن کے افعال و اقوال کا دار و مدار وحی الٰہی اور الہام پر ہے، بھلا کیسے ممکن ہے کہ وہ جھکیں اور اپنی بیٹی کے ہاتھ چومیں؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ یہاں معاملہ کچھ اور ہے، یہ ماجرا ہی کچھ اور ہے، یہ اس بات کی علامت تھی کہ یہ بیٹی اور یہ جوان خاتون جس کی دنیا سے رخصت کے وقت عمر اٹھارہ سے پچیس سال کے درمیان رہی، درحقیقت انسانیت کی ملکوتی بلندیوں پر فائز تھی اور ایک غیر معمولی ہستی کی مالک تھی۔ عورت کے بارے میں اسلام کا یہی نظریہ ہے۔

(۲۵۔۱۲۔۱۹۹۱ء)

لیکن اس عظیم شخصیت کا روحانی اور معنوی مقام، اس کے جہادی، انقلابی اور اجتماعی مقام سے کہیں بلند ہے۔ فاطمہ زہراء علیہا السلام ظاہر میں ایک انسان، ایک عورت وہ بھی ایک نوجوان خاتون ہیں، لیکن معنوی اعتبار سے ایک عظیم حقیقت، چمکتا ہوا الٰہی نور، ایک صالح ہستی، ایک ممتاز اور منتخبِ روزگار انسان ہیں۔ یہ وہ عظیم شخصیت ہیں کہ جن کے بارے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیر المومنین علی علیہ السلام سے فرمایا تھا:

”یَا عَلِیُّ أَنْتَ إمَامُ أُمَّتِی وَ خَلِیفَتِی عَلَیهَا بَعْدِیْ وَ أَنْت قَائِدُ الْمُؤْمِنِیْنَ إِلیٰ الْجَنَّةِ وَ كَأَنِّیْ أَنْظُرُ إِلیٰ اِبْنَتِیْ فَاطِمَةَ قَدْ أَقْبَلَتْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ عَلیٰ نَجِیْبٍ مِنْ نُورٍ عَنْ یَمِیْنِهَا سَبْعُوْنَ أَلْفَ مَلَكٍ وَعَنْ یَسَارِهَا سَبْعُوْنَ أَلْفَ مَلَكٍ وَبَیْنَ یَدَیْهَا سَبْعُوْنَ أَلْفَ مَلَكٍ وَ

خَلْفَهَا سَبْعُوْنَ أَلْفَ مَلَكٍ تَقُوْدُ مُؤْمِنَاتِ أُمَّتِي إِلَى الْجَنَّةِ‘‘[۱]

یعنی قیامت کے دن امیر المومنین امام علی علیہ السلام مومن مردوں کی اور حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام مومن عورتوں کی جنت کی طرف راہنمائی فرمائیں گے۔ آپؑ کی شخصیت امیر المومنین علیہ السلام کے ہم پلہ اور برابر ہے۔ یہ وہ عظیم شخصیت ہیں کہ جب محرابِ عبادت میں کھڑی ہو جاتی ہیں تو اللہ تعالیٰ کے ہزاروں مقرّب فرشتے آپؑ سے مخاطب ہوتے اور آپؑ کو سلام کرتے ہیں اور آپؑ کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے وہی الفاظ دہراتے ہیں، کو آپؑ سے پہلے حضرت مریم علیہا السلام کے بارے میں کہا کرتے تھے:

’’يَا فَاطِمَةُ اِنَّ اللهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلٰى نِسَاءِالْعَالَمِيْنَ‘‘[۲]

یہ ہے حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کا روحانی اور معنوی مقام و مرتبہ۔ ایک عورت اور وہ بھی نوجوانی ہی میں روحانی اور معنوی لحاظ سے اس مقام تک پہنچتی ہے کہ بعض روایتوں کے مطابق، اللہ کے مقرّب فرشتے آپؑ سے ہم کلام ہوتے ہیں اور آپؑ کے سامنے کائنات کے حقائق کو پیش کرتے ہیں، اسی لیے تو آپؑ کو ’’محدّثہ‘‘ کہا جاتا ہے؛ یعنی وہ شخصیت کہ جس کے ساتھ فرشتے گفتگو کرتے ہیں۔ یہ دنیا کی دوسری تمام عورتوں کے مقابلے میں حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کا عظیم معنوی مقام اور رفعتِ مکانی ہے۔

حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کمالات کی اس بلندی پر کھڑی ہو کر دنیا کی ساری خواتین سے مخاطب ہوتی ہیں اور انہیں اس راستے پر چلنے کی دعوت دیتی ہیں۔ تاریخ میں جن لوگوں نے چاہے ان کا تعلق قدیم جاہلیت سے ہو یا بیسویں صدی کی جدید جاہلیت سے،

---

[۱] اے علیؑ! آپ اس اُمت کے امام اور میرے بعد اس کے خلیفہ ہو اور آپؑ مومنین کی بہشت کی طرف راہنمائی کرنے ہیں اور گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ میری بیٹی فاطمہؑ قیامت کے دن ایک نورانی اُونٹ پر سوار ہیں اور آپؑ کے دائیں، بائیں اور آگے اور پیچھے ستر ہزار فرشتے موجود ہیں اور وہ میری اُمت کی مومن عورتوں کی بہشت کی طرف راہنمائی کر رہی ہیں۔ (بحار الانوار، ج۴۳، ص۲۴)

[۲] اے فاطمہؑ! اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو منتخب فرمایا ہے اور ہر قسم کی نجاستوں سے پاک کیا ہے اور آپؑ کو عالمین کی عورتوں پر فضیلت عطا کی ہے۔ (بحار الانوار، ج۴۳، ص۲۴)

یہ کوشش کی کہ عورت کی تذلیل و تحقیر کی جائے اور اسے ظاہری زیب و زینت کا خوگر بناکر پیش کیا جائے اور اسے لباس کے فیشن، سونے چاندی کا گرویدہ اور میک اپ کا دلدادہ ظاہر کریں اور عورت کو صرف عیش و عشرت کا سامان بناکر پیش کریں اور وہ خود عملی طور پر اس طرز کو اپناتے ہیں۔ ان کی بے تکی منطق اور سطحی سوچ حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کی درخشاں اور سورج کی طرح چمکتی دمکتی شخصیت کے سامنے برف کی طرح پگھل کر نابود ہو جاتی ہے۔

اسلام حضرت زہراء علیہا السلام جیسی برجستہ اور ملکوتی ہستی کو دنیا کی تمام عورتوں کے لیے نمونہ عمل کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ ان کی ظاہری زندگی، جہاد، علم و دانش، زورِ بیاں، فداکاری، شوہر کی خدمت، ممتا کا کردار، بیوی کی حیثیت، ہجرت اور تمام سیاسی، انتظامی، عسکری اور انقلابی میدانوں میں کردار ادا کرتے گزری، اس جانفشانی سے ایسے حالات کا مقابلہ تو بڑے اور نامور مرد حضرات بھی نہیں کر سکتے ہیں۔

آپؑ کا معنوی مقام، رکوع، سجود، عبادت، دعا، تلاوت، تضرّع و زاری، ملکوتی ذات اور معنویت بھری زندگی، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنین علیہ السلام کے ہم پایہ اور مساوی ہونے کی بہترین دلیل ہے۔ اسلام عورت کو جس مقام کا حامل دیکھنا چاہتا ہے، اس کے لیے حقیقی نمونہ، یہی خاتون ہیں جسے فاطمہ زہراء علیہا السلام کہا جاتا ہے۔

(۱۶-۱-۱۹۹۰ء)

فاطمہ زہراء علیہا السلام کی زندگی میں ایک خاص نکتہ پایا جاتا ہے جس پر توجہ دینا بہت ضروری ہے، اگرچہ ہم اس عظیم شخصیت کے معنوی اور روحانی مقام کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتے اور نہ ہی ہمارے اندر فاطمہ زہراء علیہا السلام کے معنوی اور روحانی مقام و منزلت کو سمجھنے کی ہمت ہے۔ انسانی اقدار کی بلندترین چوٹی پر فائز اس عظیم شخصیت کی منزلت کو اللہ جانتا ہے یا وہ ہستیاں جانتی ہیں جو مقام و مرتبہ کے لحاظ سے خود اس شخصیت کی برابر ہوں۔ لہٰذا فاطمہ زہراء علیہا السلام کے مقام و مرتبہ کو آپؑ کے والدِ بزرگوارؐ یا شوہرِ نامدارؑ یا آپؑ کی معصومؑ اولاد ہی سمجھ سکتے ہیں۔

اُس زمانے کے لوگ ہوں یا اس کے بعد سے لیکر آج کے لوگ، ان میں بھی اس عظیم الشان روحانی اور معنوی شخصیت کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں پائی جاتی ہے۔ آپؑ کی معنویت کے نور کو ہر کوئی آنکھ بھانپ نہیں سکتی، خصوصاً وہ آنکھیں جو کمزور ہوں اور نزدیک کی چیزوں کو دیکھنے کی عادی ہوں، ان میں اس عظیم شخصیت میں موجود اعلیٰ انسانی اقدار کے جلووں کو دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں پائی جاتی۔

لہٰذا ہم فاطمہ زہراءؑ کے معنوی اور روحانی مقام کو بیان کرنے نہیں جارہے ہیں، لیکن اس عظیم شخصیت کی عام زندگی میں ایک اہم نکتہ جو پایا جاتا ہے، وہ مختلف پہلوؤں کا آپؑ کی شخصیت میں جمع ہونا ہے، ایک مسلمان عورت کی طرح اپنے شوہر کی خدمت، اپنے بچوں کی پرورش اور گھر کی ذمہ داریوں کو نبھانے کے ساتھ، کبھی نہ تھکنے والے ایک غیور مجاہد کی طرح اہم سیاسی مسائل سے نبرد آزما ہونا، اپنے والدِ بزرگوار کی رحلت کے بعد مسجد نبویؐ میں تشریف لاکر خطبہ دینا اور اپنے موقف کا مسلسل دفاع کرنا ہے۔ یہ کردار ہر لحاظ سے ایک جہاد، عظیم الشان جدوجہد، محنت طلب اور مشکلات و سختیوں کو جھیلنے کا متقاضی ہے، تو دوسری طرف آپؑ کی عبادت، رات کی تاریکی میں محرابِ عبادت میں کھڑے ہو کر پڑھی جانے والی نمازیں، اپنے ربّ سے راز و نیاز اور اللہ تعالیٰ کے حضور آپؑ کا خشوع و خضوع بھی اپنی مثال آپ ہے۔ آپؑ عالم جوانی میں بھی کُہنہ مشق اولیاء اللہ کی طرح اپنے ربّ سے راز و نیاز اور اس کی عبادت کیا کرتی تھیں۔

فاطمہ زہراءؑ کی زندگی کا روشن ترین نکتہ یہ ہے کہ آپؑ کی زندگی میں یہ تینوں پہلو پائے جاتے ہیں۔ آپؑ نے ان تینوں پہلوؤں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا۔ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ جو شخص عبادت میں مشغول ہو جائے وہ بس ایک عابد، دعا اور ذکر و اذکار کا خوگر ہی ہو سکتا ہے، وہ ایک سیاسی انسان بن نہیں سکتا۔ یا بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو سیاستدان ہے (چاہے مرد ہو یا عورت) اور جہاد فی سبیل اللہ کے میدان میں پیش پیش ہے، وہ اگر عورت ہے تو پھر ایک گھریلو سلیقہ شعار خاتون، ایک بہترین ماں اور ایک بہترین بیوی کا کردار ادا نہیں کر سکتی اور اگر وہ

مرد ہے تو ایک گھریلو مرد کی طرح کام کاج، دکانداری اور زندگی کے دوسرے اُمور بخوبی ادا نہیں کر سکتا؛ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ یہ چیزیں ایک دوسرے کی ضد ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں یہ تینوں پہلو نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں، بلکہ یہ ایک انسانِ کامل کی شخصیت کی تکمیل میں مدد گار بھی بن جاتے ہیں۔

(۱۳-۱۲-۱۹۸۹ء)

حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کی شخصیت، تمام پہلوؤں یعنی سیاسی، اجتماعی اور جہادی اعتبار سے ایک ممتاز اور برجستہ شخصیت ہے۔ دنیا بھی کی برسرِپیکار اور انقلابی و برجستہ خواتین آپؑ کی مختصر اور پُرمغز زندگی سے درس حاصل کر سکتی ہیں۔ ایک ایسی خاتون جس نے انقلاب کے گھرانے میں آنکھ کھولی ہو اور اپنا پورا بچپن ایک ایسے باپ کی آغوش میں گزارا ہو جس کی پوری زندگی ایک ناقابلِ فراموش اور عظیم الشان جدوجہد سے عبارت تھی۔

وہ معظّمہ جو اپنے بچپن میں مکی دور کی سختیوں کو جھیل چکی ہو، جسے شعبِ ابی طالبؑ جانا پڑا ہو، جس نے وہاں بھوک اور پیاس کی سختیوں کو برداشت کیا ہو اور مدینہ ہجرت کرنے کے بعد ایک ایسے شخص کی شریک حیات بنی ہو کہ جس کی پوری زندگی جہاد فی سبیل اللہ میں گزری ہو۔ فاطمہ زہراء علیہا السلام اور امیرالمومنین امام علی علیہ السلام کی مشترکہ زندگی کے تقریباً گیارہ سالوں میں کوئی ایک سال یا چھ مہینے ایسے نہیں گزرے ہوں گے کہ آپؑ کے شوہر نے جہاد فی سبیل اللہ کے لیے کمر نہ کسی ہو اور میدانِ جنگ میں نہ گئے ہوں اور اس عظیم اور فداکار خاتون نے ایک مرد مجاہد اور ایک فوجی کمانڈر کی شریکِ حیات کی حیثیت سے ان کی شایان شان خدمت نہ کی ہو۔

اگرچہ حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کی زندگی مختصر تھی جو تقریبا بیس سال سے زیادہ نہیں تھی، لیکن آپؑ کی اس زندگی میں جہاد، مبارزہ، جدوجہد، صبر و استقامت، درس وتدریس، نبوت، امامت اور نظام اسلامی کے دفاع میں تقاریر کا ایک عظیم سمندر پایا جاتا ہے اور اس کا آخری نتیجہ شہادت کی صورت میں نکلا۔ یہ ہے حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام

کی مجاہدانہ زندگی، جو عظیم الشان اور غیر معمولی حد تک بے نظیر و بےمثال ہے اور یقیناً ہر انسان (چاہے آج کا انسان ہو یا آئندہ کا) کے ذہن میں ایک روشن اور استثنائی مثال بن کر چمکتی رہے گی۔

(۱۶_۱_۱۹۹۰ء)

حضرت فاطمہ زہراءؑ کی علمی و عبادی زندگی

حضرت فاطمہ زہراءؑ علم کے میدان میں بھی ایک عظیم عالمہ تھیں۔ حضرت رسول اکرمﷺ کی رحلت کے بعد آپؑ نے مسجد نبویؐ میں جو تاریخی خطبہ دیا، مرحوم علامہ مجلسیؒ کے بقول تمام اُدباء، فُصحاء اور علماء کو چاہیے کہ وہ مل بیٹھ کر آپؑ کے اس خطبے کے ایک ایک لفظ کی تفسیر بیان کریں، کیونکہ آپؑ کا یہ خطبہ اتنا پُرمغز اور فصیح و بلیغ ہے، جو ادبی لحاظ سے نہج البلاغہ کے فصیح اور بلیغ ترین خطبوں کی طرح ہے۔

رحلت رسول اکرمﷺ کے بعد حضرت فاطمہ زہراءؑ مسجد نبویؐ جاتی ہیں اور لوگوں کے سامنے کھڑے ہوکر فی البدیہہ خطبہ ارشاد فرماتی ہیں: تقریبا ایک گھنٹہ تک خوبصورت اور فصیح و بلیغ اور منتخب لفظوں پر مشتمل یہ خطبہ ایک ادبی شاہکار اور اسلامی سرمایہ ہے۔

(۱۶_۲_۱۹۹۲ء)

بنیادی طور پر ہم جیسے لوگ جو مقرر ہیں اور فی البدیہہ تقریریں کرتے ہیں، سمجھ سکتے ہیں کہ آپؑ کے فرمودات کتنے عظیم ہیں۔ ایک اٹھارہ، بیس یا زیادہ سے زیادہ چوبیس سالہ لڑکی (کیونکہ آپؑ کی تاریخ ولادت میں اختلاف کی وجہ سے آپؑ کی صحیح عمر معلوم نہیں ہے)، وہ بھی اتنی مشکلات اور سختیوں کے باوجود مسجد چلی آئے اور لوگوں کے جمعِ غفیر کے سامنے پورے اسلامی حجاب میں ملبوس ہوکر ایک ایسا تاریخی خطبہ بیان کرے کہ اس کا ایک ایک لفظ تاریخ میں محفوظ ہو جائے۔

عرب کے لوگ اپنے بہترین حافظے کی وجہ سے مشہور تھے۔ وہاں ایک شخص جب کسی محفل میں آکر ۸۰ اشعار پر مشتمل ایک قصیدہ پڑھتا تو محفل کے اختتام پر دس لوگ بیٹھ کر اس قصیدے کو لکھتے تھے۔ اس دور کے جو قصائد آج بھی باقی ہیں وہ غالبا اسی طرح ہی محفوظ رہے ہیں۔ وہ اشعار جو اجتماعی مراکز میں پڑھے جاتے تھے وہ محفوظ کیے جاتے تھے۔ معصومین علیہم السلام کی احادیث اور خطبے بھی اسی طرح محفوظ کیے گئے، لوگوں نے بیٹھ کر انہیں لکھا اور حفظ کیا ہے، جس کی وجہ سے یہ خطبے آج تک باقی ہیں۔

بے کار اور فضول باتیں تاریخ میں باقی نہیں رہتی ہیں (آپ سوچیں کہ) اب تک طولِ تاریخ میں کتنی باتیں کی گئی ہوں گی، کتنی تقریریں کی گئی ہوں گی، کتنے مطالب بیان کیے گئے ہوں گے اور کتنے اشعار کہے گئے ہوں گے، لیکن سب باقی نہیں رہے اور کسی کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، لیکن جس چیز کو تاریخ نے اپنے سینے میں محفوظ کیا ہے اور چودہ سو سال گزرنے کے بعد آج بھی جو شخص اسے دیکھتا ہے وہ اپنے دل میں اس کی عظمت کا احساس کرتا ہے یہ خود اس کی رفعت کی ایک علامت ہے، میری نظر میں یہ چیز ایک جوان لڑکی کے لیے نمونہ عمل ہے۔

(۲۷-۴-۱۹۹۸ء)

حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کی زندگی کا ہر پہلو اعلیٰ انسانی اقدار کی تلاش اور جستجو سے عبارت ہے۔ آپؑ کے شوہرِ نامدار مسلسل محاذ جنگ کو سنبھالے ہوئے ہیں، لیکن ان تمام تر مشکلات کے باوجود آپؑ کا گھر تمام مسلمانوں کے لیے ایک اکیڈمی کی حیثیت رکھتا ہے اور تمام لوگ اپنی مشکلات کے حل کے لیے آپؑ کے در سے رجوع کرتے ہیں۔ آپؑ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشکل کشا بیٹی ہیں۔

آپؑ نے ان مشکل حالات میں بھی کمال سرفرازی کے ساتھ زندگی گزاری ہے، آپؑ نے حسنین علیہما السلام اور حضرت زینب علیہا السلام جیسی اولاد کی تربیت کی، امام علی علیہ السلام جیسے شوہر کا خیال رکھا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسے باپ کی خوشنودی کو بھی ملحوظ رکھا! اور جب فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اور مالِ غنیمت کے دروازے کھل گئے تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس بیٹی

نے دُنیوی لذّتوں، عیش و عشرت اور اس قسم کی چیزوں کی طرف، جن کی عام طور پر جوان لڑکیاں اور عورتیں گرویدہ ہوتی ہیں، کبھی بھی توجہ نہیں دی۔

حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کی عبادت بھی ایک نمونہ ہے۔ حسن بصری جس کا شمار عالم اسلام کے ممتاز عابدوں اور زاہدوں میں ہوتا ہے، کہتا ہے: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی اتنی عبادت کیا کرتیں اور محرابِ عبادت میں کھڑی رہتی تھیں کہ ''تَوَرَّمَتْ قَدَمَاهَا''[1] محرابِ عبادت میں زیادہ دیر کھڑے رہنے کی وجہ سے آپؑ کے پاؤں میں ورم آگیا تھا! حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں: ایک رات (شب جمعہ) میری مادرِ گرامی عبادت میں مشغول ہو گئیں اور صبح تک عبادت، دعا اور تضرع و زاری کرتی رہیں۔ ''حَتّٰی اِنْفَجَرَتْ عَمُودُ الصُّبْحِ'' یہاں تک کہ سپیدۂ سحر نمودار ہو گیا۔ روایت کے مطابق امام حسن علیہ السلام فرماتے ہیں: میں پوری رات سنتا رہا میری والدہ تمام مومنین و مومنات، مسلمانوں اور دنیائے اسلام کے عمومی مسائل کے حل کے لیے دعا کرتی رہیں اور جب صبح ہوئی تو میں نے عرض کیا:

''یَا اُمَّاہ لِمَ لَا تَدْعِیْنَ لِنَفْسِکِ کَمَا تَدْعِیْنَ لِغَیْرِکِ''اے مادر گرامی! پوری رات جس طرح دوسروں کے لیے دعا کرتی رہیں اسی طرح آپؑ نے اپنے لیے دعا کیوں نہیں کی؟!

آپؑ نے فرمایا: ''یَا بُنَیَّ، اَلْجَارُ ثُمَّ الدَّارُ''[2] بیٹے پہلے پڑوسی پھر گھر۔ یعنی پہلے دوسروں کا خیال ضروری ہے پھر اپنے لیے! یہ ہے آپؑ کی اعلیٰ سوچ۔

زندگی کے تمام شعبوں میں اس عظیم خاتون کا جہاد ایک نمونہ اور رول ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے، چاہے آپؑ کا جہاد، اسلام کے دفاع میں ہو یا امامت اور ولایت کے دفاع میں یا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت میں ہو، یا اپنے شوہر اور افواج اسلامی کے علمدار علی ابن ابی طالب علیہما السلام کی دیکھ بھال کے سلسلے میں۔ یہی وجہ ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام جناب فاطمہ

---

[1] مناقب، ابن شہر آشوب، ج۳، ص۳۴۱

[2] بحار الانوار، ج۴۳، ص۸۱۔۸۲

زہراء علیہا السلام کے بارے میں فرماتے ہیں: ''وَلَا اَغْضَبَتْنِي وَلَا عَصَتْ لِي اَمْراً''[۱] یعنی پوری ازدواجی زندگی کے دوران فاطمہ زہراء علیہا السلام نے ایک مرتبہ بھی مجھے ناراض نہیں کیا اور نہ کبھی میرے حکم کی نافرمانی کی۔ حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام نے اپنی تمام تر عظمت اور بزرگی کے باوجود، اپنی گھریلو زندگی کو ایک بیوی اور شریکِ حیات کی حیثیت سے اس طرح گزارا ہے، جیسے اسلام کا حکم ہے۔

آپؑ کی عبادت، فصاحت و بلاغت، علم و فراست، معرفت و حکمت، جہاد اور جدوجہد، ایک لڑکی کی حیثیت سے آپؑ کا کردار، ایک بیوی کی حیثیت سے آپؑ کا طرزِ زندگی، ایک ماں کی حیثیت سے آپؑ کا کردار، غریبوں اور مسکینوں پر آپؑ کا احسان، ایک مسلمان عورت کے لیے مکمل نمونہ عمل ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ضعیف العمر غریب شخص کو یہ کہہ کر امیر المومنین علیہ السلام کے دروازے پر بھیجا کہ جاکر اس دَر سے مانگو اور جب وہ ضعیف شخص امیر المومنین علیہ السلام کے دروازے پر آیا تو آپؑ کے گھر میں اسے دینے کے لیے کچھ نہ تھا۔

حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام نے کھال کا وہ ٹکڑا جس پر امام حسن اور امام حسین علیہما السلام سویا کرتے تھے، اُٹھا کر اس شخص کو دے دیا اور کہا کہ جاؤ اس کو فروخت کرکے اپنی ضرورت پوری کرو۔ یہ ہے جنا حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کی ہمہ گیر شخصیت، جو تمام مسلمان عورتوں کے لیے سر و پا رول ماڈل ہے۔

ایک مسلمان عورت کو ہمیشہ علم و فراست کی جستجو میں رہنا چاہیے؛ روحانی و اخلاقی حوالے سے اپنی خود سازی میں کوشاں رہنا چاہیے؛ اسے ہر قسم کے میدانِ جہاد میں آگے آگے ہونا چاہیے؛ دنیا کی پُرکشش، بےقدر و قیمت اور پُرتکلّف چیزوں سے لاپرواہی برتنی چاہیے اور اسے پاکیزگی اور عصمت و طہارت کے اس درجے پر فائز ہونا چاہیے کہ کوئی شخص اسے بُری نظروں سے دیکھنے کی جرأت بھی نہ کر سکے، گھر کی چار دیواری میں اپنے شوہر اور بچوں کے اطمینانِ قلب کا باعث بنے، اپنے گھر اور گھر والوں کے لیے باعثِ آرام و سکون ہو اور اپنے پیار و محبت بھرے دامن اور اپنی نصیحت بھری

---

[۱] بحار الانوار، ج۴۳، ص۱۔۳۴

باتوں کے ذریعے ایسے بچوں کی تربیت کرے جو روحانی اور نفسیاتی لحاظ سے صحیح و سالم انسان ہونے کے ساتھ ساتھ، معنوی اور جسمانی لحاظ سے بھی پاک و صاف ہوں اور وہ معاشرے کے لیے فائدہ مند خواتین اور مردوں کو مہیا کرے۔

سارے معماروں میں سب سے اعلیٰ اور بہترین معمار ماں ہے۔ ممکن ہے دنیا کے بڑے بڑے سائنسدان مل کر کوئی ایسا پیچیدہ قسم کا کوئی الیکٹرونک آلہ ایجاد کریں، براعظموں کو نشانہ بنانے والے میزائل بنائیں یا فضاؤں کو تسخیر کرنے والے آلات ایجاد کریں؛ لیکن ان میں سے کسی کو بھی وہ اہمیت حاصل نہیں، جو ایک اعلیٰ صفات کے حامل انسان بنانے والے کی ہے اور یہ کام صرف اور صرف ایک ماں ہی انجام دے سکتی ہے، اس لیے خاتونِ جنت ایک مسلمان عورت کے لیے کامل نمونہ ہیں۔

(۱۶۔۱۲۔۱۹۹۲ء)

امام حسن مجتبی علیه السلام

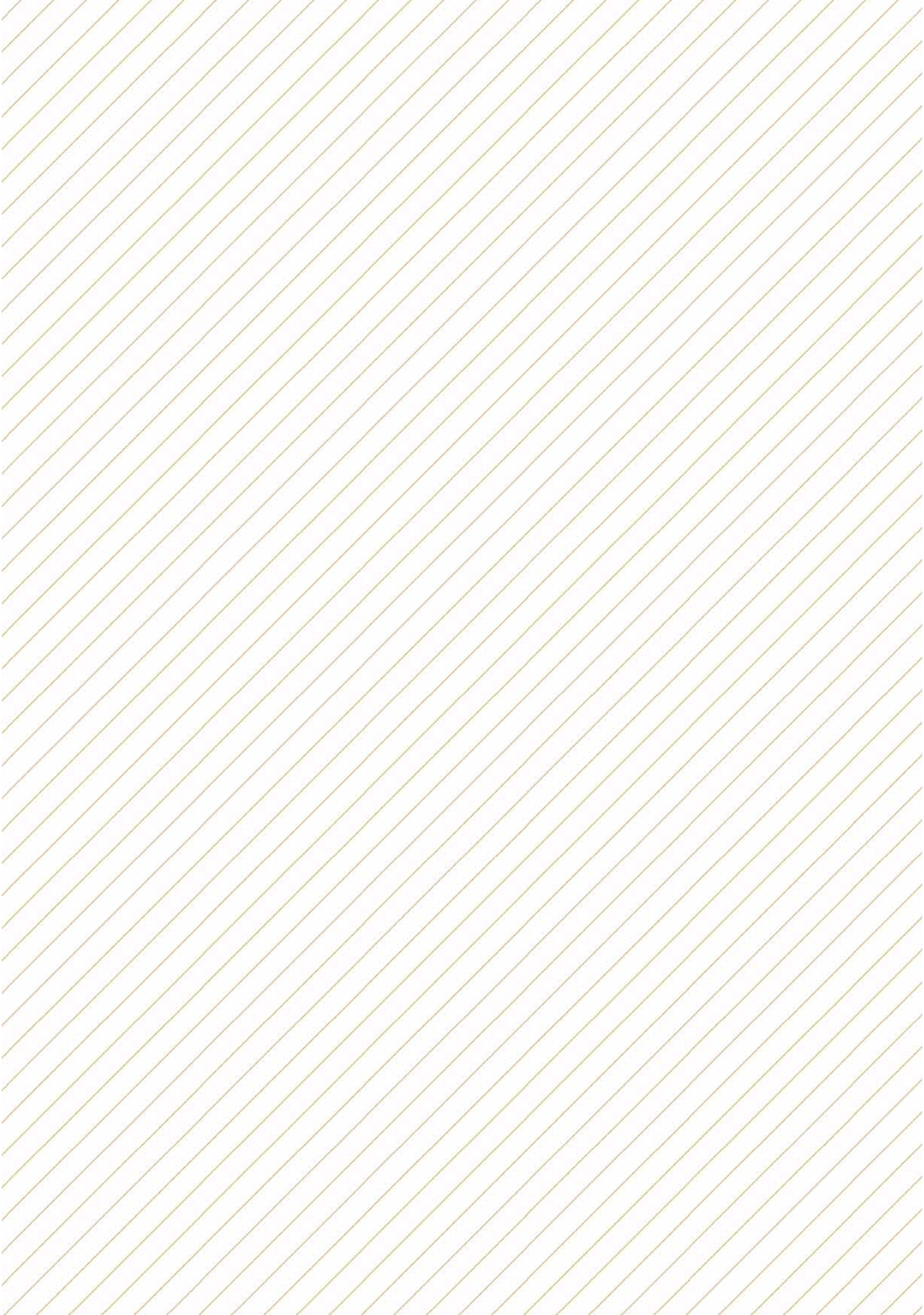

صلحِ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے اسباب

حضرت امام حسن مجتبی علیہ السلام کا دورِ خلافت اور آپؑ کی معاویہ کے ساتھ صلح یا وہ واقعہ جسے صلح کا نام دیا گیا ہے، تاریخ اسلام کے صدرِ اول کے اسلامی انقلاب کے سلسلے میں ایک بےمثال اور تقدیر بدل کر رکھ دینے والا واقعہ ہے۔ ہمارے نزدیک اس واقعہ کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ میں یہاں اس جملے کی مختصر وضاحت کے بعد اصل مطلب کی طرف آؤں گا۔ اسلامی انقلاب، یعنی اسلامی آئیڈیالوجی اور وہ امانت جسے اللہ تعالیٰ نے اسلام کے نام سے لوگوں کے لیے بھیجا تھا، جو ابتدائی طور پر ایک تحریک تھی یعنی وہ دین جس نے ابتداء میں اپنے آپ کو جہاد اور ایک عظیم انقلابی تحریک کی صورت میں پیش کیا تھا اور یہ اس وقت کی بات ہے جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ معظّمہ میں اس نظریے کا اعلان کیا تو توحید اور اسلام کے دشمنوں نے اس کے مقابلے میں صف آرائی کی، تاکہ اس فکر کو آگے بڑھنے سے روکا جا سکے؛ لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے باوفا اصحاب کی مدد سے اس تحریک کو منظم کیا اور سرزمین مکہ میں ایک عاقلانہ اور قوی تحریک کا آغاز فرمایا اور یہ جدّوجہد اور تحریک تیرہ سال تک مسلسل جاری رہی، یہ اس کا پہلا دور تھا۔

تیرہ سال بعد آپؐ نے اپنی تعلیمات، نعروں، تنظیم سازی اور بےپناہ قربانیوں اور دیگر ذرائع کی مدد سے اس فکر کو ایک حکومت، ایک سیاسی نظام اور ایک اُمت کی زندگی کے اجتماعی نظام میں بدل کر رکھ دیا اور یہ سب اس وقت ہوا جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے اور اس شہر کو اپنی حکومت کا مرکز قرار دیا پھر وہیں سے اسلامی تعلیمات کو عام کرتے رہے اور اسلام ایک تحریک سے نکل کر ایک حکومت میں تبدیل ہوگیا اور یہ اسلام کا دوسرا دور تھا۔

یہ سلسلہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دس سالہ دورِ اقتدار اور آپؐ کے بعد چار خلفاء اور امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے چھ مہینے کے دورِ خلافت تک جاری رہا اور اسلامی نظام ایک حکومت کی صورت میں ظاہر ہوا، جہاں ہر شعبے کے لیے ایک اجتماعی نظام موجود تھا، یعنی حکومتی، فوجی، سیاسی، ثقافتی، عدالتی اور اقتصادی اُمور کے شعبے موجود تھے اور سب ترقی کی راہ پر گامزن تھے اگر اسی رفتار سے یہ نظام آگے بڑھتا چلا جاتا تو پورے عالم پر چھا جاتا، یعنی اسلام نے ثابت کر دیا تھا کہ اس کے اندر یہ قابلیت موجود ہے۔

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے دورِ خلافت میں (اسلام) مخالف تحریکوں نے یوں سر اُٹھایا کہ وہ اسلامی نظام کی راہ میں ایک رکاوٹ بن کر سامنے آنے میں کامیاب ہوگئیں۔ اگرچہ یہ تحریکیں امام حسن علیہ السلام کے دور میں وجود میں نہیں آئی تھیں، بلکہ یہ کئی سال پہلے سے موجود تھیں۔ اگر کوئی شخص اپنے اعتقادی نظریات سے ذرا ہٹ کر صرف تاریخی حقائق کی روشنی میں بات کرے تو وہ یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہ تحریکیں اسلام کے ساتھ بھی وجود میں نہیں آئی تھیں؛ بلکہ یہ اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں جو نبویؐ تحریک یعنی مکی دور میں بھی موجود تھیں۔ عثمان کے دور میں جب خلافت بنو اُمیہ کے ہاتھ آگئی تو ابوسفیان نے (جو اس وقت نابینا بھی ہوچکا تھا اور اپنے قریبی لوگوں کے ساتھ ایک محفل میں بیٹھا ہوا تھا) پوچھا: یہاں پر کون لوگ موجود ہیں؟ جب اسے بتایا گیا کہ فلاں فلاں ہیں اور اسے یقین ہو گیا کہ سب بنو اُمیہ کے ہی لوگ ہیں اور کوئی غیرموجود نہیں ہے، تو اس نے ان لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا: ''تَلَقَّفُوهَا تَلَقُّفَ الْكُرَةِ'' یعنی گیند کی طرح حکومت کو ایک دوسرے کی طرف پاس دیتے جاؤ اور اپنے ہاتھ سے نکلنے نہ دو! اس واقعہ کو سنی شیعہ دونوں کی تاریخی کتابوں میں نقل کیا گیا ہے۔

یہ کوئی اعتقادی مسئلہ نہیں ہے اور نہ ہی ہم اعتقادی مسائل پر بات کر رہے ہیں، (میں پسند نہیں کرتا کہ ان مسائل کو اعتقادی یا جذباتی انداز سے لیا جائے) بلکہ میں صرف اس واقعے کا تاریخی پہلو واضح کرنا چاہتا ہوں۔ البتہ ابوسفیان اس وقت (ظاہری طور پر) ایمان لا چکا تھا اور وہ مسلمان تھا وہ فتحِ مکہ کے بعد یا فتحِ مکہ کے موقعہ پر ایمان

لایا تھا، نہ کہ اس وقت اسلام لایا تھا جب اسلام غریب اور کمزور تھا۔ اس کا اسلام، اسلام کے طاقتور ہونے کے بعد کا اسلام تھا۔

یہ تحریک حضرت امام حسن علیہ السلام کے دور خلافت میں اپنی انتہاء کو پہنچ چکی تھی اور یہ وہ تحریک تھی جو معاویہ بن ابی سفیان کی شکل میں امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے سامنے ظاہر ہوگئی۔ اس تحریک نے اسلامی نظام کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنا شروع کردیں یعنی حکومتِ اسلامی کا راستہ روکتے ہوئے، اس کی جڑوں کو کاٹ دیا اور اس کے لیے مشکلات کھڑی کر دیں۔ یہاں تک کہ یہ عملی طور پر حکومتِ اسلامی کی پیش رفت میں رکاوٹ بن گئی۔

صلحِ امام حسن علیہ السلام کے باب میں ہم نے بارہا اس مسئلے کو بیان کیا ہے اور کتابوں میں بھی لکھا ہوا ہے کہ اگر اس موقعہ پر امام حسن علیہ السلام کی جگہ کوئی اور ہوتا، یہاں تک کہ خود امیر المومنین امام علی علیہ السلام ہوتے، تب بھی جو کچھ امام حسن علیہ السلام نے کیا تھا اس کے علاوہ کچھ اور ممکن ہی نہ تھا۔ کوئی بھی شخص امام حسن علیہ السلام کے اس اقدام کے کسی بھی گوشے پر انگلی نہیں اُٹھا سکتا، کیونکہ آپؑ کا یہ اقدام سو فیصد منطقی استدلال پر مبنی ہے۔

اہل بیت علیہم السلام میں سب سے زیادہ جوشیلا اور جذباتی کون تھا؟ کس کی زندگی سب سے زیادہ شہادت طلبانہ جدّوجہد اور جہاد میں گزری ہے؟ دشمن کے مقابلے میں سب سے زیادہ دینی غیرت اور حمیّت کا پاس رکھنے والا کون تھا؟ (یقیناً) وہ حسین ابن علی علیہما السلام تھے اور آپؑ تو صلح میں امام حسن علیہ السلام کے ساتھ برابر کے شریک تھے، امام حسن علیہ السلام نے اکیلے صلح نہیں کی تھی، بلکہ امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام دونوں نے ملکر صلح کی تھی، فرق صرف یہ تھا کہ امام حسن علیہ السلام آگے آگے تھے اور امام حسین علیہ السلام آپؑ کے پیچھے تھے اور امام حسن علیہ السلام کے نظریات کا دفاع کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک نشست میں جب آپؑ کے قریبی دوستوں (تحریکی اور جذباتی ساتھیوں)میں سے ایک شخص نے امام حسن علیہ السلام پر اعتراض کیا تو امام حسین علیہ السلام نے امام حسن علیہ السلام کا دفاع کیا: ''وَغَمَزَ

اَلْحُسَیْنُ حُجْراً"[۱] کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ امام حسن علیہ السلام کی جگہ امام حسین علیہ السلام ہوتے تو یہ صلح واقع نہیں ہوتی؛ نہیں بلکہ اس صلح میں بھی امام حسین علیہ السلام، امام حسن علیہ السلام کے ہمراہ موجود تھے اور صلح واقع ہوئی، اسی طرح اگر امام حسین علیہ السلام اکیلے ہوتے، تب بھی ایسے حالات میں وہی کچھ کرتے جو امام حسن علیہ السلام نے کیا۔

تاریخ کا باعظمت اور ملائمت سے بھرپور مصالحانہ اقدام

صلح کی تمام شرائط موجود تھیں اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ ہی نہ تھا، کیونکہ اس وقت شہادت کے لیے خود کو پیش کرنے کا موقع ہرگز نہیں تھا۔ جیسا کہ مرحوم شیخ راضی آل یاسینؒ نے اپنی کتاب "صلحِ امام حسن علیہ السلام" (جس کا میں نے سن ۱۹۶۹ء میں فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔) میں یہ ثابت کیا ہے کہ اس وقت شہادت کا امکان ہی نہ تھا کیونکہ ہر مقتول شہید نہیں کہلاتا، بلکہ کچھ شرائط کے ساتھ اگر کوئی مارا جائے تو اسے شہید کہتے ہیں۔ چونکہ وہ شرائط یہاں موجود نہیں تھیں، لہٰذا امام حسن علیہ السلام ان دنوں قتل ہو جاتے تو شہید نہ کہلاتے؛ کیونکہ ایک ایسے موقعہ پر جہاں انسان کو مصلحت سے کام لینا چاہیے وہاں پر وہ جارحانہ رویّہ اپنائے اور مارا جائے تو ایسی موت کو خودکشی کے علاوہ شہید کہنا ممکن نہیں ہے۔

صلحِ امام حسن علیہ السلام کے مختلف پہلوؤں پر ہم بات کر چکے ہیں لیکن اب مسئلہ یہ ہے کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی صلح کے بعد حالات انتہائی ہوشیاری اور زیرکی کے ساتھ اس طرح سے منظم کیے گئے کہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کو خلافت کے نام پر وجود میں آنے والی ملوکیت کے اس کثیف گرداب میں داخل ہی نہ ہونے دیا جائے اور یہی امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کا کارنامہ تھا۔ آپؑ نے ایک ایسا کام انجام دیا کہ جس کے ذریعے اسلام کی اصلی تعلیمات کو جن کا آغاز مکہ سے ہوا اور مدینے میں یہ ایک اسلامی حکومت کی شکل میں ظاہر ہوئیں اور امیر المومنین علی علیہ السلام کے دورِ حکومت اور خود امام حسن علیہ السلام کے دور تک

۱۔ امام حسین علیہ السلام نے حجر کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا (اور وہ خاموش ہوگیا)۔ (شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، ج۱۶، ص۱۵)

جاری رہیں، ایک نئی جہت دینی تھی اور اگر یہ کام انجام دینا ایک حکومت کی صورت میں نہیں، تو کم از کم ایک تحریک کی صورت میں ہی سہی اسے انجام دینا تھا اور یہ اسلام کا تیسرا دور تھا کہ جس میں اسلام نے دوبارہ تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی جس کے نتیجے میں اسلام نابِ محمدیؐ، اسلام کی اصلی تعلیمات، وہ اسلام جو ظلم کے مقابلے میں اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، وہ اسلام جو سازشوں کو ناکام بنا دیتا ہے، وہ اسلام جو ہر قسم کی تحریفات سے پاک ہے اور وہ اسلام جو لوگوں کے ہاتھوں میں خواہشاتِ نفسانی اور ہوا و ہوس کا بازیچہ بننے سے بچنے والا ہے، وہ اسلام باقی رہ گیا، لیکن وہ ایک تحریک کی صورت میں باقی رہ گیا؛ یعنی امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے دور میں اسلامی طرزِ فکر جس نے ایک طویل راستے کو طے کرتے ہوئے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تھی، اس نے دوبارہ پلٹ کر ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ البتہ اس دور میں اسلامی تحریک کی ذمہ داریاں، خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور کی ذمہ داریوں سے کہیں زیادہ سخت اور مشکل تھیں۔

کیونکہ یہاں دین کا مخالف بھی مذہب اور دین کا نعرہ لگا رہا تھا اور اس نے مذہب ہی کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا؛ جبکہ حقیقت میں دین اور مذہب سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا اور یہی چیز ائمہ معصومین علیہم السلام کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ البتہ ائمہ معصومین علیہم السلام سے منقول روایات اور ان کے حالاتِ زندگی کے مطالعے سے، میں اس نتیجے پر پہنچ گیا ہوں کہ جس دن سے صلحِ امام حسن علیہ السلام واقع ہوئی، اسی دن سے لیکر آخر تک ائمہ معصومین علیہم السلام کی مسلسل یہ کوشش رہی کہ کسی نہ کسی طریقے سے اس تحریک کو ایک مرتبہ پھر اسلامی حکومت میں تبدیل کر سکیں۔ اس حوالے سے بہت ساری روایات پائی جاتی ہیں، البتہ ممکن ہے کہ کچھ لوگ اس چیز کا کسی اور انداز سے جائزہ لیں لیکن میری تحقیق یہ ہے کہ ائمہ اطہار علیہم السلام کی پوری کوشش رہی ہے کہ اس تحریک کو خالص اسلامی حکومت میں تبدیل کر سکیں؛ یعنی وہ چاہتے تھے کہ معاشرے کا نظام اس تحریک کے ہاتھ میں ہو جو ہوا و ہوس اور نفسانی خواہشات سے دور اور پاک و صاف ہے، لیکن یہ بہت ہی سخت اور مشکل کام تھا۔

اس انقلابی تحریک کے دوسرے دور یعنی سُفیانی، مروانی (اُموی) اور عباسی خلفاء کی خلافت کے دور میں لوگوں کے لیے سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ اسلام اور قرآن کے صحیح اصولوں کو سمجھنے اور ان کی پہچان میں غلطی نہ کریں۔ آخر تمام ادیانِ عالم نیز قرآن کریم میں انسانوں کو اس قدر غور و فکر اور تدبُّر کی تاکید کیوں کی گئی ہے اور وہ بھی دین کے بنیادی اصولوں یعنی توحید کے بارے میں۔ توحید کا صرف یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم کہیں کہ کوئی خدا ہے اور وہ بھی ایک ہے دو نہیں ہیں۔ یہ توحید کی ظاہری صورت ہے، جبکہ توحید کا باطن ایک ایسا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے جس میں اولیائے الٰہی غوطے لگاتے ہیں۔

توحید ایک بہت ہی باعظمت وادی کا نام ہے، لیکن اس باعظمت وادی میں بھی مومنین، مسلمین اور موحّدین کو غور و فکر اور تعقّل و تدبُّر کے ساتھ آگے بڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اور حقیقت میں بھی غور و فکر ہی انسان کو آگے لے جا سکتا ہے۔ البتہ مختلف مراحل میں عقل، وحی کے نور، معرفت کے نور اور اولیائے الٰہی کی تعلیمات سے اپنے لیے غذا حاصل کرتی ہے، لیکن پھر بھی جس طاقت کی مدد سے آگے بڑھا جا سکتا ہے وہ عقل کی طاقت ہی ہے، عقل کے بغیر کہیں بھی جایا نہیں جا سکتا ہے۔

ملتِ اسلامیہ کو ان چند سو سال کے عرصے میں، جب خلافت کے نام سے ان پر حکومت کی گئی (یعنی ساتویں صدی تک جو بنو عباس کی خلافت کا آخری دور تھا۔ البتہ بنو عباس کی خلافت کے بعد بھی بعض مقامات پر خلافت کے نام سے کچھ چیزیں موجود تھیں؛ جیسے ممالیک کے دور میں مصر اور اس کے ایک مدت بعد خلافتِ عثمانیہ کا زمانہ اور دیگر مقامات پر) جس چیز کو سمجھنے کی ضرورت تھی وہ یہ کہ انہیں عقل کو قاضی بنا کر یہ دیکھنا چاہیے تھا کہ اسلام، قرآن اور معتبر احادیث میں حکمرانوں کے لیے جو شرائط بیان کی گئیں ہیں، کیا وہ موجودہ حکمرانوں میں پائی جاتی ہیں کہ نہیں؟ یہ انتہائی اہم بات تھی۔

اُموی اور عباسی خلافتوں کا دور

مروانی، سُفیانی اور عباسی خلافت کا دور، ایک ایسا دور تھا کہ جس میں اسلامی اقدار اپنا حقیقی وقار کھو چکی تھیں اور ان کے خالی ڈھانچے باقی رہ گئے تھے، لیکن ان اقدار کے بنیادی مفاہیم جاہلی اور شیطانی مفاہیم میں تبدیل ہو چکے تھے۔

وہ مراکز جو انسانوں کو عاقل، عبادت گزار، مومن، آزاد، برائیوں سے دور، اللہ کے حضور میں خاضع اور متکبروں کے مقابلے میں متکبر بنانا چاہتے تھے (اور ان میں سب سے بہترین مرکز خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں اسلامی مملکت تھی)، وہ اب ایسے مراکز میں تبدیل ہو چکے تھے جہاں انسانوں کو مختلف تدابیر کے ذریعے دنیاداری، چاپلوسی اور ہوس رانی میں مشغول اور انہیں روحانیت سے دُور کرکے ان کی شخصیت کو تباہ کر دیا جاتا تھا۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بنو اُمیہ اور بنو عباس کے پورے دورِ خلافت میں یہی سلسلہ جاری تھا۔ تاریخ کی کتابیں ایسے واقعات سے بھری پڑی ہیں، اگر ہم انہیں بیان کرنا چاہیں تو بہت وقت لگے گا۔ یہ سلسلہ خود معاویہ ہی کے دور سے شروع ہو گیا تھا اور وہ اس کام میں مشہور ہو چکا تھا یعنی تاریخ نویسوں نے لکھا ہے کہ وہ ایک حلیم اور کھلے دل کا آدمی تھا اور وہ اپنے مخالفین کو اس بات کی اجازت دیتا تھا کہ وہ اس کے سامنے جو چاہیں کہہ سکتے ہیں، ممکن ہے کہ ایک خاص زمانے میں یا ابتدائے حکومت میں وہ ایسا رہا ہو، لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی زندگی اور شخصیت کے دوسرے پہلوؤں کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے کہ وہ کس طرح عام لوگوں، قبائل کے سرداروں اور معاشرے کے جانے پہچانے اور سرکردہ لوگوں کو اپنے عقائد اور ایمان سے دستبردار ہونے اور حق کے مقابلے میں اُٹھ کھڑے ہونے کے لیے تیار کرتا تھا۔ مورّخین نے ان چیزوں کے بارے میں بہت کم لکھا ہے لیکن پھر بھی بعض لوگوں نے کچھ نہ کچھ لکھا ضرور ہے جو تاریخ میں اس وقت بھی موجود ہے۔

اس کی خلافت سے وابستہ لوگوں کی اس طرح تربیت کی جاتی تھی کہ انہیں خلیفہ کی رائے اور اس کی مرضی کے خلاف ایک لفظ بھی زبان پر لانے کی اجازت نہیں تھی۔ آخر یہ کیسا معاشرہ ہے؟ اور یہ کس قسم کے انسان ہیں؟! لوگوں کے اندر یہ

کیسا اسلامی اور الٰہی جذبہ کارفرما ہے کہ جس کی بنا پر وہ معاشرے سے برائیوں کا خاتمہ کرکے اسے ایک الٰہی معاشرہ بنانا چاہتے ہیں؟ کیا ایسا کرنا ممکن ہے؟!

جاحظ یا شاید ابو الفرج اصفہانی نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ اپنے دورِ خلافت میں معاویہ گھوڑے پر سوار ہو کر مکہ جا رہا تھا اس کے برابر میں ایک اور شخص بھی اپنے گھوڑے پر سوار چل رہا تھا، معاویہ اس شخص کے ساتھ باتوں میں مگن تھا ان کے پیچھے اور بھی لوگ چل رہے تھے۔ معاویہ زمانۂ جاہلیت میں بنو اُمیہ کے کارنامے بیان کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ یہاں ایسا تھا تو وہاں ویسا تھا، میرے باپ ابو سفیان نے اس وقت ایسے کارنامے انجام دیئے۔ راستے میں کچھ بچے کھیل رہے تھے کہ کسی بچے نے ایک پتھر پھینکا اور وہ معاویہ کے ساتھ چلنے والے شخص کی پیشانی پر جا لگا اور اس کی پیشانی سے خون بہنے لگا۔ اس شخص نے معاویہ کی باتوں میں خلل نہیں ڈالا، بلکہ کچھ کہے بغیر خاموش درد برداشت کرتا رہا یہاں تک کہ خون اس کے چہرے اور داڑھی تک آگیا، معاویہ یوں ہی اپنی باتوں میں مگن تھا کہ اچانک اس کی نظر اس شخص پر پڑی۔ معاویہ نے دیکھا کہ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا ہے۔ کہا: ارے، یہ کیا ہوا ہے! تمہاری پیشانی سے خون بہہ رہا ہے؟ وہ شخص معاویہ کے جواب میں حیرت سے کہتا ہے: کیا میری پیشانی سے خون بہہ رہا ہے؟ کہاں ہے؟ یعنی وہ شخص یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ معاویہ کی باتیں سننے میں اس قدر مگن تھا کہ اسے پتہ بھی نہیں چلا کہ اس کی پیشانی پر پتھر لگا ہے اور خون بہہ رہا ہے! معاویہ نے اس سے پوچھا: تعجب ہے! تمہاری پیشانی پر پتھر لگا اور خون بہہ رہا ہے لیکن تمہیں پتہ بھی نہیں چلا؟! اس نے کہا: نہیں! مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا۔ اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: تعجب ہے خون بہہ رہا ہے؟ بعد میں اس نے معاویہ کی جان یا مقدسات کی قسم کھا کر کہا: میں تو آپ کی شیرین کلامی میں اس قدر مگن تھا کہ جب تک آپ نے نہیں بتایا مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ میری پیشانی سے خون نکل رہا ہے! معاویہ نے اس شخص سے پوچھا: بتا کہ بیت المال سے تجھے کتنا حصّہ ملتا ہے؟ اس نے کہا: مثلاً مجھے اتنا مال ملتا ہے۔ معاویہ نے کہا: واقعاً تیرے ساتھ ظلم ہو رہا ہے اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے حکم دیا کہ اس کے حصے کو تین گنا بڑھایا جائے! یہ تھا معاویہ کی حکومت کا مزاج اور اس

دور کی ثقافت کا معیار۔

اس زمانے میں جو لوگ سرداروں اور خلفاء کی چاپلوسی کرتے ہوئے، ان کے گن گاتے تھے اختیارات انہیں کے ہاتھوں میں ہوتے تھے۔ یہاں پر قابلیت اور معیار کی بنیاد پر اختیارات دینے کا رواج ہی نہیں تھا۔ بنیادی طور پر عرب معاشرے میں حسب و نسب کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے کہ فلاں شخص کا تعلق کس قبیلے سے ہے؟ اور اس کے والدین کون ہیں؟ لیکن یہ لوگ (بنو اُمیہ) تو حسب و نسب کا بھی کوئی خیال نہیں رکھتے تھے۔ عبد الملک بن مروان اور اس کے بعض بیٹوں کے دورِ حکومت میں، انہوں نے یوسف بن عمر ثقفی نامی شخص کو ایک طویل عرصے تک عراق پر مسلط کیے رکھا وہ کافی سال عراق کا حاکم اور گورنر تھا۔ یہ انتہائی بدبخت اور کینہ پرور شخص تھا۔ تاریخ میں اس کی کینہ پروری کے بہت سارے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ شخص چھوٹے قد کا حامل تھا اور اپنے اسی چھوٹے قد کی وجہ احساسِ کمتری میں مبتلا تھا۔ وہ جب درزی کو کپڑے دیتا تو اس سے پوچھتا تھا کہ کیا یہ کپڑا اس کے سوٹ کے لیے کافی ہے؟ اگر درزی کہتا کہ جی ہاں! یہ کپڑا کافی ہے بلکہ تھوڑا کپڑا بچ بھی جائے گا، تو وہ اس درزی سے کپڑا واپس لیتے ہوئے اسے گرفتار کرنے اور سزا دینے کا حکم دیتا تھا! درزیوں کو بھی اس کی عادت کا پتہ چل گیا تھا اس لیے جب بھی وہ کسی درزی کو کپڑا سینے دیتا اور پوچھتا: کیا یہ کپڑا میرے لیے کافی ہے؟ تو درزی اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا: نہیں جناب! شاید یہ کپڑا آپ کے قد و قامت کے لیے کم پڑ جائے، لیکن ہمیں کافی محنت کرنی ہوگی تاکہ اسے آپ کے قد و قامت کے مطابق بنا سکیں! وہ یہ جاننے کے باوجود کہ درزی جھوٹ بول رہا ہے، اس کی بات پر خوش ہوتا تھا۔ یہ ایک ایسا احمق اور بےوقوف شخص تھا۔ یہ وہی تھا جس نے کوفہ میں زید بن علی علیہ السلام کو شہید کیا۔ ایک ایسا شخص کئی سالوں تک لوگوں کی جان و مال اور عزّت و ناموس پر مسلط تھا۔ نہ تو کوئی صحیح حسب و نسب رکھتا تھا اور نہ ہی عقل و شعور کا مالک تھا، لیکن صاحبانِ اقتدار سے وابستہ تھا اس لیے اس کو اس منصب پر بٹھایا گیا تھا۔ یہ چیزیں کسی بھی نظام کے لیے بہت بڑی آفت کا درجہ رکھتی ہیں۔

یہ اسلام مخالف تحریک اسی طرح جاری و ساری تھی، جبکہ اس کے مقابلے میں حقیقی اسلامی اور قرآنی اقدار پر مبنی تحریک (جو کسی بھی صورت میں اس غیراسلامی تحریک کے مقابلے میں گھٹنے ٹیکنے والی نہیں تھی) بھی جاری و ساری تھی، جس کی سب سے واضح مثال ائمہ معصومین علیہم السلام اور ان کے باوفا اصحاب ہیں۔ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی برکت سے اسلامی اقدار پر مبنی اس تحریک نے اسلام کو بچایا۔ اگر امام حسن علیہ السلام صلح نہ کرتے تو دینِ اسلام کی ان متحرک اقدار میں سے کچھ بھی باقی نہ بچتا بلکہ سب کچھ ختم ہوجاتا، کیونکہ اس صورت میں بظاہر غلبہ تو معاویہ ہی کو حاصل ہونا تھا۔ کیونکہ حالات یہ بتاتے ہیں کہ امام حسن علیہ السلام کو کامیابی ملنے کے کوئی امکانات نہیں تھے، بلکہ کامیابی معاویہ ہی کو ملنے والی تھی کیونکہ تمام تبلیغاتی ذرائع پر اس کا قبضہ تھا اور دوسری طرف مسلمانوں کے درمیان اس کی شخصیت بھی جانی پہچانی تھی وہ کوئی غیرمعروف آدمی نہیں تھا۔

صلحِ امام حسن علیہ السلام کے اثرات

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام اگر صلح نہ کرتے تو خاندانِ رسالتؐ کے تمام افراد مارے جاتے اور معاویہ ان میں سے کسی ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑتا کہ وہ اسلام کی اصلی اقدار کی حفاظت کر سکیں۔ سب کچھ ختم ہو جاتا اور اسلام کا نام لینے والا کوئی باقی نہ بچتا اور واقعہ عاشورا کی نوبت بھی نہ آتی۔ یعنی اگر امام حسن علیہ السلام معاویہ کے ساتھ جنگ کو جاری رکھتے تو اس کے نتیجے میں خاندانِ رسالتؐ کے تمام افراد شہید ہو جاتے۔ امام حسین علیہ السلام کے ساتھ ساتھ حجر بن عدی جیسے اور بھی نامور اصحاب قتل کر دیئے جاتے۔ کوئی ایسا شخص باقی ہی نہیں بچتا جو اسلام کی حقیقی اقدار کی حفاظت کر سکے۔ اس لیے امام حسن علیہ السلام نے صلح کی اور یہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کا اسلام پر بہت بڑا احسان ہے۔

(۱۱-۰۴-۱۹۹۰ء)

البتہ صلحِ امام حسن علیہ السلام ایک زبردستی کی صلح تھی لیکن پھر بھی ایک صلح واقع تو ہوئی تھی، لیکن امام حسن علیہ السلام دل سے اس کے لیے راضی نہ تھے۔ اس لیے امام حسن علیہ السلام

نے جن شرائط پر معاویہ کے ساتھ صلح کی، ان شرائط نے معاویہ کی سیاست کو متزلزل کر دیا تھا۔ صلحِ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام اور اس کی شرائط بھی ایک الٰہی تدبیر تھی ''وَمَکَرُوا وَمَکَرَ اللّٰہُ''[1] یعنی اگر امام حسن علیہ السلام اس وقت معاویہ کے ساتھ جنگ کرتے تو یقیناً مارے جاتے اور وہ بھی اپنے ہی اصحاب کے ہاتھوں، جنہیں معاویہ کے جاسوسوں نے بھاری رقوم دے کر خرید لیا تھا اور معاویہ کہتا کہ حسن ابن علی علیہما السلام کو میں نے تو نہیں مارا بلکہ خود ان کے اصحاب ہی نے مارا ہے، عین ممکن ہے کہ وہ اس صورت امام حسن علیہ السلام کے لیے مجلسِ ترحیم کا بھی اہتمام کرتا، لیکن بعد میں وہ امیر المومنین علیہ السلام کے اصحاب کو ایک ایک کرکے تہہ تیغ کر دیتا اور شیعہ نام کا کوئی ایک شخص بھی باقی نہیں بچتا، جو بیس سال بعد کوفہ میں امام حسین علیہ السلام کو دعوت دے سکے۔ لہٰذا امام حسن علیہ السلام نے تشیع کی بنیادوں کو بچایا تاکہ بیس، پچیس سال بعد حکومت کی باگ ڈور اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں آجائے۔

(۰۲۔۰۶۔۲۰۰۰ء)

جب امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے معاویہ سے صلح کر لی تو بہت سے جاہل اور کم فہم لوگوں نے آپؑ کو مختلف طریقوں سے ہدفِ تنقید بنایا۔ کبھی وہ آپؑ کو مومنین کی ذلّت اور رسوائی کا باعث[2] گردانتے ہوئے کہتے تھے: ''آپؑ نے معاویہ کے ساتھ صلح کرکے مومنین کی اس پُرجوش جماعت کو ذلیل و رسوا اور معاویہ کے سامنے سر تسلیمِ خم کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔'' کبھی احترام کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ذرا دھیمے لہجے میں یہی باتیں دہرائی جاتی تھیں۔

لیکن امام حسن علیہ السلام ان تمام اعتراضات اور تنقیدوں کے جواب میں ان سے صرف ایک جملہ ارشاد فرماتے تھے، جو شاید آپؑ کے تمام فرمودات میں سب سے زیادہ واضح اور بہتر ہے اور وہ جملہ یہ ہے: ''مَا تَدۡرِی لَعَلَّهُ فِتۡنَةٌ لَكُمۡ وَمَتَاعٌ اِلٰی حِیۡنٍ''[3] تمہیں

۱۔ انہوں (دشمنوں) نے مکاری کی تو اللہ نے بھی جوابی تدبیر کی (اور خدا بہترین تدبیر کرنے والا ہے)۔ (سورہ آل عمران، آیت۵۴)

۲۔ ''یَا مُذِلَّ الْمُؤْمِنِیْنَ'' (تحف العقول، ص۳۰۸)

۳۔ ماخوذ از سورہ انبیاء، آیت۱۱؛ مجھے نہیں معلوم شاید یہ تمہارے لیے ایک آزمائش اور کچھ وقت کی فرصت ہو۔ (بحار الانوار، ج۴۴، ص۵۶)

کیا معلوم شاید یہ تمہارے لیے ایک آزمائش ہو؟ اور معاویہ کے لیے ایک عارضی سرمایہ اور فرصت ہو۔ آپؑ کا یہ جملہ درحقیقت قرآن کریم کا ایک اقتباس ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپؑ کو مستقبل کا انتظار ہے اور وہ مستقبل اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ آپؑ کی نظر میں حق سے منحرف اور ناقابلِ قبول حکومت برطرف ہو جائے اور اس کی جگہ آپؑ کی پسند کی ایک حکومت قائم ہو جائے۔ لہٰذا آپؑ ان لوگوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں تم صلح کے فلسفہ کو نہیں جانتے، تمہیں کیا معلوم شاید اسی میں ہی کوئی مصلحت پوشیدہ ہو؟

صلح کے آغاز ہی میں (جب) شیعہ عمائدین میں سے دو مشہور شخصیات، مُسَیَّب بن نَجَبَہ اور سلیمان بن صُرَد خزاعی چند مسلمانوں کے ہمراہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ہمارے پاس خراسان اور عراق وغیرہ میں خاصی افرادی قوت موجود ہے اور ہم اسے آپؑ کے اختیار میں دینے کے لیے تیار ہیں اور معاویہ کا شام تک تعاقب کرنے کے لیے حاضر ہیں تو آپؑ نے انہیں تنہائی میں گفتگو کرنے کے لیے طلب کیا اور کچھ دیر بات چیت کی اور جب وہ آپؑ کے ہاں سے باہر نکلے تو ان کے چہرے پر اطمینان کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے اپنے فوجی دستوں کو رخصت کر دیا، حتیٰ کہ ساتھ آنے والوں کو بھی کوئی واضح جواب نہ دیا۔

طٰہ حسین[1] کا یہ دعوی ہے کہ دراصل اسی ملاقات میں شیعوں کی تحریک کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا تھا یعنی وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے ان لوگوں کے ساتھ مل بیٹھ کر اور آپس میں بات چیت کرکے ایک عظیم شیعہ تنظیم کی بنیاد رکھ دی تھی۔

چنانچہ خود امام حسن علیہ السلام کے حالاتِ زندگی اور آپؑ کے مقدس ارشادات سے بھی واضح طور پر یہی مفہوم نکلتا ہے، اگرچہ وہ زمانہ اس قسم کی تحریک اور سیاسی جدوجہد کے لیے سازگار نہ تھا (کیونکہ) لوگوں میں سیاسی شعور بےحد کم اور دشمن کے پروپیگنڈوں نیز مالی وسائل کے بےدریغ استعمال کا بازار گرم تھا۔ دشمن جن طریقوں سے فائدہ اُٹھا رہا تھا، آپؑ ان طریقوں کو اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ مثلاً بےحساب پیسہ

---

[1] مشہور معاصر مصری مورّخ

خرچ کرنا اور معاشرہ کے چھٹے ہوئے بدقماش افراد کو اپنے گرد اکٹھا کر لینا آپؑ کے لیے ممکن نہ تھا۔ ظاہر ہے دشمن کا ہاتھ کھلا ہوا تھا اور اس حوالے سے امام عالی مقامؑ کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔[۱]

حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ایک اور روایت میں آپؑ فرماتے ہیں: ''وَقَّتَ هَذَا الْاَمْرَ فِي السَّبْعِيْنَ''[۲] یعنی خدا کی تقدیر میں یہ تھا کہ امیر المومنینؑ کی شہادت کے تیس سال اور امام حسینؑ کی شہادت کے دس سال بعد حکومتِ اسلامی کی باگ ڈور اہل بیت رسولﷺ کو واپس کی جائے، لیکن اتنا بڑا نتیجہ کب سامنے آنا ہے؟ جب لوگ اپنے قصد اور ارادے کے ساتھ اس کے لیے مقدمات فراہم کریں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی کسی سے کوئی رشتہ داری نہیں ہے! لوگوں نے اپنے فرائض اور ذمہ داریاں ادا نہیں کیں، جبکہ امام حسن اور امام حسین علیہما السلام نے اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی انجام دیا لیکن خواص جیسے عبداللہ ابن جعفر اور عبداللہ ابن عباس اور ان جیسے دوسرے لوگوں نے اپنی ذمہ داریوں کو نہیں نبھایا۔ یہاں تک کہ اُن لوگوں نے بھی جنہوں نے بعد میں واقعۂ کربلا میں امام حسینؑ کے ہم رکاب ہوکر جنگ کی۔ انہوں نے بھی جناب مسلم بن عقیلؑ (سفیرِ امام حسینؑ) کے ساتھ وہ تعاون نہیں کیا، جو کرنا چاہیے تھا۔ بلکہ انہوں نے کوتاہی کی ورنہ جناب مسلم کے ساتھ وہ کچھ نہ ہوا ہوتا، انہیں جناب مسلم کے ساتھ مل کر حکومتِ کوفہ کا قصّہ تمام کر دینا چاہیے تھا جو کہ نہیں کیا اور ان لوگوں کی یہی کوتاہیاں کربلا کے دلخراش واقعے کا سبب بنیں۔

اس کے بعد امام جعفر صادقؑ مزید فرماتے ہیں: ''فَلَمَّا أَنْ قُتِلَ الْحُسَيْنُ صَلَوَاتُ اللهِ عَلَيْهِ اِشْتَدَّ غَضَبُ اللهِ تَعَالىٰ عَلَى أَهْلِ الْاَرْضِ فَأَخَّرَهُ اِلىٰ أَرْبَعِيْنَ وَ مِائَة''[۳] یعنی یہ کام تاخیر کا شکار ہو گیا اور میرے خیال میں ایک سو چالیس ہجری تک پہنچ گیا، یعنی ستّر سال مزید تاخیر ہو گئی اور بنو عباس کے دورِ خلافت تک پہنچ گیا۔ پس معلوم ہوتا ہے

۱۔ پاسدار اسلام، شمارہ ۶

۲۔ اللہ تعالیٰ نے اس امر (حکومتِ الٰہی) کے لیے ستّر ہجری کو معین فرمایا تھا۔ (الکافی، ج۱، ص۳۶۸)

۳۔ جب امام حسینؑ کو شہید کر دیا گیا تو اہل زمین پر اللہ تعالیٰ کے غضب میں شدت پیدا ہوگئی اور اُس نے (تاسیسِ حکومت کا) وقت سن ۱۴۰ھ تک کے لیے مؤخّر کر دیا۔ (الکافی، ج۱، ص۳۶۸)

کہ امام حسن علیہ السلام کی صلح ایک عظیم کام کا مقدمہ قرار پائی، ورنہ حضراتِ ائمہ معصومین علیہم السلام اتنی آسانی کے ساتھ اپنے موقف سے دستبردار ہونے والے کب تھے اور کیا ولایت و حکومت کا مسئلہ کوئی چھوٹی بات تھی؟ نہیں! بلکہ یہ دین کی بنیاد تھی لیکن حالات اس قسم کے درپیش آئے تھے۔

(۰۲-۰۶-۲۰۰۰ء)

صلحِ امام حسن علیہ السلام کے بارے میں (اب تک) بہت کچھ لکھا اور کہا گیا ہے، لیکن میں یہاں پر اس عظیم واقعے کا ایک دوسرے زاویے سے جائزہ لینا چاہتا ہوں؛ کیونکہ اس واقعے کا تعلق تاریخ کے ایک انتہائی حسّاس موڑ سے ہے، جو اس کی اہمیت میں اضافہ کر دیتا ہے۔ چونکہ تاریخ اسلام مختلف قسم کے سیاسی واقعات سے بھری پڑی ہے، جیسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، امیر المومنین علیہ السلام اور دوسرے ائمہ معصومین علیہم السلام کے دور کے واقعات یا خلفائے بنو اُمیہ اور بنو عباس کے دور کے واقعات وغیرہ؛ لیکن صلحِ امام حسن علیہ السلام جیسے واقعات جو پوری تاریخ اسلام پر اثر انداز ہوئے ہوں، بہت کم ہیں۔ میری نظر میں تاریخ اسلام میں اس قسم کے چند ایک واقعات ہی پائے جاتے ہیں جو اس طرح پوری تاریخ پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے کئی صدیوں پر محیط تاریخ اسلام میں صلحِ امام حسن علیہ السلام کا واقعہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

اس واقعے کا ایک اہم موڑ، اسلامی خلافت کا ملوکیت میں تبدیل ہونا ہے۔ اگر ہم اس نکتے پر غور و فکر کریں تو یہ جملہ بہت ہی پُرمغز اور انتہائی اہمیت کا حامل ہے؛ کیونکہ خلافت اور ملوکیت دو الگ الگ قسم کے طرزِ حکومت ہیں، ان دونوں قسم کے طرزِ حکومت میں صرف کسی ایک، دو یا تین چیزوں میں ہی اختلاف نہیں پایا جاتا بلکہ یہ دونوں بالکل ہی ایک دوسرے سے مختلف ہیں؛ یعنی خلافت کوئی اور چیز ہے جبکہ ملوکیت (بادشاہت) دوسری چیز ہے۔ جن کا مسلمانوں اور اسلامی مملکت و معاشرے پر حکمرانی کا انداز بھی مختلف ہے۔ اس واقعے نے تاریخ اسلام اور اسلامی طرزِ حیات کا رُخ موڑ دیا اور رُخ موڑنے کا مطلب تو آپ جانتے ہی ہیں، جیسا کہ ایک ریل گاڑی جو شمال کی طرف رواں دواں ہو اور کسی ایک مقام پر ڈرائیور اس کے ٹریک کو تبدیل

کرتے ہوئے اس کا رُخ دوبارہ مخالف سمت یعنی جنوب کی طرف موڑ دے۔ البتہ یہ ایک دم محسوس نہیں ہوتا ہے لیکن تھوڑی دیر بعد جب انسان پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے، تب اسے احساس ہونے لگتا ہے۔ میں اس واقعے کو اس نظر سے دیکھتا ہوں۔

حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی امیر شام سے صلح کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوا، آج کی اصطلاح میں گویا پاور ایک پارٹی سے دوسری پارٹی کو منتقل ہوئی۔ (اب دیکھنا یہ ہے کہ) ان دونوں پارٹیوں کی خصوصیات کیا ہیں؟

یہ جو دو پارٹیوں نے ایک دوسرے کی جگہ لے لی ہے ان کے درمیان کیا فرق ہے؟ یہ ایک بات ہے۔ دوسری بات یہ کہ جب باطل تحریک نے اقتدار کو اپنے ہاتھوں میں لیا تو اس نے اسلامی معاشرے پر اپنا تسلط اور قدرت قائم کرنے کے لیے کونسے حربے استعمال کیے؟ تیسری بات یہ کہ جب حقیقی پارٹی (امام حسن علیہ السلام اور اس کے ساتھیوں) کو اقتدار سے محروم کر دیا گیا تو اس نے باطل تحریک کے مقابلے میں صبر و استقامت کے کونسے طریقوں کو اپنایا؟ یعنی اس نے کون کونسے طریقے اختیار کیے؟ چوتھی بات یہ کہ شکست کی وجوہات کیا تھیں؟ یعنی وہ کونسے عوامل تھے کہ جن کی بنا پر حق کو شکست کا سامنا کرنا پڑا؟ اس کی کیا وجوہات تھیں؟ پانچویں بات یہ کہ فاتح گروہ، مغلوب گروہ کے ساتھ کس طرح پیش آیا؟ اور یہی اس واقعے کا انتہائی اہم اور عبرتناک باب ہے۔ چھٹی چیز مغلوب گروہ کا فاتح کے ساتھ کیسا رویّہ رہا؟ اس گروہ نے (مقابلے کے لیے) کونسی پالیسی اختیار کی؟ اور ساتویں بات یہ کہ اس سارے واقعے کا نتیجہ کیا نکلا؟

ان دونوں (پارٹیوں اور) تحریکوں کی بہت سی خصوصیات ہیں، ان میں سے بعض کا تعلق حق سے ہے جبکہ بعض کا تعلق باطل سے ہے۔ اگر میں یہاں ان خصوصیات کو ایک ایک کرکے گننا چاہوں تو ایک طویل فہرست بن جائے گی۔ (لہٰذا) میں نے ان کا خلاصہ کیا ہے۔ حق کی تحریک، یعنی امام حسن علیہ السلام کی پارٹی کی نظر میں سب سے اہم چیز دین تھا، دین سے مراد کیا ہے؟ یعنی لوگوں کے ایمان اور عقیدے میں دین باقی رہے، لوگ ایمان اور عمل میں دین کی پابندی کریں اور معاشرے پر بھی

دین حاکم ہو؛ یعنی ان کی نظر میں اصل بات یہ تھی کہ معاشرہ دین کی قوت، دین کی حاکمیت اور دین کے دائرے میں رہتے ہوئے آگے بڑھے۔ دوسرے الفاظ میں معاشرے میں اسلامی نظام نافذ ہو۔

جبکہ اقتدار ہاتھ میں لینا، حکومت قائم کرنا اور اُمور کو اپنے ہاتھوں میں لینا اور اس قسم کے دیگر فروعی مسائل، ان کی نظر میں دوسرے، تیسرے اور چوتھے درجے کے کام تھے۔ ان کی نظر میں بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ اس نظام اور معاشرے پر دین کی حاکمیت کارفرما ہو اور جو لوگ اس معاشرے میں رہ رہے ہیں ان کا ایمان نہ صرف باقی رہے، بلکہ ان کے دلوں کی گہرائیوں میں بھی راسخ ہو، یہ تھی حق کی پارٹی کی پہلی خصوصیت۔

دوسری پارٹی، یعنی باطل پارٹی کا اصلی مقصد کسی بھی طریقے سے اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لینا تھا؛ یعنی ہر قیمت پر اقتدار کا حصول، یہ تھی باطل پارٹی کی اصل سیاست۔ اس کی نظر میں اصل چیز اقتدار کا حصول تھا چاہے کسی بھی قیمت اور کسی بھی طریقے سے ہو۔

جیسا کہ دنیا کے اکثر سیاستدانوں کا یہی طریقہ ہے کہ ان کی نظر میں اقدار اور اصولوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔ اگر وہ کسی اصول کو اپنا سکیں تو ٹھیک ہے اور اگر نہ اپنا سکیں تو بھی کوئی بات نہیں ہے، کیونکہ ان کے لیے سب سے اہم چیز اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لینا ہے اور یہی ان کے لیے اہمیت کا حامل ہے اور یہ ایک انتہائی اہم اور حسّاس سرحد ہے۔

ممکن ہے کہ کبھی دونوں پارٹیاں ظاہراً مذہب پر عمل پیرا ہوں، جیسا کہ امیر المومنین علیہ السلام اور امیر شام کے درمیان ہونے والی جنگ میں ایسا ہی تھا۔ ایک دن (جنگِ صفین کے موقعہ پر جو حضرت علی علیہ السلام اور امیرِ شام کے درمیان لڑی گئی تھی) امیر المومنین علیہ السلام کے کچھ سپاہی شک و تردید کا شکار ہوئے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ شک میں پڑ جاتے اور ان کے ذہنوں میں مشکوک افکار جنم لیتے ہیں تو نہ خود ان شکوک کو حل کر پاتے ہیں اور نہ ہی قابلِ اطمینان لوگوں سے رجوع کرتے ہیں، بلکہ وہ انہی شکوک

و شبہات کو موضوعِ گفتگو بنا کر پروپیگنڈہ کرتے اور دوسروں کے ذہنوں میں بھی شک ڈال دیتے ہیں اور غلط افکار پر مبنی ایک گروہ پیدا کر دیتے ہیں۔ کچھ اس قسم کے افراد (جنگِ صفین کے موقعہ پر) شک و تردید کا شکار ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم آپس میں کیوں لڑ رہے ہیں؟ وہ بھی نماز پڑھتے ہیں اور ہم بھی نماز پڑھتے ہیں، وہ بھی قرآن پڑھتے ہیں اور ہم بھی قرآن پڑھتے ہیں، وہ بھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مانتے ہیں اور ہم بھی مانتے ہیں۔ پس وہ لوگ شک و تردید کا شکار ہو گئے۔

عمار یاسر، جن کے بارے میں، میں اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ صدرِ اسلام میں وہ ایسے حساس، مشکل اور پیچیدہ مسائل کہ جن کے بارے میں لوگ غفلت اور جہالت کا شکار تھے، کا تجزیہ و تحلیل کرنے کے ماہر تھے۔ تاریخ اسلام میں عمار یاسر کا یہ مقام ہے کہ وہ گہرے اور دقیق مسائل کو سمجھتے تھے۔ اگر ہم مالکِ اشتر کو ان کی تلوار اور بہادری سے پہچانتے ہیں، تو ہمیں عمار یاسر کو ان کی فصاحتِ زبان، روشن فکری، درست فہم و ادراک اور صدرِ اسلام کے ایک عظیم تجزیہ نگار کے طور پر جاننا چاہیے۔ امیر المومنین علیہ السلام کے دور میں مجھے ایسے بہت کم موارد ملے جہاں شکوک و شبہات نے جنم لیا ہو اور وہاں عمار یاسر موجود نہ ہوں۔ وہ ایک مافوق الفطرت شخص تھے۔ (جنگ صفین کے موقعہ پر بھی جب) عمار یاسر کو یہ اطلاع ملی کہ لشکر کے کچھ سپاہی شک و تردید کا شکار ہو چکے ہیں، تو وہ ان کے پاس گئے اور ان کے سامنے کچھ حقائق بیان کیے۔ آپ نے اُن پر واضح کیا کہ اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ وہ بھی نماز پڑھتے ہیں اور تم بھی نماز پڑھتے ہو۔ چنانچہ انہوں نے کہا: خدا کی قسم! میں نے ایک اور جنگ میں دیکھا ہے کہ یہی دونوں پرچم جو آج ایک دوسرے کے مقابلے میں کھڑے ہیں، یہ پرچم کہ جس کے نیچے امیر المومنین علیہ السلام موجود ہیں اسی طرح اس پرچم کے مقابلے میں تھا جس کے نیچے معاویہ کھڑا ہے اور وہ جنگِ بدر کا موقع تھا، جس موقعہ پر یہ دونوں پرچم یعنی بنو ہاشم اور بنو اُمیہ کا پرچم ایک دوسرے کے مدِّمقابل تھے اور اس پرچم کے سایہ تلے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنین علیہ السلام تھے اور اُس پرچم کے نیچے یہی معاویہ اور اس کا باپ (ابو سفیان) تھے۔ ان دونوں کے درمیان اصولی اختلاف پایا جاتا ہے لہٰذا آپ لوگ ظاہر کو مت دیکھیں۔ اس طرح (عمار یاسر نے) ان کے ذہنوں سے شکوک و شبہات دور کر دیئے۔

پس معلوم ہوا کہ باطل تحریکیں جن کا اصل مقصد حصولِ اقتدار ہوتا ہے، وہ بھی کبھی کبھار (مصلحتاً) اسلام کے ظواہر پر عمل پیرا ہوتی ہیں۔ اور یہ (ان کے حق پر ہونے کی) دلیل نہیں ہے۔لہٰذا ضروری ہے کہ (ان کے) باطن کو دیکھا جائے اور انتہائی ہوشیاری کے ساتھ یہ تشخیص دی جائے کہ کونسی تحریک کس سے وابستہ ہے، یہ پہلی بات ہے۔

ان دونوں تحریکوں کی پہچان اور علامت یہ ہے کہ ایک طرف اقتدار پرستی اور اقتدار کو تحفظ دینا ہے تو دوسری طرف اصول پرستی اور اقدار کا تحفظ و پاسداری ہے۔ اسلام اور اس کے بنیادی افکار؛ یعنی اسلامی اقدار کو قبول کرنا اور ان کے تحفظ کے لیے جدّوجہد اور جہاد کرنا۔ پس ایک طرف اقدار، اصول پرستی اور ان کا تحفُّظ ہے اور دوسری طرف اقتدار پرستی ہے، یعنی ہر قیمت پر اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لینا ہے خواہ کچھ بھی ہو جائے وہ اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی ہے۔

لیکن یہ باطل تحریکیں کونسے طریقے اور ذرائع سے استفادہ کرتی ہیں؟ یہ بھی ایک اہم اور توجہ طلب نکتہ ہے۔ ہمیشہ باطل تحریکیں مختلف طریقہ کار اپناتی ہیں، جیسا کہ معاویہ کا منصوبہ ایسے طریقوں پر مشتمل تھا جو اس کے اقتدار، طاقت اور تحفُّظ سے عبارت ہے۔ اس کے ہر عمل سے کسی نہ کسی حوالے سے اس کے اقتدار کے استحکام کا مقصد جھلکتا ہے۔ اس کے اقدامات میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

۱۔ اپنی طاقت کا اظہار، بعض جگہوں پر وہ اپنی طاقت کا بھرپور اظہار کرتا ہے اور (اپنے مخالفین کی) بے رحمی سے سرکوبی کرتا ہے۔

۲۔ دولت اور پیسہ کا استعمال، جو سازشی عناصر کے لیے ایک بہترین ذریعہ آمدنی ہے۔

۳۔ تبلیغ اور جھوٹا پروپیگنڈہ۔

۴۔ سیاست بازی، یعنی سیاسی طریقوں اور اوچھے ہتھکنڈوں سے اپنے مخالفین کو شکست دینا۔ وہ حربے تھے جن سے معاویہ خوب استفادہ کرتا تھا۔

آپ ملاحظہ کیجیے کہ معاویہ ایک جگہ اس قدر سختی کے ساتھ پیش آتا ہے کہ حجر بن عدی، جن کا شمار پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نامور اصحاب میں ہوتا ہے، جنہیں قتل کر دینا اس کے لیے انتہائی مہنگا بھی پڑ سکتا ہے لیکن وہ انہیں قتل کرا دیتا ہے۔ رُشید ہجری کا تعاقب کرتا ہے یہاں تک کہ انہیں بھی شہید کر دیتا ہے؛ لیکن زیاد بن ابیہ کو جو ایک انتہائی ظالم، کینہ پرور، بداخلاق، بےحسب و نسب اور طاقت کا دلدادہ شخص تھا، اسے کوفہ کا جو تشیع اور پیروانِ ولایت کا گڑھ تھا، گورنر مقرر کرتا ہے اور اسے پورے اختیارات دے دیتا ہے کہ تم جو چاہو کر سکتے ہو۔ اسی زیاد بن ابیہ کے بارے میں مورّخین نے لکھا ہے کہ ''وَاعْلَمْ أَنَّ اللهَ لَيْسَ بِنَاسٍ لَكَ قَتْلَكَ بِالظِّنَّةِ وَأَخْذَكَ أَوْلِيَائَهُ بِالتُّهَمَةِ''[۱] جس شخص کے بارے میں معمولی بھی شک ہوتا کہ اس کا جھکاؤ اہل بیت اطہار علیہم السلام کی طرف ہے، اسے گرفتار کرکے زندان میں ڈال دیتا تھا اور اسے سخت اذیتیں دیتا تھا اور جس شخص پر اہل بیت علیہم السلام سے تعاون کا الزام لگتا، اسے قتل کرکے اس کا نام و نشان مٹا دیتا تھا۔ یعنی عراق اور کوفہ میں، جو شیعیانِ اہل بیت علیہم السلام کا مرکز تھا ایک عجیب افراتفری اور دگرگوں صورتحال تھی۔ (معاویہ) کہیں اس طرح اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتا تھا۔

اور دوسری جگہ یہی معاویہ ہے مگر اس کا کردار آپ دیکھ لیں کہ جب کسی قبیلے کی ایک ضعیف خاتون آکر اسے گالیاں دیتی ہے اور خوب بُرا بھلا کہتی ہے کہ تم نے یہ کہا تم نے وہ کیا، تو معاویہ اسے کچھ بھی نہیں کہتا، بلکہ ہنستے ہوئے اس کے ساتھ شفقت اور محبت کا برتاؤ کرتا ہے۔

عدی بن حاتم اس حالت میں امیر شام کے پاس آتا ہے، جب وہ دونوں آنکھوں سے نابینا ہو چکا ہے۔ معاویہ کہتا ہے: اے عدی! علی علیہ السلام نے تمہارے ساتھ انصاف نہیں کیا، تم نے میرے ساتھ علی علیہ السلام کی جنگ میں اپنے دونوں بیٹوں کو کھو دیا، لیکن علی علیہ السلام نے اپنے دونوں بیٹوں یعنی حسن و حسین علیہما السلام کو بچا کر رکھا۔ عدی بن حاتم نے روتے ہوئے کہا: اے معاویہ! حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے علی علیہ السلام کے ساتھ انصاف نہیں کیا، کیونکہ

---

[۱] تو جان لے کہ خدا وند متعال تیرے صرف شک کی بنیاد پر اولیائے الٰہی کو قتل کرنے اور جھوٹے الزام کی بنا پر انہیں گرفتار کرنے کو ہرگز فراموش نہیں کرے گا۔ (بحار الانوار، ج۴۴، ص۲۱۴؛ الامامۃ و السیاسۃ، ابن قتیبہ، ج۱، ص۲۰۲-۲۰۴)

وہ تو شہید ہو کر اپنے رب سے ملاقات کر چکے جبکہ میں ابھی تک زندہ ہوں۔[1]

امیر شام کے سیاسی ہتھکنڈے

امیر شام کے دربار میں جب کبھی کسی اہل بیت علیہم السلام کے چاہنے والے کی موجودگی میں امیر المومنین علیہ السلام کی شان میں معمولی سی گستاخی بھی کی جاتی، تو وہ اپنی پوری طاقت اور شجاعت کے ساتھ معاویہ اور اس کے ساتھیوں کے خلاف احتجاج کرتا اور معاویہ ہنستے ہوئے اسے نظر انداز کر دیتا تھا، یہاں تک کہ کبھی کبھار وہ روتے ہوئے کہتا تھا: جی ہاں آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ شاید ان باتوں کا آپ قارئین کو یقین نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہیں۔

یہ پروپیگنڈہ ہی ہے کہ پوری تاریخ میں باطل قوتوں نے اس سے خطرناک اور مسموم ترین وسیلے کے طور پر کام لیا ہے۔ حق کی تحریکیں، باطل تحریکوں کی طرح پروپیگنڈوں سے کام نہیں لے سکتی ہیں؛ کیونکہ اگر جھوٹے پروپیگنڈوں کے ذریعے کسی کے ذہن کو مکمل طور پر متأثر کرنا چاہیں تو اس کے لیے بہت زیادہ ڈرامہ بازی، جھوٹ اور فریب سے کام لینا پڑتا ہے، جو حق کی تحریکوں کے لیے ناممکن ہے۔ یہ باطل تحریکیں ہی ہیں کہ جن کے نزدیک ان کاموں کی کوئی اہمیت نہیں ہے، بلکہ ان کے نزدیک اہمیت اس بات کی ہے کہ ایک حقیقت کو کسی دوسری شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے اور وہ اس کام کے لیے تمام وسائل سے استفادہ کرتی ہیں۔

یہ جو آپ حضرات سنتے رہتے ہیں کہ جب امیر المومنین امام علی علیہ السلام محرابِ عبادت میں شہید کر دیئے گئے تو اہلِ شام کو تعجب ہوا کہ علی علیہ السلام محراب میں کیا کر رہے تھے؟ محراب تو نمازیوں کی جگہ ہے! بعض لوگوں کو ان باتوں پر یقین نہیں آتا، لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔ معاویہ نے کئی سالوں پر مشتمل اپنی حکومت کے دوران اور اس سے قبل اس کے بڑے بھائی یزید بن ابی سفیان کے دورِ حکومت میں مختلف پروپیگنڈوں کے ذریعے شام کے ماحول کو اس قدر دھندلا کر دیا اور لوگوں کے ذہنوں

---

[1] الدرجات الرفیعہ، ص۳۶۰

کو اتنا خراب کر دیا تھا کہ وہ اس کی جھوٹی باتوں کے علاوہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھے اور وہ معاویہ اور بنو اُمیہ کی حمایت اور اہل بیت اطہار علیہم السلام کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے تھے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیائے اسلام میں ہجرت کے سو سال بعد، یعنی شاید امیر المومنین علیہ السلام کی شہادت کے چالیس پچاس سال بعد تک منبروں سے آپؑ پر لعن طعن ہوتا رہا۔ میں نے یہ جو کہا کہ اسلامی دنیا میں لعن طعن کا بانی خود معاویہ ہے اور یہی اس کے اخلاق کا معیار تھا۔ بعض لوگ اہلِ تشیع کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے انہیں بُرا بھلا کہتے ہیں کہ وہ کیوں بعض صحابہ پر لعن طعن کرتے ہیں؛ جبکہ یہ وہ کام ہے جس کی بنیاد خود معاویہ نے رکھی تھی۔

جس نے امیر المومنین امام علی علیہ السلام کہ جن کے بارے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: ''اَفْضَلُ الْقَوْمِ[1] وَاَقْدَمُهُمْ اِسْلَاماً''[2] وہ علی علیہ السلام جو اصحاب میں سب سے زیادہ آپؐ کے قریب اور اسلام لانے میں پہل کرنے والے تھے، ان پر سالہا سال منبروں سے لعن طعن ہوتا رہا، آپؑ کی بُرائیاں کی گئیں، یہاں تک کہ عمر بن عبد العزیز جب خلیفہ بن گیا تو اس نے اس سلسلے کو ممنوع قرار دیتے ہوئے کہا کہ آج کے بعد کسی کو حق نہیں پہنچتا ہے کہ وہ یہ کام کرے۔

عبد الملک بن مروان کے بعد یکے بعد دیگرے اس کے دو بیٹے ولید اور سلیمان تقریباً بارہ تیرہ سال تک خلیفہ رہے، اس کے بعد دو سال کے لیے خلافت عمر بن عبد العزیز کو ملی، دو سال کے بعد دوبارہ خلافت عبد الملک کے دوسرے دو بیٹوں یعنی یزید اور ہشام کو ملی، جب خلافت عمر بن عبد العزیز کو ملی تو اس نے ان لوگوں کو

---

[1] ''كَانَ عَلِيٌّ اَفْضَلُ النَّاسِ بَعْدَ رَسُوْلِ اللهِ''؛ یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سب سے افضل شخص حضرت علی علیہ السلام تھے۔ (الکافی، ج۸، ص۸۰)

[2] ''... قَدْ زَوَّجْتُكِ أَقْدَمُهُمْ اِسْلَاماً وَأَعْظَمُهُمْ حِلْماً وَأَحْسَنُهُمْ خُلْقاً وَأَعْلَمُهُمْ بِاللهِ عِلْماً''؛ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی بیٹی جناب فاطمہ زہرا علیہا السلام سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں: یقیناً میں نے تمہاری شادی ایک ایسے شخص سے کی ہے جو سب سے پہلے اسلام لایا، جو حلم میں سب سے بڑا ہے، جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے اور جو سب سے زیادہ اللہ کی معرفت رکھتا ہے۔ (عوالم العلوم و المعارف، ج۱۱، ص۳۸۳)

امیر المومنین امام علی علیہ السلام پر سبّ و شتم سے روکا۔ اس وقت تک یہ سلسلہ جاری تھا، شروع شروع میں تو لوگوں کو اس کام پر تعجب ہوتا تھا لیکن آہستہ آہستہ وہ اس بات کے عادی ہوتے گئے۔

میں نے تاریخ میں پڑھا ہے کہ دنیائے اسلام میں کوئی قاری، محدّث اور راوی ایسا باقی نہیں رہا تھا، جسے معاویہ اور بنو اُمیہ کے حکومتی کارندوں نے اہل بیت اطہار علیہم السلام کے خلاف اور بنو اُمیہ کے حق میں احادیث گھڑنے اور ان کے حق میں آیاتِ الٰہی کی تفسیر بیان کرنے اور اس قسم کے دوسرے کاموں کے لیے تیار نہ کیا ہو۔

سَمُرَہ بن جُندَب کہ یہ مشہور حدیث ”لَا ضَرَرَ وَ لَا ضِرَار“[1] بھی اسی سے مربوط ہے، اس کا تعلق اصحابِ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے، البتہ یہ ایک ایسا صحابی ہے کہ آپؐ اس پر غضبناک ہوئے تھے۔ اس کی وجہ وہی مشہور داستان ہے کہ کسی ایک انصاری کے گھر کے صحن میں سَمُرہ کا ایک (کھجور کا) درخت تھا اور وہ اپنے درخت کو دیکھنے کے بہانے بغیر اطلاع کے اچانک اس انصاری کے گھر میں داخل ہو جاتا، جبکہ اس گھر میں اس کے بیوی بچے سب موجود ہوتے تھے، وہ دیکھتے تھے کہ اچانک ایک شخص بغیر اطلاع کے ان کے گھر میں داخل ہو جاتا ہے، سَمُرہ کی اس حرکت سے ان سب کو بہت تکلیف پہنچتی تھی، لہٰذا وہ انصاری اس شخص کی شکایت لیکر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گیا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سمرۃ ابن جُندب سے کہا کہ وہ اس درخت کو انصاری کے ہاتھوں فروخت کر دے، لیکن اس نے ایسا کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ درخت میری ملکیت ہے میں اس کی دیکھ بھال کے لیے جاتا رہوں گا۔ یہ سن کر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: چلو اس درخت کو میرے ہاتھ فروخت کر دو، اس نے قبول نہیں کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں تجھے اس درخت کے بدلے جنت میں ایک درخت کی ضمانت دیتا ہوں۔ گویا آپؐ نے اسے جنت کا وعدہ بھی دیا لیکن اس نے قبول نہیں کیا اور کہا: مجھے ہر صورت میں اپنا ہی درخت چاہیے۔ اس کی یہ بات سن کر آپؐ نے مالکِ مکان کو حکم

---

[1] ”لا ضرر ولا ضرار فی الاسلام“ یعنی اسلام میں نہ تو نقصان اُٹھانے کی اجازت ہے اور نہ ہی دوسروں کو نقصان پہنچانے کی۔ (الکافی، ج۵، ص۲۹۴؛ من لا یحضرہ الفقیہ، ج۴، ص۳۳۴)

دیا کہ گھر جا کر اس کا درخت جڑ سے اُکھاڑ کر باہر پھینک دو تاکہ یہ اسے لے جائے، آپؐ نے فرمایا: ''لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ فِي الْاِسْلَامِ'' یعنی دینِ اسلام میں ضرر اور ضرار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس بہانے کہ یہاں میری ملکیت ہے، یہ میرا مال ہے آپ کسی کو تکلیف نہیں پہنچا سکتے، کیونکہ اسلام میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ''لَا ضَرَرَ'' کی یہ مشہور حدیث جسے ہمارے ہاں ایک فقہی اصول اور قواعد کی حیثیت حاصل ہے، اس کا تعلق اسی سمرۃ ابن جندب سے ہے۔

یہ شخص امیرِ شام کے دورِ حکومت تک زندہ رہا۔ اب ذرا اس کی عاقبت کو دیکھ لیجیے، معاویہ اصحابِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلاش میں رہتا تھا، کیونکہ معاشرے میں ان کا ایک نام اور مقام تھا لہٰذا وہ انہیں اپنے ارد گرد جمع کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سمرۃ ابن جندب کو بھی اپنے حلقۂ احباب میں شامل کر لیا اور اسے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ درج ذیل مشہور آیت کی نسبت امیر المومنین علی علیہ السلام کی طرف دے دو، وہ آیت یہ ہے: ''وَمِنَ النَّاسِ مَن يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللهَ عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ''[۱] یعنی کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ جب وہ دنیا کے بارے میں بولتے ہیں تو دنیا کی مذمت میں ان کی باتیں تجھے تعجب میں ڈال دیتی ہیں اور وہ باتیں تمہیں بھلی لگتی ہیں اور وہ اپنے دل کی باتوں پر خدا کو گواہ بناتے ہیں، حالانکہ وہ ریاکاری کرتے ہیں۔

دنیا کی مذمت میں نہج البلاغہ میں موجود امیر المومنین امام علی علیہ السلام کے ان فصیح و بلیغ خطبوں کے مقابلے میں جو انتہائی اثرات کے حامل ہیں۔ امیر شام نے یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔

آپ دیکھیے کہ آج بھی اگر کوئی شخص فصیح و بلیغ گفتگو کرتا ہے، کوئی شعر کہتا ہے یا کوئی کتاب لکھتا ہے اور کسی مطلب کو خوبصورت انداز میں پیش کرتا ہے تو فطری سی بات ہے کہ یہ کام لوگوں میں مشہور ہو جاتا ہے اور اس لکھنے والے کو بھی لوگ قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

---

[۱] انسانوں میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ دنیا کی مذمت کے بارے میں ان کی باتیں آپ کو بھلی لگتی ہیں اور وہ اپنے دل کی باتوں پر خدا کو گواہ بناتے ہیں، حالانکہ وہ بدترین دشمن ہیں۔ (سورہ بقرہ، آیت ۲۰۴)

اگرچہ امیر المومنین امام علی علیہ السلام کے کلام کا آج کے کسی ادیب کے کلام کے ساتھ موازنہ نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ آپؑ کا کلام ایک نمونہ ہے۔ بلکہ نہج البلاغہ تو اسلامی معارف اور اقدار کی ایک بےمثال شاہکار ہے۔ لوگوں کے درمیان امیر المومنین امام علی علیہ السلام کی شہرت کو معاویہ کیونکہ برداشت نہیں کر سکتا تھا، لہٰذا اس نے امیر المومنین علیہ السلام کے دنیا کی مذمت اور زُہد و تقویٰ پر مبنی خطبوں کے مقابلے میں آپؑ کے خلاف کوئی سازش کرنا چاہی اور سَمُرہ سے کہا کہ تم لوگوں میں جا کر کہوں کہ مذکورہ بالا آیت امیر المومنین علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے، یعنی امیر المومنین امام علی علیہ السلام جو دنیا کی مذمّت میں اس طرح کی باتیں کرتے ہیں، تو تجھے تعجب ہونے لگتا ہے جبکہ حقیقت میں وہ خود دنیا دار اور ایک لالچی انسان ہیں، لہٰذا یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کی درج ذیل آیت''وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ . . .''[۱] ''اور لوگوں میں ایک شخص ایسا بھی ہے جو اپنے نفس کو مرضی پروردگار کے لیے بیچ ڈالتا ہے۔'' کے بارے میں اس سے کہا گیا کہ تم یہ کہو کہ یہ آیت ابنِ ملجم کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کی معاویہ کو بہت ضرورت تھی، کیونکہ وہ اس سے بہت فائدہ حاصل کر سکتا تھا۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک صحابی جس نے متعدد جنگوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ شرکت کی ہو (جیسا کہ سَمُرۃ ابن جندب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بچپنے ہی سے ایک جنگجو سپاہی تھا اور بالغ ہونے سے پہلے ہی کئی جنگوں میں حصّہ لے چکا تھا، اس شخص کا ایک رُخ یہ بھی تھا) اور آپؐ کے اصحاب میں سے بھی تھا، اس شخص سے کہا گیا کہ مذکورہ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے اس کی نسبت امیر المومنین علی علیہ السلام کی طرف دو اور کہہ دو کہ یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

سَمُرۃ ابن جندب ایک انتہائی بُرا اور شقی آدمی تھا لیکن اس کے باوجود اس کا ضمیر ایسے کاموں کے لیے تیار نہیں ہوا۔ اس نے کہا: نہیں! میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ جو شخص معاویہ اور سمرۃ ابن جندب کے درمیان واسطہ تھا، اس نے سمرہ سے کہا: تمہیں تمہارا پورا حق ملے گا تم پیسوں کی فکر مت کرو تمہیں اس کام کے بدلے میں پچاس ہزار درہم دیئے جائیں گے۔ اس زمانے میں پچاس ہزار درہم ایک بہت بڑی رقم تھی،

---

[۱] ۔ سورہ بقرہ، آیت۲۰۷

پچاس ہزار چاندی کے سکے یعنی پانچ ہزار سونے کے سکّوں کے برابر تھے۔ اس زمانے کے حساب سے یہ ایک بہت بڑی رقم تھی۔ اسے اتنی بڑی رقم کی پیش کش کی گئی لیکن اس نے کہا کہ مجھے قبول نہیں ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں سمرہ ڈرامہ بازی کر رہا تھا اور اس طرح وہ مزید رقم نکلوانا چاہتا تھا، ایسا نہیں تھا کہ اس کا ضمیر اسے اس کام سے روک رہا ہو۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ معاویہ کو اس کی ضرورت ہے، اس لیے وہ یہ ڈرامہ کر رہا تھا۔ بہرحال مجھے نہیں معلوم کہ وہ ڈرامہ کر رہا تھا یا اس کا ضمیر اسے اس کام سے روک رہا تھا میں سمرہ جیسے شخص کے گناہوں کو اپنی گردن پر لینا نہیں چاہتا۔

جب اس نے انکار کیا تو معاویہ کی طرف سے قیمت بڑھاتے ہوئے ایک لاکھ درہم کر دی گئی، لیکن جب اس نے پھر بھی انکار کیا تو ڈیڑھ لاکھ پھر دو لاکھ درہم کر دی گئی، لیکن اس نے پھر بھی قبول نہیں کیا تو قیمت بڑھاتے بڑھاتے تین لاکھ یا پانچ لاکھ کی پیش کش کی گئی جو ایک بہت بڑی اور ناقابلِ تصوّر رقم تھی، لیکن اس نے پھر بھی قبول نہیں کیا۔

معاویہ نے اس شخص سے جو اس کے اور سمرہ کے درمیان واسطہ تھا کہا: اس بےوقوف کو معلوم ہی نہیں کہ پانچ لاکھ درہم کتنے ہوتے ہیں؟ اس نے کہا: پانچ لاکھ درہم یہاں لائے جائیں تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ یہ کتنی بڑی رقم ہے؟ پھر دیکھتے ہیں کہ وہ قبول کرتا ہے کہ نہیں؟ معاویہ نے اپنے خزانچی کو حکم دیا کہ خزانے سے پانچ لاکھ درہم نکال کر یہاں لائے جائیں۔ چونکہ اس زمانے میں چاندی کے سکے ہوتے تھے جنہیں تھیلیوں میں رکھا جاتا تھا جن کا حجم بہت زیادہ ہوتا تھا (خزانچی) مزدوروں کے ذریعے درہموں کی تھیلیاں لاتا گیا اور ایک دوسرے کے اُوپر رکھتا گیا یہاں تک کہ یہ تھیلیاں کمرے کی چھت تک پہنچ گئیں۔ اس کے بعد سمرہ سے کہا گیا کہ یہ ہیں پانچ لاکھ درہم۔ اب بتاؤ تمھیں قبول ہے یا نہیں؟ اس نے ایک مرتبہ درہم کی ان تھیلیوں کی طرف دیکھا جو ایک بہت بڑی رقم تھی، لہٰذا قبول کر لیا اور معاویہ کی خواہش کے مطابق کی گئی اس آیت کی تفسیر کتابوں میں محفوظ ہو کر رہ گئی۔ اگرچہ بعد میں علماء کرام نے دنیائے اسلام سے اس قسم کی بےہودہ اور

فضول باتوں کا خاتمہ کر دیا لیکن پھر بھی بعض لوگوں کے ذہنوں میں اس کے کچھ نہ کچھ اثرات باقی رہ گئے۔ یہ وہ کارنامہ تھا جسے امیر شام نے انجام دیا تھا اور یہی اس کی پروپیگنڈہ مہم کا ایک اہم حصہ تھا، جسے وہ اپنی حکومت کے لیے ناگزیر سمجھتا تھا۔

حق کی تحریک کا طریقہ کار

باطل کی اس یلغار کے مقابلے میں حق کی تحریک بھی خاموش نہیں بیٹھی، (بلکہ) اس نے بھی کچھ طریقہ کار اپنائے بطورِ خلاصہ وہ طریقے درج ذیل ہیں۔

سب سے پہلے بھرپور طاقت کے ساتھ مقاومت: بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ شاید امام حسن علیہ السلام جنگ سے ڈر گئے تھے؛ لیکن ایسا نہیں تھا، بلکہ امام حسن علیہ السلام جنگ کے لیے بالکل تیار تھے، آپؑ کا شمار عرب کے بہادر لوگوں میں ہوتا ہے۔ میں نے مختلف کتابوں میں آپؑ کی شجاعت اور بہادری کے مختلف مواقع پر بے شمار واقعات پڑھے ہیں۔

البتہ امیر المومنین علیہ السلام کے دور میں لڑی جانے والی جنگوں میں جب آپؑ میدانِ جنگ میں جانا چاہتے تھے تو خود امیر المومنین علیہ السلام آپؑ کو جنگ کی اجازت نہیں دیتے تھے کیونکہ حضرت علی علیہ السلام یہ نہیں چاہتے تھے کہ امام حسن اور امام حسین علیہما السلام میدانِ جنگ میں جائیں اور اپنے لیے خطرات مول لیں۔

بعض لوگوں نے جب امیر المومنین امام علی علیہ السلام سے اس سلسلے میں پوچھا کہ محمد بن حنفیہ بھی تو آپؑ ہی کے بیٹے ہیں، لیکن آپؑ انہیں میدانِ جنگ میں بھیجتے ہیں جبکہ حسنین علیہما السلام کو جنگ کی اجازت نہیں دیتے؟ تو آپؑ نے فرمایا: میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کہیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسل ختم نہ ہو جائے کیونکہ یہ دونوں آپؐ کے وارث ہیں لہٰذا میں ان کی حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔ بس اسی وجہ سے امیر المومنین علیہ السلام امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کو میدانِ جنگ میں بھیجنے سے ہچکچاتے تھے، نہ کہ اپنی اولاد ہونے کی وجہ سے، کیونکہ آپؑ اپنے دوسرے بچوں سے بھی محبت کرتے تھے۔

خود امیر المومنین علیہ السلام بھی میدانِ جنگ کے ایک عظیم شہسوار اور خطرات مول لینے والے شجاع ترین انسان تھے۔ آپؑ میدانِ جنگ سے گھبرانے والے کوئی عام انسان نہیں تھے، لیکن چونکہ حسنین علیہما السلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرزند تھے لہٰذا امیر المومنین علیہ السلام ان کی جان کو خطرے میں ڈالنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ البتہ امام علی علیہ السلام کے دور میں لڑی جانے والی تمام جنگوں میں یہ حضرات موجود ضرور ہوتے تھے، لیکن انہوں نے کوئی زیادہ تلوار نہیں چلائی، یہی وجہ ہے اس دور کے بہادروں میں ان حضرات کے نام نہیں ہیں؛ لیکن اس کے علاوہ ایرانیوں کے خلاف لڑی جانے والی جنگ میں امام حسن علیہ السلام شریک تھے اسی طرح جب معترضین نے عثمان کے گھر پر دھاوا بول دیا تھا تو امیر المومنین علیہ السلام کے حکم سے خلیفہ کے گھر کا دفاع کرنے والوں میں آپؑ پیش پیش تھے۔

اس کے علاوہ بھی بے شمار اہم مواقع پر امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے اپنے وجود کا لوہا منوایا۔ خود جمل اور صفین کی جنگوں میں بھی آپؑ کا بے مثال کردار رہا ہے، کیونکہ آپؑ کے کاندھوں پر بھاری ذمہ داریاں عائد تھیں۔ میں نے ان دونوں جنگوں (جمل اور صفین) کے واقعات میں امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کا تذکرہ زیادہ، جبکہ امام حسین علیہ السلام کا تذکرہ کم دیکھا ہے۔ یعنی امام حسین علیہ السلام کے مقابلے میں امام حسن علیہ السلام نے زیادہ جنگوں میں حصّہ لیا ہے۔ جی ہاں! آپؑ ایک مجاہد انسان، مدبّر سیاستدان، فصیح و بلیغ خطیب، قوی شخص اور بحث و مناظرے کے ماہر تھے۔ انسان جب آپؑ کے مناظروں اور مباحثوں کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کیونکہ آپؑ کے فرمودات اور دلائل انتہائی سخت اور دوٹوک ہیں۔

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے معاویہ کے ساتھ صلح کے بعد ایسا دو ٹوک اور واضح موقف اپنایا کہ ایسے دو ٹوک اور چبھنے والے کلمات تو امیر المومنین امام علی علیہ السلام نے بھی ادا نہیں کیے ہیں۔ دشمن کے مقابلے میں امیر المومنین علیہ السلام کے فرمودات میں ایسا دو ٹوک موقف بہت ہی کم دکھائی دیتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ امیر المومنین علیہ السلام کا سامنا ایسے بے شرم اور خبیث دشمن سے نہیں تھا، جس طرح کے دشمن کا امام حسن علیہ السلام کو سامنا کرنا پڑا۔ لہٰذا امام حسن علیہ السلام کے کام میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں

تھی، اگر تھی تو وہ اس زمانے کی شرائط میں کمی تھی۔ امامؑ تو اپنی پوری طاقت کے ساتھ دفاع کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ جہاں تک ممکن ہو یہ بھی دشمن سے مقابلے کا ایک طریقہ ہے، کیونکہ بعض مواقع پر قدرتمندانہ اور مسلح قیام نقصان دہ ہو سکتا ہے، اس لیے روش اور طریقہ کار میں تبدیلی لانا ایک بنیادی اور ضروری کام ہے۔

دوسرا طریقۂ تبلیغ: حق پرستوں کے نزدیک تبلیغ کو بڑی اہمیت حاصل ہے، البتہ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ تبلیغ کے سلسلے میں حق پرستوں کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں کیونکہ وہ تبلیغ کے سارے ذرائع سے استفادہ نہیں کر سکتے، بلکہ وہ صرف اور صرف حقائق کے بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ بعض دفعہ لوگوں کے ذہنوں میں کچھ چیزیں موجود ہوتی ہیں اور لوگ انہیں چاہتے بھی ہیں، ایسے موقع پر باطل قوتیں لوگوں کی خواہشات کے عین مطابق بات کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی ہیں؛ لیکن حق پرست ایسا نہیں کر سکتے، وہ صرف حقائق بیان کرتے ہیں اگرچہ وہ لوگوں کے لیے تلخ ہی کیوں نہ ہوں۔ آپ دیکھیں کہ کبھی کبھار امیر المومنین علیہ السلام اپنے قریبی دوستوں کے ساتھ ایسے تلخ لہجے میں بات کرتے ہیں کہ انسان تعجب کرنے لگتا ہے اور ہم جیسے لوگ جو امیر المومنین علیہ السلام کی سیرت کو اپنانا چاہتے ہیں، اس کے باوجود بعض موارد ہمارے لیے بھی تعجب انگیز ہیں۔

معاویہ کبھی ایسا نہیں کرتا تھا، بلکہ وہ لوگوں کی خواہش کے مطابق بات کرتا تھا۔ (کیونکہ) اس کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ کسی بھی طریقے اور کسی بھی قیمت پر لوگوں کی توجہ اور حمایت حاصل کرے۔ امیر المومنین علیہ السلام یہ کام نہیں کرتے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ آپ کو ایسا کرنا آتا ہی نہ ہو، بلکہ آپؑ اس لیے لوگوں کی خواہش کے مطابق بات نہیں کرتے تھے کہ یہ تقویٰ اور دین کے اصولوں کے خلاف ہے۔

لہٰذا آپؑ فرماتے ہیں: ''لَوۡلَا التُّقیٰ لَکُنۡتُ أَدۡهَی الۡعَرَبِ''[1] اگر تقویٰ کی بات نہ ہوتی، اقدار کا لحاظ نہ ہوتا تو ایسے کاموں میں، میں معاویہ سے کہیں زیادہ چالاک ہوتا اور یہ حقیقت بھی ہے کیونکہ اگر آپؑ کی خاندانی بنیاد، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آپؑ کے قدیمی اور قریبی تعلقات، آپؑ کے عظیم کارناموں اور آپؑ کی عظیم روح کو دیکھا جائے تو معلوم

---

[1] ۔ الکافی، ج٨، ص٢٤

ہوتا ہے کہ آپؑ معاویہ سے کہیں زیادہ زیرک اور ہوشیار تھے اور آپؑ بہت کچھ بھی کر سکتے تھے، لیکن حق آپؑ کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

اسلامی اقدار کا تحفُّظ

ایک اور طریقہ اقدار کی حفاظت پر تاکید ہے، یعنی حق پرستوں کے نزدیک جس چیز کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور جس چیز کو وہ عملی طور پر بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں، وہ ہر قیمت پر اقدار کی حفاظت کرنا ہے۔ یہاں تک کہ اس حوالے سے انہیں ظاہری طور پر پیچھے ہی کیوں نہ ہٹ جانا پڑے۔ اس چیز پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے؛ یعنی حق پرست اگر یہ دیکھتا ہے کہ اس کے قیام سے پورے نظریے کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں تو پھر وہ عقب نشینی اختیار کر لیتا ہے اور وہ اس عقب نشینی میں عار بھی محسوس نہیں کرتا۔ جیسا کہ سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کا فرمان ہے:

”اَلْـمَوْتُ خَیْرٌ مِنْ رُکُوْبِ الْعَارِ
وَالْعَارُ خَـیْرٌ مِنْ دُخُوْلِ النَّارِ“[۱]

ذلت کی زندگی سے عزّت کی موت بہتر ہے اور جہنم میں جانے سے ذلّت کی زندگی ہی بہتر ہے۔

یعنی اگر مجھے ذلّت (شہادت کی مظلومانہ موت) کو قبول کرنا پڑے تو کر لوں گا کیونکہ یہ آتشِ دوزخ میں داخل ہونے سے کہیں بہتر ہے۔ بعض مقامات پر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بعض کاموں کو انجام دیتے ہوئے شرم محسوس کرتے ہیں اور ان سے بچنے کے لیے غضب اور عذابِ الٰہی کو قبول کر لیتے ہیں۔ یہ شرم کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کو حاصل کرے اور اپنی ذمہ داری نبھائے، اگرچہ اسے اپنی بات، اپنے نظریے اور اپنے موقف سے پیچھے ہی کیوں نہ ہٹنا پڑے اور یہ کام اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی کے لیے ہو۔

۱۔ بحار الانوار، ج۷۵، ص۱۲۸

آپ ملاحظہ کیجئے کہ یہ ائمہ معصومین علیہم السلام کی زندگی کا ایک بنیادی قانون ہے اور امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی زندگی میں بھی یہ چیز نمایاں نظر آتی ہے۔ امام حسن علیہ السلام ناموافق حالات کی وجہ سے معاویہ کے ساتھ صلح پر مجبور ہوئے، جبکہ اس وقت تک آپؑ مسلسل لشکر پر لشکر روانہ کر رہے تھے، لوگوں کو جنگ کے لیے تیار کر رہے تھے، لوگوں کو اپنے لشکر میں شامل کر رہے تھے اور خطوط پر خطوط لکھ رہے تھے۔ خلاصہ یہ کہ دشمن کے ساتھ جنگ میں جن کاموں کی ضرورت ہوتی ہے، انہیں مسلسل انجام دے رہے تھے لیکن جب آپؑ نے دیکھا کہ (ان حالات میں) آپؑ یہ جنگ جیت نہیں سکتے تو پھر آپؑ نے صلح کو قبول کر لیا۔ جس کی وجہ سے آپؑ کے بہت سے قریبی ساتھیوں نے آپؑ سے علیحدگی اختیار کر لی۔

جب امام حسن علیہ السلام نے صلح کی تو بہت سے لوگ دل ہی دل میں بہت خوش ہوئے، کیونکہ وہ دل ہی دل میں اس جنگ سے خوش نہیں تھے، لیکن یہی لوگ جن کی اس صلح کے ساتھ دل کی مراد بر آئی تھی، امامؑ کی خدمت میں پہنچے اور آپؑ کو ناسزا کہنا شروع کر دیا، وہ کہنے لگے: آقا! آپؑ اپنے موقف سے کیوں پیچھے ہٹے؟ امام حسن علیہ السلام کے قریبی ساتھی، یہاں تک کہ بعض بزرگان بھی جن کا میں نام لینا نہیں چاہتا، جن کا شمار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلیل القدر صحابہ میں ہوتا ہے، وہ آئے اور آپؑ کو ناسزا کہتے ہوئے آپؑ کو طرح طرح کے بُرے القابات سے نوازنے لگے۔ لیکن آپؑ نے مکتب کی حفاظت کے لیے عقب نشینی اختیار کی۔

اگلا مرحلہ حق پرستوں کی اس تحریک کی شکست کا تجزیہ کرنا ہے۔ امام حسن علیہ السلام کی شکست کی اصلی وجہ اور علّت، عمومی سوچ و بصیرت کی کمزوری اور لوگوں کے ایمان کی مادی خواہشات کے ساتھ ملاوٹ اور آمیزش تھی۔ حق یہ ہے کہ عمومی سوچ اور فکر کے حوالے سے، اس وقت کے لوگ بالکل ناآگاہ اور جاہل تھے، لوگوں کے دینی عقائد بھی دُنیوی خواہشات کے ساتھ مخلوط ہو چکے تھے اور ان کی نظر میں اصل چیز مال و دولت تھی۔ صلح امام حسن علیہ السلام کے واقعہ سے کوئی دس پندرہ سال پہلے ہی (انسانیت کی) بنیادی اقدار آہستہ آہستہ کرکے متزلزل ہو چکی تھیں۔ ایک حد تک تبعیض

اور ایک حد تک یہ چیزیں وجود میں آچکی تھیں اور یہ سب چیزیں موجب بنیں کہ امام عالی مقامؑ مقاومت نہ کر سکیں۔

لیکن فاتح گروہ کا مغلوب گروہ کے ساتھ رویّہ یہ تھا کہ انہوں نے امام حسن علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کرکے جیلوں میں ڈالنے اور انہیں قتل کر دینے کے بجائے، جب اقتدار پر قابض ہوئے تو ظاہراً امام حسن علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کا احترام ملحوظ خاطر رکھا۔ انہوں نے امام حسن علیہ السلام کے ساتھ ملاقات کی اور اس دوران بھی آپؑ کے احترام کا خاص خیال رکھا گیا۔ لیکن معاویہ اور اس کے ساتھیوں نے دل میں یہ قصد کیا ہوا تھا کہ کسی بھی طریقے سے امام حسن علیہ السلام کی شخصیت کو کمزور کرکے ختم کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ امام حسن علیہ السلام کا اس لیے احترام کرتے تھے کہ آپؑ کی شخصیت کو ختم کر سکیں اور ان کا یہی طریقہ تھا، جیسا کہ عرض کیا کہ انہوں نے اس بات کو اپنے پروپیگنڈہ مہم کا اصل محور قرار دیا تھا۔

لیکن مغلوب پارٹی نے فاتح پارٹی کے ساتھ کیا کیا؟ انہوں نے اپنی پالیسی اور حکمتِ عملی اس طرح بنائی کہ اس فتنہ آمیز، گرد آلود، انتہائی خطرناک اور زہر آلود ماحول میں بھی حق کی اس تحریک کو منظّم کر سکیں اور اسے دینِ اسلام کے اصلی ستون کی مانند آگے بڑھا سکیں؛ کیونکہ وہ سوچ رہے تھے کہ اگر ہم پورے معاشرے کو صحیح اسلامی تعلیمات کی روشنی میں آگے لیکر نہیں جا سکتے، تو پھر ایسی صورتحال میں ایک لولی لنگڑی وسیع و عریض تحریک چلانے کے بجائے، چھوٹے پیمانے پر ہی صحیح ایک منظّم اور نظریاتی تنظیم بنائی جائے، تاکہ وہ باقی رہے اور دینِ اسلام کی بنیادی تعلیمات کی حفاظت کر سکے۔

اس کام کو امام حسن علیہ السلام نے انجام دیا۔ آپؑ نے محدود پیمانے پر ایک تحریک کا آغاز کیا یا دوسرے الفاظ میں ایک پارٹی کی بنیاد رکھی، جس کے ارکان ائمہ علیہم السلام کے اصحاب تھے۔ یہی تشیع کی تحریک ہی ہے کہ جس نے پوری تاریخ میں بدترین اور خطرناک حالات میں بھی آگے بڑھ کر دینِ اسلام کی بقاء کے لیے کردار ادا کیا ہے۔ اگر یہ تحریک نہ ہوتی تو پھر کب کا سب کچھ بدل چکا ہوتا۔ یہی امامت اور ائمہ معصومین علیہم السلام

کی تحریک ہی ہے کہ جس نے حقیقی اسلام کو بچا کر رکھا ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ وہ غلبہ پانے والے فاتحین اور طاقتور، محکوم اور مغلوب بن کر رہ گئے اور کمزور و ناتوان لوگ، دنیائے اسلام کے لوگوں کے ذہنوں اور دلوں پر حاکم و فاتح بن گئے۔ آج اگر آپ عالم اسلام کی ذہنیت اور اس کی سوچ کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں وہی ذہنیت پائی جاتی ہے جس کی ترویج امیر المومنین امام علی علیہ السلام اور امام حسن علیہ السلام کیا کرتے تھے۔ آج اس ذہنیت کے طرفدار مشکل سے ہی ملتے ہیں، جس کی ترویج معاویہ، یزید، عبد الملک بن مروان اور دوسرے خلفائے بنی اُمیہ کیا کرتے تھے۔ ان کی سوچ اور فکر شکست کھا کر مٹ چکی ہے اور اب تاریخ میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اگر ہم ان کی اس ذہنیت، ان کی سوچ و فکر کو کوئی نام دینا چاہیں، تو وہ یہ مٹھی بھر ناصبی ہیں۔

نواصب ایک فرقے کا نام ہے کہ عالمِ اسلام میں آج اس کا کوئی ظاہری وجود نہیں ہے۔ ناصبی وہی لوگ تھے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت اطہار علیہم السلام کو نازیبا الفاظ سے یاد کرتے تھے اور انہیں مسلمان نہیں سمجھتے تھے۔ اگر معاویہ فاتح اور حاکم ہوتا تو آج عالمِ اسلام میں اس کی سوچ اور فکر کا دور دورہ ہوتا، لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے؛ بلکہ اس کے بالکل برعکس آج عالمِ اسلام پر امیر المومنین علیہ السلام اور امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی سوچ حاکم ہے؛ اگرچہ بعض فروعی مسائل اور کچھ عقائد جنہیں ثانوی حیثیت حاصل ہے بعینہ اصلی حالت میں منتقل نہیں ہوئے، لیکن مجموعی طور پر ان کی سوچ غالب ہے۔ بنابر ایں امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام فاتح ہیں اور آپؑ کی تحریک بھی کامیابی سے ہمکنار ہوئی ہے۔ یہ پوری تاریخ اسلام پر صلحِ امام حسن علیہ السلام کے واقعے کے اثرات کے جائزے کا ایک خلاصہ تھا۔

(۲۲۔۰۴۔۱۹۸۹ء)

امام حسین
علیه السلام

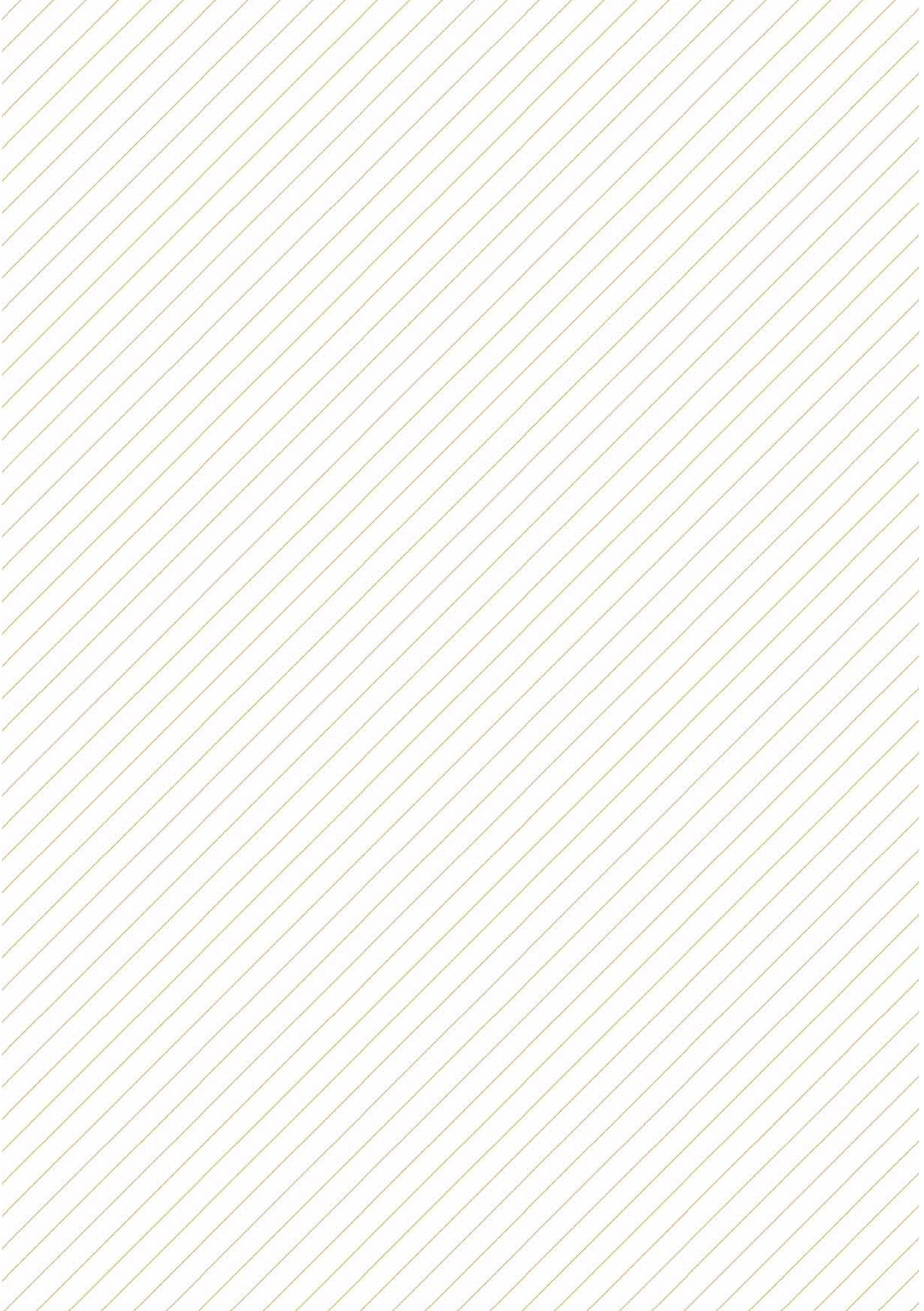

اسلام کے اندرونی و بیرونی دشمنوں سے مقابلہ

اسلام قدرت کا ایک قوی اور عظیم مظہر ہونے کے حوالے سے، اسے درپیش خطرات سے نمٹنے کے لیے، جو اِس کے ظہور سے پہلے یا ظہور کے آغاز سے لاحق تھے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے ہی سے منصوبہ بندی کی گئی ہے اور اِن خطرات سے مقابلے کے وسائل کا خود اسلام اور اس کے قوانین میں لحاظ رکھا گیا ہے۔ بالکل ایک صحیح و سالم جسم کی مانند کہ جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے دفاع کی صلاحیت، خود اس کے اندر رکھی ہے یا ایک ایسی مشین کی طرح جس کے بنانے والے انجینیر نے اس کی مرمّت کا سامان خود اسی کے اندر ہی رکھ دیا ہو۔

اسلام قدرت کا ایک مظہر ہے اور دیگر مظاہر کی طرح اِسے بھی مختلف قسم کے خطرات درپیش ہیں، لہٰذا اسے اِن خطرات سے مقابلے کے لیے وسائل کی ضرورت ہے اور اللہ تعالیٰ نے اِن وسائل کو خود اسلام کے اندر ہی رکھا ہے۔ لیکن (سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ) وہ خطرات کونسے ہیں؟ اسلام کو دو مخصوص قسم کے خطرات درپیش ہیں، اِن میں سے ایک بیرونی دشمن کا خطرہ اور دوسرا اندرونی انتشار کا خطرہ ہے۔

بیرونی دشمن سے مراد وہ عناصر ہیں جو سرحدوں کے باہر مختلف قسم کے اسلحوں سے لیس ہو کر کسی نظام کے وجود، اس کی فکر اور اس کی اعتقادی بنیادوں، اس کے قوانین اور دیگر تمام چیزوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ سرحدوں کے باہر سے یعنی کیا؟ اس سے مراد ملک کی سرحدیں نہیں ہیں، بلکہ اس سے مراد نظام سے باہر ہونا ہے، چاہے وہ ملک کے اندر ہی کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ (ہر ملک کے) بعض دشمن ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو اس ملک کے نظام سے لاتعلق سمجھتے اور اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ یہ وہ اجنبی لوگ ہوتے ہیں جو کسی بھی نظام کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جدید ترین اسلحوں، پروپیگنڈوں، مال و دولت اور دیگر مختلف اقسام کے دستیاب

وسائل کو بروئے کار لاتے ہیں، یہ دشمن کی ایک قسم ہے۔

دوسرا دشمن اور آفت، کسی نظام کا اندرونی طور پر انتشار کا شکار ہونا ہے؛ یعنی نظام کے اندر انتشار پیدا کرنا یہ غیروں کا کام نہیں، بلکہ یہ اپنوں کا کام ہوتا ہے۔ اپنے لوگ ہی کسی نظام میں رہتے ہوئے اس نظام سے اُکتا جانے، سمجھنے میں غلطی کر جانے، خواہشات کے غالب آجانے یا مادی جلوؤں کا اسیر ہو جانے کی وجہ سے، اتفاقی طور پر اِس آفت کا شکار ہو جاتے ہیں، البتہ پہلے والے دشمن کے مقابلے میں اِس کے نقصانات زیادہ ہوتے ہیں۔

یہ دونوں قسم کے دشمن، یعنی بیرونی اور اندرونی دشمن کسی بھی نظام، تنظیم اور قدرت کے مظہر کے مقابلے میں موجود ہوتے ہیں، لہٰذا اسلام نے ان دونوں قسم کے دشمنوں سے نمٹنے کے لیے ''جہاد'' کو ان کا علاج قرار دیا ہے، جو صرف بیرونی دشمن کے لیے نہیں ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ﴾[1] منافق ہمیشہ خود کو کسی نظام کے اندر قرار دیتا ہے، لہٰذا اِن سب سے جہاد کرنا چاہیے۔ جہاد ہمیشہ اس شخص سے کیا جاتا ہے جو نظام پر یقین نہ رکھنے اور اسے دشمن سمجھنے کی وجہ سے اس پر حملہ آور ہوتا ہے۔ اسی طرح اندرونی انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کا مقابلہ کرنے کے لیے، بے شمار قیمتی اخلاقی تعلیمات موجود ہیں، جو دنیا کی حقیقت سے انسان کو آگاہ اور خبردار کرتی ہیں۔

﴿اِعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ﴾[2]

یعنی اگرچہ یہ دُنیوی مال و دولت، یہ آرائشی اور تجملاتی اشیاء، یہ دُنیوی لذّتیں ہمارے لیے ضروری ہیں، کیونکہ ان سے استفادہ کرنا ہماری مجبوری بھی ہے اور ضرورت بھی۔ اس لیے کہ ہماری زندگی انہیں چیزوں سے وابستہ ہے اور اِس بات میں

---

[1] ا۔ اے رسولؐ! کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے۔ (سورہ توبہ، آیت ۷۳)

[2] ۲۔ یاد رکھو کہ دنیا کی زندگی صرف ایک کھیل، تماشا، آرائش، باہمی تفاخُر (فخر و مباہات) اور اموال و اولاد کی کثرت کا مقابلہ ہے۔ (سورہ حدید، آیت ۲۰)

بھی کوئی شک نہیں کہ ہمیں چاہیے کہ انہیں اپنے لیے حاصل کریں، لیکن یاد رکھیں کہ صرف انہیں کو ہدف قرار دیتے ہوئے آنکھیں بند کرکے ان ضروریات کے پیچھے چلے جانا اور اپنے اصلی ہدف کو بھول جانا، انتہائی خطرناک چیز ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام جو میدانِ جنگ کے شیر بھی تھے، جب گفتگو کرتے ہیں تو انسان اِس انتظار میں ہوتا ہے کہ آپؑ کی آدھی سے زیادہ گفتگو جہاد، جنگ، پہلوانی اور شجاعت سے متعلق ہوگی، لیکن جب ہم آپؑ سے منقول روایات اور نہج البلاغہ کے خطبات پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ آپؑ کی زیادہ تر گفتگو نصیحتوں، زُہد و تقویٰ، اخلاقیات، دنیا کی نفی، اِس کی تحقیر اور اعلیٰ انسانی اقدار اور معنویات کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کے بارے میں ہے۔

امام حسین علیہ السلام کی زندگی کے حالات اور واقعات میں یہ دونوں پہلو آپس میں جڑے ہوئے ہیں، یعنی جہاں نفس اور دشمن دونوں کے خلاف جہاد، بہترین اور اعلیٰ درجے میں دیکھا جا سکتا ہے، وہ واقعۂ عاشورا ہے، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ یہ حادثہ پیش آئے گا اور پوری انسانیت کے لیے ایک بہترین مثال اور نمونہ بن جائے گا اور یہ نمونہ سب کے لیے آئیڈیل بن جائے گا، جیسے مختلف ممالک میں مختلف شعبوں میں فاتح قرار پانے والے افراد اِس شعبے میں دوسرے افراد کی ترغیب و تشویق کا باعث بن جاتے ہیں۔

البتہ یہ ذہنوں کو حقیقت کے قریب لانے کے لیے ایک چھوٹی سی مثال ہے، جبکہ عاشورا کا واقعہ ان دونوں محاذوں پر لڑی جانے والی عظیم ترین جنگ سے عبارت ہے، یعنی یہ پہلا محاذ بیرونی دشمن سے جنگ کا محاذ ہے، جو اُس زمانے کے باطل نظامِ خلافت اور نظامِ سلطنت سے چمٹے ہوئے دنیا طلب لوگ تھے، جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انسانوں کی نجات کے لیے لائے ہوئے بہترین نظام کو چھوڑ کر آپؐ کے بتائے ہوئے راستے کے بالکل مخالف سمت پر چلنا چاہتے تھے اور دوسرا محاذ یعنی اندرونی محاذ ہے، کیونکہ اُس دور کے معاشرے کی عمومی صورتِ حال یہ تھی کہ پورا معاشرہ نفسانی خواہشات پر عمل کرتے ہوئے اس اندرونی فساد کی جانب چل پڑا تھا۔

دوسرا نکتہ میری نظر میں زیاد اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اسلامی نظامِ حکومت کی تشکیل کو ابھی کچھ ہی عرصہ ہوا تھا، اوائلِ اسلام کی سختیوں اور مشکلات کا زمانہ گزر چکا تھا، فتوحات کے نتیجے میں خوب مالِ غنیمت حاصل ہو گیا تھا، اسلامی مملکت کا دائرہ وسیع تر ہو چکا تھا، بیرونی دشمنوں کی جگہ جگہ سرکوبی کر دی گئی تھی، بے شمار غنائم لوگوں کے ہاتھ لگ چکے تھے، بعض لوگ مالدار بن گئے تھے تو کچھ لوگوں کا شمار اشرافیہ طبقے میں ہونے لگا تھا، یعنی اسلام کے اشرافیت کا خاتمہ کر دینے کے بعد، دنیائے اسلام میں ایک جدید اشرافیہ طبقے نے جنم لے لیا تھا۔ بہت سے عناصر نے اسلام اور مختلف عناوین جیسے فلاں صحابی کا بیٹا، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فلاں رشتہ دار کا بیٹا کہلوا کر ناشائستہ اور غیرمناسب کاموں کو انجام دینا شروع کر دیا تھا، جن میں سے بعض افراد کے نام تاریخ میں آج بھی محفوظ ہیں۔ ایسے لوگ بھی پیدا ہو گئے تھے جنہوں نے اپنی بیٹیوں کے حق مہر کو، مہر السُّنہ جسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، امیر المومنین علیہ السلام اور صدرِ اول کے مسلمانوں نے چار سو اسّی درہم معیّن کیا تھا، کی بجائے دس لاکھ دینار، دس لاکھ مثقال خالص سونا قرار دیا! یہ کون لوگ تھے؟ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بڑے بڑے صحابیوں کے بیٹے مثلاً مصعب ابن زبیر جیسے لوگ تھے۔

(۲۶۔۰۱۔۱۹۹۳ء)

اِس قسم کے حالات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے ایک عشرے سے بھی کم عرصے میں پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے، ابتداء میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام سے لے کر آپؐ کے قریبی ساتھیوں نے، جنہیں آپؐ کے ہمراہ کئی جنگوں میں حصّہ لینے کا شرف حاصل ہوا تھا، اپنے لیے خصوصی مراعات حاصل کرنا شروع کیں۔ اِن مراعات میں سے ایک، بیت المال سے زیادہ سے زیادہ مال وصول کرنا تھا۔ ایسا ماحول بنا دیا گیا تھا کہ ان کو دوسروں کے برابر سمجھنا صحیح نہیں ہے، یعنی یہ لوگ دوسروں کے برابر نہیں ہو سکتے!

یہ اس کجروی کی پہلی اینٹ تھی۔ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے انحرافات میں آہستہ آہستہ تیزی آنا شروع ہوئی اور یہیں سے انحرافات پیدا ہونا شروع ہو گئے اور خلیفۂ سوم کے دورِ حکومت کے وسط تک یہ سلسلہ چلتا رہا اور اس کے دورِ حکومت میں نوبت یہاں

تک پہنچ گئی کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے (بعض) برجستہ صحابہ کرام کا شمار اپنے زمانے کے بڑے سرمایہ داروں میں ہونے لگا! آپ غور فرمائیں! یعنی یہی بڑے بڑے صحابہ کرام کہ جن کے نام بھی مشہور ہیں: طلحہ، زبیر، سعد ابن ابی وقاص وغیرہ کہ ان میں سے ہر ایک کے جنگ بدر، جنگ حنین اور جنگ اُحد کے کارنامے اگر لکھے جائیں تو ایک اچھی خاصی کتاب بن جائے گی۔ اب ان کا شمار عالمِ اسلام کے بڑے سرمایہ داروں میں ہونے لگا تھا۔

اِن میں سے ایک کا جب انتقال ہوا اور اس کی جائیداد میں سے سونے کو اس کے ورثاء کے درمیان تقسیم کرنے کا مرحلہ آیا، تو سب سے پہلے سونے کو اینٹوں میں تبدیل کیا گیا اور اس کے بعد ان اینٹوں کو لکڑیوں کی طرح کلہاڑی کے ذریعے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں توڑا گیا! جبکہ اصولاً سونے کو مثقال کے وزن کے ذریعے جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔

آپ خود غور فرمائیں کہ اس کے پاس کتنا سونا ہوگا کہ جسے کلہاڑی کے ذریعے کاٹا گیا ہو! یہ وہ حقائق ہیں جو تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں، یہ ایسی باتیں نہیں ہیں کہ جن کے بارے میں کوئی یہ کہہ دے کہ یہ باتیں شیعوں نے اپنی کتابوں میں لکھی ہیں، بلکہ یہ وہ حقائق ہیں جنہیں محفوظ کرنے کی سب نے کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے بعد جو درہم و دینار چھوڑے، ان کا کوئی حساب نہ تھا۔

(۰۹-۰۶-۱۹۹۶ء)

جب ہم کسی سسٹم کی اندرونی خرابی کی بات کرتے ہیں تو اس کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ معاشرے میں ایسے افراد جنم لے لیں جو آہستہ آہستہ دنیا پرستی اور شہوت پرستی جیسی مہلک اخلاقی بیماریوں کو معاشرے میں پھیلائیں۔

ایسے حالات میں کیا کوئی ایسا شخص پیدا ہو سکتا ہے جو شجاعت، بہادری اور جرأت کے ساتھ یزید ابن معاویہ کی حکومت کے خلاف آواز بلند کر سکے؟! کیا یہ ممکن ہے؟ کیا کسی نے یزید کی ظالم اور جابر حکومت کے خلاف آوازِ حق بلند کرنے کا سوچا بھی تھا؟

ایسے حالات میں امام حسین علیہ السلام نے قیام فرمایا اور اپنے ظاہری دشمن سے بھی جنگ

کی اور عام مسلمانوں کو تباہی اور انحراف کی طرف لے جانے والی اندرونی برائیوں، عیاشیوں اور راحت طلبی سے بھی جنگ کی۔ یہ بہت ہی اہم بات ہے۔

قیامِ امام حسین علیہ السلام کے اہداف

اگر واقعۂ کربلا کا بغور مطالعہ کیا جائے تو شاید کہا جا سکتا ہے کہ حضرت ابا عبد اللہ الحسین علیہ السلام کے اِن چند مہینوں پر مشتمل سفر میں اس دن سے لے کر جب امامؑ نے مدینہ سے اپنے سفر کا آغاز کیا اور مکہ سے ہوتے ہوئے سرزمینِ کربلا میں جامِ شہادت نوش فرمایا، انسان سو سے زیادہ درسِ عبرت کو شمار کر سکتا ہے۔ میں ہزاروں درسِ عبرت کہنا نہیں چاہتا، البتہ کہا جا سکتا ہے کہ ہزاروں درس حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

کیونکہ عین ممکن ہے کہ امام عالی مقامؑ کا ایک ایک اشارہ ایک درس ہو، لیکن یہ جو ہم نے عرض کیا ہے کہ سو سے زیادہ درسِ عبرت، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم امامؑ کے اِن تمام اقدامات کا نہایت سنجیدگی اور توجہ کے ساتھ مطالعہ کریں تو ایسے سو سے زیادہ عناوین اور ابواب اخذ کر سکتے ہیں کہ جن میں سے ہر ایک باب ایک ملت، ایک پوری قوم اور ملک کی تعلیم و تربیت اور ذاتی و معاشرتی اصلاح اور قُربِ خدا کے لیے ایک مکمل درس کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسی لیے امام حسین ابن علی علیہما السلام کی شخصیت اور کردار دنیا کے تمام مقدّس اور پاکیزہ افراد کے درمیان خورشید کی مانند روشن اور درخشاں ہے۔ آپ انبیاء علیہم السلام، اولیاء، ائمہؑ، شہداء اور صالحین کو دیکھ لیجئے اگر یہ چاند اور ستاروں کی مانند چمکتے ہیں، تو امام عالی مقامؑ کی شخصیت سورج کی مانند تابناک ہے۔

لیکن جن سو دروس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے وہ ایک طرف، میں یہاں اِس واقعے کے اصلی درس کو آپ (قارئینِ کرام) کے سامنے بیان کرنے کی کوشش کروں گا، کیونکہ باقی تمام دروس کو ثانوی حیثیت حاصل ہے، جبکہ اس اصلی درس کو مرکزیت حاصل ہے۔ وہ یہ ہے کہ امام عالی مقامؑ نے قیام کیوں فرمایا تھا؟ یہ ایک درس ہے۔

امام حسین علیہ السلام سے کہا گیا تھا کہ آپؑ کی شخصیت مدینہ اور مکہ میں قابلِ احترام ہے اور یمن میں بھی آپؑ کے شیعہ موجود ہیں لہٰذا کسی کونے میں تشریف لے جائیے جہاں آپؑ کو یزید سے کوئی سروکار نہ ہو اور نہ ہی یزید کو آپؑ سے کوئی واسطہ ہو۔

آپؑ کے اتنے سارے چاہنے والے شیعہ ہیں، جائیے ان کے درمیان عزّت و احترام کے ساتھ زندگی بسر کیجئے اور عبادت و تبلیغ کیجئے! آپؑ قیام کیوں کرتے ہیں؟ مسئلہ کیا ہے؟ یہ ہے وہ اصلی اور بنیادی سوال اور یہی اِس واقعہ کا اصلی درس بھی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کسی نے اِن مطالب کو آج تک بیان نہیں کیا، کیوں نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اِس حوالے سے بہت سی کوششیں کی گئی ہیں اور باتیں بھی کافی زیادہ ہوئی ہیں؛ لیکن ہم یہاں جو مطالب آپ کی خدمت میں بیان کرنے جا رہے ہیں یہ خود ہماری نظر میں اِس واقعہ کا ایک بالکل ہی نیا پہلو اور ایک نئی تحقیق ہے۔

بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام یزید کی فاسد حکومت ختم کر کے خود ایک حکومت تشکیل دینا چاہتے تھے اور یہی امام حسین علیہ السلام کے قیام کا مقصد تھا تو یہ بات کسی حد تک تو صحیح ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ اگر اِس نظریے کا مقصد یہ ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے تشکیلِ حکومت کے لیے قیام کیا تھا، پھر جب انہوں نے دیکھا کہ وہ اپنے مقصد تک نہیں پہنچ سکتے، تو یہ کہہ کر انہیں واپس لوٹ جانا چاہیے تھا کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے، لہٰذا تحریک کو یہیں ختم کر دیتے ہیں! تو یہ کہنا غلط ہے۔ جی ہاں! جو شخص حکومت کی تشکیل کے لیے تحریک چلاتا ہے وہ اِس حد تک کوشش کرتا ہے جہاں تک ممکن ہو، لیکن جب اسے اِس کام کے نہ ہونے کا یقین ہو جاتا ہے یا وہ عقلی طور پر مقصد تک جانے والی راہوں کو مسدود پاتا ہے تو اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ لوٹ آئے۔ اگر مقصد حکومت کی تشکیل ہو تو پھر انسان اسی حد تک آگے جاتا ہے جہاں تک ممکن ہو اور جہاں سے آگے بڑھنے کا امکان ختم ہو جائے تو اسے واپس لوٹ جانا چاہیے۔

بنا بر ایں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قیامِ امام حسین علیہ السلام کا مقصد اور ہدف صرف اور صرف حضرت علی علیہ السلام کی مانند، ایک علوی حکومت کی تشکیل تھا تو یہ بات بالکل غلط

ہے کیونکہ امام عالی مقامؑ کی پوری تحریک اِس نظریے کی تائید نہیں کرتی۔

اِس نظریے کے مقابلے میں کچھ لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ نہیں جناب! امام حسین علیہ السلام نے حکومت کا کیا کرنا تھا؟ امامؑ تو جانتے تھے کہ آپؑ حکومت نہیں بنا سکیں گے، بلکہ وہ تو آئے ہی اس لیے تھے تاکہ قتل ہو کر شہادت کے اعلیٰ منصب پر فائز ہو سکیں! ایک زمانے میں یہ نظریہ بھی لوگوں میں بڑا مقبول تھا۔ بہت سے شعراء اِس نظریے کو اپنے خوبصورت اشعار کے قالب میں ڈھال کر بیان کرتے تھے، یہاں تک کہ میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے بعض بڑے بڑے علماء نے بھی اِسی نظریے کو بیان فرمایا ہے؛ یعنی امام حسین علیہ السلام کے قیام کا مقصد صرف اور صرف شہید ہونا تھا۔

لیکن حقیقت میں یہ کوئی نئی بات یا نیا نظریہ نہیں ہے۔ اِن لوگوں کے اِس نظریے کے مطابق گویا امامؑ نے یہ کہا کہ: چلو اگر ہم زندہ رہ کر کچھ نہیں کرسکتے تو شہید ہو کر ہی کچھ کیے دیتے ہیں!

ہمارے بنیادی مآخذ میں ہمیں اِس نظریے کی تائید میں کوئی سند نہیں ملتی کہ جاؤ اور بغیر کسی وجہ کے شہید ہو جاؤ۔ اسلامی تعلیمات میں ہمیں ایسی کوئی چیز نہیں ملتی، بلکہ شریعت مقدّسہ، قرآن اور روایات میں ہمیں جس شہادت کا تذکرہ ملتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان ایک ایسے مقدّس ہدف کی راہ میں جدّ و جہد کرے جو واجب یا راجح ہو اور اِس راہ میں قتل ہو جائے، تو یہ صحیح اسلامی شہادت ہے۔

لیکن اگر انسان صرف اِس لیے قدم اُٹھائے کہ میں جاؤں اور بغیر کسی وجہ کے قتل ہو جاؤں یا شاعرانہ اور ادیبانہ تعبیر کے مطابق، میرے خون کا سیلاب ظالم کو بہا کر لے جائے گا اور اسے زمین بوس کر دے گا؛ تو یہ تمام چیزیں واقعۂ کربلا کے اِس عظیم حادثے سے کسی بھی طرح میل نہیں کھاتیں۔ اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ امام حسین علیہ السلام کی شہادت نے یہ کام کر دکھایا ہے، لیکن آپؑ کے قیام کا مقصد یہ نہیں تھا۔

مختصر یہ کہ نہ تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام نے تشکیلِ حکومت کے لیے قیام کیا تھا اور آپؑ کا مقصد ایک حکومت بنانا تھا اور نہ ہی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ امامؑ

نے شہید ہونے کے لیے قیام کیا تھا، بلکہ آپؑ کا مقصد کوئی اور چیز تھی؛ میری نظر میں مذکورہ دونوں نظریوں کے ماننے والوں نے ہدف اور نتیجہ کو آپس میں ملا دیا ہے، اِن میں سے کوئی بھی امامؑ کا ہدف نہیں تھا، بلکہ امام حسین علیہ السلام کا ہدف کوئی اور چیز تھی۔ البتہ اِس ہدف تک پہنچنے کے لیے ایک تحریک کی ضرورت تھی جس کا نتیجہ اِن دو میں سے کسی ایک صورت میں نکل آنا لازمی تھا؛ یعنی یا حکومت ملتی یا شہادت۔

البتہ امام حسین علیہ السلام اِن دونوں نتائج کے لیے پہلے سے تیار تھے۔ انہوں نے تشکیلِ حکومت اور شہادت دونوں کے لیے تیاری کر رکھی تھی، لہٰذا جو بھی نتیجہ نکلتا آپؑ کو کچھ فرق نہیں پڑنے والا تھا، کیونکہ آپؑ ذہنی طور پر دونوں میں سے کسی ایک نتیجے کو قبول کرنے کے لیے تیار تھے، لیکن تشکیلِ حکومت اور شہادت میں سے کوئی بھی آپؑ کا ہدف اور مقصد نہیں تھا، بلکہ مقصد کچھ اور تھا۔

تو پھر امام عالی مقامؑ کا ہدف کیا تھا؟ ہم پہلے اِس ہدف کو بطورِ مختصر ایک ہی جملے میں بیان کرتے ہیں اور اِس کے بعد اس کی مختصر سی وضاحت بھی کریں گے۔ اگر ہم امام حسین علیہ السلام کے قیام کا مقصد اور ہدف بیان کرنا چاہتے ہیں، تو ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ آپؑ کا ہدف، دین کے واجبات میں سے ایک ایسے عظیم ترین واجب کو انجام دینا تھا، جس کو امام حسین علیہ السلام سے پہلے کسی نے بھی انجام نہیں دیا تھا؛ یہاں تک کہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، امیر المومنین امام علی علیہ السلام اور امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے بھی انجام نہیں دیا تھا۔

وہ ایک ایسا واجب تھا جو اسلام کے عملی اور فکری نظام میں بہت زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ وہ ایک ایسا واجب تھا جو اتنی زیادہ اہمیت کے قابل اور بنیادی حیثیت کے حامل ہونے کے باوجود، امام حسین علیہ السلام کے دورِ حیات تک اس پر عمل نہیں ہو سکا تھا۔ میں یہ عرض کروں گا کہ اس پر کیوں عمل نہیں ہوا تھا۔

امام حسین علیہ السلام کو اِس واجب پر عمل کرنا تھا تاکہ تاریخ میں سب کے لیے ایک درس بن جائے، جس طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلامی حکومت تشکیل دے کر پوری تاریخ کے لیے ایک درس چھوڑا تھا۔ آپؐ نے صرف احکام بیان نہیں کیے تھے، بلکہ عملی طور پر ایک حکومت تشکیل دی تھی، یا آپؐ نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا تو یہ عمل بھی تا ابد

پوری تاریخ اسلام اور تاریخ بشریت کے لیے ایک درس بن گیا۔ اسی طرح اِس واجب کو امام حسینؑ کے ذریعے انجام پانا تھا تاکہ پوری تاریخ کے مسلمانوں کے لیے ایک عملی درس بن سکے۔

اہم ترین واجب اور امام حسینؑ

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اِس کام کے لیے امام حسینؑ ہی کو کیوں منتخب کیا گیا؟ چونکہ اس واجب کو عملی جامہ پہنانے کا جو راستہ تھا وہ امام حسینؑ کے دور میں ہموار ہوا تھا، اگر یہ راستہ امام حسینؑ کے دور میں ہموار نہ ہوتا مثلاً امام علی نقیؑ کے دور میں یہ راستہ ہموار ہوتا، تو امام علی نقیؑ اس کام کو انجام دیتے اور تاریخ اسلام میں اس عظیم واقعے اور ذبحِ عظیم کے محور قرار پاتے۔

اسی طرح اگر یہ راستہ امام حسن مجتبیٰؑ یا امام جعفر صادقؑ کے دور میں ہموار ہوتا تو یہ ہستیاں بھی اسی طرح عمل کرتیں، جبکہ امام حسینؑ سے پہلے ایسے حالات پیش ہی نہیں آئے اور نہ ہی امام حسینؑ کے بعد سے لے کر زمانۂ غیبت تک تمام ائمہ معصومینؑ کے دور میں کبھی یہ حالات پیش آئے۔

پس ہدف اِس واجب کو انجام دینے سے عبارت ہے، اب میں اس بات کی وضاحت بھی کرتا ہوں کہ یہ واجب کیا ہے؟ اس وقت اس واجب کی ادائیگی سے خود بخود ان دو میں سے ایک نتیجہ نکل سکتا ہے، یا تو اس کا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ امام حسینؑ کو حکومت مل جائے گی، تو ''أَهلاً وَسَهلاً'' امامؑ اِس کام کے لیے پہلے سے ہی تیار تھے، اگر امام حسینؑ کو حکومت مل جاتی تو آپؑ پوری طاقت اور قدرت کے ساتھ اسے اپنے ہاتھ میں لے لیتے اور پورے معاشرے کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنینؑ کی مانند چلاتے اور اگر اِس واجب پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ، حکومت کی بجائے شہادت کی شکل میں نکل آتا، تب بھی امام حسینؑ اِس کے لیے پہلے ہی سے تیار تھے۔

اللہ تعالیٰ نے امام حسین علیہ السلام اور دیگر ائمہ معصومین علیہم السلام کو اس طرح خلق فرمایا تھا کہ اِس عظیم امر کے لیے پیش آنے والی اس خاص قسم کی شہادت کے بارِ سنگین کو اُٹھا سکیں اور اِن ہستیوں نے ان تمام مصائب و آلام اور مشکلات کو برداشت بھی کیا، البتہ کربلا میں مصائب کا پہلو اِس واقعہ کا ایک دوسرا عظیم رُخ ہے، اب میں چاہتا ہوں کہ اِس مسئلے کو ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کروں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا کوئی بھی رسول جب مبعوث ہوا ہے تو اسلامی احکامات کا ایک مجموعہ لے کر آیا ہے، اِن میں سے بعض احکامات انفرادی ہیں تاکہ انسان اپنی اصلاح کرے اور بعض اجتماعی ہیں تاکہ دنیائے بشر کو آباد کرے، انسانوں کی صحیح سمت میں راہنمائی کرے اور انسانی معاشرے کو ایک صحیح نظام کے ذریعے قائم رکھے۔ یہ انفرادی اور اجتماعی احکامات ایک مجموعے کی شکل میں ہیں کہ جنہیں اسلامی نظام کہا جاتا ہے۔

اسلام قلبِ مقدّس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا اور آپؐ نے نماز، روزہ، زکات، انفاق، حج، گھریلو زندگی کے احکامات، انفرادی رابطے اور تعلقات، جہاد فی سبیل اللہ، تشکیلِ حکومت، اسلامی اقتصادیات، حکمران اور عوام کا تعلق و رابطہ اور حکومت کے حوالے سے عوام کی ذمہ داریاں وغیرہ اِن تمام احکامات کو ایک مجموعے کی شکل میں انسانیت کے سامنے پیش کیا اور سب لوگوں کے سامنے بیان فرمایا:

’’يَا أَيُّهَا النَّاسُ وَاللهِ مَا مِنْ شَيْءٍ يُقَرِّبُكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ النَّارِ إِلَّا وَقَدْ أَمَرْتُكُمْ بِهِ‘‘[۱]

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن تمام چیزوں کو جو کسی انسان یا ایک انسانی معاشرے کو سعادت اور خوش بختی تک پہنچا سکتی ہیں، نہ صرف بیان کیا، بلکہ ان پر بذاتِ خود عمل بھی کیا اور انہیں معاشرے میں نافذ بھی کیا۔

---

[۱] اے لوگو! کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہی جو تمہیں جنت سے قریب اور جہنم سے دور کرے مگر یہ کہ میں نے تمہیں اس کا حکم نہ دے دیا ہو۔ (الکافی، ج۲، ص۷۴)

اب جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں اسلامی حکومت اور اسلامی معاشرہ تشکیل پا گیا، اسلامی اقتصادیات کو نافذ کر دیا گیا، اسلامی نظامِ جہاد قائم ہو چکا اور زکات کی ادائیگی معاشرے میں رائج ہو گئی اور یوں روئے زمین پر ایک حقیقی اسلامی ملک اور اسلامی نظامِ حکومت نے جنم لے لیا۔ اِس اسلامی نظام کے نقشہ ساز پیشوا اور اِس ریل گاڑی کو اس کی پٹری پر چلانے والے راہنما، خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا ان کی جگہ پر بیٹھنے والے لوگ تھے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بتایا ہوا یہ راستہ واضح اور روشن ہے، لہٰذا اسلامی معاشرے اور اِس سے تعلق رکھنے والے ہر فرد کو چاہیے کہ اسی راستے پر قدم اُٹھائے، اسی راستے پر آگے بڑھے اور اسی راستے سے اپنے ہدف و مقصد تک پہنچے۔

اگر اسلامی معاشرے کی حرکت اسی راستے پر اور اسی سمت کی طرف ہو تو اس وقت اس معاشرے سے تعلق رکھنے والے تمام انسان اپنے کمال تک پہنچ جائیں گے۔ وہ نیک اور فرشتہ صفت انسان بن جائیں گے۔ معاشرے سے ظلم و ستم کا خاتمہ ہو جائے گا۔ معاشرے کو برائیوں، فساد، اختلافات، فقر و افلاس اور جہالت کے منحوس و مکروہ سائے سے نجات مل جائے گی، انسان اپنی کامل خوش بختی کو پالے گا اور خدا کا مقرّب بندہ بن جائے گا۔

معاشرتی انحرافات کی اقسام

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے اسلام کو ایک مکمل ضابطۂ حیات کی حیثیت سے لایا گیا اور اس زمانے کے معاشرے میں نافذ ہوا، لیکن کہاں؟ ایک ایسے شہر میں جسے "مدینہ" کہا جاتا ہے، اس کے بعد مکہ اور دیگر چند شہروں میں اِس اسلامی نظام نے وسعت پائی۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اِس کاروان کو جسے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک معیّن راستے پر گامزن کر رکھا تھا اگر کوئی ہاتھ اسے آگے بڑھنے سے روکے یا وہ کسی حادثے کا شکار ہو جائے، تو اس وقت لوگوں کی کیا ذمہ داری بنتی ہے؟ اسی طرح

اگر اسلامی معاشرہ منحرف ہو جائے اور یہ انحراف اِس حد تک بڑھ جائے کہ پورے اسلام اور اسلامی تعلیمات کو لپیٹ میں لے لینے کا خوف ہو تو اس صورت میں مسلمانوں کی کیا ذمہ داری ہے؟

انحراف کی بھی دو قسمیں ہیں؛ ایک انحراف یہ ہے کہ لوگ فاسد اور خراب ہو جائیں۔ اکثر اوقات ایسا ہی ہوتا ہے لیکن لوگوں کے منحرف ہونے سے اسلامی تعلیمات ختم نہیں ہوتیں۔ دوسری قسم کا انحراف یہ ہے کہ لوگوں کے منحرف ہونے کے ساتھ، حکومت بھی فاسد اور خراب ہو جائے اور علمائے دین اور خطباء حضرات بھی انحراف کا شکار ہو جائیں، تو ایسی صورت میں ان منحرف لوگوں سے صحیح و سالم دین کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔

کیونکہ ایسے لوگ قرآن مجید اور اسلامی تعلیمات میں تحریف کرتے ہوئے اچھے کو بُرا اور بُرے کو اچھا، منکر کو معروف اور معروف کو منکر بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات کو اسلام کے بتائے ہوئے راستے سے، ایک سو اسّی درجہ اُلٹا پیش کرتے ہیں، اگر اسلامی معاشرہ اور اسلامی نظام اس مشکل سے دوچار ہو جائے تو یہاں ذمہ داری کیا ہے؟ البتہ پیغمبر اکرم ﷺ نے اِس سلسلے میں ذمہ داری کو بیان کر دیا ہے اور قرآن نے بھی فرمایا ہے:

﴿مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ﴾[1]

اِس سلسلے میں آیات اور روایات بہت زیادہ ہیں لیکن میں یہاں پر امام حسین علیہ السلام کی زبانی ایک روایت بیان کرنا چاہتا ہوں، جسے آپؑ نے پیغمبر اکرم ﷺ کی زبانی نقل کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا پیغمبر اکرم ﷺ خود بھی اِس حکم پر عمل کر سکتے تھے؟ نہیں۔ کیونکہ یہ حکمِ الٰہی اس وقت قابلِ عمل ہے جب معاشرہ منحرف ہو چکا ہو، اگر معاشرہ منحرف ہو جائے تو اس کا علاج کرنا چاہیے اور اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے ایک خاص حکم بھی جاری کیا ہے، ایسے معاشروں کے لیے جہاں معاشرتی انحراف اور خرابی اِس حدّ

---

[1] تم میں سے جو بھی شخص اپنے دین سے مرتدّ ہو جائے تو اللہ ایسی قوم کو لے کر آئے گا جس سے اللہ محبت کرتا ہو گا اور وہ بھی اللہ سے محبت کرتی ہو گی۔ (سورہ مائدہ، آیت ۵۴)

تک بڑھ جائے کہ یہ اصلِ اسلام اور اس کی تعلیمات سے انحراف کا سبب بنے، تو اِس صورت میں اللہ تعالیٰ نے ایک حکم جاری کیا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے انسان کو کسی بھی مسئلے میں بغیر حکم کے نہیں چھوڑا ہے۔

پیغمبر اکرمﷺ نے خود اِس حکمِ خدا کو بیان فرمایا ہے، یعنی قرآن و حدیث نے اِس حکم کو بیان کیا ہے۔ لیکن آپؐ خود اِس حکم پر عمل نہیں کر سکتے تھے۔ کیوں عمل نہیں کر سکتے تھے؟ کیونکہ اِس حکم پر تب عمل کیا جا سکتا تھا جب معاشرہ منحرف ہو جاتا۔ جبکہ رسول اکرمﷺ کے عہدِ رسالت اور امیر المومنین علیہ السلام کے عہدِ ولایت و امامت میں مسلمان معاشرہ اتنا منحرف نہیں ہوا تھا کہ اِس حکم پر عمل کرنے کی نوبت آجاتی۔ اسی طرح امام حسن علیہ السلام کے دور میں بھی جب ظاہری حکومت، معاویہ کے ہاتھ میں تھی اور اِس اجتماعی انحراف کی بہت سی نشانیاں ظہور پذیر ہوگئیں تھیں، لیکن اِس کے باوجود اِس مرحلے تک نہیں پہنچیں تھیں کہ جہاں پورے اسلام کی نابودی کا خطرہ پیش آتا۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاید ایک خاص زمانے میں ایسی صورتِ حال پیش بھی آئی تھی، لیکن اس وقت اِس حکمِ الٰہی پر عمل کرنے کی فرصت نہیں تھی یا موقع مناسب نہ تھا۔ یہ حکمِ الٰہی جو اسلامی احکامات کا ایک جزء ہے اور اِس کی اہمیت خود حکومت سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے؛ اس لیے کہ حکومت کا مطلب معاشرے کا بہترین انتظام ہے۔ اگر معاشرہ بتدریج اپنی راہ سے نکل کر خرابی کا شکار ہو جائے اور حکمِ خدا تبدیل ہو جائے اور ہمارے پاس اِس خراب حالت کو بدلنے کے لیے کوئی حکم اور منصوبہ موجود نہ ہو تو ایسی حکومت کا کیا فائدہ؟

پس معلوم ہوا کہ منحرف معاشرے کو اس کی اصلی راہ پر دوبارہ گامزن کرنے کے حکم کی اہمیت، خود حکومت اور اس کی اہمیت سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔ شاید یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اِس حکم کی اہمیت، کفار سے جہاد کرنے سے بھی زیادہ ہے اور یہ بھی کہنا صحیح ہے کہ اِس حکم کی اہمیت ایک اسلامی معاشرے میں ایک معمولی قسم کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے بھی زیادہ ہے۔ حتیٰ کہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ شاید منحرف معاشرے کو اس کے راستے پر لوٹانے کا حکم، اللہ تعالیٰ کی طرف

سے عظیم فرائض و واجبات اور حج سے بھی زیادہ ہے۔ کیوں؟

اس لیے کہ درحقیقت یہ حکم فنا شدہ یا ختم ہونے کے قریب اسلام کو زندہ کرنے کا ضامن ہے۔ اچھا تو پھر کون ہے جو اِس اہم ترین حکم پر عمل کرے؟ اِس عظیم حکم پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی ایسا جانشین ہی عمل کر سکتا ہے جو ایسے زمانے میں موجود ہو، جب معاشرہ اِس انحراف کا شکار ہو گیا ہو۔ البتہ اِس کی ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ اِس حکم پر عمل درآمد کے لیے حالات بھی سازگار ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی ایسے عمل کو واجب نہیں کرتا کہ جس کا کوئی فائدہ نہ ہو۔ لہٰذا اگر حالات ناسازگار ہوں اور یہ جانشینِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کتنی ہی محنت کیوں نہ کرے، اس کے عمل اور جدّ و جہد کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلے گا، لہٰذا عمل درآمد کرنے کے لیے حالات کو مناسب اور موزوں ہونا چاہیے۔

لیکن حالات کے سازگار ہونے کے معنی کچھ اور ہیں۔ یہ نہیں کہ ہم کہیں چونکہ اِس حکم کو عملی جامہ پہنانے کی راہ میں خطرات موجود ہیں، لہٰذا حالات سازگار نہیں ہیں۔ حالات کے سازگار ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔ حالات و شرائط کو مناسب ہونا چاہیے؛ یعنی انسان یہ جانے کہ اگر اُس نے کام کو انجام دیا تو اِس کا ایک نتیجہ ظاہر ہوگا، یعنی لوگوں تک پیغام پہنچ جائے گا، عوام اِس نتیجے سے حقیقت کو سمجھیں گے اور لاعلمی سے نکلیں گے۔ یہ وہ عظیم ذمہ داری ہے کہ جسے کسی نہ کسی کو انجام دینا ضروری ہے۔

یزید کا برسرِ اقتدار آنا اور قیام کا آغاز

اب چونکہ امام حسین علیہ السلام کے زمانے میں یہ انحراف پیدا ہو چکا تھا اور اِس کے ساتھ حکمِ الٰہی پر عمل درآمد کے لیے راستہ بھی ہموار تھا۔ لہٰذا امام حسین علیہ السلام کو قیام کر لینا چاہیے تھا کیونکہ انحرافات پیدا ہو چکے تھے، معاویہ کے بعد ایک ایسا شخص کرسی اقتدار پر بیٹھ چکا تھا جو اسلام کے ظاہری احکام کی ذرّہ برابر بھی رعایت نہیں کرتا تھا۔ وہ خلیفہ کہلانے کے ساتھ ساتھ شراب بھی پیتا تھا، جنسی گناہوں، دیگر برائیوں اور قبیح ترین اعمال کا علی الاعلان ارتکاب کرنا، اس کی عادت تھی، قرآن کے خلاف باتیں کرتا اور قرآنی احکامات

اور دینی تعلیمات کے خلاف اشعار کہتا تھا اور کھلم کھلا اسلام کی مخالفت کرتا تھا۔ چونکہ مسلمانوں کا نام نہاد خلیفہ بن گیا تھا، اس لیے وہ اسلام کے نام کو مکمل طور پر ختم نہیں کر سکتا تھا۔

وہ نہ تو اسلام کا پیروکار تھا اور نہ ہی اسے اسلام سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی اس کے دل میں اسلام کے لیے کوئی نرم گوشہ تھا، بلکہ وہ اپنے عمل میں ایسے گندے نالے کی مانند تھا جس سے مسلسل گند اور بدبودار پانی بہتا ہے اور پورے ماحول کو بدبودار کر دیتا ہے، وہ بھی اپنے گندے اور بدبودار اعمال کے ذریعہ پورے اسلامی معاشرے کی فضا کو آلودہ اور بدبودار کر رہا تھا۔

ایک بُرے اور فاسد حاکم کی مثال ایسی ہی ہے؛ کیونکہ حاکم معاشرے میں سب سے اونچے منصب پر فائز ہوتا ہے، لہٰذا جو بھی چیز اس سے رِستی ہے وہ وہیں پر نہیں ٹکتی، بلکہ نیچے آکر اطراف کے علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ عام افراد کے برخلاف (کیونکہ ان کے اعمال اس خاصیت کے حامل نہیں ہوتے ہیں)، ان کا عمل انہیں تک محدود ہوتا ہے لیکن جس کا مرتبہ بلند اور جو معاشرے میں بڑے درجے کا مالک ہوتا ہے اس کی بُرائیوں کا نقصان بھی اسی نسبت سے زیادہ ہوتا ہے۔

ممکن ہے کہ عام افراد کی بُرائیاں صرف انہیں یا ان کے ارد گرد موجود چند لوگوں کے لیے نقصان دہ ہوں؛ لیکن اگر کوئی بڑا آدمی کسی بُرائی کا ارتکاب کرے تو اس کے بُرے اثرات اطراف میں پھیل کر پورے ماحول کو آلودہ کر دیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح اگر معاشرے میں کسی اعلیٰ منصب پر فائز شخص نیک ہو تو اس کے نیک اعمال کے اثرات اور خوشبو بھی پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے کر ماحول کو معطّر کر دیتی ہے۔ معاویہ کے بعد یزید جیسے شخص کے مسلمانوں کا خلیفہ بن جانے اور اپنے آپ کو جانشینِ پیغمبر کہلوانے سے بڑھ کر بھی کوئی انحراف ہو سکتا ہے؟!

اب اِس حکمِ الٰہی پر عمل درآمد کرنے لیے راستہ بھی ہموار ہے۔ راستہ ہموار ہے؟ یعنی کیا؟ یعنی کیا کوئی خطرہ نہیں ہے؟ کیوں نہیں، خطرات تو موجود ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی اقتدار پر قابض شخص اپنے مقابلے میں آنے والوں کے لیے خطرہ ثابت نہ ہو؟ یہ

تو ایک قسم کی جنگ ہے۔ کیونکہ آپ اسے تختِ اقتدار سے نیچے اُتارنا چاہتے ہیں تو کیا وہ بیٹھ کر تماشا دیکھے گا؟ ظاہر ہے وہ بھی آپ کو نقصان پہنچانا چاہے گا تو بس پھر خطرہ تو موجود ہے۔

یہ جو ہم کہتے ہیں کہ راستہ ہموار ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کا ماحول اور اس کے حالات ایسے ہیں کہ ممکن ہے امام حسین علیہ السلام کی آواز اس زمانے میں اور پوری تاریخ کے انسانوں کے کانوں تک پہنچ جائے۔

اگر امام حسین علیہ السلام معاویہ کے دور میں قیام فرماتے تو آپؑ کا پیغام دفن ہو چکا ہوتا، کیونکہ معاویہ کے دورِ حکومت میں حالات اور سیاست ہی کچھ ایسی تھی کہ لوگ حق بات سن ہی نہیں سکتے تھے؛ لہٰذا امام عالی مقامؑ نے معاویہ کے دورِ حکومت میں دس سال تک منصبِ امامت پر فائز رہنے کے باوجود کچھ نہیں کہا اور نہ ہی اس دور میں کوئی ایسا عمل انجام دیا اور نہ ہی کوئی اقدام اور قیام کیا، کیونکہ اُس دور میں راستہ ہموار نہیں تھا۔ امام حسین علیہ السلام سے پہلے امام حسن علیہ السلام وقت کے امام تھے تو آپؑ نے بھی قیام نہیں کیا تھا کیونکہ اُن کے دور میں بھی حالات سازگار نہیں تھے، نہ یہ کہ امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام اس کام کے لیے لائق نہیں تھے۔ بلکہ امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسی طرح امام حسین علیہ السلام اور امام زین العابدین علیہ السلام اور امام علی نقی علیہ السلام اور امام حسن عسکری علیہ السلام اور دیگر ائمہ طاہرین علیہم السلام کی سیرت اور کردار میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ ہاں البتہ جب امام عالی مقامؑ نے یہ عظیم الشان قربانی دے کر تمام ائمہ اطہار علیہم السلام پر جنہوں نے یہ عمل انجام نہیں دیا ہے، سبقت حاصل کی ہے، تو آپؑ کا مقام بالاتر ہے؛ لیکن منصبِ امامت کے لحاظ سے تمام ائمہ طاہرین علیہم السلام برابر ہیں، اگر ان ہستیوں میں سے کسی اور کے لیے یہی صورتِ حال پیش آتی تو وہ بھی یہی عمل انجام دیتا اور اسی مقام و منزلت پر فائز ہو جاتا۔

اب چونکہ امام حسین علیہ السلام کو ان انحرافات کا سامنا کرنا پڑا ہے تو پس انہیں اپنی ذمہ داریوں پر عمل بھی کرنا ہو گا کیونکہ موقع بھی مناسب ہے، لہٰذا اب کسی عذر کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ اس لیے عبد اللہ ابن جعفر، محمد ابن حنفیہ اور عبد اللہ

ابن عباس وغیرہ، جو کوئی عام لوگ نہیں تھے، بلکہ دین شناس، عارف، عالم اور فہم و ادراک رکھنے والے لوگ تھے، جب امامؑ سے کہتے ہیں: مولا! خطرہ ہے آپؑ نہ جائیے؛ یعنی وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ جب ذمہ داریوں کی انجام دہی میں خطرات موجود ہوں، تو ذمہ داریاں ساقط ہو جاتی ہیں۔ ان لوگوں میں اِس بات کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں پائی جاتی تھی کہ یہ کوئی ایسی ذمہ داری نہیں ہے جو خطرات کی موجودگی میں ساقط ہو جائے۔

کیونکہ اِس ذمہ داری کی ادائیگی میں ہمیشہ خطرات ہوتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ انسان بظاہر اس قسم کی ایک بڑی مقتدر اور انتہائی مضبوط حکومت کے خلاف قیام کرے اور اسے کسی بھی قسم کے خطرات کا سامنا نہ کرنا پڑے؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟! پس اس ذمہ داری کی ادائیگی میں ہمیشہ خطرات موجود ہوتے ہیں۔

امام حسین علیہ السلام کے زمانے میں جو کام انجام پایا، اس کی ایک چھوٹی سی جھلک امام خمینیؒ کے دور میں بھی سامنے آئی۔ فرق یہ ہے کہ امام حسین علیہ السلام کے قیام کا نتیجہ شہادت کی صورت میں سامنے آیا، جبکہ امام خمینیؒ کے قیام کا نتیجہ حکومت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ امام حسین علیہ السلام اور امام خمینیؒ کا ہدف اور مقصد ایک ہی تھا۔ یہی مطلب امام حسین علیہ السلام کی تعلیمات کی بنیاد ہے۔ مذہبِ شیعہ کی تعلیمات کا ایک بڑا حصّہ، حسینیؑ تعلیمات پر مشتمل ہے، امام حسین علیہ السلام کی تعلیمات کا تعلق اسلام کی مضبوط بنیادوں سے ہے۔

پس ہدف اور مقصد یہ ہوا کہ اسلامی معاشرے کو اُس کے صحیح راستے کی طرف لوٹانا چاہیے۔ مگر کب؟ اُس وقت جب اسلام کو اس کے راستے سے ہٹا دیا گیا ہو، بعض لوگوں کی جہالت، ظلم و استبداد اور خیانت نے مسلمانوں کو منحرف کر دیا ہو اور اِس انحراف نے قیام کے لیے سازگار ماحول فراہم کر دیا ہو۔

البتہ تاریخ کے مختلف اَدوار میں مختلف زمانے آتے رہتے ہیں، کبھی شرائط پوری ہوتی ہیں اور کبھی نہیں ہوتیں۔ امام حسین علیہ السلام کے زمانے میں یہ شرائط پوری تھیں اور ہمارے زمانے میں بھی شرائط پوری تھیں، لہٰذا امام خمینیؒ نے بھی وہی کام کیا کیونکہ

ہدف ایک تھا۔ البتہ جب انسان اِس مقصد کے حصول کے لیے قدم اُٹھاتا ہے اور چاہتا ہے کہ ایک ظالم و جابر حکومت کے خلاف قیام کرے اور اسلام، اسلامی معاشرے اور اسلامی نظام کو اس کے صحیح راستے پر گامزن کر دے، تو اِس قیام کے دوران کبھی اسے حکومت مل جاتی ہے اور کبھی حکومت نہیں ملتی اور وہ درجۂ شہادت پر فائز ہو جاتا ہے۔

تو کیا اِس صورت میں ذمہ داری کی ادائیگی واجب نہیں ہے؟ کیوں نہیں، واجب ہے اگرچہ وہ درجۂ شہادت پر فائز ہو جائے۔ کیا اِس صورت میں جب وہ اپنی ذمہ داری ادا کرتے ہوئے درجۂ شہادت پر فائز ہو جائے، تو اِس قیام کا کوئی فائدہ نہیں ہے؟ کیوں نہیں؟ فائدہ ہے۔ کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اِس قیام اور تحریک کے دوران وہ درجۂ شہادت پر فائز ہو جائے یا اسے حکومت مل جائے۔ فرق یہ ہے کہ دونوں کے فائدے الگ الگ ہیں، لہٰذا ہر حال میں قیام کرنا اور تحریک چلانا ضروری ہے۔

یہ وہ کام تھا جسے امام حسین علیہ السلام نے انجام دیا اور آپؑ ہی وہ پہلی شخصیت تھے کہ جس نے پہلی بار یہ قدم اُٹھایا، آپؑ سے پہلے کسی نے یہ کام انجام نہیں دیا تھا، کیونکہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنین علیہ السلام کے دور میں ایسا کوئی انحراف ہی وجود میں نہیں آیا تھا یا اگر بعض موارد میں انحرافات تھے تو بھی ان کے خلاف قیام کی شرائط پوری نہیں تھیں اور نہ ہی حالات مناسب تھے۔ لیکن امام حسین علیہ السلام کے دور میں دونوں چیزیں (یعنی انحرافات اور شرائط و مناسب حالات) موجود تھیں، تحریکِ حسینیؑ کی اصل حقیقت بھی یہی ہے۔

پس بطورِ خلاصہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں امام حسین علیہ السلام نے اِس لیے قیام کیا کہ اِس عظیم واجب، جو اسلامی نظام اور اسلامی معاشرے کی ازسرِ نو تعمیر یا اسلامی معاشرے میں جنم لینے والے انحرافات سے مقابلہ کرنے سے عبارت ہے، کو انجام دے سکیں اور یہ کام، قیام اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہی کے ذریعے ممکن تھا بلکہ یہ خود بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک بہت بڑا مصداق ہے۔ البتہ اِس کام کا نتیجہ کبھی حکومت کی صورت میں نکلتا ہے، امام حسین علیہ السلام اِس کے لیے تیار تھے اور کبھی اِس کا نتیجہ، شہادت کی صورت میں نکلتا ہے اور امام حسین علیہ السلام اِس کے لیے بھی مکمل

طور پر تیار تھے۔ ہم کس دلیل کی بنا پر یہ بات کہہ رہے ہیں؟

قیامِ امام حسین علیہ السلام کا مقصد خود آپؑ کی زبانی

اِن باتوں کو ہم نے خود امام حسین علیہ السلام کے فرمودات سے اخذ کیا ہے ہم نے امامؑ کے فرامین میں سے چند ایک جملوں کا انتخاب کیا ہے۔ البتہ اِس سلسلے میں امامؑ کے فرمودات کی تعداد بہت زیادہ ہے، جو اسی مطلب پر دلالت کرتے ہیں۔

سب سے پہلے مدینہ میں، اُس رات جب مدینہ کے حاکم ولید نے آپؑ کو بلایا اور کہا کہ معاویہ مر گیا ہے، لہٰذا آپؑ کو یزید کی بیعت کرنی ہوگی۔ امام حسین علیہ السلام نے اُس کے جواب میں فرمایا: صبح تک صبر کرو ''وَ نَنْظُرُ وَ تَنْظُرُوْنَ أَيُّنَا أَحَقُّ بِالْبَيْعَةِ وَ الْخِلَافَةِ'' ''ہم بھی دیکھتے ہیں اور تم بھی دیکھو کہ ہم میں سے بیعت اور خلافت کا حقدار کون ہے؟''

دوسرے دن جب راستے میں امام عالی مقامؑ کی مروان سے ملاقات ہوئی تو اس نے آپؑ سے کہا: اے ابا عبد اللہ! آپؑ خود کو ہلاکت میں کیوں ڈال رہے ہیں! خلیفہ کی بیعت کیوں نہیں کرتے؟ آیئے خلیفہ کی بیعت کریں اور اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالیں، خود کو مشکلات میں نہ ڈالیں۔ تو آپؑ نے اس کے جواب میں یہ جملہ فرمایا:

''إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ وَعَلَى الْإِسْلَامِ السَّلَامُ، إِذْ قَدْ بُلِيَتِ الْاُمَّةُ بِرَاعٍ مِثْلَ يَزِيْدٍ''[۱]

''إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ، جب یزید جیسا شخص اُمتِ مسلمہ کا خلیفہ بن جائے تو اسلام کو خدا حافظ کہہ دینا چاہیے۔''

یعنی جب یزید جیسا شخص حاکم بن جائے اور اسلام یزیدیت جیسے مرض میں مبتلا ہو جائے، تو پھر تو اسلام کو خدا حافظ کہتے ہوئے اس کی فاتحہ پڑھ لینی چاہیے۔ یہاں

---

[۱] بحار الانوار، ج۴۴، ص۳۲۵۔۳۲۶

صرف یزید کی ذات کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ جو بھی یزید جیسا ہو۔ یعنی امامؑ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اب تک جو بھی ہوا وہ قابلِ برداشت تھا لیکن اب چونکہ اصولِ دین اور اسلامی نظام خطرے میں ہے اور یزید جیسے شخص کی حکومت سے اسلام مٹ جائے گا، اسی وجہ سے انحراف کا خطرہ بہت بڑا سنگین مسئلہ ہے، کیونکہ خود اسلام کو خطرات لاحق ہیں۔

حضرت ابا عبداللہ الحسین علیہ السلام نے مدینہ سے روانگی اور اسی طرح مکہ سے روانگی کے وقت بھی محمد ابن حنفیہ کے ساتھ متعدّد بار گفتگو کی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ وصیت مکہ سے روانگی کے وقت کی ہے۔ چونکہ ماہِ ذی الحجہ میں محمد ابن حنفیہ بھی مکہ میں موجود تھے اور انہوں نے کئی مرتبہ امام حسین علیہ السلام سے گفتگو کی ہے اور آپؑ نے اپنے بھائی کو ایک وصیت بھی لکھ کر دی تھی، جس میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی گواہی نیز دیگر اُمور کو بیان کرنے کے بعد لکھا تھا:

’’إِنِّي لَمْ أَخْرُجْ أَشِراً وَلَا بَطِراً وَلَا مُفْسِداً وَلَا ظَالِماً‘‘

یعنی آپؑ فرماتے ہیں کہ لوگ غلط فہمی کا شکار نہ ہوں اور دشمن کی پروپیگنڈا مشینری انہیں دھوکہ نہ دے کہ امام حسین علیہ السلام بھی دوسروں کی مانند ہیں اور مختلف جگہوں پر خروج کرتے ہیں، صرف اس لیے کہ اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیں، خود نمائی، عیاشی اور ظلم و فساد برپا کرنے کے لیے میدانِ جنگ میں قدم رکھتے ہیں؛ آپؑ فرماتے ہیں کہ ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے بلکہ ’’وَإِنَّمَا خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْاِصْلَاحِ فِي أُمَّةِ جَدِّي صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم‘‘ میں صرف اپنے جدّ بزرگوار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت کی اصلاح کے لیے میدانِ عمل میں آیا ہوں، میں فقط اصلاح کرنا چاہتا ہوں۔ یہ وہ واجب تھا کہ جسے امام حسین علیہ السلام سے پہلے کسی نے بھی انجام نہیں دیا تھا۔

یہ اصلاح ’’خروج‘‘ کے ذریعے ہی ممکن ہے، خروج یعنی قیام اور امام حسین علیہ السلام نے اپنے اِس وصیت نامے میں اِس بات کی نشاندہی کی ہے اور تقریباً واضح طور پر اِس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ سب سے پہلے ہم قیام کرنا چاہتے ہیں اور ہمارا یہ قیام بھی اصلاح کی خاطر ہے، نہ اس لیے کہ حتماً حکومت اور اقتدار ہمارے ہاتھ آجائے اور

نہ ہی اِس لیے کہ ہم جا کر صرف شہید ہونا چاہتے ہیں، ہرگز ایسا نہیں ہے؛ بلکہ ہم تو صرف اصلاح چاہتے ہیں۔ البتہ یہ جو اصلاح کا کام ہے یہ بھی کوئی چھوٹا اور معمولی کام نہیں ہے؛ کیونکہ اس قسم کی تحریکوں کے دوران کبھی حالات اور شرائط ایسے پیش آ جاتے ہیں کہ انسان حکومت تک پہنچ جاتا ہے اور زمامِ اقتدار کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے اور کبھی وہ یہ کام نہیں کر سکتا، یعنی یہ ناممکن ہو جاتا ہے، بلکہ وہ خود ہی شہید ہو جاتا ہے۔ جبکہ دونوں صورتوں میں اس کا قیام اصلاح کے لیے ہوتا ہے۔ اسی لیے امامؑ فرماتے ہیں:

''أُرِيْدُ أَنْ آمُرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَأَنْهَى عَنِ الْمُنْكَرِ وَأَسِيْرُ بِسِيْرَةِ جَدِّی ﷺ وَأَبِي عَلِيّ بْنِ أَبِيْطَالِبٍ علیہ السلام ...''[1]

اصلاح کا ایک مصداق یہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔

امام حسین علیہ السلام نے مکہ سے دو گروہوں کے نام خطوط لکھے ہیں، ایک خط قبائلِ بصرہ کے سرداروں کے نام اور دوسرا خط قبائلِ کوفہ کے سرداروں کے نام لکھا ہے۔ قبائلِ بصرہ کے سرداروں کے نام آپؑ تحریر فرماتے ہیں:

''وَقَدْ بَعَثْتُ رَسُوْلِي إِلَيْكُمْ بِهَذَا الْكِتَابِ وَإِنِّي أَدْعُوْكُمْ إِلٰى كِتَابِ اللهِ وَ إِلٰى نَبِيِّهِ، فَإِنَّ السُّنَّةَ قَدْ أُمِيْتَتْ، وَإِنَّ الْبِدْعَةَ قَدْ أُحْيِيَتْ فَإِنْ تُجِيْبُوا دَعْوَتِي وَ تُطِيْعُوا أَمْرِي أَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ''[2]

"میرا نمائندہ میرا یہ خط لے کر تمہارے پاس آیا ہے اور میں تم لوگوں کو کتابِ خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ بے شک سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زندہ

---

[1] میں خود نمائی، عیاشی اور ظلم و فساد برپا کرنے کے لیے خروج نہیں کر رہا ہوں، بلکہ میں تو صرف اپنے نانا کی اُمت کی اصلاح کے لیے خروج کر رہا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ امر بالمعروف کروں اور نہی عن المنکر انجام دوں اور میں اپنے نانا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اپنے بابا علی مرتضیٰ علیہ السلام کی سیرت کے مطابق قدم اُٹھانا چاہتا ہوں۔ (بحار الانوار، ج۴۴، ص۳۲۹)

[2] بحار الانوار، ج۴۴، ص۳۴۰

درگور کر دیا گیا ہے اور زمانۂ جاہلیت کی بدعتوں کو زندہ کر دیا گیا ہے، اگر تم میری دعوت پر لبیک کہتے ہوئے میری پیروی کرو تو میں تم کو راہِ راست کی ہدایت کروں گا۔"

یعنی میں اپنی اِس عظیم ذمہ داری پر عمل کرتے ہوئے اسلام، سنتِ رسول اکرم ﷺ اور اسلامی نظام کو زندہ کرنا چاہتا ہوں، بدعتوں کا خاتمہ اور رسول اکرم ﷺ کی سنت کا احیاء کرنا چاہتا ہوں۔ اِس کے بعد کوفہ کے سرداروں کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:

''فَلَعَمْرِیْ مَا الْاِمَامُ اِلَّا الْحَاکِمُ بِالْکِتَابِ اَلْقَائِمُ بِالْقِسْطِ اَلدَّائِنُ بِدِیْنِ الْحَقِّ وَ الْحَابِسُ نَفْسَهُ عَلَی ذَالِکَ لِلّٰہِ''[1]

"امامؑ صرف وہی ہے جو کتابِ الٰہی کے مطابق حکومت کرے، عدل و انصاف کو قائم کرے، ملک، معاشرے اور قانون کی حق کی طرف راہنمائی کرے اور خود صراطِ مستقیم اور راہِ خدا پر گامزن رہ کر اپنے نفس کی حفاظت کرے۔"

اسلامی معاشرے کا امام اور پیشوا ایسا شخص نہیں بن سکتا، جو فاسق و فاجر ہو، خیانت کار ہو، فسادی ہو اور بُرے و قبیح اعمال کو انجام دینے والا ہو؛ بلکہ اسلامی معاشرے کا حاکم، امام اور پیشوا اس کو ہونا چاہیے جو کتابِ خدا پر عمل کرنے والا ہو اور معاشرے میں لوگوں کے سامنے کتابِ خدا کے احکام پر عمل کرے، نہ کہ کسی بند کمرے میں نمازیں پڑھنے والا ہو۔

اسلامی معاشرے کے حاکم کو چاہیے کہ کتابِ خدا کے احکامات کو معاشرے پر لاگو کرے، عدل اور سماجی انصاف کے نظام کو نافذ کرے اور حق کو معاشرے کا قانون قرار دے: ''اَلدَّائِنُ بِدِیْنِ الْحَقِّ'' یعنی حق کو معاشرے کا آئین اور قانون قرار دیتے ہوئے باطل کو نکال کر پھینک دے: '' اَلْحَابِسُ نَفْسَهُ عَلَی ذَالِکَ لِلّٰہِ'' اِس جملے کا ظاہری معنی یہ ہے کہ خدا کے راستے میں جس طرح بھی ہو اپنی حفاظت کرے اور شیطانی و مادی جلوؤں اور رنگینیوں کا اسیر نہ ہو۔

---

[1] بحار الانوار، ج۴۴، ص۳۳۴

پس امام حسین علیہ السلام کے اِس خط سے بھی آپؑ کے مقصد اور ہدف کا پتہ چلتا ہے۔ امام حسین علیہ السلام نے مکہ سے روانگی کے بعد، راستے میں مختلف مقامات پر مختلف انداز میں گفتگو فرمائی ہے۔ جب آپؑ کا قافلہ ”بیضہ“ نامی مقام پر پہنچا تو حرّ ابن یزید بھی آپؑ کے ساتھ چل رہا تھا۔ آپؑ نے اِس مقام پر تھوڑی دیر آرام فرمانے سے پہلے یا آرام کرنے کے بعد کھڑے ہو کر دشمن کے لشکر سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

’’أَيُّهَا النّاسُ! اِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: «مَنْ رَأَى سُلْطَاناً جَائِراً مُسْتَحِلّاً لِحُرُمِ اللّٰهِ، نَاكِثاً لِعَهْدِ اللّٰهِ، وَمُخَالِفاً لِسُنَّةِ رَسُولِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، يَعْمَلُ فِي عِبَادِ اللّٰهِ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ثُمَّ لَمْ يُغَيِّرْ بِقَوْلٍ وَلَا فِعْلٍ كَانَ حَقّاً عَلَى اللّٰهِ أَنْ يُدْخِلَهُ مَدْخَلَهُ‘‘[1]

”اے لوگو! رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ جو شخص کسی جابر و ظالم حاکم کو دیکھے جو حرامِ خدا کو حلال جانتا ہو، قانونِ خدا کو توڑنے والا ہو، سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مخالف اور مخلوقِ خدا میں گناہ و سرکشی سے حکومت کرنے والا ہو، تو پھر وہ اپنے قول و فعل سے اس کے خلاف حکمتِ عملی اختیار نہ کرے تو خداوند عالم اِس سکوت و جمود اور خاموشی اختیار کرنے والے شخص کا ٹھکانہ، اُس ظالم سلطان کے ساتھ قرار دے گا۔“

یعنی اگر کوئی یہ دیکھے کہ معاشرے میں ایسا حاکم برسرِ حکومت ہے جو لوگوں پر ظلم و ستم کر رہا ہے، حرامِ خدا کو حلال قرار دے رہا ہے اور حلالِ خدا کو حرام بنا رہا ہے اور اُس نے حکمِ الٰہی کو پسِ پشت ڈال رکھا ہے اور دوسرے افراد کو بھی عمل نہ کرنے پر مجبور کر رہا ہے، لوگوں میں گناہ اور ظلم و دشمنی کو فروغ دیتا ہے اور اُس زمانے میں ظالم اور جابر حاکم کا کامل ترین مصداق یزید تھا۔

’’لَمْ يُغَيِّرْ بِقَوْلٍ وَلَا فِعْلٍ‘‘ اپنی زبان و عمل سے اس کے خلاف اقدام نہ کرے تو ’’كَانَ حَقّاً عَلَى اللّٰهِ أَنْ يُدْخِلَهُ مَدْخَلَهُ‘‘ تو اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ قیامت کے دن سکوت و جمود اختیار کرنے والے اِس بے عمل شخص کو اُسی ظالم شخص کے ساتھ ایک

---

[1] بحار الانوار، ج۴۴، ص۳۸۲

ہی جگہ رکھے۔

پس پیغمبر اسلام ﷺ نے پہلے سے بیان کر دیا تھا کہ اگر اسلامی نظام، انحراف کا شکار ہو جائے تو کیا کام کرنا چاہیے، امام حسین علیہ السلام نے پیغمبر اکرم ﷺ کے اسی قول کو اپنی تحریک کی بنیاد قرار دیا۔

پس تو پھر اِن حالات میں کیا ذمہ داری بنتی ہے؟ ذمہ داری یہ بنتی ہے کہ ''یُغَيِّرُ بِقَوْلٍ وَ فِعْلٍ''؛ یعنی اپنی زبان اور عمل سے اقدام کرے۔ اگر انسان ایسے حالات کا مشاہدہ کرے تو شرائط و حالات کو دیکھ کر اقدام کرے، اُس پر واجب ہے کہ ظالم و جابر حاکم کے عمل کے جواب میں قیام کرے۔ وہ اِس قیام و اقدام میں جس قسم کے حالات سے دوچار ہو، قتل ہو جائے یا زندہ رہے یا ظاہراً اسے کامیابی ملے، یا نہ ملے، اِن تمام حالات میں قیام اس کی ذمہ داری ہے۔ یہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اِن حالات میں قیام کرے اور یہ وہ ذمہ داری ہے کہ جسے حضرت ختمی مرتبت ﷺ نے بیان فرمایا ہے۔

اِس کے بعد امام حسین علیہ السلام نے فرمایا: ''وَ اَنِّي اَحَقُّ بِهٰذَا'' میں اِس قیام کا باقی تمام مسلمانوں سے زیادہ سزاوار ہوں، کیونکہ میں فرزندِ پیغمبر ﷺ ہوں۔ اگر پیغمبر اکرم ﷺ نے حالات کی تبدیلی، یعنی اِس قیام کو ایک ایک مسلمان پر واجب کیا ہے، تو ظاہر ہے کہ حسین ابن علی علیہما السلام جو فرزندِ رسول خدا ﷺ اور آپؑ کے علم و حکمت کے وارث بھی ہیں، اِس قیام کے لیے دوسروں سے زیادہ مناسب ہیں۔ پس امام حسین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے اسی لیے قیام کیا ہے اور وہ اپنے قیام کے علل و اسباب کو بیان فرما رہے ہیں۔

''عُذیب'' نامی مقام پر جب چار افراد آپؑ سے آ ملے، تو آپؑ نے فرمایا:

''أَمَا وَاللهِ اِنِّي لَأَرْجُو أَنْ يَكُونَ خَيْراً مَا اَرَادَ اللهُ بِنَا قُتِلْنَا أَوْ ظَفِرْنَا''[۲]

''کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کامیابی ہمارے قدم چومے یا ہم راہِ خدا میں قتل کر دیئے

---

[۱] بحار الانوار، ج۴۴، ص۳۸۲

[۲] خدا کی قسم! جو کچھ اللہ نے ہمارے لیے مقرر کیا ہے وہ ہمارے لیے صرف خیر و برکت ہی ہے، خواہ قتل کر دیئے جائیں یا کامیاب ہو جائیں۔ (اعیان الشیعہ، ج۱، ص۵۹۷)

جائیں۔‘‘

امام حسین علیہ السلام کا یہ ارشاد ہمارے اِس بیان کی تائید ہے کہ ذمہ داری کی ادائیگی میں حکومت مل جائے یا درجۂ شہادت پر فائز ہوں، ذمے داری کو ہر صورت میں ادا کرنا ہے۔ آپؑ نے یہی فرمایا کہ خدا وند عالم نے جس چیز کو ہمارے لیے مقرر فرمایا ہے، اسی میں ہماری بہتری اور بھلائی ہے۔ ہم اپنی ذمہ داری کو ادا کر رہے ہیں، خواہ اِس راہ میں قتل کر دیئے جائیں یا کامیاب ہو جائیں۔ سرزمینِ کربلا پر قدم رکھنے کے بعد آپؑ نے اپنے پہلے خطبے میں ارشاد فرمایا:

’’إِنَّهُ قَدْ نَزَلَ مِنَ الْاَمْرِ مَا قَدْ تَرَوْنَ‘‘

اِس کے بعد آپؑ نے مزید فرمایا:

’’أَلَا تَرَوْنَ إِلَى الْحَقِّ لَا يُعْمَلُ بِهِ وَإِلَى الْبَاطِلِ لَا يُتَنَاهٰى عَنْهُ لِيَرْغَبِ الْمُؤْمِنُ فِي لِقَاءِ رَبِّهِ حَقّاً حَقّاً ...‘‘[۱]

پس امام حسین علیہ السلام نے ایک ایسے واجب کو ادا کرنے کے لیے قیام فرمایا، جو ہر زمانے اور ہر تاریخ میں تمام مسلمانوں کو اپنی طرف بلا رہا ہے اور یہ واجب عبارت ہے اِس بات سے کہ مسلمان جب اس بات کا مشاہدہ کریں کہ اسلامی معاشرے کا نظام ایک بنیادی خرابی کا شکار ہو گیا ہے اور اس کے تمام اسلامی احکامات کو خطرہ لاحق ہے، تو ایسے حالات میں ہر مسلمان پر قیام کرنا واجب ہے۔

البتہ یہ قیام مناسب حالات اور شرائط میں واجب ہوتا ہے، یعنی قیام کرنے والا یہ جانتا ہو کہ قیام اثر بخش ہوگا۔ اِس کے علاوہ قیام کرنے والے کا زندہ رہنا، قتل نہ ہونا، یا مشکلات و مصائب کا سامنا نہ کرنا، یہ شرائط میں سے نہیں ہیں۔ لٰہذا امام حسین علیہ السلام نے قیام کیا اور عملاً اِس واجب کو انجام دیا تاکہ رہتی دنیا کے لیے ایک درس ہو۔

---

[۱] اب نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ تم خود دیکھ رہے ہو، کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ حق پر عمل نہیں کیا جا رہا ہے اور باطل سے دوری اختیار نہیں کی جا رہی ہے؟ ایسے وقت میں مومن کا چاہیے کہ وہ اللہ سے ملاقات کے لیے مشتاق رہے۔ (بحار الانوار، ج۴۴، ص۳۸۱)

(۰۹-۰۶-۱۹۹۵ء)

امام حسین علیہ السلام نے ایک ایسا کام کر دکھایا کہ جس سے لوگوں کے ضمیر جاگ گئے۔ لہٰذا آپ نے دیکھا کہ امامؑ کی شہادت کے بعد، یکے بعد دیگرے کئی اسلامی تحریکیں وجود میں آگئیں، لیکن اِن تحریکوں کو کچل دیا گیا۔ دشمن کی طرف سے کسی تحریک کو کچل دیا جانا، کوئی اہم بات نہیں ہے؛ البتہ یہ تلخ ضرور ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ تلخ بات یہ ہے کہ کوئی معاشرہ اس منزل پر پہنچ جائے کہ وہ اپنے دشمن کے مقابلے میں کسی بھی قسم کا ردِعمل ظاہر کرنے کی صلاحیت ہی کھو دے اور یہ بات ایک معاشرے کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔

امام حسین ابن علی علیہما السلام نے ایک ایسا کام انجام دیا جو آج بھی زندہ و پائندہ ہے، وہ یہ کہ طاغوتی حکومتوں کے دور میں بھی کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے، جو زمانے کے اعتبار سے اوائلِ اسلام سے فاصلہ رکھنے کے باوجود، امام حسن علیہ السلام کے دور میں ظالم و جابر حکومت سے مقابلہ کرنے والے لوگوں سے بھی زیادہ عزم و ارادے کے مالک تھے۔ مگر اِن تمام تحریکوں کو کچل دیا گیا۔ آپ اہلِ مدینہ کے قیام پر غور کیجئے جو "واقعۂ حرّہ" کے نام سے مشہور ہے اور بعد کے واقعات اور توابین و مختار کے قیام تک اور اس کے بعد بنو اُمیہ اور بنو عباس کے ادوار تک مختلف قوموں کے درمیان جو مختلف تحریکیں وجود میں آتی رہیں، اِن تمام تحریکوں کا بانی کون تھا؟ یقیناً حسین ابن علی علیہما السلام ہی تھے۔ اگر امام حسین علیہ السلام قیام نہ فرماتے، تو کیا معاشرے سے سستی، کاہلی اور اپنی ذمہ داریوں سے فرار کی عادت، ظلم کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے اور ذمہ داریوں کو قبول کرنے کی عادت میں تبدیل ہو سکتی تھی؟

ہم یہ کیوں کہتے ہیں کہ اس معاشرے میں ذمہ داریوں کو قبول کرنے کی حِسّ مر چکی تھی؟ اِس کی دلیل یہ ہے کہ جب امام حسین علیہ السلام مدینہ منورہ، جو اسلام کی عظیم اور بزرگ ہستیوں کا مرکز تھا، سے مکہ تشریف لے گئے تو اُس وقت ابن عباس، ابن زبیر، ابن عمر اور اوائل اسلام کے خلفاء کے بیٹے، سب مدینہ میں موجود تھے لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی اِس خونین اور تاریخی قیام میں امام حسین علیہ السلام کا ساتھ دینے

کے لیے تیار نہیں ہوا۔

پس قیامِ امام حسین علیہ السلام کے آغاز سے پہلے خواصؒ بھی (اِس سلسلے میں) کوئی قدم اُٹھانے کے لیے تیار نہ تھے، لیکن امام حسین علیہ السلام کے قیام کے بعد ظلم سے نفرت کی روح زندہ ہو گئی۔ یہ وہ عظیم درس ہے جسے واقعۂ کربلا کے دوسرے دروس کے ساتھ ہمیں یاد رکھنا چاہیے۔ اِس واقعہ کی عظمت یہ ہے۔

اور یہ جو کہا گیا ہے کہ ''اَلْمَوْعُوْدُ بِشَهَادَتِهِ قَبْلَ اِسْتِهْلَالِهِ وَوِلَادَتِهِ'' یا امام حسین علیہ السلام کی ولادت با سعادت سے قبل ''بَكَتْهُ السَّمَآءُ وَمَنْ فِيْهَا وَالْاَرْضُ وَمَنْ عَلَيْهَا''[1] کہا گیا ہے؛ یہ لوگوں کو امام حسین علیہ السلام کے اِس عظیم غم اور عزاء اور اس کے خاص احترام کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور ان دعاؤں اور زیارت کی تعبیرات میں ان پر گریہ کیا گیا ہے، تو ان سب کی وجہ بھی یہی چیز ہے۔

لہٰذا آج جب آپ اسلام کو پھلتا پھولتا دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اسلام کو امام حسین علیہ السلام ہی نے زندہ کیا ہے اور آپؑ ہی اسلام کے محافظ ہیں۔

(۲۶۔۰۱۔۱۹۹۳ء)

---

[1] وہ شخص جس کی ولادت سے پہلے اس کی شہادت کی نوید سنائی گئی، جس پر آسمان اور اس میں موجود مخلوق اور زمین اور اس پر موجود تمام چیزوں نے گریہ کیا۔ (بحار الانوار، ج۴۴، ص۳۷۴)

زینب کبری
سلام الله علیها

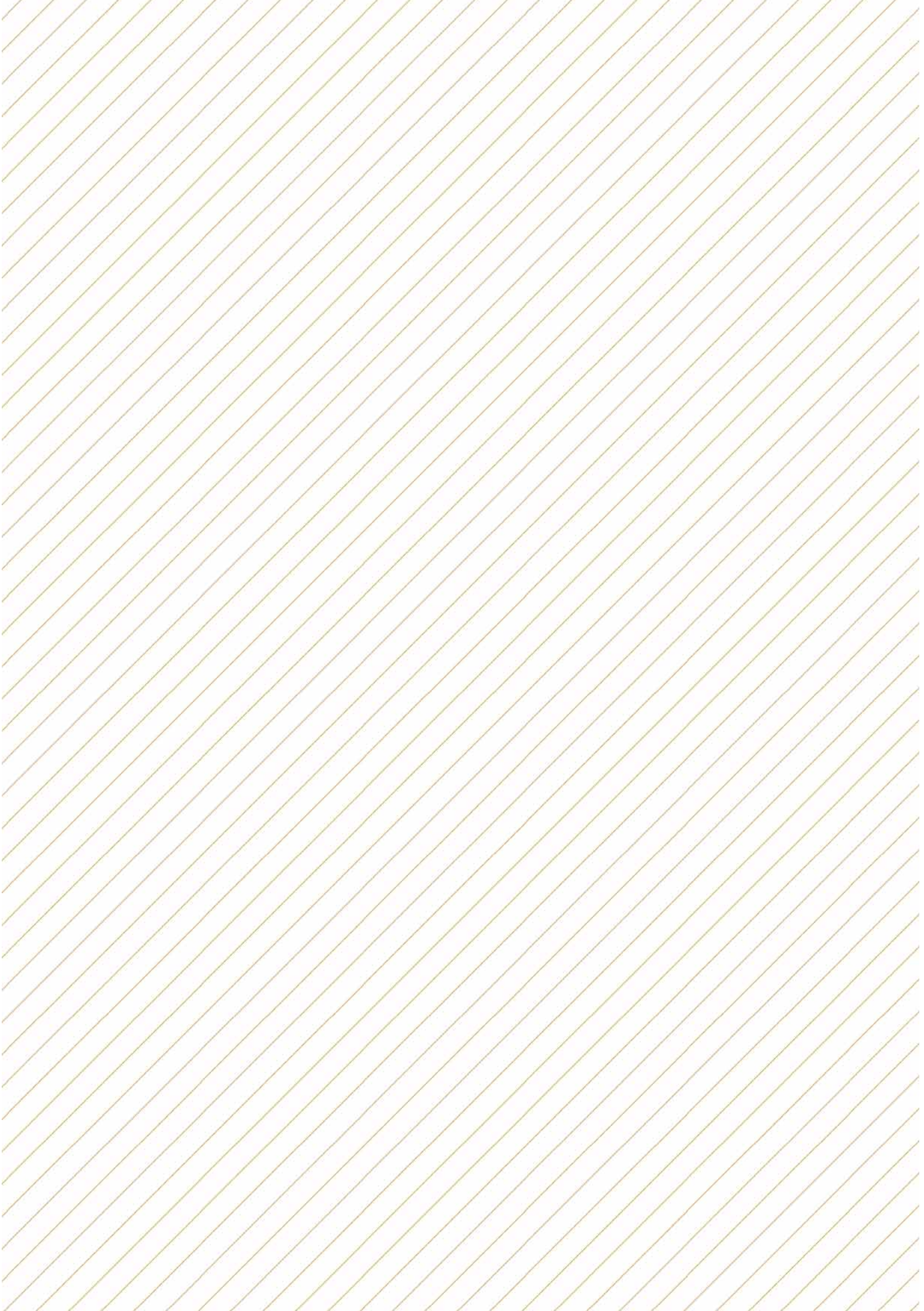

زینب کبریٰؑ کی تحریک

زینب کبریٰؑ ایک عظیم خاتون ہیں۔ مسلمانوں کی نظر میں اِن عظیم خاتون کو جو عظمت حاصل ہے وہ کس وجہ سے ہے؟ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آپؑ کو یہ عظمت اِس لیے حاصل ہے کہ آپؑ علی ابن ابیطالبؑ کی بیٹی اور حسنینؑ کی بہن ہیں۔ (کیونکہ صرف یہ) نسبتیں ہرگز ایسی عظمت کا سبب نہیں بن سکتیں۔ ہمارے باقی ائمہ طاہرینؑ کی بھی بیٹیاں، مائیں اور بہنیں تھیں، لیکن اُن میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے۔ زینب کبریٰؑ جیسی کون ہے؟

زینب کبریٰؑ کی اہمیت اور آپؑ کی عظمت، آپؑ کی عظیم اسلامی اور انسانی تحریک اور موقف کی وجہ سے ہے، جسے آپؑ نے الٰہی فریضے کی بنیاد پر انجام دیا۔ آپؑ کے کام، آپؑ کے فیصلے اور آپؑ کی تحریک کی نوعیت نے، آپؑ کو ایسی عظمت عطا کی ہے۔ (پس) جو خاتون بھی ایسا کام کرے گی اگرچہ وہ امیر المومنینؑ کی بیٹی نہ بھی ہو، تب بھی ایسی عظمت حاصل کر سکتی ہے۔

اِس عظمت کا بہترین حصّہ یہ ہے کہ آپؑ نے پہلے مرحلے میں ہی موقع شناسی کا ثبوت دیا، امام حسینؑ کے کربلا جانے سے پہلے کے موقعہ کو بھی پہچانا اور روزِ عاشورا کے بحرانی موقعہ کو بھی اور امام حسینؑ کی شہادت کے بعد کے دل ہلا دینے والے واقعات کے موقعہ کو بھی پہچانا اور دوسرے مرحلے میں ہر موقع کی مناسبت سے الگ الگ اقدام کا انتخاب کیا اور انہیں اقدامات نے حضرت زینب کبریٰؑ کی شخصیت کو عظیم ترین بنا دیا ہے۔

کربلا کی جانب روانگی سے پہلے، ابنِ عباس اور عبد اللہ ابن جعفر جیسے بزرگان اور صدرِ اسلام کی نامور شخصیات جو فقاہت، شہامت، ریاست اور آقا زادگی کی دعویدار تھیں، وہ بھی شش و پنج کا شکار ہوگئیں تھیں، وہ یہ نہیں سمجھ سکیں کہ انہیں کیا کرنا

چاہیے؟ لیکن حضرت زینب کبریٰ علیہاالسلام کسی شش و پنج کا شکار نہیں ہوئیں۔ بلکہ وہ سمجھ گئیں کہ آپؑ کو اس راستے کا انتخاب کرنا چاہیے اور اپنے امامؑ کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے اور آپؑ امام حسین علیہ السلام کے ساتھ چلی گئیں۔ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ آپؑ نہ جانتی ہوں کہ یہ راستہ بہت سخت ہے۔ بلکہ آپؑ دوسروں سے بہتر اِس بات کو محسوس کر رہی تھیں۔ آپؑ ایک خاتون تھیں، جو اپنے فریضے کی ادائیگی کے لیے اپنے شوہر اور اپنے خاندان سے دور ہو رہی تھیں، اس بناء پر اپنے چھوٹے بچوں اور نوجوان بیٹوں کو اپنے ساتھ لیا۔ آپؑ محسوس کر رہی تھیں کہ کیسا حادثہ رونما ہو سکتا ہے۔

ایسے بحرانی حالات میں، جب طاقتور ترین مرد حضرات بھی نہیں سمجھ سکتے کہ اِنہیں کیا کرنا چاہیے، لیکن آپؑ اپنا فریضہ سمجھ گئیں اور اپنے امامؑ کی حمایت کرتے ہوئے آپؑ کو شہادت کے لیے تیار کیا، امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد جب دنیا تاریک ہو گئی، دل و جان اور آفاقِ عالم پر اندھیرا چھا گیا، تو یہ عظیم خاتون روشنی بن کر چمکنے لگیں۔ حضرت زینب علیہاالسلام اُس منزل پر فائز ہو گئیں کہ جہاں تک تاریخ بشریت کے صرف بلندترین افراد یعنی انبیاء علیہم السلام ہی پہنچ سکتے ہیں۔

(۱۳۔۱۱۔۱۹۹۱ء)

یقیناً اگر حضرت زینب علیہاالسلام نہ ہوتیں تو واقعۂ کربلا باقی نہ رہتا اور نہ ہی زینب کبریٰ علیہاالسلام کے بغیر عاشور کا واقعہ اتنا عام ہوتا اور تاریخ میں زندہ و جاوید بن کر اُبھرتا؛ واقعۂ عاشورا کے آغاز سے آخر تک علی علیہ السلام کی بیٹی زینب عُلیا مقام علیہاالسلام کی شخصیت اور کردار اتنا نمایاں ہے کہ انسان یہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ ایک خاتون کے لباس اور علی علیہ السلام کی بیٹی کی صورت میں، ایک دوسرا حسینؑ ہے۔

قطعِ نظر اس کے کہ اگر حضرت زینب علیہاالسلام نہ ہوتیں تو عاشور کے بعد کیا ہوتا، شاید امام زین العابدین علیہ السلام بھی شہید کر دیئے جاتے، شاید امام حسین علیہ السلام کا پیغام کہیں بھی نہ پہنچتا۔

امام حسینؑ کی شہادت سے پہلے بھی جناب زینب سلام اللہ علیہا آپؑ کے لیے ایک ایسے سچے غمخوار کی مانند تھیں کہ ان کی موجودگی میں امام حسینؑ کبھی بھی تنہائی اور تھکاوٹ کا احساس نہیں کرتے تھے۔ انسان ایسے کردار کو حضرت زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا کے مقدّس چہرے، آپؑ کے فرمودات اور آپؑ کے کردار میں مشاہدہ کر سکتا ہے۔

زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا کربلا کی شیر دل خاتون

دو مرتبہ جناب زینب سلام اللہ علیہا نے کسی حدّ تک بے چینی کا احساس کیا اور امام حسینؑ کے پاس جا کر اپنی اِس بے چینی کا اظہار بھی کیا۔ ایک مرتبہ مکہ سے کربلا جاتے ہوئے، کسی ایک منزل پر جب حضرت مسلم ابن عقیلؑ کی شہادت سے متعلق مختلف خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ حضرت زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا بھی آخر ایک عورت تھیں، وہ (بھی صنفِ نازک کی طرح) زنانہ جذبات رکھتی تھیں اور لطیف زنانہ احساسات کی مالک تھیں؛ بلکہ جذبات اور احساسات کا اصلی مظہر تو یہی خاندانِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ تمام تر طاقت، قدرت، شجاعت اور مصائب و مشکلات کے مقابلے میں ڈٹ جانے کے باوجود، انسانی نفاست، پاکیزگی اور انسانی ترحُّم کا جوش مارتا ہوا سرچشمہ بھی تو یہی خاندان ہے۔ ہم امام حسینؑ کی مثال پیش کرتے ہیں، وہ حسینؑ جو پوری دنیا کے مقابلے میں کھڑے ہو جاتے ہیں یا ایک صحراء میں بھرے بھیڑیوں کے مقابلے میں کھڑے ہونے سے نہیں گھبراتے، لیکن یہی شخص کبھی بعض چھوٹی چھوٹی چیزوں کے مقابلے میں منقلب ہو جاتے ہیں؛ مثلاً اُس وقت جب ایک حبشی غلام زخمی ہو کر زمین پر گر گیا، شاید وہ ابوذر غفاری کا غلام ”جون“ تھا، جو امامؑ کے چاہنے والوں اور آپؑ کے ارادتمندوں میں سے تھا۔ اجتماعی اور معاشرتی حوالے سے اُس دور کے مسلمانوں میں غلام کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا اور نہ ہی خاندانی لحاظ سے کسی اعلیٰ خاندان سے اس کا تعلق تھا۔

عاشور کے دن کربلا کے میدان میں امام حسینؑ کے رکاب میں بڑے بڑے لوگوں نے اپنی جان کے نذرانے پیش کیے، جیسے حبیب ابن مظاہر، زُہیر ابن قین اور دیگر شہدائے کربلا جن کا شمار کوفہ کے بزرگوں میں ہوتا تھا، ان میں سے کسی ایک

کی شہادت پر بھی امام حسین علیہ السلام نے ایسا ردِّعمل ظاہر نہیں کیا تھا، جو ردِّعمل اِس حبشی غلام کی شہادت پر دکھایا۔ جب مسلم ابن عوسجہ زخمی ہو کر زمین پر گر پڑے تو آپؑ نے مسلم ابن عوسجہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ” ان شاء اللہ تم اللہ تعالیٰ سے اس کا اجر پاؤ گے۔“ لیکن جب یہ حبشی غلام زمین پر گرتا ہے کہ جس کی نہ کوئی اولاد ہے اور نہ ہی اِس کا کوئی رشتہ دار اِس پر رونے والا ہے تو، امام حسین علیہ السلام آگے بڑھتے ہیں اور اِس غلام کے ساتھ وہی کچھ کرتے ہیں، جو آپؑ نے حضرت علی اکبر علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا؛ یعنی امام حسین علیہ السلام اِس غلام کے سرہانے زمین پر بیٹھ گئے اور اس کے خون آلود سر کو اپنے زانو پر رکھا، لیکن امامؑ کے دل کو تب بھی سکون نہیں ملا اور سب نے یہ منظر دیکھا کہ ایک مرتبہ امام عالی مقامؑ نے اپنے چہرۂ مبارک کو ”جون“ کے خون آلود چہرے پر رکھا۔ یوں انسانی ہمدردی اور احساس کا ایک عجیب منظر سامنے آگیا!

لہٰذا حضرت زینب سلام اللہ علیہا نے ایک عورت کی حیثیت سے لطیف زنانہ احساسات کے ساتھ، نہ کہ ایک عام عورت کی حیثیت سے، بلکہ امام حسین علیہ السلام کی بہن اور ایک ایسی بہن جو دل و جان سے اپنے بھائی کو چاہتی ہے، ایک ایسی بہن جو اپنے شوہر اور اپنے گھربار کو چھوڑ کر امام حسین علیہ السلام کے ساتھ آگئی ہے اور وہ بھی تنہا نہیں آئی، بلکہ اپنے ساتھ اپنے دونوں بیٹوں عونؑ و محمدؑ کو بھی لے آئی ہے، تاکہ وہ ان کے ساتھ رہیں اور جب اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربانی کی ضرورت پڑے تو انہیں قربان کر سکیں۔

لیکن اِس کے باوجود جناب زینب سلام اللہ علیہا نے جب راستے میں ایک منزل پر خطرے کا احساس کیا تو امام حسین علیہ السلام کے پاس جا کر عرض کیا: بھائی جان! مجھے خطرے کی بو آرہی ہے، حالات خطرناک لگ رہے ہیں۔ اگرچہ آپؑ جانتی تھیں کہ جانوں کے نذرانے پیش کرنے ہیں اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی ہیں؛ لیکن اِس کے باوجود اِس حد تک دباؤ میں آ جاتی ہیں کہ امام حسین علیہ السلام سے رجوع کرتی ہیں، اِس موقع پر امام حسین علیہ السلام آپؑ سے کوئی تفصیلی گفتگو نہیں کرتے، بلکہ امامؑ فرماتے ہیں کوئی بات نہیں، اللہ جو چاہے وہی ہوگا، یعنی آپؑ نے تقریباً اِس قسم کا ایک جملہ کہا: ”مَا شَاءَ اللّٰهُ كَانَ“[1]

---

[1] ۱۔ الکافی، ج۲، ص۵۳۰

جو اللہ چاہے گا وہ ہو کر رہے گا۔ اس کے بعد تاریخ میں ہمیں کچھ نہیں ملتا ہے کہ حضرت زینب علیہا السلام نے امام حسین علیہ السلام سے حالات کے متعلق کچھ کہا ہو یا کوئی سوال کیا ہو یا اپنے چہرے سے کسی قسم کی پریشانی کا اظہار کیا ہو۔ سوائے شبِ عاشور کے۔

شبِ عاشور کے ابتدائی حصّے کے بارے میں بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اِس موقع پر بھی حضرت زینب کبریٰ علیہا السلام شدّتِ غم سے بے چین ہوئیں، اِس واقعے کے راوی خود امام زین العابدین علیہ السلام ہیں جو اُس وقت بیمار تھے، آپؑ فرماتے ہیں: میں اپنے خیمے میں لیٹا ہوا تھا اور میری پھوپھی زینب علیہا السلام میری تیمارداری میں مشغول تھیں، ہمارے ساتھ والے خیمے میں میرے بابا امام حسین علیہ السلام تشریف فرما تھے۔ آپؑ کے خیمے میں جناب ابوذر کا غلام ”جون“ آپؑ کی تلوار کو صیقل کر رہا تھا اور اس کی دھار سدھار رہا تھا، گویا امامؑ کل کی جنگ کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہے تھے۔

امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں: ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ امام حسین علیہ السلام نے زیرِ لب کچھ اشعار پڑھنا شروع کیے اور ایک شعر پڑھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ: دنیا نے اپنا رُخ موڑ لیا ہے اور زندگی انسان سے وفا نہیں کرتی اور موت نزدیک ہے:

”یَا دَھْرُ اُفٍّ لَکَ مِنْ خَلِیْلِ
کَمْ لَکَ بِالْاِشْرَاقِ وَالْاَصِیْلِ“[۱]

یہ اِس بات کی علامت ہے کہ جو شخص یہ شعر پڑھ رہا ہے اُسے یقین ہے کہ وہ بہت ہی جلد اِس دنیا سے رخصت ہونے والا ہے۔ امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں: جب میں نے یہ شعر سنا تو اس کے معنی اور مفہوم کو بھی سمجھ گیا، یعنی میں جان گیا کہ امام حسین علیہ السلام اپنی شہادت کی خبر دے رہے ہیں؛ لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ مگر پھوپھی زینب علیہا السلام یہ سن کر پریشان ہو گئیں اور اُٹھ کر بھائی کے خیمے میں چلی گئیں اور امام حسین علیہ السلام سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں: بھائی جان! میں سن رہی ہوں کہ آپؑ

۱۔ اے زمانے! تُف ہو تیری دوستی پر! تو اپنے بہت سے دوستوں کو صبح و شام موت کے سپرد کر دیتا ہے۔
(بحار الانوار، ج۴۴، ص۳۱۶)

اپنی شہادت کی خبر دے رہے ہیں۔ جب بابا شہید ہوئے، تو ہم نے کہا کہ ہمارے بھائی موجود ہیں اور جب بھائی حسنؑ شہید ہوئے تو ہم نے کہا: ہمارے بھائی حسینؑ موجود ہیں اور کئی سالوں سے آپؑ ہی کے بھروسے پر جی رہے ہیں اور آج میں دیکھ رہی ہوں کہ آپؑ بھی اپنی شہادت کی خبر دے رہے ہیں۔

کربلا میں حضرت زینبؑ کا کردار

البتہ پریشان ہونا حضرت زینبؑ کا حق بھی بنتا ہے۔ میں تصوّر کر سکتا ہوں کہ اُس دن حضرت زینب کبریٰؑ کی جو حالت تھی وہ ایک استثنائی حالت تھی؛ کسی بھی عورت، یہاں تک کہ خود امام زین العابدینؑ کی حالت کا بھی زینب کبریٰؑ سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ حضرت زینبؑ کی حالت انتہائی سخت اور طاقت فرسا تھی۔ (قافلے میں شامل) تمام مرد عاشور کے دن شہید کر دیئے گئے تھے۔ عصرِ عاشور ان خیموں میں امام زین العابدینؑ کے علاوہ کوئی مرد باقی نہیں بچا تھا اور امام زین العابدینؑ بھی بستر بیماری پر پڑے ہوئے تھے اور شاید بےہوشی کی حالت میں تھے۔

اب ایسے حالات میں آپ سوچئے کہ اس خیمہ گاہ میں تقریبا ۸۴ عورتیں اور بچے بھی موجود تھے، جنہیں چاروں طرف سے دشمن کے ایک جمِّ غفیر نے گھیر رکھا تھا؛ انہیں کس قدر توجہ اور حمایت کی ضرورت تھی، جبکہ ان میں سے کوئی بھوکا ہو اور کوئی پیاسا، بلکہ یہ کہا جائے کہ سب کے سب بھوکے اور پیاسے ہوں اور سب خوف زدہ اور پریشان حال ہوں۔ ان کے شہیدوں کے لاشے زمینِ کربلا پر پامال شدہ بکھرے پڑے ہوں؛ کسی کے بھائی، کسی کے بیٹے (اور کسی کے دوسرے اعزاء و اقرباء)۔ بہر حال یہ ایک انتہائی تلخ اور وحشتناک واقعہ ہے جسے صرف ایک ہی شخصیت نے آگے بڑھ کر سنبھالا تھا اور وہ شخصیت حضرت زینب کبریٰؑ کی تھی۔

صرف ایسا نہیں تھا کہ جناب زینب کبریٰؑ نے اپنے بھائی کو کھو دیا ہو یا اپنے دو بیٹوں یا اپنے دیگر بھائیوں اور عزیز و اقارب یا بنو ہاشم کے اُٹھارہ جوانوں اور اپنے

(بھائی کے) باوفا اصحاب و انصار کو کھو دیا ہو، ان حالات کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک اہم حقیقت تھی اور شاید اس کی اہمیت اس سے کسی بھی لحاظ سے کم بھی نہ تھی، وہ یہ کہ اتنے سارے دشمنوں کی موجودگی میں اِس شکست خوردہ اور منتشر قافلے کی دیکھ بھال کی ذمہ داری آپؑ کے کاندھوں پر تھی، یہاں تک کہ خود امام زین العابدینؑ کی دیکھ بھال بھی آپؑ ہی کے ذمہ تھی۔

لہٰذا اِن چند گھنٹوں کے درمیان، یعنی واقعۂ عاشور کے بعد سے لے کر یہ طے ہونے تک کہ دشمن اس لٹے ہوئے قافلے کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتا ہے؛ یعنی اِس تاریک اور سخت رات کے اِن چند گھنٹوں کے دوران، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ جناب زینبؑ پر کیا گزری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِس دوران حضرت زینبؑ مسلسل مصروف اور بھاگ دوڑ کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ آپؑ کبھی ایک بچے کے پاس جاتی ہیں، تو کبھی کسی ایسی ماں کے پاس پہنچتی ہیں جس کی گود اُجڑ گئی ہے اور کبھی ایسی بہن کے پاس پہنچ جاتی ہیں کہ جس کے سر سے بھائی کا سایہ چھینا گیا ہے، گویا آپؑ مسلسل مصروف ہیں، ان سب کو جمع کرتی ہیں اور ان کی حوصلہ افزائی کرتی اور انہیں تسلّی دیتی ہیں۔

لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ حضرت زینبؑ کا حوصلہ جواب دے جاتا ہے۔ آپؑ اپنے اُس بھائی کی (مقتل گاہ کی) طرف رُخ کرتی ہیں جو آپؑ کی واحد پناہ گاہ تھے۔ روایت میں ہے کہ حضرت زینبؑ آتی ہیں اور اپنے بھائی کے پامال شدہ لاشے کے سرہانے کھڑی ہو جاتی ہیں اور دل کی گہرائیوں کے ساتھ فریاد کرتے ہوئے کہتی ہیں:

''یَا مُحَمَّدَاهُ صَلَّی عَلَیکَ مَلَائِکَةُ السَّمَآءِ''

''اے نانا جان! آپ ﷺ پر آسمان کے فرشتے درود و سلام بھیجتے ہیں۔''

''هَذَا الْحُسَینُ مُرَمَّلٌ بِالدِّمَآءِ''[١]

---

[١] اللہوف، سید ابن طاؤس، ص١٣٣

> ”یہ آپؑ کا پیارا حسینؑ ہے جو خاک و خوں میں غلطاں کربلا کی گرم ریت پر پڑا ہوا ہے۔“

(۱۲-۱۰-۱۹۸۴ء)

یہ جو کہا جاتاہے کہ عاشور وہ دن ہے جب کربلا میں خون نے تلوار پر فتح حاصل کی۔ یہ ایک حقیقت ہے اور یہ فتح اور کامیابی حضرت زینبؑ کی وجہ سے نصیب ہوئی تھی؛ ورنہ یہ خون کربلا میں ختم ہو چکا تھا اور یہ جنگ کربلا کے میدان میں بظاہر حق کی شکست کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ لیکن جو چیز اِس ظاہری شکست کو ایک دائمی فتح و کامرانی میں تبدیل کرنے کا سبب بنی، وہ حضرت زینب کبریٰؑ کی ذاتِ بابرکت تھی۔ اِس واقعے میں حضرت زینبؑ نے جو کردار ادا کیا وہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

اِس واقعے نے یہ ثابت کر دیا کہ عورت تاریخ کے حاشیے پر نہیں، بلکہ تاریخ کے اہم واقعات کے اصلی متن کا حصّہ ہے۔ قرآن مجید نے بھی متعدّد مقامات پر اِس نکتے کی جانب اشارہ کیا ہے؛ لیکن یہ واقعہ گزشتہ اُمتوں سے مربوط کسی دور کا واقعہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک زندہ اور قابلِ ادراک واقعہ ہے، جہاں انسان یہ مشاہدہ کرتا ہے کہ حضرت زینبؑ ایک حیرت انگیز اور تابناک عظمت کے ساتھ میدان میں اُترتی ہیں اور ایک ایسا کارنامہ انجام دیتی ہیں کہ جس کی بناء پر وہ دشمن جو اپنے مخالفین کا قلع قمع کرکے، سر پر فتح کا تاج پہن کر اپنی کامیابی اور فتح کے نقّارے بجا رہا تھا، اسے اپنے ہی شہر، اپنے محل اور اپنے دار الحکومت میں ذلیل و رسوا ہونا پڑا اور حضرت زینبؑ نے اس کی پیشانی پر ذلّت اور رسوائی کا ایک ایسا دائمی داغ لگا دیا کہ اس کی فتح اور کامرانی، شکست میں تبدیل ہو کر رہ گئی، یہی حضرت زینبؑ کا کارنامہ ہے۔ آپؑ نے اپنے اِس عمل سے پوری دنیا پر واضح کر دیا کہ خواتین کے حجاب اور پاکدامنی کو مجاہدانہ وقار اور عظیم جہاد میں کس طرح سے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

حضرت زینب کبریٰؑ کے خطبات

حضرت زینب کبریٰؑ کے جو خطبات اور فرمودات ہم تک پہنچے ہیں، ان سے بھی آپؑ کی تحریک کی عظمت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بازارِ کوفہ میں آپؑ کا ناقابلِ فراموش خطبہ کوئی معمولی خطبہ نہیں ہے، یہ کسی عظیم شخصیت کا معمولی اظہارِ خیال نہیں ہے، بلکہ اُن سخت اور دُشوار حالات میں اُس دور کے اسلامی معاشرے کے مسائل کا مکمل تجزیہ و تحلیل ہے، جو انتہائی خوبصورت الفاظ، نہایت عمیق اور گہرے مفاہیم کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ آپ حضرت زینبؑ کی شخصیت کی طاقت تو دیکھئے کہ آپؑ کی شخصیت کس قدر طاقتور ہے۔ ابھی دو دن پہلے ایک صحراء میں، آپؑ کے بھائی آپؑ کے قائد اور امامؑ، آپؑ کے عزیز و اقارب، آپؑ کے بیٹوں اور دیگر جوانوں کو نہایت بے رحمی سے شہید کر دیا گیا ہے اور زندہ بچ جانے والے بچوں اور خواتین کی اِس چھوٹی سی جماعت کو قیدی بنا لیا گیا ہے اور انہیں بے کجاوہ اُونٹوں پر سوار کر کے ایسے تماشائیوں کے مجمع کے سامنے سے گزارا جا رہا ہے، جس کے بعض لوگ خوشیاں منا رہے ہیں اور کچھ لوگ آنسو بہا رہے ہیں، ایسے دل کو لرزا دینے والے حالات میں، اچانک یہ عظمت و وقار کا سورج طلوع ہوتا ہے اور حضرت زینبؑ اسی لب و لہجے میں گفتگو کرتی ہیں، جس انداز میں آپؑ کے والدِ بزرگوار حضرت علیؑ منبرِ خلافت پر متمکن ہو کر اُمتِ اسلامیہ سے خطاب کیا کرتے تھے، اسی اندازِ تخاطب سے، انہیں کلمات سے، اسی فصاحت و بلاغت سے اور انہیں بلند و بالا مفاہیم و مضامین سے کوفے والوں سے یوں مخاطب ہوتی ہیں:

”یَا أَهْلَ الْكُوفَةِ يَا أَهْلَ الْخَتْلِ وَالْغَدَرِ“۔

”اے کوفہ والو! اے بےوفا اور غدار لوگو!“

یعنی اے دھوکہ باز اور بےوفا لوگو! جنہوں نے ہم سے وفاداری کا ڈھونگ رچایا اور شاید خود تمہیں اِس بات کا یقین تھا کہ تم دینِ اسلام اور اہلِ بیت رسولﷺ کے سچے پیروکار ہو؛ لیکن میدانِ امتحان میں تمہارے قدم ڈگمگا گئے اور اِس پُر آشوب اور فتنوں کے دور میں تم نے اِس اندھے پن کا مظاہرہ کیا:

''هَلْ فِيْكُمْ إِلَّا الصَّلِفُ وَالنَّطِفُ وَمَلْقُ الْإِمَاءِ وَغَمْزُ الْأَعْدَاءِ''

''کیا تمھارے اندر بیہودہ گوئی، خود پسندی، جھوٹ، کنیزوں کی سی چاپلوسی اور دشمنوں کی طرح کینہ و عداوت کے سوا بھی کچھ ہے؟''

تمھارے قول و فعل میں تضاد تھا، تم اس دھوکے میں تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ تم آج بھی صاحبِ ایمان ہو، ماضی کی طرح انقلابی ہو، امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے پیرو کار ہو؛ حالانکہ حقیقت اِس کے بالکل برعکس تھی۔ تم اِس آشوب اور فتنے کا مقابلہ نہیں کر سکے، تم اپنے آپ کو اِس سے نجات نہیں دلا سکے:

''مَثَلُكُمْ كَمَثَلِ الَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثاً''[۱]

''تمھاری مثال اُس نادان عورت کی سی ہے جس نے اپنے دھاگے کو مضبوط طریقے سے کاتنے کے بعد اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔''

تم اُس عورت کی طرح ہوگئے جو اُون کاتتی ہے، اسے دھاگے میں تبدیل کرتی ہے، پھر اِن دھوگوں کو دوبارہ کھولتی ہے اور انھیں ٹکڑوں میں تبدیل کر دیتی ہے۔ تم نے اپنی بےبصیرتی، حالات کی نزاکت کے عدمِ ادراک اور حق و باطل کے فرق کو نہ پہچانے کی وجہ سے، اپنے ماضی کے کارناموں پر پانی پھیر دیا ہے۔ تم بظاہر تو ایمان کا دعوی کرتے ہو، اپنے انقلابی ہونے کا ڈھونگ رچاتے ہو؛ لیکن اندر سے بالکل کھوکھلے ہو اور کوئی بھی تیز ہوا کا جھونکا تمھارے پائے ثبات میں لغزش پیدا کر سکتا ہے۔

یہ اُس دور کی مشکلات کا مکمل تجزیہ ہے، جو جناب زینب کبریٰ علیہا السلام نے اپنے خطبے میں بیان فرمایا ہے۔ حضرت زینب علیہا السلام اُن دُشوار اور کٹھن حالات میں اِس زورِ بیان اور اِن پختہ الفاظ سے گفتگو کر رہی تھیں اور آپؑ کے سامنے کوئی معمولی سامعین نہیں بیٹھے ہوئے تھے، جو آرام و اطمینان سے آپؑ کی گفتگو کو سن رہے ہوں اور حضرت زینب علیہا السلام ایک معمولی خطیب کی طرح اُن کے سامنے خطبہ دے رہی ہوں، نہیں! بلکہ

---

[۱] بحار الانوار، ج۴۵، ص۱۰۹

آپؑ کے سامنے دشموں کا مجمع تھا۔ آپؑ نیزہ بردار دشمنوں کے نرغے میں تھیں۔ اُن کے علاوہ اِس مجمع میں کچھ دوغلے کردار کے مالک افراد بھی موجود تھے، یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے جنابِ مسلمؑ کو عبید اللہ ابن زیاد کے حوالے کیا تھا، جنھوں نے امام حسین علیہ السلام کو ہزاروں خط لکھے اور انہیں کوفہ آنے کی دعوت دی تھی اور پھر بےوفائی کا مظاہرہ کیا تھا، یہ وہ لوگ تھے کہ جس دن انہیں ابنِ زیاد کا مقابلہ کرنا چاہیے تھا، اُس دن یہ اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے تھے۔ بازارِ کوفہ میں اِنہیں لوگوں کا مجمع تھا، البتہ کچھ ضعیف النفس افراد بھی موجود تھے، جو مولائے کائنات امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی بیٹی کو اسیر دیکھ کر آنسو بہا رہے تھے۔

حضرت زینب سلام اللہ علیہا کا سامنا ایسے ناقابلِ اعتماد اور مختلف الاوصاف افراد سے تھا، اِس کے باوجود آپؑ اِس انداز میں گفتگو فرماتی ہیں، آپؑ ایک تاریخ ساز خاتون ہیں؛ یہ کوئی کمزور خاتون نہیں ہیں؛ ایک ایسی خاتون ہیں جن کو کمزور نہیں کیا جا سکتا۔ ایک صاحبِ ایمان خاتون کا زنانہ جوہر، مشکل حالات میں اِسی طرح ظاہر ہوتا ہے، یہ خاتون ایک اعلیٰ مثال اور اعلیٰ نمونہ ہیں؛ پوری دنیا کے بڑے بڑے مردوں اور خواتین کے لیے بہترین مثال ہیں۔ یہ خاتون نبویؐ اور علویؑ انقلاب کو لاحق ہونے والی آفتوں کا تجزیہ و تحلیل کرتی ہیں اور اہلِ کوفہ سے مخاطب ہوتے ہوئے یہ کہتی ہیں کہ تم فتنے اور آشوب کے دور میں حق کو نہیں پہچان سکے، تم اپنی ذمہ داریاں ادا نہیں کر سکے؛ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سر نوکِ نیزہ پر بلند کیا گیا۔ حضرت زینب سلام اللہ علیہا کی عظمت کو یہاں سے سمجھا جا سکتا ہے۔

(۲۱۔۰۴۔۲۰۱۰ء)

اسیری کے دوران امام زین العابدین علیہ السلام کا کردار

واقعۂ عاشورا کے بعد شیعوں اور نظریۂ امامت کے پیروکاروں کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ تھی۔ بنو اُمیہ کے وحشی مزدوروں نے کربلا، کوفہ اور شام میں خاندانِ نبوتؑ کے ساتھ

جو سلوک روا رکھا تھا، اُس نے پیروانِ امامت کو خوف زدہ کر دیا تھا۔ امام حسینؑ کے قریبی دوست و اصحاب، واقعۂ کربلا اور اس کے بعد توابین کی تحریک میں شہید ہو چکے تھے۔ جو لوگ بچ گئے تھے ان میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ یزید اور مروان جیسے ظالم و جابر حکمرانوں کے سامنے کھڑے ہو کر حق بات کہہ سکیں۔

شیعوں اور مومنین کی ایک مختصر تعداد موجود تو تھی، لیکن وہ انتہائی غیر منظّم اور منتشر تھے، ان کے درمیان کوئی تنظیم موجود نہیں تھی، سب وحشت زدہ اور بہت سے امامت کے راستے سے ہی منحرف ہو چکے تھے۔ یہ وہ میراث تھی جو شیعوں کی طرف سے امام زین العابدینؑ کے حصّے میں آئی تھی۔ گھٹن کا ماحول تھا، افرادی قوّت کی انتہائی کمی تھی؛ ایسے حالات میں امام زین العابدینؑ کو حقیقی اسلام اور مکتبِ محمدیؐ کی حفاظت کے لیے کچھ ایسے مدبّرانہ اور انقلابی اقدامات کرنے کی ضرورت تھی کہ جن کے نتیجے میں اِن بکھرے ہوئے لوگوں کو دوبارہ ایک پلیٹ فارم پر جمع کرکے انہیں علویؑ حکومت، یعنی حقیقی اسلامی حکومت کی تشکیل کے لیے تیار کر سکیں۔ ایسے حالات میں امام زین العابدینؑ نے چونتیس سال زندگی بسر کی۔

میں یہاں پر امام زین العابدینؑ کی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں کو آپ (قارئین) کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے چوتھے امام حضرت زین العابدینؑ کی زندگی کا افتخار آمیز دور، آپؑ کی اسیری کا دور ہے۔ البتہ امام زین العابدینؑ دو مرتبہ اسیر ہوئے اور دونوں مرتبہ آپؑ کو طوق و زنجیر میں جکڑ کر شام لے جایا گیا۔ پہلی مرتبہ کربلا سے اور دوسری مرتبہ عبد الملک بن مروان کے زمانے میں مدینہ سے گرفتار کیا گیا۔ جب کربلا سے گرفتار کرکے قافلۂ حسینیؑ کے دوسرے اسیروں کے ساتھ آپؑ کو شام لے جایا گیا تو آپؑ مجسمۂ قرآن اور اسلام تھے۔

جب شہدائے کربلا خاک و خوں میں غلطاں ہوئے، تب امام زین العابدینؑ کی تحریک کا آغاز ہوا۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں، معصوم بچے، بے سہارا عورتیں، امامؑ کے ارد گرد جمع تھیں۔ اِس کاروان میں امام زین العابدینؑ کے علاوہ کوئی دوسرا مرد نہیں تھا، امامؑ تنہا ہی ان سب کی راہنمائی کر رہے تھے، انہیں جمع کرتے تھے، یہاں تک کہ

اسیروں کے شام پہنچنے تک پورے راستے میں ان کی دیکھ بھال کرتے رہے اور ان لوگوں کو جو ایمان کے رشتے میں جڑے ہوئے تھے، ایک لمحے کے لیے بھی شک و تردید میں مبتلا نہ ہونے دیا۔

جب امام زین العابدین علیہ السلام کوفے میں داخل ہوئے تو عُبید اللہ بن زیاد، جس نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ اِس خاندان کے تمام مردوں کو قتل کر دیا جائے، نے دیکھا کہ اسیروں کے قافلے میں ایک مرد بھی موجود ہے؛ اس نے پوچھا: تم کون ہو؟ امامؑ نے فرمایا: میں علی ابن حسین علیہما السلام ہوں۔ اس نے امامؑ کو قتل کی دھمکی دی۔ یہ پہلا موقع تھا جب امام زین العابدین علیہ السلام نے امامت اور معنویت کے جوہر دکھاتے ہوئے فرمایا: ''أَ بِالْقَتْلِ تُهَدِّدُنِي''[1] کیا تو ہمیں موت سے ڈراتا ہے؟ جبکہ ہم تو شہادت کو اپنے لیے کرامت اور راہِ خدا میں قتل ہونا باعثِ افتخار سمجھتے ہیں، ہم موت سے نہیں ڈرتے ہیں، امامؑ کے اِس سخت موقف کے سامنے عُبید اللہ کو خاموش ہونا پڑا۔

شام میں جہاں امام زین العابدین علیہ السلام کو مسلسل کئی دن تک اسیروں کے ساتھ قید رکھ کر آپؑ کے ساتھ انتہائی ناگفتہ بہ سلوک روا رکھا گیا تھا۔ یزید نے سوچا کہ امام زین العابدین علیہ السلام کو (اسیری کی حالت میں) اپنے ساتھ مسجد میں لے جائے، تاکہ لوگوں کے سامنے امامؑ کو نفسیاتی اعتبار سے کمزور کر سکے اور کوئی ایسا کام کرے کہ اِس کے مخالفین اور امامؑ کے چاہنے والے جو ہر جگہ موجود تھے، وہ اِس کی حکومت کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں۔

اِس موقع پر امام زین العابدین علیہ السلام نے یزید سے مخاطب ہو کر کہا: اجازت دو تو میں بھی اِن لکڑیوں پر چڑھ کر ان لوگوں سے کچھ باتیں کروں۔ یزید سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ فرزندِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ایک ایسا جوان جو اسیر بھی ہے اور بیمار بھی، جو اِس پوری مدت میں جسمانی اور نفسیاتی طور پر کافی کمزور بھی ہو چکا ہے، وہ اس کے لیے کسی قسم کا کوئی خطرہ پیدا کر سکتا ہے۔ یزید نے امام عالی مقامؑ کو اجازت دی۔ آپؑ منبر پر تشریف لے گئے اور لوگوں کے سامنے فلسفۂ امامت اور واقعۂ کربلا کو بیان کرتے ہوئے، بنو اُمیہ کی حکومت کی

---

[1] بحار الانوار، ج۴۵، ص۱۱۸

سیاہ کاریوں کو خود انہیں کی حکومت کے مرکز میں فاش کر دیا۔ (یعنی) امامؑ نے ایک ایسا کام کر دیا کہ اہلِ شام میں بغاوت کے آثار ظاہر ہونے لگے۔

یعنی امام زین العابدین علیہ السلام ایک ایسی عظیم شخصیت ہیں کہ جو عُبید اللہ ابنِ زیاد اور شام کے فریب خوردہ لوگوں کے جلسۂ عام میں، یزید کے حکومتی کارندوں کی موجودگی میں بغیر کسی خوف کے حقائق سے پردہ اُٹھاتے ہوئے حق اور سچ بات کہہ دیتے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ آپؑ کی نظر میں زندگی کی کوئی اہمیت نہ ہو۔

(۰۵-۱۲-۱۹۸۰ء)

امام زین العابدین علیہ السلام نے اسیری اور بیماری کے باوجود، کسی عظیم مردِ مجاہد کی طرح اپنے قول و فعل کے ذریعے شجاعت و دلیری کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔ اِس دوران آپؑ کا طرزِ عمل، آپؑ کی عام زندگی سے بالکل مختلف نظر آتا ہے۔ امام زین العابدین علیہ السلام کی زندگی کے اصلی دور میں آپؑ کی حکمتِ عملی، مستحکم بنیاد پر بڑے ہی جچے تُلے انداز میں نرم روی کے ساتھ، اپنے مقصد کی طرف آگے بڑھنا ہے، حتیٰ کہ بعض اوقات آپؑ عبد الملک ابن مروان کے ساتھ نہ صرف ایک محفل میں بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں، بلکہ اُس کے ساتھ آپؑ کا رویّہ بھی نرم نظر آتا ہے۔ جبکہ اس مختصر مدّت (ایامِ اسیری) میں آپؑ کے اقدامات بالکل کسی پُرجوش انقلابی کی مانند نظر آتے ہیں، جس کے لیے کوئی معمولی سی بات بھی برداشت کر لینا ممکن نہ ہو، لوگوں کے سامنے بلکہ بھرے مجمع میں بھی مغرور اور اقتدار کے نشے میں بدمست دشمن کو دندان شکن جواب دینے میں کسی طرح کا تامل نہیں کرتے۔

کوفہ کا درندہ صفت خونخوار حاکم، عُبید اللہ ابن زیاد جس کی تلوار سے خون ٹپک رہا ہے، جو فرزندِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے اعوان و انصار کا خون بہا کر مست ہو چکا ہے اور کامیابی کے نشے میں بالکل چُور ہے، اُس کے مقابلے میں آپؑ ایسا بے باک اور سخت لب و لہجہ اختیار کرتے ہیں کہ ابنِ زیاد آپؑ کے قتل کا حکم جاری کر دیتا ہے، اس وقت اگر جناب زینب سلام اللہ علیہا ڈھال بن کر آپؑ کے سامنے آکر یہ نہ کہتیں کہ میں اپنے جیتے جی ایسا ہرگز نہ ہونے دوں گی اور ایک عورت کے قتل کا مسئلہ درپیش نہ ہوتا، نیز یہ

کہ آپؑ کو قیدی کی حیثیت سے دربارِ شام میں پیش کرنا مقصود نہ ہوتا، تو عجب نہیں کہ ابنِ زیاد امام زین العابدینؑ کے خون سے بھی اپنے ہاتھ رنگین کر لیتا۔

بازارِ کوفہ میں آپؑ اپنی پھوپھی جناب زینبؑ اور اپنی بہن جناب سکینہؑ کی آواز میں آواز ملا کر خطبہ ارشاد فرماتے ہیں، لوگوں میں جوش و خروش پیدا کرتے ہیں اور حقیقتوں کا انکشاف کرتے ہیں۔

اسی طرح شام میں چاہے وہ یزید کا دربار ہو یا مسجد میں لوگوں کا بےپناہ ہجوم، آپؑ بڑے ہی واضح الفاظ میں دشمن کی سازشوں سے پردہ اُٹھا کر حقائق کا برملا اظہار کرتے ہیں؛ چنانچہ آپؑ کے ان تمام خطبوں اور تقریروں میں اہل بیتؑ کی حقانیت، خلافت کے سلسلے میں ان کا استحقاق اور یزیدی حکومت کے جرائم اور ظلم و زیادتی کا پردہ چاک کرتے ہوئے، نہایت ہی تلخ اور درشت لب و لہجہ میں غافل اور ناواقف عوام کو جھنجھوڑنے اور بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہاں اِن خطبوں کو نقل کرکے امامؑ کے جملوں کی گہرائی پیش کرنے کا وقت نہیں، کیونکہ یہ خود ایک مستقل کام ہے اور اگر کوئی شخص اِن خطبوں کی تشریح و تفسیر کرنا چاہتا ہے تو اُس کے لیے ضروری ہے کہ اِن بنیادی حقائق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، ایک ایک لفظ کی تحقیق اور چھان بین کرے۔ یہ ہے امام زین العابدینؑ کی اسارت اور قید و بند کی زندگی جو جرأت و ہمت اور شجاعت و دلاوری سے معمور نظر آتی ہے۔

اسیری کے بعد امام زین العابدینؑ کا کردار

ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سی وجوہات تھیں جن کے پیشِ نظر امام زین العابدینؑ کے موقّف میں ایسی تبدیلی پیدا ہو گئی کہ اب قید سے چھوٹ کر آپؑ نہایت ہی نرم روی کا مظاہرہ کرتے ہیں، تقیہ سے کام لیتے ہیں۔ اپنے تُند و تیز انقلابی اقدامات پر دعا اور نرم روی کا پردہ ڈال دیتے ہیں، تمام اُمور بڑی خاموشی کے ساتھ انجام دیتے ہیں؛ جبکہ قید و بند کے عالم میں آپؑ نے ایسے دلیرانہ عزائم اور مخاصمت آمیز

اقدامات کا اظہار فرمایا ہے؟

تو اِس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک استثنائی دور تھا، یہاں امام زین العابدین علیہ السلام کو فرائضِ امامت کی ادائیگی اور حکومتِ الٰہی و اسلامی کی تشکیل کے لیے مواقع کی فراہمی کے ساتھ، عاشورا میں بہنے والے بے گناہوں کے خون کی ترجمانی بھی کرنی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہاں سید الساجدین علیہ السلام کے دَہنِ اقدس میں ان کی اپنی زبان نہ تھی، بلکہ شمشیر سے خاموش کر دی جانے والی امام حسین علیہ السلام کی زبان، اس وقت کوفہ و شام کی منزلوں سے گزرنے والے اِس انقلابی جوان کو ودیعت کر دی گئی تھی۔

چنانچہ اِس منزل پر اگر امام زین العابدین علیہ السلام خاموش رہتے اور اس جرأت و ہمت اور جواں مردی و بیباکی کے ساتھ حقائق کی وضاحت کرکے، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی نہ کر دیتے، تو آئندہ آپؑ کے مقاصد کی تکمیل کی تمام راہیں مسدود ہو کر رہ جاتیں؛ کیونکہ یہ امام حسین علیہ السلام کا جوش مارتا ہوا خون ہی تھا جس نے نہ صرف آپؑ کے لیے میدان ہموار کر دیا، بلکہ تاریخ تشیع میں جتنی بھی انقلابی تحریکیں برپا ہوئی ہیں ان سب میں خونِ حسین علیہ السلام کی گرمی شامل نظر آتی ہے۔ چنانچہ امام زین العابدین علیہ السلام سب سے پہلے لوگوں کو موجودہ صورتِ حال سے خبردار کر دینا ضروری سمجھتے ہیں، تاکہ آئندہ اپنے اسی عمل کے سائے میں، بنیادی، اصولی، عمیق، متین اور ایک طویل حکومت اور باطل مخالف تحریک کا سلسلہ شروع کر سکیں اور ظاہر ہے کہ تُند و تیز زبان استعمال کیے بغیر لوگوں کو متنبّہ اور ہوشیار کرنا ممکن نہ ہوتا۔

اِس قید و بند کے سفر میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کا کردار، جناب زینب علیہا السلام کے کردار سے بالکل ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ دونوں کا مقصد حسینیؑ انقلاب اور پیغامات کی تبلیغ و اشاعت ہے۔ اگر لوگ اِس بات سے واقف ہو جائیں کہ امام حسین علیہ السلام قتل کر دیئے گئے، کیوں قتل کر دیئے گئے؟ اور کس طرح قتل کیے گئے؟ تو آئندہ اسلام اور اہلِ بیت علیہم السلام کی دعوت ایک نیا رنگ اختیار کر لے گی، لیکن اگر عوام اِن حقیقتوں سے ناواقف رہ گئے تو انداز کچھ اور ہوگا۔

لٰہذا معاشرے میں اِن حقائق کو عام کر دینے اور صحیح طور پر حسینیؑ انقلاب کی پہچان کروانے کے لیے، اپنا تمام سرمایہ بروئے کار لاکر جہاں تک ممکن ہو سکے اِس کام کو انجام دینا ضروری تھا۔ چنانچہ امام زین العابدین علیہ السلام کا وجود، نہ صرف جناب سکینہ علیہا السلام، جناب فاطمہ صغریٰ علیہا السلام اور جناب زینب علیہا السلام کی مانند، بلکہ ایک ایک قیدی کی مانند (اپنی اپنی صلاحیت کے اعتبار سے) اپنے اندر ایک پیغام لیے ہوئے ہے۔ ضروری تھا کہ یہ تمام انقلابی قوتیں مجتمع ہو کر غربت و بےکسی میں بہا دیئے جائے والے حسینیؑ خون کی سرخی، کربلا سے لے کر مدینہ تک تمام بڑے بڑے اسلامی مراکز میں پھیلا دیں۔

اور جب امام سجاد علیہ السلام مدینہ میں وارد ہوں، تو لوگوں کی بےچین اور متجسس نگاہوں، چہروں اور زبانوں کے جواب میں آپؑ ان کے سامنے حقائق بیان کریں اور یہ امامؑ کی آئندہ مہم کا اولین نقشہ ہے۔ اسی لیے ہم نے امام زین العابدین علیہ السلام کے اِس مختصر دورِ حیات کو ایک استثنائی دور سے تعبیر کیا ہے۔ اِس مہم کا دوسرا دور اُس وقت شروع ہوتا ہے جب آپؑ مدینۃ الرسولؐ میں ایک محترم شہری کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کرتے ہیں اور اپنے کام کی ابتداء پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر اور آپؐ کے حرم (مسجد النبیؐ) سے کرتے ہیں۔ حضرت امام سجاد علیہ السلام کے آئندہ موقف اور طریقہ کو سمجھنے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کی حالت و کیفیت اور اس کے تقاضوں پر بھی ایک تحقیقی نظر ڈالی جائے، چنانچہ اِس موضوع پر آگے روشنی ڈالیں گے۔[۱]

واقعۂ کربلا کے بعد کے اجتماعی اور سیاسی حالات

جب عاشور کا المناک حادثہ رونما ہوا اور پوری اسلامی دنیا میں جہاں جہاں بھی یہ خبر پہنچی، خصوصاً ائمہ معصومین علیہم السلام کے شیعوں اور طرفداروں میں سے جو عراق اور حجاز میں مقیم تھے، ایک عجیب رُعب و وحشت کی فضا پیدا ہوگئی کیونکہ یہ محسوس کیا جانے لگا کہ یزیدی حکومت اپنی حاکمیت کو مسلط کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے حتیٰ کہ اُس کو عالمِ اسلام کی جانی پہچانی عظیم، مقدّس اور معتبرترین ہستی فرزندِ رسولؐ حسین ابن علی علیہما السلام

---

[۱] پاسدار اسلام، شمارہ ٦

کو بے دردی کے ساتھ قتل کرنے میں بھی کسی طرح کا کوئی دریغ نہیں ہے اور وحشت و دہشت میں جس کے آثار کوفہ اور مدینہ میں کچھ زیادہ ہی نمایاں تھے، جو کچھ کمی رہ گئی تھی وہ اُس وقت پوری ہوگئی جب کچھ ہی عرصہ بعد بعض دوسرے لرزہ خیز حوادث رونما ہوئے، جن میں سرِ فہرست واقعۂ ''حرّہ'' ہے۔

اہل بیت علیہم السلام کے زیرِ اثر علاقوں، یعنی حجاز میں بالخصوص مدینہ اور عراق اور اس سے بھی بڑھ کر کوفہ میں بڑا ہی گھٹن کا ماحول پیدا ہو گیا تھا؛ باہمی روابط اور تعلقات کافی حدّ تک کمزور ہو چکے تھے۔ جو لوگ ائمہ طاہرین علیہم السلام کے طرفدار تھے اور بنو اُمیہ کی خلافت و حکومت کے زبردست مخالفین میں سے شمار ہوتے تھے، بہت ہی کسمپرسی اور شک و شبہ کی حالت میں زندگی بسر کر رہے تھے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک روایت منقول ہے کہ جس میں گزشتہ ائمہ طاہرین علیہم السلام کے دور کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اِرْتَدَّ النَّاسُ بَعْدَ الْحُسَیْنِ إِلَّا ثَلَاثَةً''

یعنی امام حسین علیہ السلام (کی شہادت) کے بعد تین افراد کے علاوہ سارے لوگ مرتدّ ہو گئے تھے۔

ایک روایت میں پانچ اور بعض دوسری روایتوں میں سات افراد تک کا ذکر ملتا ہے۔

ایک اور روایت جو خود امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول ہے جس کے راوی ابو عمر نہدی ہیں۔ امامؑ فرماتے ہیں:

''مَا بِمَكَّةَ وَالْمَدِيْنَةِ عِشْرُوْنَ رَجُلاً يُحِبُّنَا''

"پورے مکہ اور مدینہ میں بیس افراد بھی ایسے نہیں ہیں، جو ہم سے محبت کرتے ہوں۔"

۱۔ بحار الانوار، ج۴۶، ص۱۴۳؛ شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، ج۴، ص۱۰۴

ہم نے یہ دونوں حدیثیں اس لیے نقل کی ہیں کہ اہل بیتِ طاہرین علیہم السلام اور ان کے طرفداروں کے بارے میں عالمِ اسلام کی مجموعی صورتِ حال کا اندازہ لگایا جا سکے۔ دراصل اُس وقت خوف و ہراس کی ایسی فضاء پیدا ہو گئی تھی کہ ائمہ علیہم السلام کے طرفدار متفرّق، پراکندہ اور مایوس و مرعوب زندگی گزار رہے تھے اور اُن کے لیے کسی طرح کی اجتماعی تحریک ممکن نہ تھی۔ البتہ جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام مذکورہ بالا روایت میں ارشاد فرماتے ہیں:

''ثُمَّ إِنَّ النَّاسَ لَحِقُوْا وَكَثُرُوْا''[1]

”پھر آہستہ آہستہ لوگ اہل بیت علیہم السلام سے ملحق ہوتے گئے اور اُن کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔“

اگر یہی مسئلہ جس کا ابھی ہم نے ذکر کیا ہے، ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ: کربلا کا عظیم سانحہ رونما ہونے کے بعد اگرچہ لوگوں کی خاصی بڑی تعداد رُعب و وحشت میں گرفتار ہوگئی تھی، لیکن پھر بھی خوف و ہراس اتنا غالب نہ تھا کہ شیعیانِ اہل بیت علیہم السلام کی پوری تنظیم یکسر درہم برہم ہو کر رہ گئی ہو؛ جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس وقت اسیرانِ کربلا کا لٹا ہوا یہ قافلہ کوفہ میں پہنچتاہے تو کچھ ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جو شیعہ تنظیموں کے وجود کا پتہ دیتے ہیں۔

شیعہ خفیہ تنظیموں کا وجود

البتہ یہاں ہم جو ”شیعوں کی خفیہ تنظیم“ کی بات کرتے ہیں تو اِس سے مراد، موجودہ زمانہ کی طرح سیاسی تنظیموں کی کوئی باقاعدہ منظّم شکل نہیں ہے؛ بلکہ ہمارا مقصد وہ اعتقادی روابط اور تعلقات ہیں جو لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لاکر ایک مضبوط دھاگے میں پرو دیتے ہیں اور پھر لوگوں میں جذبۂ فداکاری پیدا کرکے خفیہ سرگرمیوں پر اُکساتے ہیں،

---

[1] بحار الانوار، ج۴۶، ص۱۴۴

جس کے نتیجے میں انسانی ذہن میں ایک ہم فکر جماعت کا تصوّر پیدا ہو جاتا ہے۔

ان ہی دنوں جب کہ پیغمبر اسلامﷺ کی ذریّت کوفہ میں اسیر تھی، ایک رات اسی جگہ جہاں ان کو قید رکھا گیا تھا، ایک پتھر آکر گرا، اہل بیتؑ اِس پتھر کی طرف متوجہ ہوئے تو دیکھا کہ ایک کاغذ کا ٹکڑا اس کے ساتھ منسلک ہے جس پر کچھ اس طرح کہ عبارت تحریر تھی: ”کوفہ کے حاکم نے ایک شخص کو یزید کے پاس (شام) روانہ کیا ہے تاکہ آپ کے حالات سے باخبر کرے، نیز آئندہ کے بارے میں اُس کا فیصلہ معلوم کرے۔ اب اگر کل رات تک (مثلاً) آپ کو تکبیر کی آواز سنائی دے تو سمجھ لیجئے کہ آپ کو یہیں قتل کر دینے کا فیصلہ ہوا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو سمجھ جائیے گا کہ حالات کچھ بہتر ہیں۔“[1]

جب ہم یہ واقعہ سنتے ہیں تو اِس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اِس تنظیم کے دوستوں یا ممبروں میں سے کوئی شخص ابن زیاد کے دربار میں موجود رہا ہوگا جس کو تمام حالات کی خبر تھی اور قید خانہ تک رسائی بھی رکھتا تھا، حتی کہ اُس کو یہ بھی معلوم تھا کہ قیدیوں کے سلسلے میں کیا فیصلے اور منصوبے تیار کیے جا رہے ہیں اور صدائے تکبیر کے ذریعے وہ اہل بیتؑ کو حالات سے باخبر کر سکتا ہے۔ چناچہ اس شدّتِ عمل کے ساتھ ساتھ جو وجود میں آچکی تھی، اِس طرح کی چیزیں بھی دیکھی جا سکتی تھیں۔

اسی طرح کی ایک مثال عبد اللہ بن عَفیف اَزدی کی ہے، جو ایک نابینا شخص ہیں اور اسیرانِ کربلا کی کوفہ میں آمد کے موقع پر شدید ردِّعمل کا اظہار کرتے ہیں اور نتیجے میں انہیں جامِ شہادت نوش کرنا پڑتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اِس قسم کے افراد کیا کوفہ اور کیا شام، ہر جگہ مل جاتے ہیں جو قیدیوں کی حالت دیکھ کر ان سے محبت کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں اور صرف آنسو بہانے پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ ایک دوسرے کے لیے ملامت کے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں؛ حتی کہ اِس قسم کے واقعات دربارِ یزید اور ابنِ زیاد کی بزم میں بھی پیش آئے ہیں۔

لٰہذا اگرچہ واقعۂ کربلا کے بعد نہایت ہی شدید قسم کا خوف، عوام اور خواصّ پر

---

[1] ۱۔ اِس واقعے کو ابن اثیر نے اپنی تاریخ کی کتاب ''الکامل فی التاریخ'' میں نقل کیا ہے۔ (مصنف)

طاری ہو چکا تھا پھر بھی ابھی اس نے ایسی نوعیت اختیار نہیں کی تھی کہ شیعیانِ اہل بیت علیہم السلام کی تمام سرگرمیاں بالکل مفلوج ہو کر رہ گئی ہوں اور وہ ضعف و پراکندگی کا شکار ہوگئے ہوں؛ لیکن کچھ ہی مدت کے بعد بعض اِس قسم کے مزید حادثات رونما ہوئے جن کی وجہ سے ماحول کی گھٹن میں کچھ اور اضافہ ہو گیا اور یہیں سے امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث ''اِرۡتَدَّ النَّاسُ بَعۡدَ الۡحُسَیۡنِ'' کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔ امامؑ نے غالباً انہیں حادثات کے دوران یا اِن کے بعد کے حالات کی طرف اشارہ فرمایا ہے یا ممکن ہے یہ بات اُس درمیانی وقفہ سے متعلق ارشاد فرمائی ہو جو اِن کے مابین گزرا ہے۔

اِن چند برسوں کے دوران، یعنی اِس عظیم واقعے کے رونما ہونے سے پہلے، شیعہ اپنے اُمور منظّم کرنے اور اپنے درمیان پہلے جیسی ہم آہنگی دوبارہ واپس لانے میں لگے ہوئے تھے۔ اس صورتِ حال کے متعلق طبری اپنے تاثرات کا یوں اظہار کرتا ہے:

''فَلَمۡ یَزَلِ الۡقَوۡمُ فِی جَمۡعِ آلَةِ الۡحَرۡبِ وَالۡاِسۡتِعۡدَادِ لِلۡقِتَالِ''[1]

وہ لوگ (یعنی شیعہ) جنگی ساز و سامان اکٹھا کرنے نیز خود کو جنگ کے لیے آمادہ کرنے میں لگے ہوئے تھے، چپکے چپکے شیعوں اور غیرشیعوں کو حسین ابن علی علیہما السلام کے خون کا انتقام لینے پر تیار کر رہے تھے اور لوگ گروہ در گروہ ان کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ان میں شمولیت اختیار کر رہے تھے اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا، یہاں تک کہ یزید ابن معاویہ واصلِ جہنم ہوا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں باوجود اس کے کہ ماحول میں گھٹن اور سراسیمگی بہت زیادہ پائی جاتی تھی، پھر بھی اِس طرح کی سرگرمیاں اپنی جگہ جاری تھیں؛ جیسا کہ طبری کی عبارت سے پتہ چلتا ہے اور شاید یہی وہ وجہ تھی جس کی بنیاد پر ''جهادالشیعه''[2] کی مؤلّفِہ اگرچہ شیعہ نہیں ہے اور امام زین العابدین علیہ السلام کے سلسلے میں صحیح اور حقیقت کے مطابق نظریات بھی نہیں رکھتی، پھر بھی وہ اِس حقیقت کو درک کر لیتی ہے اور اپنے احساسات اِن الفاظ میں پیش کرتی ہے کہ:

---

[1] تاریخ طبری، ج۵، ص۵۵۸

[2] ڈاکٹر سمیرة مختار اللیثی استاد عین شمس یونیورسٹی، مصر

"شیعہ گروہ نے امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد خود کو باقاعدہ تنظیم کی صورت میں منظّم کر لیا، ان کے اعتقادات اور سیاسی تعلقات انہیں آپس میں مربوط کرتے تھے۔ ان کی جماعتیں اور قائد و رہبر تھے۔ اسی طرح وہ فوجی و عسکری طاقت کے بھی مالک تھے، چنانچہ توابین کی جماعت اِس تنظیم کی سب سے پہلی مظہر ہے۔"

اِن حقائق کے پیشِ نظر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عاشور کے عظیم واقعے کے زیرِ اثر اگرچہ بڑی حدّ تک شیعہ تنظیمیں کمزوری کا شکار ہو گئی تھیں، پھر بھی اِس دوران شیعہ تحریکیں اپنی ناتوانی کے باوجود مصروفِ عمل رہیں، جس کے نتیجے میں پہلے کی طرح دوبارہ خود کو منظّم کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ یہاں تک کہ واقعہ حَرّہ پیش آیا اور میں سمجھتا ہوں واقعۂ حَرّہ تاریخ تشیع میں نہایت اہم موڑ ہے۔ دراصل یہی وہ واقعہ ہے جس نے شیعہ تحریک پر بڑی کاری ضرب لگائی ہے۔

واقعۂ حَرّہ کا پس منظر

واقعۂ حَرّہ تقریباً سال ۶۳ ہجری میں پیش آیا۔ مختصر طور پر اس واقعے کی تفصیل کچھ اِس طرح سے ہیں کہ ۶۳ ہجری میں بنو اُمیہ کا کم تجربہ کار نوجوان مدینہ کا حاکم مقرّر ہوا۔ اس نے خیال کیا کہ شیعیانِ مدینہ کا دل جیتنے کے لیے بہتر ہوگا کہ اِن میں سے کچھ لوگوں کو شام جا کر یزید سے ملاقات کرنے کی دعوت دی جائے، چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ مدینہ کے چند سربرآوردہ افراد، اصحاب اور دیگر معزّزین سے منتخب کیے، جن کی اکثریت امام زین العابدین علیہ السلام کے عقیدت مندوں میں سے شمار ہوتی تھی، اِن لوگوں کو شام جانے کی دعوت دی گئی کہ وہ جائیں اور یزید کا لطف و کرم دیکھ کر اُس سے مانوس ہو جائیں اور اِس طرح اختلافات میں کمی واقع ہو جائے۔

یہ لوگ شام گئے اور انہوں نے یزید سے ملاقات کی۔ چند دن اُس کے مہمان رہے، اِن لوگوں کی خوب پذیرائی کی گئی اور رخصت ہوتے وقت یزید نے ہر ایک کو ایک بڑی رقم (تقریباً پچاس ہزار سے لے کر ایک لاکھ درہم تک) سے نوازا؛ لیکن جیسے ہی یہ لوگ مدینہ واپس پہنچے، چونکہ یزیدی دربار میں پیش آنے والا المیہ انہوں نے

اپنی نظروں سے خود دیکھا تھا، لہٰذا خوب کھل کر یزید پر تنقید شروع کر دی اور نتیجہ بالکل ہی برعکس ظاہر ہوا۔ اِن لوگوں نے یزید کی تعریف و توصیف کرنے کے بجائے ہر خاص و عام کو اُس کے جرائم اور بدکاریوں سے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔

انہوں نے لوگوں سے کہا: یزید کو کس بنیاد پر مسلمانوں کا خلیفہ تسلیم کیا جا سکتا ہے، جبکہ شراب و کباب میں غرق رہنا اور کتوں سے کھیلنا اُس کا بہترین مشغلہ ہے۔ کوئی فسق و فجور ایسا نہیں ہے جو اُس کے یہاں نہ پایا جاتا ہو۔ لہٰذا ہم اُس کو خلافت سے معزول کرتے ہیں۔

عبد اللہ ابن حَنظلہ[1] جو مدینہ کی نمایاں اور محبوب شخصیتوں میں سے تھے، یزید کے خلاف آواز بلند کرنے والوں میں پیش پیش تھے۔ اِن لوگوں نے یزید کو (خلافت سے) معزول کرکے لوگوں کو اپنی طرف دعوت دینی شروع کر دی۔

اِس اقدام کا نتیجہ یزید کی طرف سے براہِ راست ردِّعمل کی صورت میں ظاہر ہوا اور اُس نے اپنے ایک تجربہ کار ظالم بوڑھے سردار مسلم ابن عُقبہ کو چند مخصوص لشکریوں کے ساتھ مدینہ روانہ کیا کہ وہ اِس تحریک کو خاموش کر دے۔ مسلم ابن عُقبہ مدینہ آیا اور چند روز تک اہلِ مدینہ کی قوتِ مقابلہ کو پست کرنے کی غرض سے شہر کا محاصرہ کئے رہا، یہاں تک کہ ایک دن شہر میں داخل ہوا اور اِس قدر قتل و غارت گری مچائی اور اِس قدر ظلم وبربریت کا مظاہرہ کیا کہ تاریخ اسلام میں اِس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

اُس نے مدینہ منورہ میں کچھ ایسا قتل و غارت گری اور ظلم و زیادتی کا بازار گرم کیا کہ اِس واقعے کے بعد اُس کا لقب ہی ''مُسرف''[2] پڑ گیا اور لوگ اسے ''مُسرف ابن عُقبہ'' کے نام سے پکارنے لگے۔ واقعۂ حَرّہ سے متعلق واقعات کی فہرست کافی طویل ہے

---

[1] ۱۔ عبد اللہ جناب حنظلہ کے بیٹے تھے اور حنظلہ وہ جوان ہیں جو اپنی شادی کی پہلی رات صبح ہونے سے پہلے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپاہیوں میں شامل ہوئے اور جنگ اُحد میں منصبِ شہادت پر فائز ہوئے اور ملائکہ نے انہیں غسل دیا اس لیے وہ ''غسیل الملائکۃ'' کے لقب سے مشہور ہیں۔ (مؤلف)

[2] ۲۔ اسراف کرنے والا، فضول خرچ شخص، وہ شخص جو کسی بھی کام میں حد سے زیادہ آگے بڑھ جائے۔

اور میں زیادہ تشریح میں جانا نہیں چاہتا، صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ یہ واقعہ تمام مسلمانوں خصوصاً اہل بیتؑ کے دوستوں اور ہمنواؤں میں بےپناہ خوف و ہراس پیدا کرنے کا سبب بنا۔

مدینہ تقریباً خالی ہو گیا کچھ لوگ بھاگ گئے، کچھ قتل کر دیئے گئے اور اہل بیتؑ کے کچھ مخلص و ہمدرد مثلاً عبد اللہ ابن حنظلہ جیسے لوگ شہید کر دیئے گئے اور ان کی جگہ خالی ہو گئی۔ اِس حادثہ کی پوری خبر اسلامی دنیا میں پھیل گئی اور سب سمجھ گئے کہ اِس قسم کی ہر تحریک کا سدِّ باب کرنے کے لیے حکومت پوری طرح آمادہ ہے اور کسی طرح کے اقدام کی اجازت ہرگز نہیں ہے۔

اِس کے بعد ایک اور حادثہ جو مزید شیعوں کی سرکوبی اور ضعف کا سبب بنا، وہ جناب مختار ثقفی کی کوفہ میں شہادت اور پورے عالمِ اسلام پر عبد الملک ابن مروان کے تسلط کی صورت میں ظاہر ہونا ہے۔ یزید کی موت کے بعد، جو خلفاء آئے ان میں اُس کا بیٹا معاویہ ابن یزید بھی ہے جو تین ماہ سے زیادہ حکومت نہ کر سکا۔ اس کے بعد مروان ابن حکم کے ہاتھ میں اقتدار آیا اور تقریباً دو سال یا اس سے کچھ کم اس نے حکومت کی اور پھر خلافت کی باگ ڈور عبد الملک ابن مروان کے ہاتھ آگئی جس کے لیے مورِّخین کا خیال ہے کہ وہ خلفائے بنو اُمیہ میں زیرک ترین خلیفہ رہا ہے، چنانچہ اُس کے بارے میں مشہور ہے کہ:

’’كَانَ عَبْدُ الْمَلِكِ أَشَدَّهُمْ شَكِيمَةً وَأَمْضَاهُمْ عَزِيمَةً‘‘[1]

عبد الملک پورے عالمِ اسلام کو اپنی مٹھی میں جکڑ لینے میں کامیاب ہو گیا اور خوف و دہشت سے معمور آمرانہ حکومت قائم کر دی۔ حکومت پر مکمل تسلط حاصل کرنے کے لیے عبد الملک کے سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ کہ اپنے تمام رقیبوں کا صفایا کر دے۔ مختار جو شیعیت کی علامت تھے، مصعب ابن زبیر کے ہاتھوں پہلے ہی جام شہادت نوش فرما چکے تھے، لیکن عبد الملک شیعہ تحریک کا نام و نشان مٹانا چاہتا تھا

۱۔ عبد الملک بنو اُمیہ کا (دشمنوں کو سرکوب کرنے میں) سخت ترین اور مصمم ارادہ رکھنے والا خلیفہ تھا۔ (انساب الاشراف، ج۷، ص۲۰۹)

اور اُس نے ایسا ہی کیا۔ اُس کے دور میں عراق خصوصاً کوفہ جو اُس وقت شیعوں کا ایک گڑھ شمار کیا جاتا تھا، مکمل جمود اور خاموشی کی نذر ہوگیا تھا۔[۱]

اگرچہ سن چونسٹھ، پینسٹھ ہجری میں توابین کی تحریک کی وجہ سے (کہ ظاہراً ۶۵ ہجری توابین کی شہادت کا سال ہے) عراق کے گھٹن زدہ ماحول میں ہوا کی ایک تازہ لہر چلنے لگی تھی؛ لیکن ان سب کی شہادت کی وجہ سے، ایک مرتبہ پھر عراق میں خوف و دہشت کے ماحول میں اضافہ ہو گیا اور اس کے بعد جب بنو اُمیہ کی حکومت کے دشمن، یعنی مختار اور مصعب ابن زبیر آپس میں ایک دوسرے کی جان کے در پے ہوئے اور عبد اللہ ابن زبیر مکہ میں ہوتے ہوئے بھی کوفہ میں ایک محبِ اہل بیت علیہم السلام، یعنی مختار کو برداشت نہ کر سکا اور مختار مصعب کے ہاتھوں شہید ہو گئے، تو اِس خوف و دہشت میں مزید اضافہ ہوتا چلا گیا اور اُمیدیں کم ہونے لگیں اور آخر کار جب عبد الملک برسرِاقتدار آیا تو اس نے انتہائی کم مدّت میں ہی پورے عالمِ اسلام کو اپنے زیر نگین کر لیا اور اکیس سال تک پوری طاقت کے ساتھ حکومت کرتا رہا۔

(۱۹۔۰۷۔۱۹۸۶ء)

بہرحال یہ واقعات، کربلا کے عظیم سانحے سے شروع ہوئے اور پھر یکے بعد دیگرے واقعۂ حَرّہ میں اہلِ مدینہ کے قتل و غارت، عراق میں توابین[۲] کی بیخ کنی،

---

[۱] پاسدار اسلام، شمارہ۸

[۲] توابین کی تحریک واقعۂ کربلا کا سب سے پہلا ردِّعمل ہے جو کوفہ میں ظاہر ہوا۔ امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد بعض شیعوں نے ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے باہمی مواخذہ کا سوچا کہ انہوں نے امامؑ کی دعوت پر لبیک کیوں نہ کہا اور مدد کے لیے میدان میں نکلنے سے کیوں گریز کیا؛ چنانچہ انہوں نے محسوس کیا اِس گناہ سے اپنے دامن کو پاک کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ امامؑ کے دشمنوں اور قاتلوں سے آپؑ کے خونِ ناحق کا انتقام لیا جائے، لہذا وہ لوگ کوفہ آئے اور اکابرینِ شیعہ میں سے پانچ افراد کو جمع کرکے اُن سے اِس سلسلے میں گفتگو کی۔ جس کے نتیجے میں سلیمان بن صُرَد خزاعی کی قیادت میں کھلے عام مسلحانہ تحریک کا آغاز کر دیا۔ پچیس ربیع الثانی سال ۶۵ ہجری کی شبِ جمعہ کو یہ لوگ امام حسین علیہ السلام کی قبرِ مبارک پر زیارت کے لیے جمع ہوئے اور اِس طرح فریاد و گریہ کرنا شروع کیا کہ آج تک اِس گریہ و زاری کی مثال نہیں ملتی۔ اِس کے بعد قبرِ امامؑ کو وداع کہہ کر شامی حکومت سے نبرد آزمائی کے لیے شام کا رُخ کیا اور پھر لشکر بنو اُمیہ سے جم کر جنگ ہوئی اور سب کے سب مارے گئے۔ توابین کی تحریک کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ یہ لوگ باوجود اِس کے کہ کوفہ میں تھے پھر بھی شام گئے

جناب مختار ثقفی اور ابراہیم ابن مالک اشتر نخعی، نیز دیگر اکابرینِ شیعہ کی شہادت کا نتیجہ یہ نکلا کہ آزادی کے حصول کی غرض سے ہر تحریک، چاہے وہ مدینہ میں ہو یا کوفہ میں (کیونکہ اُس وقت یہ دونوں شیعوں کے اہم ترین مراکز تھے) کچل کر رکھ دی گئی، شیعت سے متعلق پورے عالمِ اسلام میں ایک عجیب خوف و ہراس پیدا ہو گیا۔ اِس کے بعد بھی جو لوگ ائمہ طاہرینؑ سے وابستہ رہ گئے تھے، اپنی زندگی نہایت ہی غربت و کسمپرسی میں بسر کر رہے تھے۔[1]

لوگوں کی اسلامی و قرآنی تعلیمات سے دوری

اِس خوف و دہشت کے علاوہ ایک اور عامل بھی موجود تھا، وہ پورے عالمِ اسلام کے لوگوں کی ذہنی پستی تھی جو گذشتہ بیس سالوں کے دوران دینی تعلیمات سے مسلمانوں کی دوری کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ دینی اور اعتقادی تعلیمات، قرآنی آیات کی تفسیر اور سنتِ پیغمبرﷺ کے متعلق حقائق و واقعات چالیس ہجری کے بعد، اِن آخری بیس سالوں میں اِس قدر متروک اور بے توجہی کا شکار ہوگئے تھے کہ عام مسلمان اعتقادی اور ایمانی لحاظ سے بالکل کورے اور خالی تھے۔

جب انسان اُس دور کے لوگوں کی زندگی کا بغور مطالعہ کرتا ہے تو تاریخ اور متعدّد روایات سے یہ واضح ہو جاتا ہے۔ البتہ علماء، قُرّاء اور محدّثین موجود تھے، جن کے بارے میں ہم بعد میں عرض کریں گے۔ لیکن عوام الناس کا ایمان اور ان کے عقائد بُری طرح تباہ و برباد ہو کر رہ گئے تھے۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی تھی کہ بعض حکومتی آلہ کاروں نے نبوت پر انگلیاں اُٹھانا شروع کر دیں تھیں! کتابوں میں موجود ہے کہ خالد ابن عبداللہ قسری جو بنو اُمیہ کا ایک انتہائی پست اور گھٹیا قسم کا پٹھو تھا، وہ کہتا تھا:

اور برسرِاقتدار حکومت سے جنگ کی، تاکہ یہ ثابت کر دیں کہ امام حسینؑ کا قاتل کوئی ایک شخص یا چند اشخاص نہیں ہیں، بلکہ یہ حکومتِ وقت ہے جس نے امام حسینؑ کو شہید کیا ہے۔ (مصنف)

[1] پاسدار اسلام، شمارہ۸

’’كَانَ يُفَضِّلُ الْخَلَافَةَ عَلَى النُّبُوَّةِ‘‘

یعنی خلافت نبوّت سے افضل ہے۔

اور وہ اپنے اِس دعویٰ پر دلیل پیش کرتے ہوئے کہتا تھا:

’’أَخَلِيفَتُكَ فِي أَهْلِكَ أَحَبُّ إِلَيْكَ وَآثَرَ عِنْدَكَ أَمْ رَسُولُكَ‘‘[۱]

آپ کسی شخص کو اپنا جانشین بنا کر اپنے گھر والوں کے پاس بٹھاتے ہیں، وہ افضل اور آپ کا قریب تر ہوگا یا وہ شخص جسے کوئی پیغام پہنچانے کے لیے آپ نے کہیں بھیجا ہے؟ معلوم ہے کہ جس شخص کو آپ نے اپنا جانشین بنا کر اپنے گھر میں بٹھایا ہے وہ آپ کا زیادہ قریبی ہوگا۔ پس خلیفۃُ اللہ (یعنی کہ وہ خلیفۂ رسول اللہؐ بھی نہیں کہتے تھے) خود رسولُ اللہ سے بھی افضل ہے!

یہ تو خالد ابن عبد اللہ قسری کہتا تھا اور دوسرے لوگ بھی (اِسی قسم کی باتیں) کرتے تھے۔ میں نے بنو اُمیہ کے دور کے شعراء کے کلام کا مطالعہ کیا ہے۔ عبد الملک کے دور سے شعراء کے کلام میں ’’خلیفۃ اللہ‘‘ کی تعبیر اِس قدر تکرار ہوئی ہے کہ انسان کو یاد ہی نہیں رہتا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھی کوئی خلیفہ ہوتا ہے!

اور یہ سلسلہ بنو عباس کے دورِ حکومت تک چلتا رہا۔

’’بَنِي أُمَيَّةَ هَبُّوا طَالَ نَوْمُكُمْ
إِنَّ الْخَلِيفَةَ يَعْقُوبُ بْنُ دَاوُدَ
ضَاعَتْ خِلَافَتُكُمْ يَا قَوْمِ فَالْتَمِسُوا
خَلِيفَةُ اللهِ بَيْنَ الزِّقِّ وَالْعُودِ‘‘[۲]

---

[۱] الاخبار الطول، ص۳۴۶

[۲] اے بنو اُمیہ! تم لمبی نیند سو گئے ہو اب جاگ جاؤ، یعقوب بن داود خلیفہ بن چکا ہے۔ تمھاری خلافت تباہ و

یہاں تک کہ اگر کوئی خلیفہ کی ہجو و مذمّت کرنا چاہتا تھا تو بھی خلیفۃُ اللہ ہی کہتا تھا! ہر جگہ اس دور کے مشہور شعراء، جیسے جریر، فرزدق، کثیر اور دیگر سینکڑوں مشہور شعراء؛ جب خلیفہ کی تعریف میں کوئی شعر کہتے تھے تو خلیفۃُ اللہ کہتے تھے، خلیفۃُ رسولِ اللہؐ نہیں کہتے تھے؛ یہ ایک نمونہ ہے۔ اسی طرح لوگ دین کے بنیادی عقائد کے بارے میں بھی سستی اور کاہلی سے کام لیتے تھے اور اخلاقی لحاظ سے بھی لوگوں کی حالت انتہائی خراب اور ناگفتہ بہ تھی۔

میں نے ابو الفرج کی کتاب ''الاغانی'' کے مطالعہ کے دوران اِس بات کو نوٹ کیا ہے کہ تقریباً ستّر، اسّی، نوے اور سو ہجری کے دوران اِن پچاس، ساٹھ سالوں میں عالمِ اسلام میں جو بڑے بڑے گلوکار، صدا کار اور ناچ گانے والے اور عیش و عشرت کے شوقین لوگ گزرے ہیں، ان سب کا تعلق یا تو مدینہ سے تھا یا پھر مکہ سے!

شام میں جب بھی خلیفہ کو گانے سننے کا شوق ہوتا تھا تو وہ مدینہ یا مکہ سے کسی مشہور گلوکار، صدا کار یا ڈھول بجانے والے کو بلواتا تھا۔ بدترین اور فحش اشعار کہنے والے شعراء مکہ اور مدینہ میں رہتے تھے۔ نزولِ وحی اور اسلام کے جائے پیدائش، اب فحش و فساد کے مرکز بن گئے تھے۔ یہ اچھی بات ہے کہ مکہ اور مدینہ کے بارے میں ہمیں یہ باتیں معلوم ہونی چاہییں۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہ ہمارے علمی آثار میں اِس قسم کی باتیں موجود نہیں ہیں جبکہ یہ حقیقت تھی۔ میں یہاں پر فحش و فساد کی ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

مکہ میں عمر ابن ابی ربیعہ نام کا ایک شاعر رہتا تھا۔ جس کا شمار بدترین فحش گو شعراء میں ہوتا تھا لیکن وہ اپنے فن کا بڑا ماہر تھا۔ خود عمر ابن ابی ربیعہ کی داستانیں اور یہ کہ وہ مکہ میں کیا کرتا تھا، یہ ایک تفصیلی اور اُس دور کی ایک المناک تاریخ ہے۔

مکہ میں خانہ کعبہ کے طواف اور رمیِ جمرات کے دوران وہ یہ اشعار کہتا ہے، جنہیں ہم ''مغنی اللبیب'' میں پڑھتے ہیں وہ کہتا ہے:

برباد ہوگئی ہے، جاؤ خلیفۃ اللہ کو شراب اور گانوں کے درمیان تلاش کرو۔ (طبقات الشعراء، ص۳)

فَوَاللهِ مَا أَدْرِیْ وَإِنْ كُنْتَ دَارِيَا

بِسَبْعٍ رَمَيْنَ الْجَمْرَأَمْ بِثِمَانٍ

بَدَا أَلِي مِنْهَا مِعْصَم حِيْنَ جَمَّرَت

وَكَفَّ خَضِيْب زينَت بِبَنَانٍ[1]

راوی کہتا ہے کہ جب عمر ابن ابی ربیعہ مر گیا تو اُس کے غم میں پورا مدینہ سوگوار ہو گیا، لوگ مدینہ کی سڑکوں اور گلیوں میں نکل کر رو رہے تھے۔ (راوی کہتا ہے) میں جہاں بھی جاتا تھا، دیکھتا تھا کہ مرد، عورتیں، جوان، بوڑھے سب عمر ابن ابی ربیعہ کے سوگ میں افسردہ تھے۔ (راوی مزید کہتا ہے) میں نے دیکھا کہ ایک کنیز کسی کام سے جارہی تھی، مثلاً ہاتھ میں کوئی برتن لے کر پانی لینے جارہی تھی اور وہ عمر ابن ابی ربیعہ کے مرنے پر مسلسل آنسو بہا رہی تھی اور افسوس کا اظہار کر رہی تھی؛ جب وہ کچھ لوگوں کے قریب سے گزری تو لوگوں نے پوچھا تم کیوں اس طرح رو رہی ہو؟ اُس نے کہا: عمر ابن ابی ربیعہ کے مرنے پر رو رہی ہوں کہ وہ ہمارے درمیان سے چلا گیا ہے۔ کسی نے کہا کہ اتنی پریشان نہ ہو کیونکہ مدینہ میں خالد ابن مخزومی نامی ایک اور شاعر موجود ہے جو کچھ مدت کے لیے بنو اُمیہ کی طرف سے حاکمِ مدینہ بھی رہا ہے، وہ بھی عمر ابن ابی ربیعہ کی طرح فحش اور بے پردہ شعر کہنے والوں میں سے تھا۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے خالد ابن مخزومی کا ایک شعر پڑھ کر سنایا۔ اُس کنیز نے شعر کو غور سے سنا (شعر اور اس کی خصوصیات کو الاغانی میں لکھا ہے) اور اس کے بعد اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی لَمْ يُضَيِّع حَرَمَهُ'' اللہ کا شکر ہے کہ اُس نے اپنے حرم کو خالی نہیں رکھا۔ یعنی ایک چلا گیا تو اس کی جگہ دوسرا آگیا۔ یہ تھی اہلِ مدینہ کی اخلاقی حالت۔

آپ مکہ اور مدینہ کی رنگین راتوں کے بہت سارے قصّے سن چکے ہوں گے یہ

---

[1] خدا کی قسم! رمی جمرات کے دوران میں اس (معشوقہ) کے مہندی لگے ہاتھوں کو دیکھ کر اتنا متحیر ہو گیا کہ یہ بھی بھول گیا کہ میں نے سات کنکریاں ماری ہیں یا آٹھ! (مغنی اللبیب، ص۲۰)

صرف نچلے درجے کے لوگوں کا مسئلہ نہیں تھا، بلکہ ہر طبقے کے لوگ اس میں مبتلا تھے۔ گداگروں، فقیروں اور بھوکوں، جیسے شعب طماع نامی مشہور اور مسخرہ باز شاعر اور عام قسم کے بازاری لوگوں اور کنیزوں سے لے کر قریش کے بڑے بڑے لوگ مرد اور عورتیں یہاں تک کہ بنی ہاشم کے کچھ لوگ بھی اِن بُرائیوں میں غرق تھے۔

خالد ابن مخزومی نامی شخص کے دورِ حکومت میں طلحہ کی بیٹی عائشہ طواف کر رہی تھی، مخزومی اسے پسند کرتا تھا۔ جب اذانِ عصر کا وقت ہوا تو عائشہ نے مخزومی سے کہا کہ آپ حکم دیں کہ میرا طواف ختم ہونے تک عصر کی اذان نہ دی جائے! اُس نے حکم دیا کہ عصر کی اذان نہ دی جائے اور جب لوگوں نے اعتراض کیا کہ آپ ایک عورت کے طواف کی خاطر سب کی نماز قضا کرانا چاہتے ہو؟! تو مخزومی نے کہا: خدا کی قسم! اگر کل صبح تک بھی اِس کا طواف مکمل نہ ہوا میں ہرگز اذان کی اجازت نہیں دوں گا! اُس زمانے کے لوگوں کی ذہنی پستی کا یہ عالم تھا۔

(۱۹-۰۷-۱۹۸۶ء)

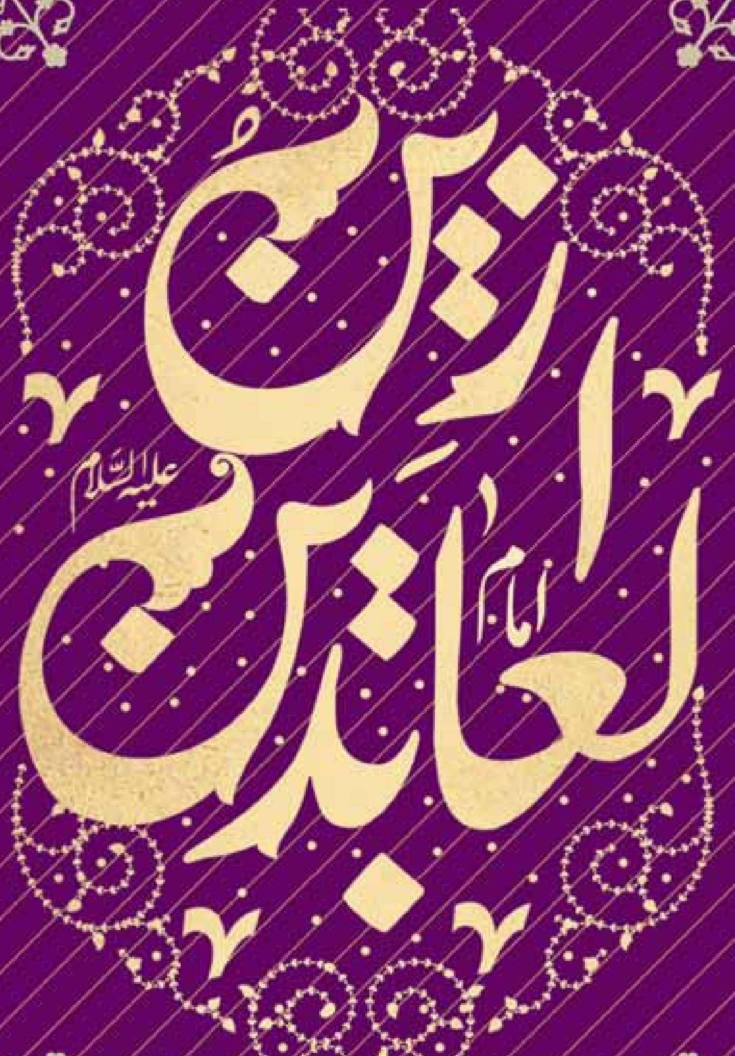
امام
زین العابدین
علیه السلام

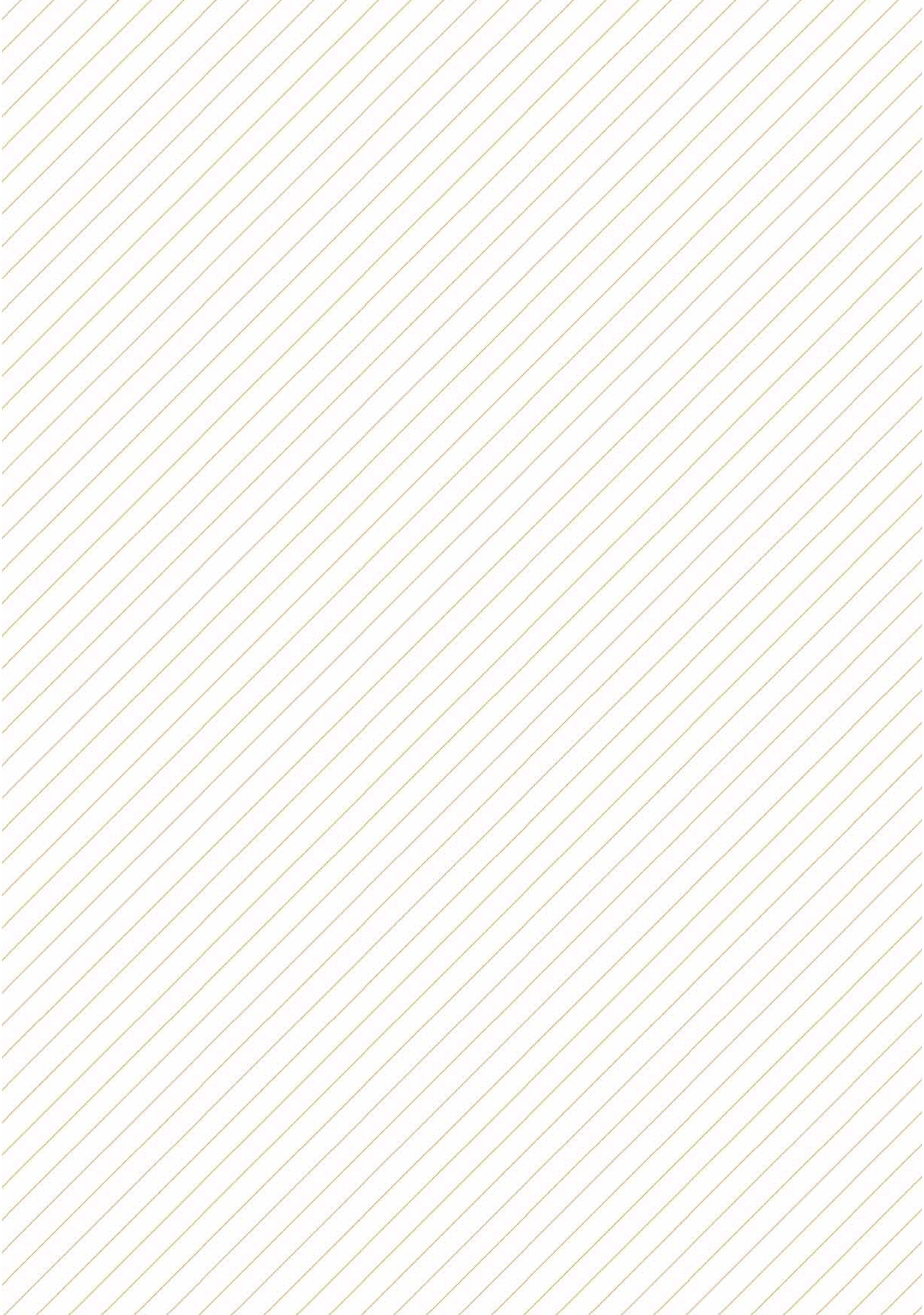

امام زین العابدین علیہ السلام کی شخصیت اور بنیادی مقاصد

امام زین العابدین علیہ السلام کی شخصیت پر بحث و گفتگو کرنا اور آپؑ کی پاکیزہ سیرت پر قلم اُٹھانا خاصا مشکل کام ہے، کیونکہ لوگوں کو اس عظیم امامؑ کی معرفت اور آشنائی سے متعلق بنیادی مآخذ ہی میسر نہیں۔ زیادہ تر سیرت نویسوں اور تجزیہ نگاروں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ یہ عظیم ہستی ایک کونے میں بیٹھ کر عبادت میں مشغول رہی اور سیاسی اُمور سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ بعض مورّخین اور سیرت نگاروں نے تو اس بات کو بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے اور جن لوگوں نے صراحت کے ساتھ نہیں لکھا، انہوں نے بھی آپؑ کی زندگی سے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ ان سے کچھ مختلف نہیں ہیں۔ یہ مطلب امام زین العابدین علیہ السلام کو دیئے جانے والے القابات سے بھی بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

بعض لوگ اس عظیم امامؑ کو ”بیمار“ کے لقب سے یاد کرتے ہیں، جبکہ آپؑ کی بیماری واقعہ عاشورا کے چند دنوں تک محدود تھی آپؑ کوئی دائمی مریض نہیں تھے۔ ہر آدمی اپنی زدگی میں کبھی نہ کبھی بیمار ہو ہی جاتا ہے۔ اگرچہ آپؑ کی اس بیماری میں بھی مصلحت اور حکمتِ الٰہی پوشیدہ تھی۔ اس کے ذریعے آپؑ سے جہاد اور دفاع کی ذمہ داریاں اُٹھالینا مقصود تھا، تاکہ آئندہ امانت اور امامت کی عظیم ذمہ داریوں کو اپنے کاندھوں پر اُٹھا سکیں اور اپنے والد بزرگوارؑ (کی شہادت) کے بعد چونتیس یا پینتیس سال تک زندہ رہتے ہوئے شیعوں کی امامت کے اس سخت اور پُرآشوب دور کو گزار سکیں۔

آپ قارئین اگر امام زین العابدین علیہ السلام کے حالات زندگی کا مطالعہ کریں تو ہمارے دوسرے ائمہ اطہار علیہم السلام کی طرح، یہاں بھی قابلِ توجہ اور دلچسپ واقعات کا ایک تسلسل نظر آئے گا۔ البتہ اگر آپ ان تمام واقعات کو جمع کر لیں تب بھی امامؑ کی سیرت کو مکمل طور پر سمجھ نہیں سکتے۔

کسی بھی شخصیت کی سیرت صحیح معنوں میں سمجھنا، تب ہی ممکن ہوتا ہے جب ہم اس شخصیت کی زندگی کے بنیادی اغراض و مقاصد و اہداف کو جان لیں اور پھر اس کی زندگی کی جزئیات سمجھنے کی کوشش کریں۔ اگر اس کے اغراض و مقاصد کو سمجھ لیا جائے تو زندگی کی جزئیات خود بخود سمجھ میں آجاتی ہیں؛ لیکن اگر وہ بنیادی اغراض ومقاصد ہی سمجھ میں نہ آئیں یا انہیں غلط سمجھا جائے تو جزئی واقعات بھی بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں یا ان سے کوئی غلط مطلب اخذ کیا جاتا ہے اور یہ قاعدہ صرف امام زین العابدینؑ یا دوسرے اماموںؑ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ یہ ہر ایک کی زندگی پر صادق آتا ہے۔

امام زین العابدینؑ کی زندگی کے واقعات کے سلسلے میں محمد بن شہاب زہری کے نام آپؑ کے خط کو بطورِ نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا خط ہے جو خاندانِ نبوت کے ایک فرد کی طرف سے اُس دور کے ایک مشہور دانشور کے نام لکھا گیا۔ اس سلسلے میں بہت کچھ کہا جا سکتاہے۔ ممکن ہے کہ یہ خط کسی بنیادی نوعیت کی حامل وسیع سیاسی جدوجہد کا ایک حصہ ہو، ممکن ہے نہی عن المنکر کے سلسلے میں ایک نصیحت ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ایک شخصیت کی طرف سے دوسری شخصیت پر ایک قسم کا اعتراض ہو، جیسا کہ تاریخ میں دو یا کئی شخصیات کے درمیان اس قسم کے اعتراضات کا تبادلہ کثرت سے نظر آتا ہے۔

امام زین العابدینؑ کی زندگی کے دیگر واقعات کو نظر انداز کرتے ہوئے، صرف اس واقعے سے کسی بھی نتیجے پر نہیں پہنچا جا سکتا۔ میں اس بات کی تاکید کرتا ہوں کہ اگر ہم اس قسم کی جزئیات کو امامؑ کے بنیادی اغراض و مقاصد اور آپؑ کے اہداف سے الگ کرکے دیکھیں گے تو ہم امامؑ کی سوانح حیات سمجھ نہیں سکتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم ابتداء میں امامؑ کی زندگی کے بنیادی اغراض و مقاصد اور اہداف سے آشنائی حاصل کریں۔

یہاں میں سب سے پہلے امام زین العابدینؑ کے بنیادی اغراض و مقاصد سے متعلق گفتگو کرنا چاہتا ہوں اور وہ بھی خود امامؑ کی سوانح حیات، آپؑ کے فرمودات نیز دیگر ائمہ معصومینؑ کی پاکیزہ زندگی سے اخذ کرتے ہوئے واضح کرنے کی کوشش

کروں گا۔

ہماری نظر میں ۴۱ہجری میں امام حسن علیہ السلام کی صلح کے بعد سے ہی اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف اس بات پر ہرگز تیار نہیں تھے کہ گھر بیٹھ کر اپنے علم و دانست کے مطابق محض احکام الٰہیہ بیان کرتے رہیں، بلکہ اس صلح کے آغاز سے ہی تمام ائمہ علیہم السلام کا یہی موقف تھا کہ وہ اپنے طرزِ فکر کے مطابق ایک اسلامی حکومت کے قیام کے لیے مقدّمات فراہم کرتے رہیں؛ جیسا کہ اس بات کو خود امام حسن علیہ السلام کی زندگی اور آپؑ کے فرمودات میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

امام حسن علیہ السلام کا کام انتہائی عمیق، دیرپا اور بنیادی نوعیت کا تھا۔ دس سال تک امامؑ نے اسی کیفیت میں زندگی بسر کی اور اس دوران آپؑ نے کچھ لوگوں کو اپنے قریب کیا اور ان کی تربیت کی، ان میں سے کچھ افراد مملکت کے مختلف گوشہ و کنار میں اپنے قول و فعل کے ذریعے معاویہ کی حکومتی مشینری کی مخالفت کرتے رہے اور اس حکومت کی مخالفت کے جرم میں ہی جام شہادت نوش کر گئے۔

اس کے بعد امام حسین علیہ السلام کی باری آئی۔ آپؑ نے بھی اسی روش پر چلتے ہوئے مدینہ، مکہ اور دیگر مقامات پر اس تحریک کو آگے بڑھایا۔ یہاں تک کہ معاویہ کا انتقال ہو گیا اور کربلا کا (دلخراش) واقعہ رو نما ہوا۔ اگرچہ واقعہ کربلا اسلام کے مستقبل کے لیے نہایت مفید اور ثمر آور ثابت ہوا، لیکن بہر حال وہ مقصد جس کے لیے امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کوشاں تھے وہ تاخیر کا شکار ہو گیا، کیونکہ اس حادثے نے لوگوں کو دہشت زدہ کر دیا تھا۔ اس دوران امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کے قریبی دوستوں کو تہہ تیغ کیا گیا اور دشمن کو ان پر مسلط ہونے کا موقع ملا۔

اگر یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا اور امام حسین علیہ السلام کوئی اقدام نہ کرتے، تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا تھا کہ اس کے بعد یعنی مستقبل قریب میں ایک ایسی تحریک اُٹھنے کے امکانات موجود تھے کہ جن کی بنا پر حکومت کی باگ ڈور شیعوں کے ہاتھ میں آجاتی۔

البتہ ہماری اس گفتگو کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ امام حسین علیہ السلام کو قیام نہیں کرنا

چاہیے تھا، بلکہ اس وقت تو حالات ہی کچھ اس قسم کے پیدا ہو گئے تھے کہ قیام ناگزیر ہو گیا تھا۔ اس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش ہی نہیں ہے لیکن اگر اس قسم کے حالات پیش نہ آتے اور امام حسینؑ اس حادثے میں شہید نہ ہوئے ہوتے، تو اس بات کا قوی امکان تھا کہ مستقبل کے حوالے سے امام حسنؑ کا منصوبہ عملی شکل اختیار کر لیتا۔

ائمہ طاہرینؑ کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے اور وہ مسلسل اسلامی حکومت کی تشکیل کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ جب امام حسینؑ کربلا میں شہید کر دیئے گئے اور امام زین العابدینؑ اپنی بیماری کی حالت میں اسیر ہوئے، تو اس وقت سے ہی درحقیقت امام زین العابدینؑ کی ذمہ داریوں کا آغاز ہو گیا اور اب تک (حکومتِ اسلامی کی تشکیل کے حوالے سے) جو ذمہ داریاں امام حسن اور امام حسینؑ کے کاندھوں پر تھیں، اب وہ ذمہ داریاں امام زین العابدینؑ کے سپرد کر دی گئیں اور ان کے بعد دوسرے اماموںؑ کو یہ ذمہ داریاں سونپی گئیں۔

لٰہذا امام زین العابدینؑ کی پوری زندگی کا مکمل جائزہ انہی اغراض و مقاصد اور اہداف کی روشنی میں لینا چاہیے اور بغیر کسی شک و شبہ کے ہمیں یہ بات جان لینی چاہیے کہ امام زین العابدینؑ بھی انہی اہداف کے حصول کے لیے کوشاں تھے، جن اہداف کے لیے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کوشاں رہے۔

امام زین العابدینؑ سن ۶۱ ہجری عاشور کے دن منصب امامت پر فائز ہوئے اور سن ۹۴ ہجری میں آپؑ کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔ اس پورے عرصے میں آپؑ اسی مقصد کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ اب آپ اس زاویے سے امامؑ کی زندگی کی جزئیات کا جائزہ لیں کہ آپؑ نے کون کونسے مراحل طے کیے اور کیا طریقہ کار اپنائے اور پھر اس میں کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی۔

آپؑ کے تمام فرمودات، اعمال، دعائیں، مناجات اور راز و نیاز جو صحیفہ سجادیہ کی شکل میں موجود ہیں، ان کی بھی انہی بنیادی اغراض و مقاصد کی روشنی میں تفسیر و تشریح کی جانی چاہیے، نیز اس پورے دورِ امامت میں آپؑ نے جو اقدامات اُٹھائے انہیں بھی اسی

نظر سے دیکھنا چاہیے:

۱۔ آپؑ نے عُبید اللہ ابن زیاد اور یزید کے مقابلے میں جو اقدامات اُٹھائے وہ انتہائی شجاعت، بہادری اور فداکاری سے بھرپور تھے۔

۲۔ مسرف بن عُقبہ کے حوالے سے جس نے یزید کی حکومت کے تیسرے سال اس کے حکم سے مدینہ پر چڑھائی کی اور مسلمانوں کے اموال کو غارت کیا، یہاں امامؑ کا موقف انتہائی نرم تھا۔

۳۔ عبدالملک بن مروان جس کو خلفائے بنو اُمیہ میں طاقتور ترین اور چالاک ترین خلیفہ شمار کیا جاتا ہے، اس کے ساتھ امامؑ کا موقف کبھی بہت ہی سخت اور کبھی بہت ہی نرم نظر آتا ہے۔

۴۔ عمر بن عبدالعزیز کے ساتھ آپؑ کا رویّہ۔

۵۔ اپنے اصحاب اور دوستوں کے ساتھ آپؑ کا کیا رویّہ اور انہیں دوستانہ نصیحتیں۔

۶۔ ظالم و جابر حکومت اور اس کے عملے سے وابستہ درباری علماء کے ساتھ آپؑ کا سلوک۔

ان تمام رویّوں اور اقدامات کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ میں تو اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر ائمہ اطہارؑ کے بنیادی موقّف کو پیش نظر رکھتے ہوئے، ان تمام جزئیات اور حوادث کا جائزہ لیا جائے تو بہت معنی خیز حقائق سامنے آئیں گے۔ چنانچہ اگر اسی زاویے سے امام زین العابدینؑ کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ کریں تو آپؑ ایک ایسے عظیم انسان نظر آئیں گے جو اس روئے زمین پر الٰہی حکومت قائم کرنے اور اسلام کو اس کی اصل شکل میں نافذ کرنے کو ہی اپنا مقدس مقصد سمجھتے اور اسی راہ میں اپنی تمام تر کوششوں و کاوشوں کو بروئے کار لاتے رہے ہیں اور آپؑ نے پختہ ترین اور کارآمد ترین کارکردگی سے نہ صرف یہ کہ اسلامی کارواں کو اس انتشار اور پریشاں حالی سے نجات دلائی، جو واقعۂ عاشور کے بعد دنیائے اسلام پر

چھا چکی تھی، بلکہ ممکنہ حد تک اس کو آگے بھی بڑھایا ہے۔

دو اہم اور بنیادی فرائض جو ہمارے تمام ائمہ اطہار علیہم السلام کو سونپے گئے تھے، (ہم ابھی ان کی طرف اشارہ کریں گے) ان کو امام زین العابدین علیہ السلام نے بڑی خوش اسلوبی سے عملی جامہ پہنایا ہے۔ آپؑ مکمل سیاسی بصیرت، شجاعت اور زیرکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، نہایت احتیاط اور باریک بینی سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے، یہاں تک کہ تقریباً ۳۵سال کی انتھک جدوجہد اور الٰہی نمائندگی کی عظیم ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے بعد آپؑ سرفراز و سربلند اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور اپنے بعد امامت و ولایت کی عظیم ذمہ داری اپنے فرزند اور جانشین حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے سپرد فرما گئے۔

چنانچہ امام محمد باقر علیہ السلام کو منصبِ امامت اور حکومت اسلامی کی تشکیل کی ذمہ داریوں کا سونپا جانا، روایات میں بہت واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک روایت کے مطابق امام زین العابدین علیہ السلام نے اپنی اولاد کو جمع کیا اور محمد بن علی یعنی امام محمد باقر علیہ السلام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:”یہ صندوق اور یہ اسلحہ سنبھالو یہ تمہارے ہاتھوں میں امانت ہے۔“ اور جب صندوق کھولا گیا تو اس میں قرآن اور کتاب تھی۔ میرے خیال میں اسلحہ سے مراد، انقلابی قیادت و رہبری اور کتاب سے مراد اسلامی افکار و نظریات اور اسلامی آئیڈیالوجی ہے اور یہ چیزیں امام زین العابدین علیہ السلام نے اپنے بعد کے امامؑ کی تحویل میں دے کر نہایت ہی اطمینان و سکون کے ساتھ، بیدار انسانوں اور خداوند عالم کی نظر میں سرفراز ہو کر اس دنیاکو خیر باد کہا۔ یہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی حیات طیبہ کا ایک مجموعی خاکہ ہے۔[1]

بے شمار مسائل اور مشکلات کے ساتھ امام زین العابدین علیہ السلام کے دورِ امامت کا آغاز ہوا، کیونکہ کربلا کے دلخراش واقعے نے نہ صرف مکتب تشیع، بلکہ پورے عالم اسلام کو ہلا کر رکھ دیا تھا، اگرچہ قتل و غارت گری، قید و بند اور مخالفین کو ظلم کے شکنجوں میں جکڑنے کا سلسلہ تو پہلے ہی سے چل رہا تھا؛ لیکن فرزند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنا اور خانوادۂ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قید کر کے شہر بہ شہر پھرانا نیز فرزند زہراؑ کے سرمبارک کو نوک نیزے

---

۱. پاسدار اسلام، شمارہ ٦

پر بلند کرنا، ایک ایسا کام تھا جس نے پورے عالم اسلام کو غم و اندوہ میں مبتلا کر دیا تھا؛ کیوکہ اب بھی ایسے لوگ موجود تھے جنھوں نے اپنی آنکھوں سے پیغمبر اسلام ﷺ کو ان ہونٹوں کو چومتے ہوئے دیکھا تھا۔ کسی نے یہ سوچا بھی نہ تھا کہ نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی۔ حضرت زینب سلام اللہ علیہا سے منسوب ایک شعر میں آپؑ فرماتی ہیں:

مَا تَوَهَّمْتُ يَا شَقِيقَ فُؤَادِي
كَانَ هَـذَا مُقَدَّراً مَكْتُوباً[1]

(اے وہ چاند کہ جس کو مکمل ہونے سے پہلے ہی گرہن لگ گیا۔) اے میرے جگر کے ٹکڑے! میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا یہ سب کچھ تقدیر میں لکھا ہوگا۔

اس شعر میں بھی اسی نکتے کی طرف اشارہ ہے اور یہی اس دور کے لوگوں کی عمومی سوچ تھی۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ اصل سیاست تو کچھ اور ہے اور مشکلات اور سختیاں تصور سے کہیں زیادہ درپیش ہونے لگی تھیں، حتی کہ جن چیزوں کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا وہ انجام پا گئیں ہیں۔

ایسے عالم میں کوفہ کے علاوہ پورےعالم اسلام پر ایک رُعب و وحشت کا سکتہ طاری تھا اور کوفہ پہلے توابین اور پھر مختار ثقفی کی برکت سے اس خوف و دہشت سے باہر نکلا تھا، ورنہ تو واقعہ کربلا کی وجہ سے مدینہ اور دیگر مقامات، یہاں تک کہ مکہ میں بھی جہاں عبداللہ بن زبیر نے اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد قیام کیا تھا، ایک ایسا خوف چھایا ہوا تھا جس کی دنیائے اسلام میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

فکری حالات، اخلاقی مفاسد اور سیاسی بُرائیاں ایک دوسرے عامل کے طور پر معاشرے میں اس قدر رسوخ کر گئی تھیں کہ بڑے لوگوں کی اکثریت کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے، حکومتی کارندوں سے مراعات وصول کر رہی تھی۔ محمد بن شہاب زہری جیسے برجستہ آدمی، جو ایک زمانے میں امام زین العابدین علیہ السلام کے شاگرد بھی رہ چکے تھے، وہ بھی حکومتی مشینری کے آلہ کار بن چکے تھے؛ لہٰذا محمد بن شہاب زہری کے نام امام

---

[1] بحار الانوار، ج۴۵، ص۱۱۵

زین العابدینؑ کے اس تاریخی خط سے جو "تحف العقول" اور دوسری تاریخی کتابوں میں موجود ہے، واضح ہوتا ہے کہ کس طرح بڑی بڑی شخصیات حکومتی مشینری سے وابستہ ہو چکی تھیں۔ محمد بن شہاب زہری جیسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ مرحوم علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں امام زین العابدینؑ سے ایک روایت نقل کی ہے، ظاہراً امامؑ نے جابر بن عبداللہ (انصاری) سے مخاطب ہو کر فرمایا: "مَا نَدرِی کَیفَ نَصنَعُ بِالنَّاسِ اِن حَدَّثنَاهُم مَاسَمِعنَامِن رَسُولِ اللهِ (صَلَی اللهُ عَلَیهِ وَ آلِهِ) ضَحِكُوْاوَاِنسَكَتنَالَم يَسعَنَا"[1] ہم نہیں جانتے کہ لوگوں سے کس طرح پیش آئیں، اگر ہم ان کے سامنے پیغمبر اسلامﷺ کی کوئی حدیث بیانکرتے ہیں، تو وہ ہنستے ہیں اور اگر حدیث نقل نہ کریں تو خاموش نہیں رہتے۔

یعنی نہ صرف یہ کہ لوگ ہماری بیان کردہ حدیث قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں، بلکہ (ہمارے اوپر) ہنستے ہیں۔

اس کے بعد (مرحوم علامہ مجلسیؒ) ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ امام زین العابدینؑ نے کسی مجلس میں ایک حدیث بیان فرمائی، تو مجمع سے ایک شخص نے آپؑ کو جھٹلایا اور اس حدیث کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

علامہ مجلسیؒ سعید بن مُسیّب اور زہری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ دونوں منحرفین میں سے تھے؛ البتہ میں سعید بن مُسیّب کے بارے میں یہ نہیں مانتا کہ وہ منحرفین میں سے تھے، کیونکہ مختلف دلائل سے ثابت ہے کہ وہ امام زین العابدینؑ کے دوستوں میں سے تھے؛ لیکن زہری اور دیگر بہت سارے لوگوں کا تعلق منحرفین سے تھا۔ ابن ابی الحدید نے اس دور کی مشہور و معروف شخصیات کی ایک طویل فہرست ذکر کی ہے کہ وہ سب اہل بیت علیہم السلام سے منحرف ہوگئے تھے۔

لوگوں کا دین صحیح ہو، لوگوں کا اخلاق صحیح ہو اور لوگ فساد کے اس گرداب سے باہر نکلیں اور معنویات کی طرف چل پڑیں؛ کیونکہ دین کا لُبِ لباب اور اصلی روح جو

---

[1] بحار الانوار، ج٦، ص۲۵۹

وہی معنویات کی سمت چلنا ہے، یہ معاشرے میں زندہ ہو جائیں۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ امام زین العابدین علیہ السلام کی پوری زندگی اور آپؑ کے فرمودات زُہد و تقویٰ سے ہی عبارت ہیں۔ چنانچہ ایک تفصیلی گفتگو کے آغاز میں آپؑ فرماتے ہیں: ''أَنَّ عَلَامَةَ الزَّاهِدِيْنَ فِي الدُّنْيَا الرَّاغِبِيْنَ فِي الْآخِرَةِ---''[1]

دنیا میں زاہد و پرہیز گار اور آخرت سے دل لگا لینے والوں کی علامت یہ ہے کہ۔ ۔ ۔

اگرچہ اس گفتگو میں بھی ان اغراض و مقاصد کی طرف ایک اشارہ ہے، جنہیں ہم نے بیان کیا ہے۔ یا فرماتے ہیں:

''أَوَلَا حُرٌّ يَدَعُ هَذِهِ اللُّمَاظَةَ لِأَهْلِهَا يَعْنِي الدُّنْيَا فَلَيْسَ لِأَنْفُسِكُمْ ثَمَنٌ إِلَّا الْجَنَّهَ فَلَاتَبِيْعُوهَا إِلَّا بِهَا بِغَيْرِهَا''[2]

کیا تم میں کوئی ایسا آزاد مرد نہیں، جو اس کتے کا بچا کھچا اس کے لیے چھوڑ دے، یعنی دنیا کو اہل دنیا کے لیے چھوڑ دے۔ تمہاری جانوں کی قیمت بہشت کے علاوہ کچھ نہیں، پس انہیں (اپنی جانوں کو) بہشت کے سوا کسی دوسری چیز کے بدلے مت بیچو۔

امام زین العابدین علیہ السلام کے زیادہ تر فرامین زُہد و تقویٰ اور اسلامی معارف پر مبنی ہیں اور معارف بھی دعا ہی کے قالب میں بیان ہوئے ہیں؛ جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ اس گھٹن کے ماحول اور نامناسب حالات میں امام زین العابدین علیہ السلام کھل کر لوگوں سے گفتگو نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ نہ صرف حکومتی مشینری اس کام میں رکاوٹ تھی، بلکہ خود لوگ بھی سننے کو تیار نہ تھے۔

بنیادی طور پر وہ معاشرہ ہی ایک تباہ شدہ اور نالائق معاشرہ تھا، جس کی از سرنو مرمّت کی ضرورت تھی اور سن۶۱ہجری سے سن۹۵ہجری تک چونتیس، پینتیس سال کے اس عرصے میں امام زین العابدین علیہ السلام نے یہی کام انجام دیا۔ یہی وجہ

---

[1] بحار الانوار، ج۷۵، ص۱۲۸

[2] تحف العقول، ص۳۹۱

ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات میں بھی بہتری آتی گئی؛ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام اپنی اس حدیث ''اِرْتَدَّ النَّاسُ بَعْدَ الْحُسَیْن'' کے آخر میں فرماتے ہیں: ''ثُمَّ اِنَّ النَّاسَ لَحِقُوا وَ كَثُرُوا'' یعنی پھر لوگ ہم سے ملحق ہوتے گئے اور ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا اور امام محمد باقر علیہ السلام کے زمانے تک حالات بالکل بدل گئے تھے اور یہ سب کچھ امام زین العابدین علیہ السلام کی پینتیس سالہ زحمتوں کا نتیجہ تھا۔

(۱۹۔۷۔۱۹۸۶ء)

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر امام زین العابدین علیہ السلام بنو اُمیہ کے نظامِ حکومت کے خلاف ہوتے، تو آپؑ بھی عَلم بغاوت بلند کرتے یا کم از کم (مثال کے طور پر) عبداللہ ن حنظلہ یا مختار ثقفی سے مل جاتے یا یہ کہ آپؑ ان لوگوں کی رہبری قبول کر لیتے اور کھل کر مسلحانہ مقابلہ کرنے کی دعوت دیتے؛ لیکن اگر اس دور کی وہ صورتحال ہمارے پیش نظر ہو جس میں امام زین العابدین علیہ السلام زندگی بسر کر رہے تھے، تو ہمارے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ ہوگا کہ اس طرح کی فکر ائمہ اطہار علیہم السلام کے مقصد سے (جسے ہم بعد میں بیان کریں گے) قطعی میل نہیں کھاتی۔

ان حالات میں اگر امام زین العابدین علیہ السلام یا ائمہ علیہم السلام میں سے کوئی بھی آپؑ کی جگہ ہوتے اور کھل کے کسی مخالف تحریک میں شامل ہو جاتے یا تلوار لے کے سامنے آجاتے، تو یقینی طور پر شیعیت کی جڑیں ہمیشہ کے لیے کٹ جاتیں۔ آئندہ پھر کسی زمانہ میں مکتب اہل بیت علیہم السلام کی نشونما اور ولایت و امامت کے قیام کی کوئی اُمید باقی نہ رہ جاتی، سب کچھ ختم ہوکر رہ جاتا۔

بظاہر یہی وجہ نظر آتی ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام مختار ثقفی کے معاملہ میں کھل کر کسی طرح کی ہم آہنگی کا اعلان نہیں کرتے، اگرچہ بعض روایتیں اس بات کی شاہد ہیں کہ آپؑ کا مختار ثقفی سے خفیہ طور پر رابطہ قائم تھا، چنانچہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ امامؑ نے علی الاعلان ان سے کبھی کسی طرح کا رابطہ نہیں رکھا؛ بلکہ بعض روایتیں تو کہتی ہیں کہ آپؑ عام نشستوں میں مختار سے اپنی ناراضگی کا اظہار بھی کرتے تھے

اور یہ چیز بالکل فطری ہے، ظاہر ہے آپؑ اس سلسلہ میں تقیہ سے کام لے رہے تھے تاکہ دشمن کو ان کے درمیان کسی خفیہ رابطے کا شک بھی نہ ہو۔

البتہ اگر جناب مختار کو کامیابی نصیب ہو جاتی تو وہ حکومت کو اہل بیت علیہم السلام کے سپرد کر دیتے، لیکن شکست کی صورت میں (جیسا کہ ایسا ہی ہوا) امام زین العابدین علیہ السلام اور مختار کے درمیان رابطہ کا علم ہو جانے کے بعد، خود امامؑ اور آپؑ کے دوستوں اور ہمنواؤں کو بھی اس کی سخت قیمت چکانی پڑتی اور شاید شیعیت کا قلع قمع ہو جاتا، لہٰذا امام زین العابدین علیہ السلام مختار سے کھلم کھلا رابطہ رکھنا، اپنے موقّف کے لیے مفید نہیں سمجھتے تھے۔

روایت میں ہے جب واقعۂ حَرّہ کے وقت مسلم ابن عُقبہ مدینہ منورہ آرہا تھا تو کسی کو اس بات میں شک نہ تھا کہ سب سے پہلی شخصیت جو اس ظلم و جَور کا نشانہ بنے گی، وہ امام زین العابدین علیہ السلام کی ہوگی۔ لیکن آپؑ نے اپنی تدبیر و فراست سے کام لیتے ہوئے ایسی حکیمانہ روش اختیار کی کہ یہ بلا آپؑ سے دور ہوگئی اور امامؑ حیات رہے۔ اس طرح شیعیت کا اصل محور اپنے مقام پر محفوظ رہ گیا۔

البتہ وہ روایتیں جو بعض کتب، منجملہ بحار الانوار میں نقل کی گئی ہیں کہ امام زین العابدین علیہ السلام نے مسلم بن عُقبہ کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار کیا؛ اس کو میں کسی صورت قبول کرنے کو تیار نہیں، بلکہ میری نظر میں یہ امامؑ پر جھوٹ اور افتراء باندھا گیا ہے؛ کیونکہ پہلی بات تو یہ کہ ان میں سے کوئی روایت صحیح اسناد پر منتہی نہیں ہوتی اور دوسری یہ کہ ان کے بالمقابل دوسری بہت سی ایسی روایتیں موجود ہیں، جو مضمون کے اعتبار سے ان کا جھوٹا ہونا ثابت کرتی ہیں۔

امام زین العابدین علیہ السلام اور مسلم بن عُقبہ کی ملاقات کے ذیل میں متعدد روایتیں ملتی ہیں اور ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتیں، لیکن ان میں سے بعض روایات چونکہ ائمہ اطہار علیہم السلام کی شخصیت اور ان کے کردار سے زیادہ قریب ہیں، لہٰذا ہم ان کو قبول کرتے ہیں، ان کے مقابلے میں بہت سی دوسری روایتیں خود بخود غلط قرار پاتی ہیں اور میرے نزدیک ان کے غلط ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا۔ بہر حال وہ اُمور جو بعض روایتوں میں بیان کیے گئے ہیں، امام زین العابدین علیہ السلام سے بعید ہیں

لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ آپؑ نے مسلم بن عُقبہ کے مقابلے میں کسی معاندانہ رویّے کا اظہار نہیں کیا، کیوں کہ اگر آپؑ کوئی ایسا طریقہ کار اپناتے تو قتل کر دیئے جاتے اور یہ امام حسین علیہ السلام کی اس تحریک کے حق میں ایک ناقابل تلافی نقصان ثابت ہوتا جس کو زندہ رکھنا امام زین العابدین علیہ السلام کے لیے سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ لٰہذا یہ ضروری تھا کہ آپؑ زندہ رہیں اور اسی طرح جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول روایت میں کہا گیا ہے کہ رفتہ رفتہ لوگ آپؑ سے ملحق ہوتے رہے اور ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ دراصل امام زین العابدین علیہ السلام کا کام ایسے سخت اور نامساعد حالات میں شروع ہوتا ہے جس کا جاری رکھنا عام آدمی کے لیے تقریباً ناممکن تھا۔ عبدالملک کا دور جس میں آپؑ کی امامت کا بیشتر حصہ، یعنی تقریباً تیس بتّیس سال گزرے، بڑا ہی دشوار دور تھا۔ عبدالملک کی پوری حکومتی مشینری مکمل طور پر آپؑ کی نگرانی پر لگی ہوئی تھی، اس نے ایسے جاسوس مقرر کر رکھے تھے جو امامؑ کی زندگی کے ایک ایک لمحے حتیٰ کہ گھریلو معاملات کی خبر بھی اس تک پہنچاتے رہتے تھے۔

امام زین العابدین علیہ السلام کے اہداف اور مقاصد

امام زین العابدین علیہ السلام نے کس طرح کام کیا اور کن حالات میں اپنی تحریک کا آغاز کیا، یہ سب واضح ہو چکا۔ یہاں میں ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے مقصد اور طریقہ کار کے حوالے سے مختصر طور پر اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں، پھر اس روش اور طریقہ کار کی روشنی میں امام زین العابدین علیہ السلام کی زندگی کی جزئیات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ امام زین العابدین علیہ السلام کا آخری مقصد، اسلامی حکومت قائم کرنا تھا چنانچہ صادق آل محمد علیہ السلام کی اس روایت کے مطابق، جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، خداوند عالم کی طرف سے سن ۷۰ ہجری، اسلامی حکومت کی تاسیس کا سال قرار دیا گیا تھا، مگر سن ۶۱ ہجری میں امام حسین علیہ السلام کی شہادت واقع ہوگئی، جس کے نتیجے میں یہ کام سن ۱۴۷ ۔ ۱۴۸ ہجری تک موقوف کر دیا گیا۔

یہ چیز مکمل طور پر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام نیز دیگر تمام ائمہ اطہار علیہم السلام کا آخری مقصد، اسلامی حکومت قائم کرنا ہی رہا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان حالات میں حکومتِ اسلامی کس طرح قائم ہو سکتی تھی؟ اس کے لیے چند باتیں بہت ضروری ہیں:

۱۔ صحیح اسلامی طرزِ فکر، جو واقعی طور پر ائمہ طاہرین علیہم السلام کے پاس تھی، وہ مدوّن اور مرتّب ہو اور درس و تبلیغ کے ذریعے عام ہو جائے، کیونکہ یہی طرزِ فکر ہے جس کو اسلامی حکومت کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ ایک طویل عرصے تک اسلامی معاشرہ، صحیح اسلامی طرزِ فکر سے مسلسل دوری اختیار کیے رہا، بھلا کس طرح ممکن تھا کہ لوگوں کے ذہنوں پر اسلامی افکار کا نقش قائم کیے بغیر، اسلامی نظریات پر مبنی ایک حکومت قائم کر دی جائے جب کہ ابھی حکومت کے حقیقی احکام کی تدوین و ترتیب بھی باقاعدہ عمل میں نہ آ سکی ہو۔

امام زین العابدین علیہ السلام کا عظیم ترین کارنامہ یہی ہے کہ آپؑ نے اسلام کے بنیادی افکار و نظریات توحید، نبوت، انسان کی معنوی حیثیت، خدا اور بندے کے درمیان رابطہ نیز دیگر اہم موضوعات کو مدوّن و مرتّب کر دیا۔ چنانچہ زبور آل محمدؐ یعنی صحیفہ سجادیہؑ کی اہم ترین خصوصیت یہی ہے۔ اگر آپ صحیفہ سجادیہؑ کا مطالعہ کریں اور اس کے بعد اس زمانے کی عام اسلامی فکر کا جائزہ لیں تو آپ دیکھیں گے کہ دونوں کے درمیان کتنا بڑا فاصلہ نظر آتا ہے۔

جس زمانے میں پورا عالمِ اسلام مادیّت میں گرفتار اپنی مادی ضروریات و خواہشات کی تکمیل میں سرگرداں ہے، خلیفۂ وقت (عبدالملک بن مروان) سے لے کر اس کے اردگرد بیٹھنے والے علماء تک (مثال کے طور پر محمد بن شہاب زہری جیسے درباری علماء) سب کے سب مفاد پرستی و دنیا طلبی میں غلطاں نظر آتے ہیں، امام زین العابدین علیہ السلام لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے ان کی اسلامی حمیّت کو للکارتے ہیں: ''أَوَلَا حُرٌّ يَدَعُ هَذِهِ اللُّمَاظَةَ لِأَهْلِهَا'' آیا (تم میں) کوئی ایسا آزاد مرد نہیں ہے جو اس دریدہ دہن حریص کتے کا بچا کھچا اس کے اہل کے لیے چھوڑ دے۔

یہاں اسلامی طرزِ فکر سے مراد، معنویات کو اصل ہدف قرار دے کر صحیح اسلامی و معنوی بلندیوں تک پہنچنے کی جدوجہد کرنا اور انسان کا اپنے معبود نیز اس کی طرف سے عائد ذمہ داریوں کی طرف متوجہ رہنا ہے۔ جب کہ اس کے مقابلے میں وہ مادی طرزِ فکر ہے جس نے اس دور کے مسلمانوں کو اپنا شکار بنا رکھا تھا۔

بہر حال صرف مثال کے طور پر ہم نے ایک بات یہاں ذکر کی ہے، ورنہ امام زین العابدین علیہ السلام نے اس طرح کے بے انتہا اُمور انجام دیئے ہیں جس کے نتیجے میں صحیح اسلامی طرزِ فکر اپنے اصل خدّوخال کے ساتھ، اسلامی معاشرے میں باقی رہ جائے اور نابود نہ ہو اور اس کو امام زین العابدین علیہ السلام کا اولین کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

۲۔ اسلامی حکومت کی تشکیل کی اہلیت رکھنے والے افراد کی طرف عوام کی رہنمائی، ایسے حالات میں جب دسیوں سال سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیہم السلام کے خلاف پروپیگنڈے کا بازار گرم ہو اور تقریباً پورا عالم اسلام اس جھوٹے پروپیگنڈے سے متاثر ہو۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب ایسی جعلی حدیثوں کا انبار لگا دیا ہو، جو اہل بیت علیہم السلام کی تحریک کے سو فیصد خلاف ہوں، حتیٰ کہ بعض حدیثوں میں اہل بیت علیہم السلام کو ہی سبّ و شتم کا حقدار قرار دے دیا گیا ہو اور یہ حدیثیں عوام کے درمیان نشر بھی ہو چکی ہوں، لوگوں کو اہل بیت علیہم السلام کی صحیح معرفت اور ان کی معنوی حیثیت اور مقام و مرتبے کا علم ہی نہ ہو تو بھلا بتائیے (ایسے میں) اہل بیت علیہم السلام کے ہاتھوں حکومت کی تشکیل کیسے ممکن ہو سکتی ہے؟

اسی لیے امام زین العابدین علیہ السلام کا ایک اہم ترین مقصد یہ بھی تھا کہ لوگوں کے درمیان اہل بیت علیہم السلام کی حقانیت کو واضح کریں اور انہیں بتائیں کہ ولایت و امامت اور خلافت و حکومت صرف ان کا حق ہے۔ یہی حضرات پیغمبر ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی جانشین ہیں۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں کو اس مسئلہ کی اہمیت سے بھی آگاہ کیا جائے۔ اگرچہ یہ مسئلہ اسلامی نظریات اور آئیڈیالوجی سے تعلق رکھتا ہے، تب بھی اس کا سیاست سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ موجودہ سیاسی نظام کے خلاف ایک سیاسی تحریک ہے۔

۳۔ امام زین العابدین علیہ السلام کی تیسری اہم ذمہ داری یہ تھی کہ ایک ایسی تنظیم تشکیل

دی جائے جو آئندہ کے لیے ہر طرح کی سیاسی و اسلامی تحریک کا اصل محور قرار پا سکے، لیکن ایک ایسے معاشرے میں جہاں لوگ گھٹن، اقتصادی بدحالی اور معنوی دباؤ کی وجہ سے افراتفری اور پراکندگی کی زندگی گزارنے کے عادی ہو چکے ہوں، حتیٰ کہ خود شیعہ حضرات بھی ایسے سخت دباؤ اور رُعب و وحشت میں مبتلا کر دیئے جائیں کہ ان کی تنظیمیں درہم برہم ہو کر رہ گئی ہوں، ایسے میں بھلا امام زین العابدین علیہ السلام کے لیے یہ کیونکر ممکن تھا کہ اکیلے یا اپنے چند گنے چنے غیر منظم مخلصین کے ساتھ اپنا کام شروع کریں؟

چنانچہ کسی بھی تحریک کے آغاز سے پہلے امامؑ کے لیے ضروری تھا کہ وہ شیعوں کو منظم کریں اور باقاعدہ ان کی تنظیمیں تشکیل دیں۔ اور یہ تنظیم جہاں تک میرا خیال ہے امیر المومنین علیہ السلام کے دور میں موجود تھی البتہ بعد میں کربلا کے المناک سانحے، مدینہ میں واقعۂ حرّہ اور کوفہ میں قیامِ مختار کے واقعے نے تقریباً اس کی بنیادیں متزلزل کر دی تھیں۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ اس کو دوبارہ منظم کر کے اس میں ایک نئی روح پھونک دی جائے۔

مختصر یہ کہ امام زین العابدین علیہ السلام کو اپنی تحریک آگے بڑھانے کے لیے درج ذیل بنیادی نوعیت کے حامل تین اہم امور انجام دیتے تھے:

پہلا: صحیح اسلامی افکار و نظریات کی قرآن حکیم و سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق تدوین و ترتیب، جو ایک مدت سے تحریف یا فراموشی کی نذر کر دیئے گئے تھے۔

دوسرا: اہل بیت علیہم السلام کی حقانیت اور خلافت، امامت اور ولایت پر ان کے استحقاق کا اثبات۔

تیسرا: شیعیان آل محمدؐ کو جمع کر کے ان کی ایک باقاعدہ تنظیم کی تشکیل۔

یہی وہ تین بنیادی کام ہیں جن کا ہمیں تفصیل سے جائزہ لینا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ ان میں سے کون سا کام، امام زین العابدین علیہ السلام کے زمانے میں انجام پایا۔ اگرچہ ان مذکورہ اُمور کے علاوہ اور بھی بہت سے کام ہیں، مگر ان کو ثانوی حیثیت حاصل

ہے۔ مثلاً کبھی خود امامؑ یا آپؑ کے ساتھیوں کے ذریعے ایسے اقدامات اُٹھائے یا ایسے افکار و خیالات پیش کیے جائیں جو اس گھٹن زدہ ماحول میں کسی حد تک تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوں۔

چنانچہ ایسے متعدد واقعات ملتے ہیں جہاں مجمع عام میں امامؑ کے اصحاب یا خود امامؑ کچھ ایسے خیالات کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں، جس کا مقصد محض اس گھٹن کی فضا کو توڑ دینا ہوتا تھا (البتہ اس طرح کے اقدامات کے وقت تحریک کسی حد تک مستحکم ہو چکی تھی)۔

بہر حال یہ وہ ضمنی اقدامات ہیں جن کے چند نمونے ہمآگے پیش کریں گے۔ اسی طرح کا ایک ضمنی کام موجودہ سیاسی مشینری یا اس کے کارندوں کے ساتھ معمولی نرمی برتنا بھی ہے۔ چنانچہ اس طرح کے واقعات امام زین العابدین﵇ اور عبدالملک بن مروان کے درمیان پیش آتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اسی ضمن میں امام زین العابدین﵇ اور عبدالملک کے دربار سے وابستہ (محمد بن شہاب زہری جیسے) منحرف علماء کے درمیان پیش آنے والے معاملات بھی شامل ہیں۔آپؑ کے دوستوں اور خلفائے وقت کے مابین ہونے والی بعض معرکہ آرائیاں بھی اسی ذیل میں آتی ہیں اور ان سب کا مقصد کسی حد تک اس حبس اور گھٹن کے ماحول سے لوگوں کو نجات دلانا تھا۔ انشاء اللہ آگے ان جزئیات پر تفصیلی بحث کی جائے گی۔

اگر کوئی شخص صرف اسی حد تک میرے ان معروضات کو اچھی طرح سمجھ لے، تو ساری اخلاقی روایات، موعظانہ گفتگو، پیغامات اور عارفانہ دعائیں، نیز دیگر بے بہا اقوال و ارشادات اور واقعات جو امام زین العابدین﵇ سے مروی ہیں یا آپؑ کی زندگی میں واقع ہوتے رہے ہیں، خود بخود واضح ہو جائیں گے یعنی وہ شخص اس بات کو محسوس کرنے پر مجبور ہو جائے گا کہ امامؑ کے تمام اقدامات اور ارشادات ان ہی تینوں اُمور کے اردگرد گردش کرتے نظر آئیں گے جن کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے اور مجموعی طور پر ان تمام اُمور کا ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے ایک اسلامی حکومت کی تشکیل۔

البتہ یہاں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ امام زین العابدین﵇ کو ہرگز اس بات کی فکر اور

جلدی نہیں تھی کہ مطلوبہ اسلامی حکومت خود آپؑ کے زمانے میں ہی تشکیل پا جائے، بلکہ آپؑ جانتے تھے کہ یہ مستقبل قریب میں یعنی آپؑ کے فرزند امام جعفر صادق علیہ السلام کے ہاتھوں تشکیل پائے گی۔[1]

ان تینوں بنیادی اُمور کے انجام پانے کا مطلب یہ ہے کہ اب اسلامی حکومت یا علوی نظام کے لیے زمین ہموار ہو چکی ہے۔ البتہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں اور یہاں پھر یہ بات واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے برعکس، امام زین العابدین علیہ السلام کے پیشِ نظر یہ بات ہرگز نہیں تھی کہ خود ان کے زمانے میں ہی یہ حاکمیت تبدیل ہو کر حکومت، اسلامی قائم ہو جائے، کیو نکہ آپؑ اچھی طرح جانتے تھے کہ آپؑ کے زمانے میں اس کے لیے زمین ہموار نہیں ہو سکے گی۔ ظلم و زیادتی، حبس اور گھٹن کا ماحول کچھ اتنا بڑھ چکا تھا کہ محض تیس سال کی مدت میں حکومت کا برطرف ہو جانا، ممکن نہ تھا۔ چنانچہ امام زین العابدین علیہ السلام مستقبل کے لیے زمین ہموار کر رہے تھے یہاں تک کہ متعدد ایسے قرائن بھی ملتے ہیں جن کے مطابق امام محمد باقر علیہ السلام بھی اپنی زندگی میں ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے کہ خود اپنے دور میں ہی اسلامی حکومت تشکیل دے دیں؛ یعنی سن۶۱ہجری سے ۹۵ہجری تک جب امام زین العابدین علیہ السلام کی شہادت واقع ہوئی اور پھر سن۹۵ہجری سے ۱۱۴ہجری تک جو امام محمد باقر علیہ السلام کا دورِ امامت ہے، ان دونوں میں سے کوئی امامؑ اپنے زمانے میں ہی حکومتِ اسلامی تشکیل دینے کی فکر میں نہیں تھے، بلکہ ان کی نظریں کچھ مدت کے بعد ظاہر ہونے والے نتائج پر تھیں۔ چنانچہ جیسا کہ میں نے اشارتاً عرض کیا کہ امام زین العابدین علیہ السلام طویل المدت منصوبے پر کام کر رہے تھے۔ اب ہم امام زین العابدین علیہ السلام کے ارشادات کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے معروضات کا ثبوت، خود آپؑ کے اقوال میں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں؛ کیونکہ امامؑ کی زندگی کے متعلق کوئی تحقیقی جائزہ پیش کرتے وقت، ہمارے بنیادی مصادر و مآخذ خود آپؑ کے کلمات اور ارشادات ہی ہونے چاہئیں۔

---

[1] ۱. پاسدار اسلام، شمارہ۸

یہی طریقہ دیگر ائمہ طاہرین علیہم السلام کی زندگی اور سیرت کے سلسلے میں بھی ہم نے اختیار کیا ہے، کیونکہ ہماری نظر میں کسی بھی امامؑ کی زندگی سے متعلق صحیح معرفت و آشنائی کے لیے خود اُس امامؑ کی زبانِ مبارک سے جاری ہونے والے بیانات یا روایتیں ہی بہترین منبع و مدرک ہو سکتے ہیں؛ لیکن ہم اس سے قبل بھی بیان کر چکے ہیں کہ ہم ائمہ طاہرین علیہم السلام کے بیانات کو تب ہی صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں جب ان کے موقّف و مقصد، راہِ عمل اور تلاش و جستجو سے آشنا ہوں، ورنہ ہم جو بھی تفسیر کریں گے وہ غلط ہوگی اور اگر خود یہ آشنائی بھی ان کے کلمات کی برکت سے ہی حاصل ہوئی ہے تو آپ دیکھیں گے کہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے کلمات سے کتنے صحیح نتائج ہمیں حاصل ہوں گے۔

قبل اس کے کہ ہم اس بحث میں وارد ہوں، ایک اہم نکتہ کی طرف مختصراً اشارہ کرنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ امامؑ چونکہ انتہائی گھٹن کے ماحول میں زندگی بسر کر رہے تھے اور آپؑ کے لیے ممکن نہیں تھا کہ صراحت سے اپنے موقّف اور نظریات بیان کر سکیں لہٰذا آپؑ نے دعا اور موعظہ کو اپنے اظہار کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ دعا، صحیفہ سجادیہؑ سے مربوط ہے جس کا ہم عنقریب ذکر کریں گے، البتہ موعظہ کا تعلق ان اقوال و روایات سے ہے جو آپؑ سے نقل ہوئی ہیں۔ امام زین العابدین علیہ السلام کے زیادہ تر ارشادات یا شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ تمام کے تمام بیانات، موعظہ کے لب و لہجہ میں ہیں۔

چنانچہ اس موعظہ اور نصیحت کے ضمن میں وہ باتیں جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، آپؑ نے بیان فرمائیں۔ جب آپ قارئین ان بیانات کا غور سے مطالعہ کریں گے تو دیکھیں گے کہ امامؑ نے کتنا حکیمانہ اور مدبّرانہ طریقہ کار منتخب کیا ہے؛ بظاہر تو ایسا لگتا ہے کہ آپؑ لوگوں کو وعظ و نصیحت کر رہے ہیں، لیکن اسی ضمن میں جو باتیں لوگوں کے ذہن میں بٹھانا چاہتے ہیں غیر محسوس طور پر لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں اور یہ افکار و نظریات کے ابلاغ کا بہترین طریقہ ہے۔

امامؑ کے بیانات، سیاسی جدوجہد کا منہ بولتا ثبوت

یہاں ہم امام زین العابدین علیہ السلام کے ان کلمات کی تحقیق و تشریح کرنا چاہتے ہیں جو کتاب ''تحف العقول'' میں آپؑ سے نقل کیے گئے ہیں۔ اس میں آپؑ سے نقل ہونے والے مطالب ہمیں مختلف نوعیت کے حامل نظر آتے ہیں، جو ان ہی مذکورہ جہات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ان میں بعض بیانات وہ ہیں جن میں عام لوگوں سے خطاب ہے، جیسا کہ خود بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے سننے اور پڑھنے والے امامؑ کے خاص الخاص افراد نہیں ہیں؛ چنانچہ عام لوگوں سے خطاب کرتے وقت ہمیشہ قرآنی آیات سند کے طور پر پیش کی گئی ہیں، کیونکہ عوام الناس آپؑ کو امامؑ کی حیثیت سے نہیں پہچانتے، وہ تو ہر بات کے لیے دلیل و استدلال چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امامؑ یا تو براہِ راست آیات سے استدلال پیش کرتے ہیں یا آیات سے بطورِ استعارہ مدد لیتے ہیں۔ اس روایت میں تقریباً پچاس یا اس سے بھی زائد موارد میں قرآنی آیات کا براہِ راست یا بطورِ استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔

لیکن بعد کے بیان میں جہاں مومنین سے خطاب ہے، ایسا نہیں کیونکہ وہ امامؑ کی معرفت رکھتے ہیں اور ان سے امامؑ اپنی گفتگو کے دوران، چونکہ وہ آپؑ کی بات قبول کرتے ہیں، قرآن سے استدلال کرنے ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ چنانچہ اگر شروع سے آخر تک جائزلیں تو قرآنی آیات بہت کم نظر آتی ہیں۔

امامؑ سے ایک مفصّل روایت نقل کرتے ہوئے صاحب ''تحف العقول'' فرماتے ہیں:

''مَوْعِظَتِهِ لِسَائِرِأَصْحَابِهِ وَشِيْعَتِهِ وَتَذْكِيْرِهِ أَيَّاهُمْ كُلَّ يَوْمِ جُمُعَة''[1]

یعنی یہ موعظہ اس لیے تھا کہ حضرتؑ کے شیعہ اور حضرتؑ کے دوست ہر جمعہ کے دن اپنے مجمع میں یا انفرادی طور پر اسے پڑھا کریں۔ یہاں مخاطبین کا دائرہ کافی وسیع ہے اور یہ نکتہ خود اس تفصیلی روایت میں پائے جانے والے قرائن سے استنباط

---

[1] تحف العقول، ص٢٤٩

کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس روایت میں خطاب ”أَيُّهَاالْمُؤْمِنُونَ؛ أَيُّهَاالْاِخْوَةُ“ کے عنوان سے نہیں ہے، بلک ”أَيُّهَاالنَّاسُ“ کہہ کر خطاب کیا گیا ہے، جو عمومیت پر دلالت کرتا ہے؛ جب کہ بعض دوسری روایتوں میں خود خطاب کا انداز مومنین سے مخصوص ہونے کی نشاندہی کرتا ہے، لہٰذا یہاں عمومی خطاب ہونا ثابت ہے۔

ثانیاً اس روایت میں موجود باتوں کا صریحی انداز میں مواخذہ نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اس میں صرف عقائد یا ایسی باتیں بیان کی گئی ہیں جن کا جاننا انسان کے لیے ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں محض اعتقادات و معارفِ اسلامی کی یاد دہانی کرائی گئی ہے، جیسا کہ ہم نے عرض کیا پورا خطاب موعظہ کے لب و لہجے میں ہے جس کی ابتدا یوں ہوتی ہے: ”أَيُّهَاالنَّاسُ اِتَّقُوااللهَ وَاعْلَمُوْاأَنَّكُمْ اِلَيْهِ رَاجِعُونَ“

گفتگو ہی موعظہ سے شروع ہوتی ہے کہ اے لوگو! تقوائے الٰہی اختیار کرو اور یاد رکھو کہ آخر خدا کے سامنے جانا ہے۔ اس کے بعد عقائدِ اسلامی کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تمہارا فرض ہے کہ اسلام کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کرو۔ جس کا مطلب و مفہوم یہ ہے کہ تم اسلام کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکے ہو، گویا اس بیان کے ذیل میں لوگوں کے اندر اسلام کی صحیح شناخت کا جذبہ بیدار کر رہے ہیں۔

اسی طرح ذرا دیکھئے کہ کتنے حَسین انداز میں موعظہ کرتے ہوئے آپؑ فرماتے ہیں: ”أَلَا وَاِنَّ اَوَّلَ مَا يَسْأَلَانِكَ عَنْ رَبِّكَ الَّذِىْ كُنْتَ تَعْبُدُهُ“ اس وقت سے ڈرو جب تم کو لوگ تنِ تنہا قبر کے حوالے کر دیں گے اور منکر و نکیر تمہارے پاس آئیں گے اور وہ پہلی چیز جس کے بارے تم سے سوال کریں گے، تمہارے خدا سے متعلق ہوگی جس کی تم بندگی کرتے ہو، یعنی سننے والوں کے ذہن میں توحید کا مفہوم اُتار کر معرفتِ خدا پیدا کر رہے ہیں۔

”وَعَنْ نَبِيِّكَ الَّذِىْ اُرْسِلَ اِلَيْكَ“

اور تم سے اُس نبیؐ کے بارے میں پوچھیں گے جو تمہاری طرف بھیجا گیا تھا۔

گویا مسئلہ نبوت اور حقیقت محمدیﷺ کے عرفان کا جذبہ زندہ کر رہے ہیں۔

''وَعَنْ دِیْنِکَ الَّذِیْ کُنْتَ تَدِیْنُ بِهِ''

اور اس دین کے بارے میں پوچھیں گے جس کی تم نے پیروی کی ہے۔

''وَعَنْ کِتَابِکَ الَّذِیْ کُنْتَ تَتْلُوْهُ''

اور اُس کتاب کے سلسلے میں تمہاری خبر لیں گے جس کی تم تلاوت کیا کرتے ہو۔

اور پھر مذہبِ اسلام کے ان ہی بنیادی اور اصلی عقائد یعنی توحید، نبوت، قرآن اور دین کے ساتھ، اپنے مقصود اور اہم نکتے کی طرف بھی لوگوں کو متوجہ کر دیتے ہیں۔

''وَعَنْ اِمَامِکَ الَّذِیْ کُنْتَ تَتَوَلَّاهُ''[1] اور اس امام کے بارے میں بھی سوال ہوگا جس کی ولایت کا تم دَم بھرتے رہے ہو۔

یہاں امامؑ مسئلہ امامت کو واضح کر رہے ہیں دراصل ائمہ اہل بیتؑ کے یہاں مسئلہ امامت، حکومت سے الگ نہیں؛ یعنی ان کے نزدیک ولایت اور امامت میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

اگرچہ ممکن ہے ولی اور امام کے معنی آپس میں کچھ تفاوت رکھتے ہوں، لیکن یہ دونوں مسئلے یعنی امامت اور ولایت ائمہؑ کی زبان میں ایک ہیں اور ان سے ایک ہی معنی مراد ہیں۔ یہاں آپؑ اسی امام کے بارے میں سوال کی بات کر رہے ہیں، جسے دینی طور پر لوگوں کی ہدایت و آگاہی کا بھی ذمہ دار بنایا گیا ہے اور دنیوی اعتبار سے ان کے اُمور زندگی کا بھی نگراں اور ذمہ دار قرار دیا گیا ہے؛ یعنی پیغمبر اسلامﷺ کا جانشین۔ امام یعنی معاشرہ کا رہبر و قائد۔ امام یعنی وہ جس سے ہم دین بھی حاصل کرتے ہیں اور ہماری

---

[1] تحف العقول، ص۲۴۹

دنیا بھی اسی کے ہاتھ میں ہے، جس کی اطاعت ہم پر دینی اُمور میں بھی واجب ہے اور دُنیوی معاملات میں بھی فرض ہے۔ لیکن آپ ملاحظہ کیجئے صدیوں سے دنیائے تشیع میں یہ مسئلہ کتنی غلط فہمی کا شکار رہا ہے۔ لوگ خیال کرنے لگے تھے کہ ایک شخص وہ ہے جو معاشرے پر حکومت کر رہا ہے، زندگی سے متعلق اُمور اس کے ہاتھ میں ہیں، بندش و آزادی سے لے کر جنگ و صلح تک سب کچھ اسی کے اختیار میں ہے، وہی مالیات (ٹیکس) مقرر کرتا ہے اور وہی ہمارے اچھے اور بُرے کا مالک و ذمہ دار ہے؛ جبکہ اسی کے مقابلے میں ایک شخص اور بھی ہے جس کا کام لوگوں کا دین درست کرنا ہے، پہلے کو حاکم کہتے ہیں اور دوسرے کو غیبت کے زمانہ میں عالمِ دین اور قبل از غیبت "امام" کہتے ہیں، یعنی ائمہ اطہارؑ کے زمانہ میں ایک "امام" کی حیثیت وہی تصور کرنے لگے تھے جو غیبتِ امامؑ کے زمانے میں ایک عالمِ دین کی ہوتی ہے، ظاہر ہے یہ تصور قطعاً غلط ہے۔

دراصل امام، پیشوا اور ہادی کو کہتے ہیں، جیسا کہ ہم صادق آل محمدؑ کے حالات زندگی میں اشارہ کریں گے کہ جس وقت امامؑ منیٰ یا عرفات میں پہنچتے ہیں تو ایک مرتبہ بلند آواز میں ارشاد فرماتے ہیں:

"أَیُّهَاالنَّاسُ اِنَّ رَسُولَ اللهِ کَانَ الْاِمَامَ"

یعنی پیغمبر اسلام ﷺ امام تھے، امام اس کو کہتے ہیں جو لوگوں کے دین اور دنیا کا ذمہ دار ہوتا ہے چنانچہ امام زین العابدینؑ کے دور میں بھی جب حکومت عبدالملک بن مروان کے ہاتھ میں تھی، لوگ امام کا مفہوم غلط سمجھ بیٹھے تھے۔ معاشرے کی امامت کا مطلب ہی لوگوں کے مسائلِ حیات نیز تمام بندش و آزادی کے نظام کی نگرانی و تحفظ کرنا ہوتا ہے اور یہ امامت کا ایک بڑا ہی اہم شعبہ ہے۔ یہ منصب اہل سے لے کر نا اہل کے سپرد کر دیا گیا تھا اور وہ نا اہل خود کو امام سمجھتا بھی تھا، صرف یہی نہیں بلکہ عرصہ دراز تک عوام بھی اس کو امام ہی سمجھتے تھے۔

چنانچہ لوگ عبدالملک بن مروان کو اور اس سے پہلے مروان بن حکم کو اور اس سے پہلے یزید کو اس کے پیشرووں کو نیز اسی طرح عبدالملک کے بعد اس کی جگہ پر

آنے والے دوسرے لوگوں کو اپنا امام تصور کرتے رہے، ان کو معاشرے کا رہبر نیز لوگوں کے اجتماعی مسائل پر حاکم کے عنوان سے قبول کر چکے تھے اور یہ بات لوگوں کے ذہنوں میں بیٹھ چکی تھی۔

جب امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں: قبر میں تم سے امامت کے بارے میں سوال کیا جائے گا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ امامؑ لوگوں کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ فیصلہ کرلو کہ جب نکیرین سوال کریں گے کہ تم نے جس کو اپنا امام مان لیا تھا کیا وہ واقعی امام تھا؟ جو شخص تم پر حکومت کر رہا تھا، معاشرے کی رہبری جس کے ہاتھ میں تم نے دے رکھی تھی کیا وہ حقیقتاً امام ہونے کا لائق تھا؟ کیا وہ وہی تھا جس کی امامت پر خدا راضی تھا؟ اس کا کیا جواب دو گے؟ یعنی اس طرح آپؑ اس مسئلہ کی نزاکت کا احساس دلاکر لوگوں کو بیدار کر رہے تھے؛ گویا بالکل غیرمحسوس طور پر مسئلہ امامت کو، جس کے سلسلہ میں بنو اُمیہ کی پوری مشینری کسی طرح کی کوئی بات سننے پر قطعی تیار نہ تھی، امام زین العابدین علیہ السلام اس کو موعظہ کے قالب میں ڈھال کر ایک عمومی خطاب کے ضمن میں پیش کرکے لوگوں کے ذہن و احساس کو زندہ و بیدار کر رہے تھے۔ یہاں آپؑ کی روش اور طریقہ کار میں ٹھہراؤ پایا جاتا ہے، کسی طرح کی عُجلت نظر نہیں آتی۔ آگے چل کر جہاں امامؑ نے ذرا سی سختی اور تیزی سے کام لیا ہم اس کا بھی ذکر کریں گے۔

مختصر یہ کہ عوام النّاس سے مربوط اپنے عمومی خطاب میں امام عالی مقامؑ موعظہ کی زبان میں اسلامی معارف کے ساتھ وہ حقائق جن پر آپؑ کی خاص توجہ تھی، لوگوں کے ذہنوں میں زندہ کرتے ہیں آپؑ کی کوشش تھی کہ عوام ان چیزوں کو یاد رکھیں۔ اس قسم کے خطابات میں دو نکتے خاص طور پر توجہ کے لائق ہیں:

پہلا یہ کہ عوام النّاس سے کیا جانے والا یہ خطاب، تعلیمی نقطہ نظر سے پیش نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کی نوعیت یاد دہانی کی سی ہے؛ یعنی یہاں امامؑ بیٹھ کر عوام کے سامنے مسئلہ توحید کے دریچے کھولنے یا مسئلہ نبوّت کی گھتیاں سلجھانے کی کوشش نہیں کر رہے، بلکہ محض یاد دہانی مقصود ہے۔

مثلاً مسئلۂ نبوت کو لے لیجئے۔ ظاہر ہے امام زین العابدین علیہ السلام جس معاشرے اور جس زمانے میں زندگی بسر کر رہے تھے، وہاں ابھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کو اتنی زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ مکمل طور پر اعتقاداتِ اسلامی انحراف یا تحریف کا شکار ہو چکے ہوں، بلکہ اس زمانے میں بہت سے ایسے لوگ موجود تھے جنھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، خلفائے راشدین کا زمانہ بھی ان کے سامنے گذرا تھا اور ائمہ اطہار علیہم السلام میں سے امیر المومنین علیہ السلام، امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کو دیکھنے والے بھی موجود تھے اور اجتماعی نظام کے اعتبار سے ابھی نوبت یہاں تک نہیں پہنچی تھی کہ لوگ مسئلۂ توحید و نبوّت کے سلسلے میں یا مسئلۂ معاد و قرآن کے بارے میں کسی بنیادی و اصولی شک و شبہ اور تحریف سے دوچار ہوں، ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اکثریت اِن کے تقاضوں کو بُھلا بیٹھی تھی۔

مادی زندگی اس بات کی موجب بنی ہوئی تھی کہ لوگ اسلام، اسلامی اعتقادات اور ان کی عظمت و اہمیت کے بارے میں غور و فکر کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے تھے۔ معاشرے میں دُنیوی و مادی طمع نے اس شدّت کے ساتھ لوگوں کو اپنا اسیر بنا لیا تھا کہ یہ فکر کہ انسانی زندگی میں معنویات اور نیکیوں کے سلسلے میں تقابُل و موازنہ کا بھی کوئی میدان موجود ہے، لوگوں کے ذہنوں سے بالکل نکل چکی تھی اور کسی کو میدان میں آگے بڑھنے کی کوئی فکر نہ تھی اور اگر اس طرف کوئی قدم بڑھاتا بھی تھا تو اس میں ظاہرداری اور سطحیت کا عمل دخل ہوتا تھا۔ توحید کے وہ آثار وفوائد جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں یا اس سے متصل قریبی زمانے میں لوگوں پر واضح تھے، اس حوالے سے وہ احساس و ادراک اور وہ ذمہ داری اب مفقود ہو چکی تھی لہٰذا فقط یاددہانی کی ضرورت تھی تاکہ لوگوں میں ادراک پیدا ہو جائے، ورنہ دین میں ابھی کوئی ایسی تحریف نہیں ہوئی تھی کہ جس کی تصحیح ضروری ہو۔

اس کے برخلاف بعد کے زمانوں، مثلاً امام جعفر صادق علیہ السلام کے دور کو لے لیجئے جس میں یہ تحریف اپنی حد سے آگے بڑھ چکی تھی۔ اس وقت خود مسلمانوں کے درمیان بہت سے متکلمین یا دوسرے لفظوں میں ایسے بہت سے فلسفی اور منطقی پیدا

ہو گئے تھے جو طرح طرح کے ناموں سے بڑی بڑی مسجدوں، مثلاً مسجد نبویؐ، مسجد اُموی شام، حتیٰ کہ خود مسجد الحرام میں آکر بیٹھ جاتے اور غلط افکار و عقائد کے باقاعدہ درس دیا کرتے تھے۔

وہاں ابن ابی العوجا جیسے افراد بھی موجود تھے جو زَندیقیت و دَہریت، یعنی وجود خدا سے انکار کا درس دیا کرتے تھے اور اس پر استدلال بھی پیش کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم امام جعفر صادق علیہ السلام کے بیانات کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ آپؑ توحید و نبوّت یا اس جیسے دوسرے مسائل، باقاعدہ استدلال کے ساتھ بیان فرماتے ہیں، ظاہر ہے دشمن کے استدلال کے خلاف استدلال ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔[1]

جبکہ امام زین العابدین علیہ السلام کے بیانات میں یہ چیزیں نہیں ملتیں۔ آپؑ اسلامی مطالب پیش کرتے وقت منطقی استدلال، عوام کے سامنے پیش نہیں کرتے بلکہ صرف یاددہانی کے طور پر اشارہ فرماتے ہیں کہ ”دیکھو! قبر میں تم سے توحید و نبوّت کے سلسلے میں سوالات کیے جائیں گے۔“آپ نے ملاحظہ فرمایا یہ صرف ذہن کو جھنجوڑنے کے لیے ہے کہ انسان ان مسائل پر سوچنے کے لیے مجبور ہو جائے اور وہ چیزیں جو غفلت و فراموشی کی نذر ہو چکی ہیں، ذہن دوبارہ ان کی طرف متوجہ ہو جائے۔

خلاصہ بحث یہ کہ امام زین العابدین علیہ السلام کے دور میں ایسی کوئی چیز نہیں ملتی جو اس بات پر دلالت کرے کہ لوگ حتیٰ کہ اربابِ حکومت و سلطنت بھی اسلامی فکر و نظر سے کھل کر بغاوت پر آمادہ ہوں۔ ہاں! صرف ایک موقع پر مجھے نظر آیا اور اس کا اظہار یزید کے اس شعر سے ہوتا ہے جو اس نے غرور و مستی میں ڈوب کر اس وقت پڑھا تھا جب خانوادۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسیر کر کے اس کے دربار میں پیش کیا گیا۔ وہ کہتا ہے:

لَعِبَتْ بَنُوهَاشِمٍ بِالْمُلْكِ فَلَا

---

[1] حضرت امام جعفر صادقؑ علیہ السلام نے ابن ابی العوجا(جو ایک منکر خدا ملعون شخص تھا) کے جواب میں مخلوقات کی مختلف حالتوں؛ جیسے چھوٹے کے بعد بڑا ہونے، قوت و طاقت کے بعد کمزوری اور اس کے برعکس اور نیز بیماری کے بعد صحت اور اس کے برعکس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے وجود پر استدلال کیا ہے۔ (مجموعہ رسائل در شرح احادیث از کافی، ج۱، ص۵۶۵)

خَبَرٌ جَاءَ وَلَا وَحْيٌ نَزَلَ[1]

بنی ہاشم نے حکومت و سلطنت کے لیے ایک کھیل کھیلا تھا جبکہ حقیقت میں نہ کوئی خبر آئی اور نہ کوئی وحی نازل ہوئی ہے۔

یعنی اس کو دین و وحی سے کوئی مطلب نہ تھا۔ چنانچہ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یزید کی یہ ہرزہ سرائی ممکن ہے نشہ و مستی کے غلبہ کے سبب رہی ہو، ورنہ حتیٰ کہ عبدالملک اور حجاج بن یوسف جیسے ظالموں میں بھی عقیدۂ توحید یا عقیدۂ نبوّت کی کھل کر مخالفت کرنے کی جرأت نہ تھی۔ عبدالملک بن مروان وہ شخص ہے جو اس کثرت سے قرآن کی تلاوت کیا کرتا تھا کہ اس کو لوگ قرآن کے قُرّاء میں شمار کرتے تھے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جب اس کو خبر دی گئی کہ تم خلیفہ بن گئے ہو اور حکومت پر فائز ہو گئے ہو تو اس نے قرآن کو بوسہ دیا اور کہا: ''هَذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ''[2] یعنی اب ہماری اور تمہاری ملاقات قیامت میں ہوگی۔ حقیقت بھی یہی تھی پھر اس کے بعد اس نے کبھی قرآن اُٹھا کر نہ دیکھا۔

حجاج بن یوسف کیسا ظالم آدمی تھا آپ نے سنا ہی ہوگا، لیکن یقیناً جتنا آپ نے سنا ہے وہ اس کے مظالم سے کہیں کم ہے۔ مگر اس جیسا شخص بھی جب منبر سے خطبہ دیتا ہے تو لوگوں کو تقوائے الٰہی کی تلقین کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ چنانچہ امام زین العابدین علیہ السلام کی زندگی میں جو کچھ ملتا ہے اس کا ماحصل عوام کو اسلامی افکار و نظریات کی طرف متوجہ اور خبر دار کرنا ہے تاکہ لوگوں کے فکری بہاؤ کو مادیّت کی بجائے خدا، اس کے دین اور قرآن کی طرف موڑ دیا جائے۔

دوسرا نکتہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے پہلے اشارہ کیا کہ امام زین العابدین علیہ السلام اس عمومی خطاب میں اچانک اپنی سخن کا رُخ مسئلۂ امامت کی طرف پھیر دیتے ہیں، یعنی گوناگوں اسلامی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے امامؑ مسئلۂ امامت کی اہمیت پر بھی

---

[1] اللھوف علی قتلی الطفوف، ترجمہ فہری، النص، ص۱۸۱

[2] یہ میرے اور تیرے درمیان جدائی (کا وقت) ہے۔ (سورۂ کہف، آیت۷۸)

ضرور تاکید کرتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے کوئی سابقہ شہنشاہی حکومت کے دوران آپ سے اس طرح کہے: اے لوگو! اللہ کی پروا کرو اور مسئلہ توحید و نبوّت کے بارے میں سوچ بچار کرو، نیز حکومتی مسائل اور سلطنتی اُمور سے بھی غافل نہ رہو۔ ملاحظہ فرمائیں یہاں ہماری جو ذمہ داریاں ہیں وہ ہم امام زین العابدین علیہ السلام کے کلام سے سمجھتے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ یہی حکومت کی بات کرنا، گذشتہ ظالم حکومت کے دور میں ایک خطرناک چیز تھی۔ اگر کوئی لوگوں سے کہتا کہ اے لوگو! مسئلۂ حکومت کے بارے میں بھی کوئی فکر کرو، تو یہ بات ایسی نہیں تھی کہ حکومتی مشینری اسے آسانی سے سن لے؛ لیکن اگر یہی بات نصیحت و موعظہ کے انداز میں، ایک زاہد اور عابد شخص کی زبان سے بیان ہو، تو کسی حد تک حکومتی مشینری کے لیے قابل قبول تھی، یعنی زیادہ حسّاس اور چوکنّا کر دینے والی نہیں تھی۔ بہرحال یہ امامؑ کے بیانات کی ایک قسم تھی۔[1]

دوسری قسم کے بیانات وہ ہیں جن میں امام زین العابدین علیہ السلام کے مخاطب کچھ مخصوص افراد ہیں۔ اگرچہ یہ مشخّص نہیں کہ وہ کون لوگ تھے لیکن یہ طے ہے کہ آپؑ کا خطاب ایک ایسے گروہ سے ہ جو موجودہ حکومت سے بیزار اور اس کا مخالف ہے، چاہے اس میں جو بھی ہوں۔ شاید یہ کہنا بھی غلط نہ ہو کہ یہ وہی گروہ ہے جو امامؑ کی اطاعت اور اہل بیت علیہم السلام کی حکومت پر یقین و اعتقاد رکھتا تھا۔

خوش قسمتی سے کتاب ”تحف العقول“ میں امام زین العابدین علیہ السلام کے اس قسم کے بیانات کا ایک نمونہ موجود ہے، (ایک نمونہ اس لیے کہ جب ہم اس طرح کی دوسری کتابوں کی چھان بین کرتے ہیں تو ان میں بھی ایسے چند نمونوں کے سوا آپؑ سے منقول کوئی چیز نہی ملتی) پھر بھی انسان یہ محسوس کر سکتا ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام کی زندگی میں اس طرح کے بے شمار نمونے پیش آئے تھے مگر حالات اور آپؑ کی حیات کے دوران پیش آنے والے حوادث، گھٹن کی زندگی، دشمنوں کے حملے، اذیتیں، اصحاب ائمہؑ کا قتل وغیرہ اس بات کا باعث بنے کہ وہ گراں بہا آثار باقی نہ رہ سکے، چنانچہ بہت ہی کم مقدار میں یہ چیزیں ہمارے ہاتھ لگ سکی ہیں۔

---

[1] پاسدار اسلام، شمارہ۹

بہر حال امام زین العابدین علیہ السلام کا یہ بیان کچھ اس طرح شروع ہوتا ہے:

''كَفَانَا اللهُ وَإِيَّاكُمْ كَيْدَ الظَّالِمِيْنَ وَبَغْيَ الْحَاسِدِيْنَ وَبَطْشَ الْجَبَّارِيْنَ''
خداوند ہمیں اور تمہیں ظالموں کے مکروفریب، حاسدوں کی بغاوت و سرکشی اور جابروں کے ظلم و زیادتی سے محفوظ و مامون رکھے۔

خطاب کا انداز بتاتا ہے کہ خود امامؑ اور آپؑ کا مخاطب گروہ، دونوں اس میں شریک ہیں؛ یعنی موجودہ حکومت اور نظام کی طرف سے وہ سب خطرے میں ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ بات ایک مخصوص گروہ سے تعلق رکھتی ہے اور اس جماعت کو لفظ مومنین یا اہل بیت علیہم السلام کے محبّین و مقرّبین سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس انداز کے خطابات ''يَا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ'' سے شروع ہوتے ہیں۔ جب کہ پہلی نوعیت کے بیانات میں''أَيُّهَا النَّاسُ'' یا بعض موارد میں ''يَابْنَ آدَمَ'' کہہ کر خطاب کیا گیا ہے اور یہاں ''أَيُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ'' ہے، یعنی امامؑ کے خطاب میں اپنے مخاطبین کے صاحبِ ایمان ہونے کا اعتراف موجود ہے اور یہ وہ مومنین ہیں جو اہل بیت علیہم السلام اور ان کے افکار و نظریات پر واقعی ایمان رکھتے تھے۔

اس منزل میں جب امامؑ اپنے اصل مطلب پہ آتے ہیں تو آپؑ کی گفتگو بھی اس چیز کی واضح نشاندہی کرتی ہے کہ آپؑ کے مخاطب، مومنین یعنی اہل بیت علیہم السلام سے قُربت رکھنے والے افراد ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

''أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الطَّوَاغِيْتُ وَأَتْبَاعُهُمْ مِنْ أَهْلِ الرَّغْبَةِ فِيْ هَذِهِ الدُّنْيَا اَلْمَائِلُوْنَ إِلَيْهَا اَلْمَفْتُوْنُوْنَ بِهَا اَلْمُقْبِلُوْنَ عَلَيْهَا''[1] یہ طاغوت اور ان کے فرمانبردار جو دنیا کے حریص، اس کے شیدائی، اس پر فریفتہ و قربان اور اس کی طرف دوڑنے والے لوگ ہیں، یہ کہیں تم کو فریب میں مبتلا نہ کر دیں۔

---

[1] اے ایمان والو! خبردار کہیں یہ طاغوت اور ان کے پیرو کار جو دنیا کے حریص اور اس پر فریفتہ ہو چکے ہیں، وہ تمہیں حق سے دور نہ کر دیں کیونکہ وہ دنیا سے دھوکہ کھا چکے اور اس پر فریفتہ ہو چکے ہیں۔ (تحف العقول، ص۲۵۲)

یہاں مومنین سے خطاب کے وقت اصل لب و لہجہ میں، ان کے شر سے محفوظ رہنے اور آئندہ ہم فکری کے ساتھ کام کرنے کے لیے آمادہ کیا جارہا ہے۔ ظاہر ہے موجودہ طاغوتی نظام کے طرفداروں اور ائمہ اطہارؑ کے ساتھیوں کے درمیان، اندر اندر جو شدید مخالفت اور مقابلہ آرائی جاری تھی اس کی وجہ سے ائمہ معصومینؑ کے چاہنے والوں کو بڑی سخت مشکلات اور رنج و مصیبت جھیلنی پڑ رہی تھیں۔ طبیعی طور پر وہ لوگ جو کسی ظالم نظام کے خلاف برسرپیکار ہوں، اپنی عادی زندگی میں محرومیت اور وسائل کی کمی کا شکار ہوتے ہیں، جب کہ دوسرے لوگ آسائشوں اور مادی نعمتوں سے سرشار ہوتے ہیں۔ مجاہدین اور برسرپیکار لوگوں کو جو سب سے بڑا خطرہ درپیش ہوتا ہے وہ ان کے آسائشوں اور مادی نعمتوں کی طرف متمائل ہونے کی صورت میں ہوتا ہے اور یہ چیز اس مقدس جہاد اور مبارزہ آرائی کو چھوڑے بغیر ممکن نہیں ہے۔

چنانچہ امامؑ کے بیان میں اس نکتے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، مومنین کو خبردار کیا گیا ہے ہے اگر اس دنیا کی عارضی چمک دمک اور آسائش کے دھوکے میں آگئے تو اس کی قیمت میں تم کو اہل طاغوت سے ہاتھ ملانا پڑے گا۔ امامؑ کا یہ انداز اور لب و لہجہ نہ صرف اس بیان میں، بلکہ آپؑ سے منقول بہت سے مختصر اقوال اور روایات میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر ان کو دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ امامؑ نے لوگوں کو دنیا سے اجتناب برتنے کی دعوت دی ہے۔

دنیا سے اجتناب کا کیا مطلب ہے؟ یعنی لوگوں کو اس لہر سے محفوظ رکھیں جو انسان کو ناز و نعم میں غرق کر دیتی ہے اور اس کے دام میں گرفتار ہوکر انسان اپنے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور اس کی انقلابی جدوجہد سرد پڑ جاتی ہے۔ یہ دعوت مومنین سے متعلق خطابات میں ملتی ہے۔ عوام الناس سے خطاب کے دوران یہ انداز بہت کم نظر آتا ہے۔ عوام سے خطاب کے وقت جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے، زیادہ تر اندازِ خطاب اس طرح کا ہوتا ہے: اے لوگو! خدا کی طرف متوجہ رہو، قبر و قیامت کا دھیان رکھو، خود کو کل کے لیے آمادہ کرو یا اسی طرح کی دوسری باتیں۔

ان حقائق کی روشنی میں اگر کوئی سوال کرے کہ اس قسم کے خطابات سے آخر امامؑ کا مقصد کیا تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ امامؑ ایک ہم فکر جماعت تیار کرنا چاہتے ہیں، امامؑ چاہتے ہیں کہ کسی ضروری موقع کے لیے مومنین کا ایک گروہ تیار رہے اور آپؑ انہیں اقتدار کی ہوس اور جھوٹی مراعات کی چکاچوند سے محفوظ رکھیں۔ اس قسم کے بیان میں امامؑ بار بار موجودہ نظام کا تذکرہ کرتے ہیں، جب کہ گزشتہ قسم کے بیان میں یہ چیز اتنی وضاحت کے ساتھ نظر نہیں آتی۔ یہاں امام زین العابدین علیہ السلام بہت سخت لب و لہجہ میں حکومتی مشینری پر تنقید کرتے اور اس کو شیطان کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ آپؑ فرماتے ہیں:

''إِنَّ الْأُمُوْرَ الْوَارِدَةَ عَلَيْكُمْ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ وَ لَيْلَةٍ مِنْ مُظْلِمَاتِ الْفِتَنِ وَ حَوَادِثِ الْبِدَعِ وَ سُنَنِ الْجَوْرِ وَ بَوَائِقِ الزَّمَانِ'' تم لوگوں کو جن اُمور سے شب و روز واسطہ پڑتا ہے (یعنی) یہ ظلمت خیز فتنے، نئی نئی بدعتیں (وہ بدعتیں جو ظالم نظام کی اختراع ہیں)، ظلم و جور پر مبنی سنّتیں اور زمانہ بھر کی سختیاں ہیں۔

''وَ هَيْبَةِ السُّلْطَانِ'' یہ (ظالم) سلطان کا خوف و ہراس ہے۔ ''وَ وَسْوَسَةِ الشَّيْطَانِ'' اور شیطانی وسوسے ہیں۔

یہاں امامؑ ذکرِ سلطان کے فوراً بعد وسوسۂ شیطان کا ذکر کرتے ہیں، یعنی پوری صراحت کے ساتھ حاکم وقت کا ذکر کرتے ہیں اور اس کو شیطان کا دستِ راست قرار دیتے ہیں۔ گفتگو کے آخر میں آپؑ ایک نہایت ہی عمدہ جملہ ارشاد فرماتے ہیں، چونکہ یہ جملہ بہت اہمیت کا حامل ہے لہٰذا ہم اسے یہاں نقل کرنا چاہتے ہیں، یہ جملہ اسی مطلب کی نشاندہی کرتا ہے جس کی طرف ہم ابھی اشارہ کر چکے ہیں۔ امامؑ فرماتے ہیں: ''لَتُثَبِّطُ الْقُلُوْبَ عَنْ تَنَبُّهِهَا'' یہ حوادث جو انسانی زندگی میں شب و روز پیش آتے ہیں، خصوصاً ایسے گھٹن کے ماحول میں، دلوں کو ان کی نیت اور جہت سے موڑ دیتے ہیں، جہاد کی کے شوق اور اس کے محرّکات کو ختم کر دیتے ہیں۔ ''وَ تُذْهِلُهَا عَنْ مَوْجُوْدِ الْهُدَىٰ'' موجودہ ہدایت، یعنی وہ ہدایت جو موجودہ معاشرے میں پائی

جاتی ہے، اس کی طرف سے ذہنوں کو غافل اور برگشتہ کر دیتے ہیں۔ ''وَمَعْرِفَةِ أَهْلِ الْحَقِ''[1] (اور انسان سے) اہلِ حق کی معرفت کو بُھلا دیتے ہیں اور اہلِ حق کی یاد کو ان کے دلوں میں باقی نہیں رہنے دیتے۔

امام زین العابدین علیہ السلام کے اس پورے بیان میں وہی اسلوب اور انداز پایا جاتا ہے، جس کا ہم نے شروع میں ذکر کیا ہے؛ یعنی لوگوں کو موعظہ و نصیحت کے انداز میں خبردار کر رہے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس طرح کے حوادثِ زندگی ان کو ان کی مجاہدانہ روش سے غافل بنا دیں اور انہیں ان کے راستے سے منحرف کر دیں اور دل و دماغ اس کی یاد سے خالی ہو جائیں۔ امامؑ کے ایسے متعدد بیانات ملتے ہیں جن میں سلطان و حاکمِ جَور کا ذکر کیا گیا ہے۔ امامؑ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

''وَإِيَّاكُمْ وَصُحْبَةَ الْعَاصِينَ وَمَعُونَةَ الظَّالِمِينَ''[2]

خبردار! گنہگاروں کی ہم نشینی اور ظالموں کی مدد سے ہمیشہ دور رہنا۔

امامؑ کے اس بیان میں گناہگاروں سے کون لوگ مقصود ہیں؟ مقصود وہ لوگ ہیں جو اس ظالمانہ نظام اور عبدالملک کی ظالمانہ مشینری کا حصہ بن گئے ہیں۔ امامؑ فرماتے ہیں کہ تم اپنے کسی بھی عمل سے ان کے مدد گار نہ بنو۔

اب ان حقائق کی روشنی میں امام سجاد علیہ السلام کی تصویر پردۂ تخیل پر اُتار کر دیکھئے کہ آپؑ کی کیسی شخصیت ذہن میں اُبھر کر آتی ہے؟ کیا اب بھی وہی مظلوم، بے زبان، کمزور اور بیمار امامؑ، جو زندگی کے اُمور سے کوئی مطلب نہیں رکھتا، آپ کے ذہن میں آتا ہے؟! امامؑ اپنے کچھ مومن دوستوں، طرفداروں اور بہی خواہوں کو ایک جگہ جمع کرتے ہیں اور موجودہ حالات میں ان کو ظالم حُکام اور درباریوں کی ہم نشینی اختیار کرنے نیز اپنی مقدس مہم اور جدوجہد سے غافل و بےپرواہ ہونے سے سختی کے ساتھ منع کرتے ہیں اور ان کو اجازت نہیں دیتے کہ وہ اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں سے منحرف

---

[1] اصول کافی، ج۸، ص۱۵

[2] اصول کافی، ج۸، ص۱۶

ہو جائیں۔ امامؑ ان کے ایمانی جذبات کو تروتازہ، زندہ اور باقی رکھنا چاہتے ہیں، تاکہ ایک دن ان کا وجود اسلامی حکومت کے قیام کی راہ میں مؤثر ثابت ہوسکے۔

مجملہ ان تمام چیزوں کے جو امامؑ کے بیانات کے اس حصے میں مجھے بہت ہی اہم اور قابلِ توجہ نظر آئیں، آپؑ کے وہ ارشادات ہیں جن میں اہل بیتؑ سے وابستہ افراد کے گزشتہ تجربات کا آپؑ نے ذکر فرمایا ہے۔ بیان کے اس حصّے میں امام زین العابدینؑ لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: کیا تم لوگوں کو یاد ہے (یا تم کو اس بات کی خبر ہے) کہ گزشتہ ادوار میں ظالم و جابر حکمرانوں نے تم پر کیا کیا زیادتیاں کی ہیں؟ یہاں اُن مصیبتوں اور زیادتیوں کی طرف اشارہ مقصود ہے، جو محبانِ اہل بیتؑ کو معاویہ، یزید اور مروان وغیرہ کے ہاتھوں اُٹھانی پڑی تھیں۔ چنانچہ امامؑ کا اشارہ واقعۂ کربلا، واقعہ حرّہ، حُجر ابن عَدیؓ اور رُشَید ہجری وغیرہ کی شہادت، نیز ایسے بہت سے مشہور و معروف اور اہم ترین واقعات اور سانحات کی طرف ہے، جن کا اہل بیتؑ کے چاہنے والے ایک طویل مدت سے سامنا کرتے چلے آرہے تھے اور وہ واقعات ان کے ذہنوں میں ابھی تک تازہ تھے۔ امامؑ چاہتے ہیں کہ گزشتہ تجربات اور تلخ ترین یادوں کو تازہ کر کے ان لوگوں کے مجاہدانہ عزم و ارادے میں مزید پختگی پیدا کریں۔ چنانچہ مندرجہ ذیل عبارت پر ذرا توجہ فرمائیے: ''فَقَدْ لَعَمْرِيْ اِسْتَدْبَرْتُمْ مِنَ الْأُمُوْرِ الْمَاضِيَةِ فِيْ الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ مِنَ الْفِتَنِ الْمُتَرَاكِمَةِ وَ الْاِنْهِمَاكِ فِيْهَا مَا تَسْتَدِلُّوْنَ بِهِ عَلَى تَجَنُّبِ الْغُوَاةِ''[۱] میری جان کی قسم! گزشتہ واقعات جو تمھاری آنکھوں کے سامنے گزر چکے ہیں، فتنوں کا ایک لامتناہی سلسلہ جس میں ایک دنیا غرق نظر آتی تھی، تمھیں ان حوادث و تجربات سے فائدہ اُٹھانا چاہیے اور ان کو اپنے لیے سبق اور استدلال بناتے ہوئے زمین پر فساد پھیلانے والے گمراہ اور بدعتی لوگوں سے دوری اختیار کر لینا چاہیے۔

یعنی تمھیں اس بات کا بخوبی تجربہ حاصل ہے کہ اہلِ بغی و فساد یعنی یہی ظالم حکمران، جب تسلُّط حاصل کر لیتے ہیں تو تمھارے ساتھ کس طرح پیش آتے ہیں۔ گزشتہ تجربات کی روشنی میں تم جانتے ہو کہ تمھیں ان لوگوں سے دور رہنا چاہیے اور

---

[۱] تحف العقول، ص۲۵۳

ان کے مقابلے میں صف آرائی کرنی چاہیے۔

امام زین العابدین علیہ السلام اپنے بیان میں مسئلۂ امامت کو بڑی صراحت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ مسئلۂ امامت یعنی خلافت و ولایت اور مسلمانوں پر حکومت کرنے اور نظامِ اسلامی کے نفاذ کا مسئلہ۔ یہاں امام زین العابدین علیہ السلام مسئلہ امامت کو واضح انداز میں بیان کرتے ہیں، حالانکہ اس وقت کے حالات ایسے تھے کہ اس قسم کے مسائل اتنی صراحت کے ساتھ عوام میں پیش نہیں کیے جا سکتے تھے، آپؑ فرماتے ہیں: ''فَقَدِّمُوْا أَمْرَاللّٰهِ وَطَاعَتَهُ وَطَاعَةَ مَنْ أَوْجَبَ اللّٰهُ طَاعَتَهُ'' فرمانِ الٰہی اور اطاعتِ الٰہی کو مقدّم رکھو اور اس ہستی کی اطاعت اور پیروی کرو جس کی اطاعت خدا نے واجب قرار دی ہے۔

امامؑ نے یہاں امامت کی بنیاد اور فلسفے کو شیعی نقطہ نظر سے بیان کیا ہے کہ خدا کے بعد وہ کون سے افراد ہیں جن کی اطاعت کی جانی چاہیے؟ وہ جن کی اطاعت خدا نے واجب قرار دی ہے۔ اگر لوگ اس وقت اس مسئلہ پر غور و فکر سے کام لیتے تو بڑی آسانی سے یہ نتیجہ نکال سکتے تھے کہ عبدالملک کی اطاعت واجب نہیں ہے، کیونکہ خدا کی طرف سے اس کی اطاعت واجب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عبدالملک کا اپنے ظلم و ستم اور اسلامی احکام سے بغاوت و فساد کی وجہ سے لائقِ اطاعت نہ ہونا، صاف ظاہر ہے۔ یہاں پہلے تو امامؑ مسئلۂ امامت بیان فرماتے ہیں، اس کے بعد صرف ایک شبہہ جو آپؑ کے مخاطبین کے ذہن میں باقی رہ جاتا ہے اس کا بھی ازالہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''وَلَا تُقَدِّمُوْا الْأُمُوْرَالْوَارِدَةَ عَلَيْكُمْ مِنْ طَاعَةِ الطَّوَاغِيْتِ وَفِتْنَةِ زَهْرَهِ الدُّنْيَا بَيْنَ يَدَيْ أَمْرِاللّٰهِ وَطَاعَتِهِ وَطَاعَةِ أُوْلِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ''[۱]

اور تم لوگوں پر طاغوتوں کی طرف سے جو احکام عائد کیے جاتے ہیں ان کو خدا کی اطاعت سمجھ کر خدا، اس کے رسولؐ اور اولی الامر کی اطاعت پر مقدّم قرار نہ دو۔

---

[۱] تحف العقول، ص۲۵۴

اصل میں امامؑ نے اپنے بیان کے اس ٹکڑے میں بھی مسئلۂ امامت کو بڑی صراحت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔

آپؑ نے گزشتہ بیان کے ساتھ، یہاں بھی دو بنیادی اور اساسی مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ چنانچہ دونوں بیانات میں مذکورہ تبلیغ کے تین مراحل (جنہیں ہم نے پہلے بیان کیا ہے) میں سے دو مرحلوں، یعنی لوگوں کو اسلامی افکار و عقائد کی یاد دہانی، تاکہ لوگ اسلامی عقائد کا پاس کریں اور ان میں دینداری کا شوق پیدا ہو سکے اور دوسرا مسئلہ ”ولایتِ امر“ یعنی نظامِ اسلامی میں حکومت اور قیادت کے استحقاق کو واضح کیا ہے۔ امامؑ اس وقت لوگوں میں ان دونوں مسائل کو بیان کرتے ہیں اور حقیقت میں اپنے مدِّنظر علوی نظام، یعنی اسلامی و الٰہی نظام کی تبلیغ کرتے ہیں۔

امام زین العابدین علیہ السلام کے یہاں ایک تیسری نوعیت کے حامل بیانات بھی ملتے ہیں، جو ان دونوں بیانات سے بھی زیادہ قابلِ توجہ ہیں۔ ان بیانات میں آپؑ اعلانیہ طور پر لوگوں کو ایک اسلامی تنظیم کی تشکیل کی طرف متوجہ کرتے ہیں، البتہ یہ بات اُن ہی لوگوں کے درمیان ہوئی ہے جن کا آپؑ کو اعتماد حاصل رہا ہے ورنہ اگر عام لوگوں کو اس قسم کی کسی جماعت کی تشکیل کی دعوت دی گئی ہوتی، تو اس بات کا راز میں رہنا مشکل ہو جاتا اور آپؑ کے لیے بڑی زحمت اور پریشانی کا سبب بن جاتا۔ خوش قسمتی سے ”تحف العقول“ میں اس نوعیت کے بیانات کا بھی ایک نمونہ موجود ہے جسے ہم یہاں نقل کر رہے ہیں۔[1]

---

[1] افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول اس قسم کی روایات کے انتخاب میں (جنہیں مختلف محدثین نے منتخب کیا ہے) کسی کی سرخی میں ان مطالب کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا گیا جن کو ہم نے بیان کیا ہے۔ غالباً انہوں نے اس قسم کی احادیث کو بھی زُہد و تقویٰ ہی کے ذیل میں بیان کیا ہے۔ البتہ حقیقت میں دیکھا جائے تو زُہد و تقویٰ بھی یہی ہے، لیکن عام طور پر زُہد سے جو مراد لیا جاتا ہے یہاں پر وہ مراد نہیں ہے لہٰذا اس مطلب کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ امامؑ اس قسم کے فرمودات کے ذریعے سیاسی مسائل کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ (مؤلف)

امام زین العابدین علیہ السلام کا بیان یوں شروع ہوتا ہے:

''أَنَّ عَلَامَةَ الزَّاهِدِيْنَ فِي الدُّنْيَا الرَّاغِبِيْنَ فِي الْآخِرَةِ تَرْكُهُمْ كُلَّ خَلِيْطٍ وَ خَلِيْلٍ وَرَفْضُهُمْ كُلَّ صَاحِبٍ لَا يُرِيْدُ مَا يُرِيْدُوْنَ''[1]

دنیا کے زاہدین جو دنیا کے پیچھے نہیں بھاگتے اور اپنی دلچسپی آخرت پر مرکوز رکھتے ہیں، ان کی پہچان اور علامت یہ ہے کہ ان کے جو دوست ان کے ہم فکر، ہم عقیدہ اور ہم مشرَب نہیں ہوتے، وہ ان کو چھوڑ دیتے ہیں۔

کیا یہ واضح طور پر ایک شیعی تنظیم کی تشکیل کی دعوت نہیں ہے؟ اس بیان سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ جو لوگ آپؑ کے مطالبات و خیالات سے اتفاق نہیں رکھتے اور جن کے احساس و جذبات بالکل مختلف ہیں، جو حکومتِ حق یعنی علوی نظام نہیں چاہتے، آپؑ کے دوستوں کو چاہیے کہ ان سے کنارہ کش ہو کر ان سے اجنبی اور بیگانہ بن جائیں۔ البتہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کے یہاں آمد و رفت بند اور ان سے تعلقات ختم کر لیں۔ یہ تعلقات ویسے ہی ہوں جیسے انقلابِ اسلامی ایران سے پہلے ملت ایران ساواک اور دوسرے حکومتی کارندوں کے ساتھ رکھتی تھی۔ یعنی امامؑ فرماتے ہیں وہ لوگ جو تمہاری فکر و عزائم سے متفق نہ ہوں یا ہدف و مقصد سے ہم آہنگی نہ رکھتے ہوں، ان کے ساتھ تمہارے معاملات اور آمد و رفت کسی اجنبی اور بیگانے کی مانند ہونی چاہیے، ان سے دوستانہ تعلقات ختم کر دینے چاہییے۔[2]

امام زین العابدین علیہ السلام کے کچھ بیانات ایسے بھی ہیں جن کے مطالب کلی نوعیت کے ہیں، ان میں ان مخصوص پہلوؤں پر بحث نہیں کی گئی ہے جن کی طرف ہم نے

---

[1] بحار الانوار، ج۷۵، ص۱۲۸

[2] میں سمجھتا ہوں اس طرح کے مزید بیانات خود امام زین العابدین علیہ السلام اور دیگر ائمہ طاہرین علیہم السلام کے یہاں بھی مل جائیں گے بلکہ دیگر ائمہؑ کے ارشادات میں یہ باتیں زیادہ ملی گی جہاں تک خود میرا مطالعہ ہے اس طرح کے بیانات امام جعفر صادق علیہ السلام اور امام محمد باقر علیہ السلام نیز ان کے بعد کم از کم تین چار ائمہ اہل بیتؑ کے یہاں مجھے ملے ہیں حتیٰ کہ امیر المومنین علیہ السلام کے فرمودات میں بھی منظم و مرتّب اسلامی جماعت کی تشکیل کی طرف اشارے ملتے ہیں، البتہ یہاں اس تفصیل طلب موضوع پر زیادہ بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ (مؤلف)

اشارہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر امام زین العابدین علیہ السلام کا ایک رسالہ، حقوق سے متعلق ہے جو دراصل آپؑ کا نہایت ہی مفصّل خط ہے اور ہماری اصطلاح میں اس کو ایک مستقل رسالہ کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، جی ہاں! یہ ایک کتاب جو ”رسالۃ الحقوق“ کے نام سے مشہور ہے آپؑ کا ایک خط ہے جو آپؑ نے اپنے کسی مُحبّ کے نام لکھا ہے اور اس میں انسانوں کے ایک دوسرے پر حقوق اور ذمہ داریوں کا ذکر فرمایا ہے، یقیناً یہ ایک رسالہ سے کم نہیں ہے۔

آپؑ نے اس خط میں مختلف جہتوں سے لوگوں کے ایک دوسرے پر حقوق کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ مثلاً خدا کے بندوں پر حقوق، اعضا و جوارح کے حقوق، کان کے حقوق، آنکھ کے حقوق، زبان کے حقوق، ہاتھ کے حقوق وغیرہ۔ اسی طرح اسلامی معاشرے کے حاکم کے عوام پر اور عوام کے حاکم پر حقوق ہیں۔ دوستوں کے حقوق، پڑوسیوں کے حقوق، خاندان کے حقوق وغیرہ۔ ان تمام حقوق کا اس عنوان سے ذکر کیا گیا ہے جس کا لحاظ ایک اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنے والے شخص کے لیے رکھنا ضروری ہے۔ گویا امامؑ نے بہت ہی نرم انداز میں حکومت سے مقابلہ آرائی یا آئندہ نظام کا حوالہ دیئے بغیر، مستقبل میں قائم کیے جانے والے نظام کی بنیادوں کو بیان کر دیا ہے کہ اگر ایک دن خود امام زین العابدین علیہ السلام کے زمانۂ حیات میں (جس کا اگرچہ احتمال نہیں تھا) یا آپؑ کے بعد آنے والے زمانہ میں اسلامی نظامِ حکومت قائم ہو جائے تو مسلمانوں کے اذہان باہمی ذمہ داریوں سے پہلے ہی مانوس رہیں۔ دوسرے لفظوں میں آپؑ لوگوں کو آئندہ کی متوقّع اسلامی حکومت سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی امام زین العابدین علیہ السلام کے بیانات کی ایک قسم ہے، جو بہت ہی زیادہ قابل توجہ ہے۔

ایک قسم وہ بھی ہے جس کا مشاہدہ ہم صحیفہ سجادیہؑ میں کرتے ہیں۔ ظاہر ہے صحیفہ سجادیہؑ سے متعلق کسی بحث کے لیے بڑی تفصیل و تشریح کی ضرورت ہے۔ مناسب یہی ہے کہ کوئی اس کتاب پر باقاعدہ کام کرے۔ صحیفہ سجادیہؑ دعاؤں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں ان تمام موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے جن کی طرف بیدار اور ہوشمند انسان اپنی زندگی میں متوجہ ہوتا ہے۔ ان دعاؤں میں زیادہ تر انسان کے قلبی

روابط اور معنوی ارتباطات کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں بے شمار مناجاتیں اور دعائیں مختلف انداز سے معنوی ارتقاء کی خواہش و آرزو سے پُر ہیں۔ امامؑ نے ان دعاؤں کے ضمن میں، دعاؤں کی ہی زبانی لوگوں کے ذہنوں میں اسلامی زندگی کا ذوق و شعور بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

دعا کے ذریعہ جو فائدے اُٹھائے جا سکتے ہیں، ان میں سے ایک وہ بھی ہے جسے میں کئی مرتبہ ذکر کر چکا ہوں کہ دعا لوگوں کے قلوب میں ایک صحیح و سالم محرّک اور رُجحان پیدا کر دیتی ہے جس وقت آپ کہتے ہیں:

”اَللّٰھُمَّ اجۡعَلۡ عَوَاقِبَ اُمُوۡرِنَا خَیۡراً“ خدایا ہمارا انجام بخیر فرما۔

تو ظاہر ہے آپ کے دل میں اس وقت انجام کار کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور آپ عاقبت کی فکر میں ہوتے ہیں۔ بعض وقت انسان اپنی عاقبت سے غافل ہو جاتا ہے، اپنے حال میں مست زندگی گزارتا ہے اور اسے اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ عاقبت کا تصوّر انسانی سرنوشت کے تعیُّن میں بہت ہی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جب آپ نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا لیے تو فوراً ذہن اس طرف متوجہ ہوا اور انجام پر نظر رکھنے کا جذبہ بیدار ہو گیا اور پھر آپ اس فکر میں پڑ گئے کہ ایسے اُمور انجام دیں جو آپ کی عاقبت بہتر بنا سکیں۔ ویسے اس کو کس طرح بہتر بنایا جا سکتا ہے، یہ ایک دوسری بحث ہے۔ میں تو اس مثال کے ذریعے صرف اس بات کی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا کہ دعا کس طرح انسان کے اندر ایک صحیح اور سچا جذبہ بیدار کر دیتی ہے۔ صحیفہ سجادیہؑ ایک ایسی کتاب ہے جو شروع سے آخر تک دعاؤں کے قالب میں ایسے ہی اعلیٰ جذبات و افکار سے معمور ہے، جن پر انسان اگر غور کرے تو صرف یہی صحیفہ سجادیہؑ معاشرے کی اصطلاح اور بیداری کے لیے کافی ہے۔

فی الحال اس بحث کو ہم یہیں ختم کرتے ہیں، البتہ اس کے علاوہ بھی ایسی بہت سی چھوٹی روایتیں ہیں جو امام زین العابدین علیہ السلام سے نقل ہوئی ہیں جس کا ایک نمونہ ہم گزشتہ بحث کے ذیل میں پیش کر چکے ہیں۔ جیسا کہ امامؑ فرماتے ہیں:

''اَوَلَا حُرٌّ یَدَعُ هٰذِهِ اللُّمَاظَةَ لِأَهْلِهَا''

''لُمَاظَةَ'' یعنی کتے کا جوٹھا، ملاحظہ کیجئے کہ امام زین العابدین علیہ السلام کا یہ بیان کتنا اہم ہے۔ کیا ایک حرّیت پسند اور آزادی خواہ ایسا نہیں، جو کتے کے جوٹھے کو اس کے اہل کے لیے چھوڑ دے! کتّے کا جوٹھا کیا ہے؟ یہی دُنیوی آرائش، اُونچے اونچے محل، شان و شوکت اور چمک دمک، وہ چیزیں جن کی طرف تمام کمزور دل افراد عبدالملک کے دور میں کھنچے چلے جارہے تھے۔ ان کو امامؑ نے کتّے کے جوٹھے سے تعبیر کیا ہے۔ وہ تمام لوگ جو عبدالملک کی غلامی یا اس کے غلاموں کی غلامی میں مشغول تھے یا انہیں کے راستوں پر چل رہے تھے، ان سب کا مقصد یہی کتّے کی جوٹھی غذا کا حاصل کرنا تھا؛ امامؑ اسی لیے فرماتے ہیں کہ کتّے کے جوٹھے کے پیچھے بھاگتے نہ پھرو، تاکہ مومنین عبدالملک کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس کر اس کی طرف راغب نہ ہونے پائیں۔

اس طرح کے نہایت ہی قابلِ توجہ انقلابی بیانات امامؑ کے ارشادات میں بہت زیادہ ملتے ہیں جن کا انشاء اللہ ہم آگے چل کر ذکرکریں گے۔ اسی فہرست میں آپؑ کے اشعار بھی شامل ہیں، امام زین العابدین علیہ السلام نے اشعار بھی کہے ہیں اور ان اشعار کے مضامین بھی اسی قسم کے ہیں۔ انشاء اللہ ہم آگے اس پر روشنی ڈالیں گے۔[1]

امام زین العابدین علیہ السلام کی زندگی کے مختلف حصّوں کا جائزہ لیتے وقت ہمیں اس چیز کی طرف توجہ کرنے کی بھی ضرورت ہے کہ آیا امامؑ نے اپنے زمانے کے ظالمانہ نظامِ حکومت کے مدِّمقابل کوئی مسلحانہ جدوجہد اور کوشش بھی کی ہے یا نہیں؟ گزشتہ بحثوں میں ہم نے مختصر طور پر اس مطلب کی طرف اشارہ کیا ہے، اب ذرا تفصیل کے ساتھ اس مطلب کو بیان کرتے ہیں:

---

[1] پاسدار اسلام، شمارہ ۱۰

ائمہ اطہار ؑ کی تحریک کے تیسرے مرحلے کا آغاز

جہاں تک امام زین العابدین ؑ کی حیاتِ مبارکہ کا میں نے مطالعہ کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا کہ مجھے آپؑ کی زندگی میں کوئی ایک موقع بھی ایسا نہ مل سکا جہاں حکومت سے آپؑ نے اس طرح کھلے عام تعرُّض کیا ہو، جیسے دیگر ائمہ طاہرین کے ہاں مثلاً بنی اُمیہ کے دور میں امام جعفر صادق ؑ یا بعد میں امام موسیٰ کاظم ؑ کے یہاں نظر آتا ہے۔

اس کی وجہ بھی معلوم ہے کیونکہ ائمہ معصومین ؑ کی امامت اور سیاسی تحریک کے چار ادوار ہیں۔ ان کے تیسرے مرحلے کا آغاز امام زین العابدین ؑ کی زندگی سے ہوتا ہے۔ اگر اسی مرحلہ میں خلافت سے تعرُّض کی تحریک شروع کر دی جاتی تو پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ خطروں سے معمور، ذمہ داریوں کا یہ کارواں وہاں نہیں پہنچ سکتا تھا جس منزل تک اہل بیت ؑ اسے لے جانا چاہتے تھے۔ وہ گلستانِ اہل بیت ؑ جس کی تربیت و آبیاری امام زین العابدین ؑ جیسے ماہرانہ صلاحیت کے حامل باغباں کر رہے تھے، ابھی یہ باغ اتنا زیادہ مستحکم اور پائیدار نہیں ہو سکا تھا۔ اس باغ میں ایسے نونہال پودے بھی موجود تھے جن میں طوفانی جھکّڑوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ جیسا کہ ہم اس بحث کے آغاز میں اشارہ کر چکے ہیں۔ امامؑ کے گرد و پیش اہل بیت ؑ سے محبت و عقیدت رکھنے والے مومنین کی بہت ہی مختصر تعداد تھی اور اس زمانے میں ممکن نہیں تھا کہ اس قلیل تعداد کو جس کے کاندھوں پر شیعی تنظیم چلانے کی عظیم ذمہ داری بھی تھی، ظالم تھپڑوں کے حوالے کر کے ان کو موت کے گھاٹ اُتر جانے پر مجبور کر دیں۔

اگر چاہیں تو امام زین العابدین ؑ کے اس دور کو مکہ میں پیغمبر اسلام ﷺ کی دعوت کے ابتدائی دور سے تشبیہ دی جا سکتی ہے، یعنی دعوتِ اسلام کے وہ چند ابتدائی سال جب علی الاعلان دعوت دینا بھی ممکن نہ تھا۔ اسی طرح شاید امام محمد باقر ؑ کے دور کو پیغمبر اکرم ﷺ کی تبلیغ کے دوسرے دور اور پھر اس کے بعد کے ادوار کو دعوتِ اسلام کے بعد کے ادوار سے تشبیہ دینا غلط نہ ہوگا۔ لہٰذا تعرُّض اور مڈبھیڑ کی حکمتِ عملی ابھی صحیح طور پر انجام نہیں دی جا سکتی تھی۔

یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہی تیز و تُند حکمتِ عملی، جو امام جعفر صادق علیہ السلام، امام موسی کاظم علیہ السلام اور امام علی رضا علیہ السلام کے بعض کلمات سے مترشّح ہوتی ہے، امام زین العابدین علیہ السلام بھی اپنا لیتے تو عبدالملک بن مروان جس کا اقتدار پورے اوج پر نظر آتا ہے، بڑی آسانی کے ساتھ تعلیماتِ اہل بیت علیہم السلام کی پوری بساط اُلٹ کے رکھ دیتا اور پھر نئے سرے سے کام شروع کرنا پڑتا اور یہ اقدام ہرگز عاقلانہ اور دُور اندیشی پر مبنی نہ ہوتا۔

اس کے باوجود امام زین العابدین علیہ السلام کے ارشادات و اقوال میں، جو غالباً آپؑ کی زندگی اور طویل دورِ امامت کے آخری دنوں سے مربوط ہیں، کہیں کہیں حکومتی مشینری کے ساتھ تعرُّض و مخالفت کے اشارے بھی مل جاتے ہیں۔[1]

ائمہ اطہار علیہم السلام کی تعرُّض آمیز روش کے جلوے مختلف شکلوں میں ظاہر ہوئے، جن میں سے ایک شکل تو وہی تھی جو محمد بن شہاب زہری کے نام امام زین العابدین علیہ السلام کے خط میں قارئین نے ملاحظہ کیا۔ ایک اور شکل معمولی دینی مسائل اور اسلامی تعلیمات کے پردے میں اُموی خلفاء کے کردار کی حقیقت پر روشنی کے حوالے سے تھی۔ چنانچہ ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: ''إِنَّ بَنِي أُمَيَّةَ أَطْلَقُوا لِلنَّاسِ تَعْلِيمَ الْإِيمَانِ وَلَمْ يُطْلِقُوا تَعْلِيمَ الشِّرْكِ لِكَيْ إِذَا حَمَلُوهُمْ عَلَيْهِ لَمْ يَعْرِفُوهُ''[2] یعنی بنی اُمیہ نے لوگوں کے لیے ایمانی تعلیمات کی راہیں کھلی چھوڑ رکھی ہیں، لیکن شرک کی حقیقت کو سمجھنے کی راہیں بند کر دی ہیں کیونکہ اگر عوام شرک کے مفہوم سے نابلد رہیں گے تو شرک (کی حقیقت) بھی نہ سمجھ سکیں گے اور باآسانی شرک کے رستے پر چلائے جا سکیں گے۔

مطلب یہ ہے کہ بنی اُمیہ نے علماء اور متدیّن افراد منجملہ ائمہ معصومین علیہم السلام کو نماز، روزہ، حج، زکات نیز دیگر عبادات اور اس طرح توحید و نبوّت سے متعلق بحث و

---

[1] یہاں پر اس بات کی طرف اشارہ کرتا چلوں کہ اِس وقت امامؑ کے جس رویے کو ہم بیان کر رہے ہیں وہ آپؑ کے اُس رویے کے برعکس ہے، جسے آپؑ نے یزید اور آل ابوسفیان کی خلافت کے خلاف اپنایا تھا۔ وہ ایک الگ بحث ہے جس کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔ (مؤلف)

[2] الکافی، ج۲، ص۴۱۵

گفتگو کرنے کی مکمل چھوٹ دے رکھی تھی کہ وہ ان موارد میں احکامِ الٰہی بیان کر سکتے تھے؛ لیکن انہیں اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ وہ شرک کا مفہوم اور اس کے مصادیق، نیز اسلامی معاشرے میں موجود اس کے جیتے جاگتے مظاہر کو بحث اور تدریس کا موضوع قرار دیں؛ اس لیے کہ اگر عوام النّاس کو شرک سے متعلق اسلامی معارف کا علم ہو گیا تو وہ مشرک چہروں کو پہچان لیں گے اور فوراً سمجھ جائیں گے کہ بنی اُمیہ جن اوصاف کے حامل اور جس کی طرف عوام کو گھسیٹ کر لے جانا چاہتے ہیں دراصل یہ بھی شرک ہے۔ وہ پہچان لیں گے کہ عبدالملک بن مروان اور دیگر خلفائے بنو اُمیہ طاغوتی ہیں، جنھوں نے خدا کے مقابلے میں سر اُٹھا رکھا ہے گویا جس نے بھی ان کی اطاعت کی ہے دراصل اس نے شرک کے مجسموں کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ عوام کے درمیان شرک سے متعلق حقائق و معارف بیان کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔

جب ہم اسلام میں توحید کے موضوع پر بحث کرتے ہیں تو ہماری اس بحث کا ایک بڑا حصّہ شرک اور مشرک کی شناخت سے مربوط ہوتا ہے۔ بُت کسے کہتے ہیں اور کون بُت پرست ہے؟

علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار میں بڑی عمدہ بات کہی ہے وہ فرماتے ہیں:

''إِنَّ آيَاتِ الشِّرْكِ ظَاهِرُهَا فِي الْأَصْنَامِ الظَّاهِرَةِ وَ بَاطِنُهَا فِي خُلَفَاءِ الْجَوْرِ الَّذِيْنَ أَشْرَكُوْا مَعَ أَئِمَةِ الْحَقِّ وَ نَصَبُوْا مَكَانَهُمْ''[1]

قرآن میں شرک کے حوالے سے جو آیتیں آئی ہیں وہ بظاہر، ظاہری بتوں سے مربوط ہیں؛ لیکن باطن میں اگر تاویل کی جائے تو ان کے مصداق ظالم خلفاء ہیں، جنھوں نے خلافت کے نام پر حکومتِ اسلامی کا دعویٰ کیا اور اسلامی معاشرے پر حاکمیت میں خود کو ائمہ اطہارعلیہم السلام کا شریک قرار دے دیا ہے۔ جب کہ ائمہ حق علیہم السلام کے ساتھ یہ شرک، خدا کے ساتھ شرک کے مترادف ہے کیونکہ ائمہ حق علیہم السلام خدا کے

---

[1] بحار الانوار، ج۴۸، ص۹۶-۹۷

نمائندے ہیں ان کے ذہن میں خدا کی زبان ہوتی ہے وہ خدا کی باتیں کرتے ہیں اور چونکہ ظالم خلفاء نے ان کی جگہ بیٹھ کر دعوائے امامت میں خود کو ان کا شریک بنا دیا ہے، لہٰذا وہ سب طاغوتی بُت ہیں اور جو شخص ان کی اطاعت اور پیروی کرے، دراصل وہ مشرک ہے۔

علامہ مجلسیؒ نے اس کے بعد مزید وضاحت کی ہے۔ چنانچہ یہ بیان کرتے ہوئے کہ قرآنی آیات، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ ہر عصر اور ہر دور کے لیے ہیں؛ وہ فرماتے ہیں: ''فَهُوَ يَجْرِيْ فِيْ أَقْوَامٍ تَرَكُوْا طَاعَةَ أَئِمَّةِ الْحَقِّ وَاتَّبَعُوْا أَئِمَّةَ الْجَوْرِ'' یہ شرک کی تعبیر، ان قوموں پر بھی صادق آتی ہے جنہوں نے ائمہ حق علیہم السلام کی اطاعت چھوڑ دی ہے اور ائمہ جور سے الحاق اور ان کی پیروی کر لی ہے۔

''لِعُدُوْلِهِمْ عَنِ الْأَدِلَّةِ الْعَقْلِيَّةِ وَالنَّقْلِيَّةِ وَأَتْبَاعِهِمُ الْأَهْوَاءَ وَعُدُوْلِهِمْ عَنِ النُّصُوْصِ الْجَلِيَّةِ''[1]

کیونکہ ان لوگوں نے ان عقلی اور نقلی دلائل سے (جو مثال کے طور پر عبدالملک کی مسلمانوں پر حکومت و خلافت کی نفی کرتے ہیں) منہ موڑ لیا اور اپنی ہوا و ہوس کی پیروی شروع کر دی، روشن اور واضح نصوص کو ٹھکرا دیا۔

لوگوں نے دیکھا کہ حُکامِ وقت سے ٹکر لینے کی نسبت، یہ زندگی آرام دہ بھی ہے اور ہر طرح کی تکلیف سے خالی بھی، لہٰذا اسی راحت طلبی میں لگ گئے اور ان ظالم حکمرانوں کی پیروی کر لی۔ لہٰذا وہ بھی مشرک قرار پاتے ہیں۔

ان حالات میں اگر ائمہ اطہار علیہم السلام شرک کے بارے میں کچھ بیان کرنا چاہیں تو حکومتی مشینری اور دربارِ خلافت سے ایک طرح کا مقابلہ شمار ہوگا اور یہ بات امام زین العابدین علیہ السلام کی زندگی اور آپؑ کے کلمات موجود ہے۔

---

[1] بحار الانوار، ج۴۸، ص۹۷

اس مخالفت کا ایک اور نمونہ ہم امامؑ اور اس جابر اور مقتدر اُموی خلیفہ عبدالملک کے درمیان ہونے والی بعض خط و کتابت میں دیکھتے ہیں، جس کے دو روشن نمونوں کی طرف یہاں اشارہ مقصود ہے:

۱۔ ایک دفعہ عبدالملک بن مروان نے امام زین العابدینؑ کو خط لکھا اور اس میں آپؑ کو آپؑ کی ایک آزاد کردہ کنیز کے ساتھ عقد کر لینے پر تنقید کا نشانہ بنایا۔ اصل میں آپؑ کے پاس ایک کنیز تھی جس کو آپؑ نے پہلے آزاد کر دیا پھر اس کے بعد اس سے نکاح کر لیا۔ عبدالملک نے خط لکھ کر امامؑ کے اس عمل پر سخت تنقید کی۔ ظاہر ہے امامؑ کا یہ عمل نہ صرف انسانی بلکہ ہر اعتبار سے اسلامی تھا، کیونکہ ایک کنیز کو کنیزی کی زنجیر سے آزادی دینا اور پھر عزت و شرافت کا تاج پہنا کر اس کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر لینا، یقیناً انسانیت کا اعلیٰ ترین شاہکار تھا۔ اگرچہ عبدالملک کے خط لکھنے کا مقصد کچھ اور تھا، وہ امامؑ کے اس مستحسن عمل کو تنقید کا نشانہ بناکر آپؑ کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ ہم آپ کے داخلی مسائل سے بھی آگاہی رکھتے ہیں۔ گویا اس خط کی آڑ میں آپؑ کو آپؑ کی ذاتی سرگرمیوں کے سلسلے میں متنبّہ کرنا چاہتا تھا۔ امام زین العابدینؑ جواب میں ایک خط تحریر فرماتے ہیں، جس میں لکھتے ہیں: (میرا) یہ عمل کسی طرح بھی قابلِ اعتراض نہیں قرار دیا جا سکتا۔ بزرگوں نے بھی اس طرح کا عمل انجام دیا ہے، حتیٰ کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہاں بھی اسی طرح کا عمل ملتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں میرے اُوپر کوئی تنقید نہیں کی جا سکتی۔ ''فَلَا لُؤْمَ عَلَى مُسْلِمٍ إِنَّمَا اللُّؤْمُ لُؤْمُ الْجَاهِلِيَّةِ''[۱] یعنی ایک مسلمان کے لیے کسی طرح کی ذلت و خواری نہیں ہوئی، ذلت و پستی صرف جہالت کی ہوتی ہے۔

عبدالملک کے لیے اس جملے میں بڑا ہی لطیف طنز اور نصیحت مضمر ہے، کتنے حسین انداز میں اسے اس کے آباء و اجداد کی حقیقت کی طرف متوجہ کر دیا گیا ہے کہ یہ تم ہو جس کا خاندان جاہل و مشرک اور دشمنِ خدا رہا ہے اور جن کی خصوصیات تم کو وراثت میں ملی ہیں!! اگر شرم ہی کی بات ہے تو تم کو اپنی اصلیت پر شرم کرنی چاہیے

---

[۱] بحار الانوار، ج۴۶، ص۱۰۵

میں نے تو ایک مسلمان عورت سے شادی کی ہے اس میں شرم کی کیا بات ہے؟

جب یہ خط عبدالملک کو ملا تو عبدالملک کا دوسرے نمبر کا بیٹا سلیمان اس کے پاس موجود تھا۔ خط پڑھا گیا تو اس نے بھی سنا اور امامؑ کی طنزآمیز نصیحت، باپ کی طرح اس نے بھی محسوس کی۔ اس نے باپ سے مخاطب ہو کر کہا: اے امیر المومنین! دیکھا علی بن حسین علیہ السلام نے آپ پر کس طرح فخر کا اظہار کیا ہے؟ وہ اس خط میں آپ کو سمجھانا چاہتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا تو تمام مومن اور موحّد رہے ہیں اور تیرے باپ دادا کافر و مشرک رہے ہیں۔ سلیمان باپ کو بھڑکانا چاہتا تھا تاکہ اس خط کے سلسلے میں عبدالملک کوئی سخت اقدام کرے؛ لیکن عبدالملک بیٹے سے زیادہ سمجھدار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نازک مسئلے میں امام زین العابدین علیہ السلام سے اُلجھنا درست نہیں۔ لہٰذا اس نے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا: میرے بیٹے! کچھ نہ کہو تم نہیں جانتے یہ بنی ہاشم کی زبان ہے جو پتھروں میں بھی شگاف پیدا کر دیتی ہے، یعنی ان کا استدلال ہمیشہ قوی اور لہجہ سخت ہوتا ہے۔

۲۔ دوسرا نمونہ امام زین العابدین علیہ السلام کا ایک دوسرا خط ہے جو عبدالملک کی ایک فرمائش ردّ کرنے پر اس کی جانب سے ایک دھمکی آمیز خط کے جواب میں آپؑ نے تحریر فرمایا۔ واقعہ کچھ یوں ہے:

جب عبدالملک کو معلوم ہوا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلوار امام زین العابدین علیہ السلام کی تحویل میں ہے اور یہ ایک قابلِ توجہ چیز تھی کیونکہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یادگار اور فخر کا ذریعہ بھی تھی اور اب اس کا امام زین العابدین علیہ السلام کی تحویل میں چھوڑ دینا، عبدالملک کے لیے خطرناک تھا کیونکہ یہ لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ لہٰذا اس نے امام زین العابدین علیہ السلام کو ایک خط لکھا اس میں درخواست کی کہ یہ تلوار اس کے حوالے کر دیں اور یہ بھی تحریر کیا کہ اگر آپؑ کو مجھ سے کوئی کام ہو تو میں حاضر ہوں۔ مطلب یہ تھا کہ میں آپؑ کو اس تلوار کا عوض دینے کو بھی تیار ہوں۔

امام زین العابدین علیہ السلام کا جواب انکار میں تھا، لہٰذا اُس نے دوبارہ ایک اور دھمکی آمیز

خط لکھا کہ اگر تلوار نہ بھیجی گئی تو میں بیت المال سے آپؑ کا وظیفہ بند کر دوں گا۔[1]

امام عالی مقامؑ نے اس دھمکی کے جواب میں تحریر فرمایا: ”امّا بعد! خداوند عالم نے ذمہ داری لی ہے کہ وہ اپنے پرہیز گار بندوں کو ناگوار چیزوں سے نجات عطا کرے گا اور ایسی جگہ سے روزی دے گا جس کا وہ سوچ بھی نہیں سکتے اور قرآن میں ارشاد اقدسِ الٰہی ہے: ”إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُورٍ“[2] یقیناً خدا کسی ناشکرے خیانت کار کو دوست نہیں رکھتا۔

اب تم دیکھو کہ یہ آیت ہم دونوں میں سے کس پر منطبق ہوتی ہے۔“

ایک خلیفۂ وقت کے مقابلے میں یہ لہجہ بہت زیادہ سخت تھا کیونکہ یہ خط جس کسی کے ہاتھ لگے گا وہ خود فیصلہ کر لے گا کہ امامؑ خود کو خائن اور ناشکرا نہیں سمجھتے اور کوئی دوسرا بھی اس عظیم ہستی کے بارے میں ایسا رکیک تصور نہیں رکھتا، کیونکہ آپؑ کا شمار خاندانِ نبوّت کے منتخب اور شائستہ ترین افراد میں ہوتا تھا اور ہرگز اس آیت کے مستحق قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ چنانچہ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ امام زین العابدینؑ کی نظر میں عبدالملک خائن اور ناشکرا ہے۔

دیکھئے! کس شدید انداز میں امام زین العابدینؑ عبدالملک کی دھمکی کا جواب دیتے ہیں۔ اس سے آپؑ کے فیصلہ کن کردار کی حدود کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بہر حال یہ اُموی سرکار کی نسبت امامؑ کی مزاحمت آمیز طرزِ عمل کی دو روشن مثالیں تھیں۔

٣۔ اگر اس میں مزید کسی نمونے کا اضافہ کرنا چاہیں تو وہ اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں جو خود امام زین العابدینؑ یا آپؑ کے دوستوں سے نقل ہوئے ہیں، یہ بھی حکومت کی مخالفت کے اظہار کا انداز ہے کیونکہ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ خود امامؑ نے خلفاء پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا، تب بھی آپؑ کے قریبی افراد اُن پر معترض رہے ہیں

---

[1] اس زمانے میں تمام لوگوں کو بیت المال سے حصّہ ملتا تھا امامؑ بھی دوسرے لوگوں کی طرح اپنا حصّہ لے لیتے تھے۔ (مؤلف)

[2] سورہ حج، آیت٣٨

اور یہ خود ایک طرح سے امامؑ کی مزاحمت میں شمار کیا جائے گا۔

چند اشعار تو خود امام زین العابدین علیہ السلام کے ہیں جو بہت ہی انقلابی ہیں۔ فرزدق کے اشعار بھی ایک نمونہ ہیں۔ فرزدق کے واقعے کو مورّخین و محدّثین دونوں نے نقل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: ہشام یعنی خلیفہ عبدالملک کا بیٹا، اپنے دورِ خلافت سے قبل مکہ گیا۔ طواف کے دوران وہ حجرِ اسود کو چُھونا چاہتا تھا کیونکہ طواف میں حجرِ اسود کو چُھونا اور مَس کرنا مستحب ہے۔ لیکن حجرِ اسود کے قریب مجمع زیادہ ہونے کی وجہ سے ہزار کوشش کے باوجود حجرِ اسود کے قریب نہ جا سکا، حالانکہ وہ خلیفۂ وقت کا فرزند اور ولی عہد تھا اور رفیقوں اور محافظوں کے ایک دستے کے ہمراہ حکومتی انتظام کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ پھر بھی لوگوں نے اس کی حیثیت اور شاہی کرّ وفرّ کی پرواہ کیے بغیر اس کو موقع نہ دیا۔ یہ ناز و نعم کا پروردہ ان افراد میں سے تو تھا نہیں کہ انسانوں کے ہجوم میں دھکّے کھاتا ہوا حجرِ اسود کو مَس کرے اور بوسہ دے۔ چنانچہ حجرِ اسود کے استلام سے مایوس ہوکر مسجد الحرام میں ایک بلند جگہ بیٹھ گیا اور وہیں بیٹھ کر مجمع کا تماشہ دیکھنے لگا۔ اس کے ارد گرد بھی کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی دوران ایک شخص وقار و متانت کا مرقّع، ملکوتی زُہد و وَرع کے ساتھ طواف کرنے والوں کے درمیان ظاہر ہوا اور حجرِ اسود کی طرف قدم بڑھانے لگا، مجمع نے اس کو راستہ دے دیا اور کسی قسم کی زحمت کے بغیر اس نے بڑے اطمینان سے حجرِ اسود کو چُھوا اور بوسہ دیا اور پھر واپس جاکر طواف میں مشغول ہو گیا۔

یہ منظر ہشام بن عبدالملک کے لیے نہایت ہی حیران کن اور گراں خاطر تھا۔ وہ خلیفۂ وقت کا فرزندِ ارجمند!! اور کوئی اس کے احترام کا قائل نہیں! اس کو مجمع کے مکّے اور دھکّے کھا کر واپس ہونا پڑتا ہے۔ استلام کرنے کے لیے اس کو راستہ نہیں ملتا۔ دوسری طرف ایک شخص آتا ہے جو بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ حجرِ اسود کو مَس کرتا اور بوسہ دیتا ہے۔ آتشِ حسد سے لال پیلا ہوکر وہ سوال کر بیٹھتا ہے؟ یہ شخص کون ہے؟ اردگرد بیٹھے ہوئے افراد حضرت علی بن حسین علیہما السلام کو اچھی طرح پہچانتے ہیں، لیکن صرف اس لیے خاموش ہیں کہ کہیں ہشام کے دل میں ان کی طرف سے

کوئی ایسی ویسی بات نہ بیٹھ جائے، کیونکہ ہشام کے خاندان کے ساتھ امام زین العابدین علیہ السلام کے خاندان کا اختلاف کسی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ ہمیشہ بنی اُمیہ اور بنی ہاشم کے درمیان اختلاف کی آگ روشن رہی ہے۔ وہ یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکے کہ یہ شخص تیرے دشمن خاندان کا سردار ہے، جس کے لیے لوگ اس قدر عقیدت و احترام کے قائل ہیں۔ ظاہر ہے یہ بات ایک طرح سے ہشام کی اہانت شمار ہوتی۔

مشہور شاعر فرزدق، جو اہل بیت علیہم السلام سے خلوص و محبت رکھتے تھے، وہیں موجود تھے انہوں نے جب محسوس کیا کہ لوگ تجاہلِ عارفانہ سے کام لے رہے ہیں اور یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ہم علی بن حسین علیہما السلام کو نہیں پہچانتے، تو وہ آگے بڑھے اور آواز دی: اے امیر! اگر اجازت ہو تو میں اس شخص کا تعارف کرا دوں؟ ہشام نے کہا: ہاں! بتاؤ تو سہی یہ کون ہیں؟ یہ سن کر فرزدق نے وہیں برجستہ وہ قصیدہ پڑھنا شروع کر دیا، جس کا شمار اہل بیت علیہم السلام کی شان میں لکھے گئے قصائد میں سے معروف ترین قصیدوں میں ہوتا ہے اور یہ شروع سے آخر تک امام زین العابدین علیہ السلام کی شاندار مدح سے معمور ہے۔ مطلع یوں شروع ہوتا ہے:

هَذَا الَّذِيْ تَعْرِفُ الْبَطْحَاءُ وَطْأَتَهُ
وَالْبَيْتُ يَعْرِفُهُ وَالْحِلُّ وَالْحَرَمُ[1]

یہ وہ ہیں کہ سرزمین بطحا[2] ان کے قدموں کے نشان خوب پہچانتی ہے۔ یہ وہ ہیں کہ حلّ و حرم[3] جنہیں پہچانتے ہیں اور یہ وہ ہیں کہ زمزم و صفا جنہیں پہچانتے ہیں، یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرزند ہیں، یہ بہترین انسان کے فرزند ہیں۔

مدح کے موتی لُٹانے پر آئے تو ایک ہی قصیدے میں اس طرح امامؑ کی خصوصیات کا ذکر شروع کر دیا کہ ہر ہر مصرع ہشام کے سینے میں خنجر کی طرح چبھتا چلا گیا۔

---

[1] بحار الانوار، ج۴۶، ص۱۲۱

[2] مکہ کی ہموار اور کشادہ زمینیں جہاں سے سیلاب گزرتا تھا۔

[3] وہ مقدّس حدود جو مکہ مکرمہ کا چاروں اطراف سے احاطہ کرتی ہیں انہیں ”حرم“ کہتے ہیں اور ان حدود سے باہر کے حصّے کو ”حِل“ کہتے ہیں۔

اس کے بعد فرزدق کو ہشام کے غضب کا نشانہ بھی بننا پڑا۔ ہشام نے انہیں اپنی بزم سے نکال باہر کیا؛ لیکن امام زین العابدین علیہ السلام نے ان کے لیے انعام کی تھیلی بھیجی، جس کو فرزدق نے معذرت کے ساتھ واپس کر دیا اور کہلا بھیجا کہ میں نے یہ اشعار خدا کی خوشنودی کے لیے کہے ہیں، آپؑ سے انعام و اکرام لینے کے نہیں۔

اس طرح کا اندازِ مزاحمت، امامؑ کے اصحاب کے یہاں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ جس کا ایک اور نمونہ یحییٰ بن اُمّ الطُّوَیل کا طرزِ عمل ہے۔ البتہ یہ ذکرِ شعر و شاعری کے ضمن میں نہیں آتا۔

یحییٰ بن اُمّ الطُّوَیل کا شمار اہل بیت علیہم السلام سے وابستہ نہایت ہی مخلص اور بہادر جوانوں میں ہوتا ہے۔ جس کا معمول یہ تھا کہ وہ کوفہ جاتا، لوگوں کو جمع کرتا اور آواز لگاتا: ”اے لوگو (مخاطب حکومت بنی اُمیہ کے آگے پیچھے بھاگنے والے افراد ہوتے تھے) ہم تمہارے (اور تمہارے آقاؤں کے) منکر ہیں جب تک تم لوگ خدا پر ایمان نہیں لاتے، ہم تمہیں قبول نہیں کرتے۔“ اس گفتگو سے ایسا لگتا ہے کہ وہ لوگوں کو مشرک سمجھتا تھا اور ان کو کافر و مشرک کے الفاظ سے خطاب کرتا تھا۔ اس طرح کے تعرُّض اور مزاحمت کے بہت سے نمونے امام زین العابدین علیہ السلام اور آپؑ کے اصحاب کی زندگی میں مشاہدہ کیے جا سکتے ہیں۔[1]

امام زین العابدین علیہ السلام کی درباری علماء پر سخت تنقید

امام زین العابدین علیہ السلام کے حالات اور طرزِ حیات کی تشریح کرتے ہوئے، ہم اپنی بحث کے اس موڑ پر آ پہنچے ہیں جہاں ایک ایسی عظیم اسلامی تحریک کی بنیاد رکھنے کے لیے زمین ہموار ہو چکی ہے، جس کا علوی اور اسلامی حکومت پر منتج ہونا ممکن نظر آنے لگا ہے۔ اس صورت حال کو مختصر طور پر ہم یوں بیان کر سکتے ہیں:

---

[1] پاسدار اسلام، شمارہ ۱۲

امامؑ کی روش کچھ لوگوں کے لیے (معارفِ اسلامی کی) بیان و وضاحت، کچھ لوگوں کے لیے خود کو منظم کرنے کی تلقین اور کچھ افراد کے لیے عمل کی راہیں معین و مشخص کرنے کا ذریعہ تھی؛ یعنی اب تک کے معروضات کی روشنی میں امام زین العابدینعلیہ السلام کی تصویر کا جو خاکہ اُبھر کر سامنے آتا ہے اس کے مطابق آپؑ تیں، پنتیس سال اس کوشش میں گزار دیتے ہیں کہ عالمِ اسلام کے شدید برگشتہ ماحول کو ایک ایسی سمت میں لے جائیں کہ خود آپؑ کے لیے یا آپؑ کے جانشینوں کے لیے اس بنیادی جدوجہد اور فعالیت کے لیے موقع فراہم ہو سکے، جس کے تحت ایک اسلامی معاشرہ اور الٰہی حکومت قائم ہو سکے۔ چنانچہ اگر امام زین العابدینعلیہ السلام کی ۳۵سالہ کوشش کو ائمہ اطہارعلیہم السلام کی زندگی سے جدا کرلیا جائے تو ہرگز ایسی صورت حال تصور نہیں کی جا سکتی جس کے نتیجے میں امام جعفر صادقعلیہ السلام کو پہلے بنو اُمیہ اور پھر بنو عباس کی حکومتوں کے خلاف اتنی واضح پالیسی اپنانے کا موقع ہاتھ آئے۔

ایک اسلامی معاشرہ وجود میں لانے کے لیے، فکری اور ذہنی طور پر زمین ہموار کرنا تمام چیزوں سے زیادہ ضروری ہے اور یہ ذہنی و فکری آمادگی، اس وقت کے ماحول اور حالات میں جس سے پورا عالمِ اسلام دوچار تھا، وہ کام تھا جو یقیناً ایک طویل مدت کا طالب ہے اور اس کام کو امام زین العابدینعلیہ السلام نے تمام تر زحمتوں، مشکلوں اور مصیبتوں کے باوجود اپنے ذمے لیا تھا۔

اس عظیم ذمہ داری کے ساتھ ساتھ، امام زین العابدینعلیہ السلام کی زندگی میں ایک اور تلاش و جستجو جلوہ گر نظر آتی ہے جو دراصل گذشتہ اماموں کی تیارکردہ زمین کو مزید ہموار کرنے کی طرف آپؑ کے ایک اور اقدام کا مظہر ہے۔ اس طرح کی کوششوں کا ایک بڑا حصہ سیاسی نوعیت کا حامل ہے اور بعض اوقات بےحد سخت صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کا ایک نمونہ امامؑ کا حکومتِ وقت سے وابستہ اور ان کے درباری محدّثوں پر کڑی تنقید ہے۔ موجودہ بحث میں اسی نکتے پر روشنی ڈالنا مقصود ہے۔

ائمہ طاہرینعلیہم السلام کی زندگی کی ولولہ انگیز ترین بحثوں میں سے ایک، یہ بھی ہے کہ

اسلامی معاشرے کی فکر اور ثقافت کو اُجاگر کرنے والے افراد یعنی علماء[1] یا شعراء کے ساتھ ان بزرگواروں کا برتاؤ کیسا رہا ہے؟ اصل میں عوام کی فکری اور ذہنی تربیت و رہبری ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ خلفائے بنی اُمیہ و بنی عباس معاشرے کو جس رُخ پر لے جانا چاہتے تھے، یہ عوام کو اسی راہ پر لگا دیتے تھے گویا خلفاء کی اطاعت اور تسلیم کا ماحول پیدا کرنا ان لوگوں کا کام تھا۔ چنانچہ ایسے افراد کے ساتھ کس طرح کی روش اور طرز اپنایا جائے، دیگر ائمہ اہل بیتؑ کی طرح امام زین العابدینؑ کی زندگی کا بھی ایک بہت اہم اور قابلِ توجہ پہلو یہی ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ظالم خلفاء کے سامنے دل سے اسلام کا عقیدہ رکھنے والوں پر حکومت قائم رکھنے کا، اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں تھا کہ وہ جو کچھ بھی کریں اس کی طرف لوگوں کے قلبی ایمان کو جذب کریں؛ کیونکہ اس وقت صدرِ اسلام کا زمانہ گزرے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا، لوگوں کے دلوں میں اسلام کا عقیدہ اور ایمان باقی تھا اگر لوگوں کو یقین ہو جاتا کہ یہ جو ظالم کی انہوں نے بیعت کر رکھی ہے، درست نہیں ہے یا یہ خلیفہ، رسول اللہﷺ کی خلافت کا لائق نہیں ہے تو یقیناً خود کو اس کے حوالے نہ کرتے اور اگر یہ حسنِ ظن ہم سب کے متعلق قبول نہ کریں، تب بھی اسلامی معاشرے میں یقیناً ایسے افراد کثرت سے پائے جاتے تھے جو پورے ایمانِ قلبی کے ساتھ خلفاء کے دربار کی غیر اسلامی صورت حال کو برداشت کر رہے تھے؛ یعنی ان کا خیال تھا کہ یہی اسلامی حکومت اور اس کا طرزِ حکومت ہے۔ یہی وجہ تھی کہ خلفائے جور نے اپنے دور میں زیادہ سے زیادہ دینی علماء اور محدّثین کی خدمات سے استفادہ کیا اور ان لوگوں کو آمادہ کیا اور پھر ان سے اپنی مرضی کے مطابق پیغمبر اسلامﷺ اور آپؐ کے بزرگ اصحاب سے جعلی حدیثیں اور روایتیں جعل کروائیں۔ اس سلسلے میں بہت سی مثالیں موجود ہیں جو انسان کو لرزا دیتی ہیں، نمونہ کے طور پر ہم یہ حدیث نقل کرتے ہیں:

معاویہ کے زمانے میں ایک شخص کی کعب الاحبار[2] سے ملاقات ہوئی، کعب الاحبار

---

[1] یہاں علماء سے مراد اس زمانے کے علمائے دین ہیں جن میں محدّثین، مفسرین، قرّاء، قاضی صاحبان اور صوفی سب ہی شامل ہیں۔ (مؤلف)

[2] کعب الاحبار ایک یہودی شخص تھا جو حضرت عمر کے دور خلافت میں مسلمان ہو گیا تھا اس کی بیان کردہ حدیثوں

چونکہ معاویہ نیز دیگر شاہی امراء کے ساتھ اچھے تعلقات رکھتا تھا، اس لیے اس شخص سے کعب الاحبار نے پوچھا: تم کہاں سے تعلق رکھتے ہو؟

آدمی: اہلِ شام سے ہوں۔

کعب الاحبار: شاید تم ان لشکریوں میں سے ہو جن کے ستر ہزار افراد بغیر حساب و کتاب کے بہشت میں داخل ہوں گے!

آدمی: وہ کون لوگ ہیں؟

کعب الاحبار: وہ سب اہلِ دمشق سے ہیں۔

آدمی: نہیں! میں اہلِ دمشق سے نہیں ہوں۔

کعب الاحبار: شاید تمہارا تعلق ان لشکریوں میں سے ہے جن کی طرف اللہ تعالیٰ ہر روز دو مرتبہ نظرِ رحمت کرتا ہے!

آدمی: وہ کون لوگ ہیں؟

کعب الاحبار: اہلِ فلسطین!

اگر اس وقت وہ آدمی کہہ دیتا کہ میں اہلِ فلسطین سے نہیں ہوں، تو شاید کعب الاحبار ایک ایک کر کے بعلبک، طرابلس اور شام کے باقی شہروں کے رہائشیوں کی شان میں حدیثیں نقل کرتا رہتا اور ثابت کردیتا کہ یہ سب نہایت ہی صالح اور شائستہ افراد ہیں! سب کے سب اہلِ بہشت ہیں! کعب الاحبار یہ حدیثیں یاتو شامی حکمرانوں کی خوشامد اور چوپلوسی میں گھڑتا تھا تاکہ وہ ان سے زیادہ سے زیادہ انعام حاصل کرے اور ان کا مقرّب بن سکے، ورنہ اس کے اس عمل کی جڑیں اس کی اسلام دشمنی میں تلاش کرنی پڑیں گی جس کا مقصد اسلامی احادیث کو خلط ملط کر کے پیغمبر اسلام ﷺ کے اقوال کو مشتبہ اور ناقابلِ شناخت بنانا تھا۔

کے بارے میں بہت زیادہ شک و شبہ پایا جاتا ہے نہ صرف شیعوں کے درمیان، بلکہ بہت سے اہلِ سنت حضرات بھی اس کی حدیثوں کے متعلق یہی گمان رکھتے ہیں، البتہ بعض اہل سنت نے اس کو قبول بھی کیا ہے۔ (مؤلف)

تذکرہ اور رجال و حدیث کی کتابوں میں اس قسم کے بہت سے واقعات موجود ہیں۔ ان ہی میں سے ایک اس امیر کی داستان ہے جو اپنے بیٹے کو ایک مکتب میں داخل کرتا ہے اور وہاں کا مہتمِم اس کی پٹائی کر دیتا ہے، لڑکا روتا دھوتا گھر پہنچ کر باپ کو اپنی بپتا سناتا ہے تو باپ غصّے میں بپھرا ہوا کہتا ہے: ابھی جاکر حکم دیتا ہوں کہ اس مہتمِم کے خلاف ایک ایسی حدیث وضع کرو تاکہ مکتب کا مہتمِم دوبارہ ایسی غلطی کرنے کی جرأت ہی نہ کر سکے!

اِس واقعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے لیے حدیث گڑھ لینا اس قدر آسان ہو چکا تھا کہ بچوں کی آنکھوں سے گرنے والے آنسوؤں کے قطرے، مکتب کے مہتمِم یا اس کے وطن و شہر کے خلاف حدیث گھڑنے کے لیے کافی ہوتے تھے۔ بہر حال ایسے حالات اس بات کا سبب بنے کہ دنیائے اسلام کے اندر سے ہی اسلام سے برگشتہ ایک خود ساختہ مخلوط اور من گھڑت ذہنیت اور تہذیب و ثقافت پھلنے پھولنے لگی اور اس غلط ذہنیت کو جنم دینے والے وہی علماء اور محدّثین تھے جو اپنے زمانے کے صاحبانِ اقتدار اور خلفاء کے ہاتھوں بکے ہوئے تھے۔ چنانچہ ایسے سخت ترین حالات میں اس گروہ سے ٹکر لینا بہت ہی اہم اور فیصلہ کن معاملہ ہے۔

اب ہم اس کا ایک نمونہ امام زین العابدینؑ کی زندگی سے نقل کرتے ہیں، یہ محمد بن شہاب زہری[1] کے ساتھ آپؑ کے طرزِ عمل کی عکاسی کرتا ہے۔

محمد بن شہاب زہری شروع میں امام زین العابدینؑ کے شاگردوں اور ساتھ اُٹھنے بیٹھنے والوں میں نظر آتا ہے، یعنی یہ وہ شخص ہے جس نے آپؑ سے علوم حاصل کیے اور آپؑ سے حدیثیں بھی نقل کی ہیں پھر رفتہ رفتہ اپنے اندر کی جسارت کے باعث، یہ شخص دربارِ خلافت سے قریب ہوتا چلا گیا اور پھر ان درباری علماء و محدّثین کے زُمرے میں باقاعدہ شامل ہو گیا کہ ائمہ اہل بیتؑ جن کے مقابلے میں قیام فرماتے تھے۔

---

[1] کبھی اس کو محمد بن مسلم زہری بھی کہتے ہیں، یعنی اس کے باپ کو کبھی شہاب اور کبھی مسلم کے نام سے پکارا گیا ہے؛ احتمال یہی ہے کہ ان میں سے ایک اس کے باپ کا اصل نام اور دوسرا اس کا لقب ہے۔ (مؤلف)

محمد بن شہاب زہری کی اُفتاد طبع سے مزید آشنائی پیدا کرنے کے لیے پہلے ہم اس کے بارے میں چند حدیثیں نقل کریں گے۔ ان میں سے ایک حدیث کے ذیل میں وہ خود کہتا ہے:

''كُنَّا نَكْرَهُ كِتَابَةَ الْعِلْمِ حَتّٰى أَكْرَهَنَا عَلَيْهِ هٰؤُلَآءِ الْأُمَرَاءُ فَرَأَيْنَا أَنْ لَا يَمْنَعَهُ أَحَدٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ''[۱]

شروع میں علمی قلم نگاری ہمیں اچھی نہیں لگتی تھی یہاں تک کہ اُمراء و حُکام نے ہم کو اس بات پر آمادہ کیا کہ ہم جو کچھ جانتے ہیں قلم بند کر دیں، تاکہ کتاب کی صورت میں آجائے۔ اس کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی بھی مسلمان کو اس کام سے منع نہیں کریں گے تاکہ علم و دانش سپرد قلم ہوتے رہیں۔

اس گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک محدّثین کے اس گروہ کے درمیان یہ دستور نہیں تھا کہ وہ جن حدیثوں کو جانتے ہیں، انہیں تحریری صورت دیں۔ اسی طرح محمد بن شہاب زہری کا اُمراء کی خدمت میں حاضر ہونا اور ان کی طرف سے اس کو اپنے علم و خواہش کے تحت حدیث قلم بند کرنے کی ترغیب بھی اسی عبارت سے ثابت ہے۔

''مُعَمّر'' نامی ایک شخص کہتا ہے: ہمارا خیال تھا کہ ہم نے زہری سے بہت زیادہ حدیثیں نقل کی ہیں، یہاں تک کہ ولید[۲] مارا گیا۔ ولید کے قتل ہو جانے کے بعد ہم نے دیکھا کہ تحریروں کا ایک انبار ہے جو چوپایوں پر لاد کر ولید کے خزانے سے باہر نکالا جارہا ہے اور لوگ کہہ رہے ہیں کہ: یہ سب زہری کا علم ہے![۳]

یعنی زہری نے ولید کی خواہش اور خوشامد میں اتنی تحریریں اور کتابیں، حدیثوں سے بھر دی تھیں کہ جب ولید کے خزانے سے ان کو نکالنے کی نوبت آئی تو چوپایوں

---

[۱] طبقات ابن سعد، ج۲، ص۱۳۵-۱۳۶

[۲] ولید، عبدالملک بن مروان کا بڑا بیٹا تھا جو باپ کے مرنے کے بعد خلیفہ بنا تھا۔ (مؤلف)

[۳] فاذا الدفاتر قد حملت علی الدواب من خزائنه و یقال هذامن علم زهری! (مؤلف)

کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ تحریری کاپیاں اور کتابیں جو ولید کے حکم سے اور اس کے بارے میں حدیثوں سے بھری ہوئی ہوں، ظاہر ہے ان میں کس طرح کی حدیثیں ہو سکتی ہیں؟ بلاشبہ ان میں ایک حدیث بھی ولید کی مذمّت اور اسے متنبّہ کرنے والی نہیں مل سکتی، بلکہ اس کے برعکس یہ وہ حدیثیں ہیں جن کے ذریعے ولید اور اس جیسے ظالم حکمرانوں کے سیاہ کارناموں پر مہرِ تصدیق ثبت کی گئی تھی۔

ایک دوسری حدیث زہری سے منقول ہے جو بلاشبہ اس دور سے مربوط ہے جب زہری دربارِ خلافت سے وابستگی اختیار کر چکا تھا۔ یعقوبی اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں: ''اِنَّ الزَّهْرِيَ يُحَدِّثُكُمْ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ أَنَّهُ قَالَ: لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا إِلىٰ ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْمَسْجِدِ مَدِيْنَةَ وَالْمَسْجِدِ الْأَقْصیٰ وَأَنَّ الصَّخْرَةَ الَّتِيْ وَضَعَ رَسُوْلُ اللهِ قَدَمَهُ عَلَيْهَا تَقُوْمُ مَقَامَ الْكَعْبَةِ''[۱]

یعنی زہری نے رسول خدا؟ صل؟ سے یہ حدیث بیان کی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: ”صاحبانِ ایمان اور مقدّس لوگ سفر نہیں کرتے مگر تین مساجد کی طرف اور وہ مسجد حرام، مسجد مدینہ اور مسجد اقصیٰ ہیں اور مسجد اقصیٰ میں موجود جس پتھر پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا قدم مبارک رکھا تھا اس کی منزلت کعبہ کے برابر ہے۔“

حدیث کا یہی آخری ٹکڑا توجہ کے قابل ہے جس میں مسجد اقصیٰ کے ایک پتھر کو کعبہ کی برابری کا درجہ دیتے ہوئے اس کے لیے اتنی ہی اہمیت اور شرافت بیان کی گئی ہے جو کعبہ کو حاصل ہے! یہ حدیث اس زمانے کی ہے جب عبداللہ بن زبیر مکہ پر مسلّط تھا اور جب کبھی لوگوں کے دل میں حج یا عمرہ کی خواہش ہوتی تو وہ مجبور تھے کہ مکہ میں جو کہ عبداللہ ابن زبیر کے زیر اثر تھا، کچھ روز گزاریں اور یہ عبداللہ ابن زبیر کے لیے اپنے دشمنوں کے خلاف، جن میں عبدالملک ابن مروان کا نام سرفہرست آتا ہے، پروپیگنڈا کرنے کا سنہری موقع ہوتا تھا۔ جبکہ عبدالملک کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ عوام ان پروپیگنڈوں سے متاثر نہ ہونے پائیں؛ اس لیے وہ ان کا مکہ جانا پسند نہیں کرتا تھا۔

---

۱. تاریخ یعقوبی، ج۲، ص۲۶۱

چنانچہ اس نے اس کا آسان ترین حل یہ نکالا کہ ایک حدیث گھڑی جائے جس کے مطابق مسجدِ اقصیٰ کو شرف و منزلت میں مکہ اور مدینہ کے برابر قرار دیا جائے، حتیٰ کہ مسجدِ اقصیٰ میں موجود پتھر کو کعبہ کے برابر شرافت و منزلت مل جائے!

حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ اسلامی عرف و ثقافت میں دنیا کا کوئی علاقہ کعبہ کی قدر و منزلت کو نہیں پہنچ سکتا اور دنیا کا کوئی پتھر خانہ کعبہ میں موجود حجرِ اسود کا مقام حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لحاظ سے حدیث کے گھڑنے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ عوام کا رُجحان خانہ کعبہ نیز مدینہ منورہ سے موڑ کر فلسطین کی طرف کیا جائے۔ کیونکہ مکہ کی طرح مدینہ بھی غالباً عبدالملک کی حکومت کے خلاف پروپیگنڈا مہم کا مرکز رہا ہوگا، اس کے برخلاف فلسطین شام کا ہی ایک حصّہ تھا اور وہاں عبدالملک کو پورا تسلّط حاصل تھا۔ اب یہ جعلی حدیث عوام النّاس پر کس حد تک اثر انداز ہوئی، اس کو اوراقِ تاریخ میں تلاش کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا کبھی ایسا اتفاق ہوا کہ لوگ مکہ جانے کی بجائے بیت المقدس میں موجود پتھر کی زیارت کے لیے گئے ہوں یا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا؟ بہر حال اگر کبھی اس طرح کا اتفاق ہوا بھی ہو تو اس کا اصلی مجرم یا مجرمین میں سے ایک محمد بن شہاب زہری کو سمجھنا چاہیے جس نے اس طرح کی حدیث وضع کر کے عوام النّاس کو ایسے شک و شبہ میں مبتلا کیا، جب کہ اس کا مقصد محض عبدالملک بن مروان کے سیاسی مقاصد کو تقویت پہنچانا تھا۔

اب جب کہ محمد بن شہاب زہری دربارِ خلافت سے وابستہ ہو چکا تھا اس کے لیے امام زین العابدین علیہ السلام یا خاندان علوی کی تنظیم کے خلاف حدیثیں گھڑنے میں بھلا کیا رکاوٹ ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس سلسلے میں مجھے دو حدیثیں سید عبدالحسین شرف الدین مرحوم کی کتاب ”أجوبة مسائل جارالله“ میں ملیں ہیں۔ جن میں سے ایک روایت میں محمد بن شہاب دعویٰ کرتا ہے کہ امیر المومنین امام علی علیہ السلام ”جبری“ تھے؛ یعنی عقیدۂ جبر کے قائل تھے۔[1]

---

[1] جبری عقیدہ کے پیروکار انسان کے صاحبِ اختیار ہونے کی نفی کرتے ہیں۔

زہری، پیغمبر اسلام ﷺ سے استناد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ قرآن کی آیت ''وَكَانَ الْإِنسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا''[۱] میں ''انسان'' سے مراد امیرالمومنین امام علیؑ ہیں! (العیاذ باللہ)۔

دوسری روایت میں وہ نقل کرتا ہے کہ سید الشہداء حضرت حمزہؓ نے (معاذ اللہ) شراب پی لی تھی۔ یہ دونوں روایتیں برسرِاقتدار سیاسی ٹولے بنو اُمیہ اور ان کے خلیفہ عبدالملک بن مروان کو ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کے مقابلے میں تقویت پہنچانے کے لیے گھڑی گئی ہیں تاکہ اس طرح خاندان پیغمبر اسلام ﷺ کے اس سلسلۃ الذہب کو جو اُمویوں کے مقابلے میں ہمیشہ ثابت قدم رہا ہے، مسلمانوں کی اعلیٰ ترین صف سے خارج کر دیں اور ان کو اس طرح پیش کریں جیسے وہ اسلامی احکام سے لگاؤ اور ان پر عمل کے حوالے سے متوسّط درجے کے قاصر اور گنہگار شخص یا بالکل ہی عوامی سطح کے، بلکہ اس سے بھی گئے گزرے نظر آئیں۔

چنانچہ اس شخص کے مقابلے میں امام زین العابدینؑ نہایت ہی سخت طریقۂ کار کا انتخاب کرتے ہیں اور آپؑ کی یہ سخت گیری ایک خط میں نظر آتی ہے؛ البتہ ممکن ہے کوئی یہ سوچے کہ بھلا ایک خط کے ذریعے کس طرح امام عالی مقامؑ کے طرزِ عمل کا تعیُّن کیا جاسکتا ہے!

پھر بھی اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ اس خط کا لب و لہجہ خود زہری اور اس طرح کی برسرِاقتدار حکومتی مشینری کے خلاف بہت ہی سخت ہے اور یہ خط محمد بن شہاب زہری تک محدود نہیں رہتا، بلکہ دوسروں کے ہاتھ میں بھی آتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ ایک زبان سے دوسری زبان تک منتقل ہوتے ہوئے، دامنِ تاریخ پہ ثبت ہوکر تاریخ کا جزو بن جاتا ہے۔ آج تیرہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی ہم اس خط کے بارے میں بحث کر رہے ہیں۔ ان اُمور پر توجہ دینے کے بعد ہم آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ خط زہری جیسے نام نہاد علماء کے شیطانی تقدُّس پر کیسی کاری ضرب لگاتا ہے۔ یقیناً اس خط کا اصل مخاطب محمد بن شہاب زہری ہے، لیکن یہ اپنی زد میں اس جیسے تمام

---

۱. اور انسان تو سب سے زیادہ جھگڑا کرنے والا ہے۔ (سورہ کہف، آیت ۵۴)

ضمیر فروش افراد کو لیے ہوئے ہے۔ ظاہر ہے جب یہ خط مسلمانوں خصوصاً اس زمانے کے شیعوں کے ہاتھ آیا ہوگا اور ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں پہنچا ہوگا تو ان کے درمیان اس قسم کے درباری افراد کے متعلق کیسی سخت بےاعتمادی پیدا ہوئی ہوگی۔ اب ہم اس خط کے کچھ حصے نقل کرتے ہیں۔ خط کی ابتدا یوں ہوتی ہے:”كَفَانَا اللهُ وَإِيَّاكَ مِنَ الْفِتَنِ وَرَحِمَكَ مِنَ النَّارِ“ خداوند عالم ہمیں اور تمہیں فتنوں سے محفوظ رکھے اور تم پر آتش جہنم کے سلسلے میں رحم فرمائے۔

دوسرے فقرے میں صرف اس کو مخاطب کیا گیا ہے کیونکہ فتنوں سے دوچار سب ہو سکتے ہیں، ممکن ہے خود امام زین العابدین علیہ السلام بھی کسی اعتبار سے فتنوں سے دوچار ہوں؛ لیکن فتنے میں غرق ہونا امامؑ کے لیے ناممکن ہے اس کے برعکس زہری فتنہ سے نہ صرف دوچار بلکہ اس میں مکمل طور پر غرق ہے۔ دوسری طرف آتشِ جہنم امام زین العابدین علیہ السلام کے قریب پھٹک نہیں سکتی، لہٰذا آپؑ اس کی نسبت محمد بن شہاب کی طرف دیتے ہیں۔ خط کا آغاز ہی ایسے لب و لہجہ میں کیا جانا جو نہ صرف مخالفانہ، بلکہ تحقیر آمیز بھی ہو، زہری کے متعلق آپؑ کے طرزِ عمل کی بہترین دلیل ہے۔ اس کے بعد امامؑ فرماتے ہیں: ”فَقَدْ أَصْبَحْتَ بِحَالٍ يَنْبَغِي لِمَنْ عَرَفَكَ بِهَا أَنْ يَرْحَمَكَ“ تم ایسی منزل پر کھڑے ہو کہ جو آدمی تمہاری حالت سمجھ لے سزاوار ہے کہ وہ تمہارے حالِ زار پر رحم کرے۔

غور فرمائیے کہ یہ کس شخص سے خطاب ہے؟ یہ ایک ایسے شخص سے خطاب ہے جس پر لوگ رشک کرتے ہیں۔ جس کا شمار دربارِ حکومت کے بزرگ اور محبوب علمائے دین میں ہوتا ہے۔ پھر بھی امامؑ اس کو اس قدر حقیر اور کمزور قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں: تو اس قابل ہے کہ جو لوگ تجھے اس حال میں دیکھیں تو تیرے حال کو قابلِ رحم سمجھیں۔

اس کے بعد امامؑ اس کو مختلف الٰہی نعمتوں سے نوازے جانے اور خدا کی جانب سے ہر طرح کی حجتیں تمام ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”ان تمام نعمتوں کے باوجود جو تجھے خدا کی جانب سے ملی ہیں، کیا تو خدا کے حضور کہہ سکتا ہے کہ تو نے ان نعمتوں کا کس طرح شکر ادا کیا؟ یا نہیں“ پھر قرآن کی چند آیتوں کو ذکر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: ”خداوند عالم تیرے قصور اور گناہوں سے ہرگز راضی نہیں ہو سکتا کیونکہ اس نے علماء پر یہ فرض کیا ہے کہ وہ حقائق کو عوام النّاس کے سامنے بیان کریں گے اور کتمانِ حق سے کام نہ لیں گے“: ''لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَاتَكْتُمُونَهُ''اس تمہید کے بعد جب امام زین العابدینؑ اصل مطلب پر آتے ہیں تو محمد بن شہاب کے بارے میں خط کا انداز اور بھی سخت ہو جاتا ہے:''وَاعْلَمْ أَنَّ أَدْنىٰ مَا كَتَمْتَ وَأَخَفَّ مَا احْتَمَلْتَ أَنْ آنَسْتَ وَحْشَةَ الظَّالِمِ وَسَهَّلْتَ لَهُ طَرِيْقَ الْغَيِّ بِدُنُوِّكَ مِنْهُ حِيْنَ دَنَوْتَ وَإِجَابَتِكَ لَهُ حِيْنَ دُعِيْتَ'' یاد رکھ! وہ معمولی ترین چیز جس کے سلسلے میں تو نے کتمان سے کام لیا ہے اور وہ حقیر ترین بات جو تو نے برداشت کی ہے، یہ ہے کہ جو چیز ظالموں کے لیے وحشت ناک تھی اس کو تو نے راحت اور اُنسیت کا سامان بنا کر ان کے لیے گمراہی کے راستے مزید ہموار کر دیئے اور یہ کام تو نے صرف ان کا تقرُّب حاصل کرنے کی غرض سے کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے جب بھی تجھے کسی بات کی دعوت دی تو تیار ہوگیا۔

یہاں امامؑ اس کی دربارِ حکومت و خلافت کے ساتھ قُربت کو اس طرح اس کے سامنے بیان کرتے ہیں گویا اس کے سر پر تازیانہ مار رہے ہوں: ''إِنَّكَ أَخَذْتَ مَا لَيْسَ لَكَ مِمَّنْ أَعْطَاكَ''ان لوگوں سے جو کچھ تجھے ملا ہے وہ تیرا حق ہرگز نہ تھا پھر بھی تو نے لے لیا۔''وَدَنَوْتَ مِمَّنْ لَمْ يَرُدَّ عَلىٰ أَحَدٍ حَقّاً وَلَمْ تَرُدَّ بَاطِلاً حِيْنَ أَدْنَاكَ'' اور تو ایک ایسے شخص کے قریب ہو گیا جس نے کسی کا کوئی حق واپس نہیں کیا (یعنی ظالم خلیفہ) اور جب اس نے تجھے اپنے قریب جگہ دی تو تو نے ایک بھی باطل اس سے دور نہ کیا۔

یعنی تو کوئی بہانہ نہیں بنا سکتا کہ میں اس لیے اس کے قریب ہوا تھا تاکہ حق کو بیان

---

۱. یقیناً اسے لوگوں کے لیے بیان کریں گے اور نہیں چھپائیں گے۔ (سورہ آلِ عمران، آیت۱۸۷)

اور باطل کا انکار کر سکوں! کیونکہ جب سے تو اس کے ساتھ ہے، کسی بھی باطل بات کا خاتمہ نہ کر سکا جبکہ اس کا دربار سراسر باطل سے معمور ہے۔ ''وَأَحْبَبْتَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ'' اور تونے دشمن خدا کو اپنی دوستی کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ اس تہدید نامہ میں امامؑ کا وہ جملہ جو ذہن کو سب سے زیادہ جھنجھوڑتا ہے یہ ہے: ''أَوَ لَيْسَ بِدُعَائِهِ إِيَّاكَ ۔ حِيْنَ دَعَاكَ۔ جَعَلُوْكَ قُطْباً أَدَارُوْا بِكَ رَحَى مَظَالِمِهِمْ وَجِسْراً يَعْبُرُوْنَ عَلَيْكَ إِلٰى بَلَايَاهُمْ وَ سُلَّماً إِلٰى ضَلَالَتِهِمْ دَاعِياً إِلٰى غَيِّهِمْ، سَالِكاً سَبِيْلَهُمْ، يُدْخِلُوْنَ بِكَ الشَّكَّ عَلَى الْعُلَمَاءِ وَيَقْتَادُوْنَ بِكَ قُلُوْبَ الْجُهَّالِ إِلَيْهِمْ'' کیا ایسا نہیں اور تو نہیں جانتا کہ انہوں نے جب تجھے اپنے قریب کر لیا تو تیرے وجود کو ایک ایسا قطب اور محور بنا دیا جس کے گرد ظلم و ستم کی چکی گردش کرتی رہے اور تجھے ایک ایسا پل بنا دیا جس سے ان کی تمام غلط کاریوں کے کاروان عبور کرتے رہیں اور انہوں نے ایک ایسی سیڑھی تعمیر کر لی ہے جو انہیں ان کی ذلت و گمراہی تک پہنچنے میں سہارا دیتی ہے تو ان کی گمراہیوں کی طرف دعوت دینے والا اور ان ہی کی راہ پر چلنے والا بن گیا۔ انہوں نے تیرے ذریعہ علماء کے بارے میں شکوک و شبہات کی فضا پیدا کر دی اور جاہلوں کے دل اپنی جانب راغب کر لیے۔

یعنی تو علماء کے اندر یہ شک و شبہ پیدا کرنے کا سبب بنا کہ کیا کوئی حرج ہے کہ ہم بھی دربارِ حکومت سے وابستہ ہو جائیں؟ بلکہ بعض لوگ اس دھوکے میں آ بھی گئے (اس کے علاوہ) تو اس بات کا بھی سبب بنا کہ جہلاء بڑے اطمینان کے ساتھ خلفاء کی طرف مائل اور ان میں گھل مل گئے۔ اس کے بعد آپؑ فرماتے ہیں: ''فَلَمْ يَبْلُغْ أَخَصُّ وُزَرَائِهِمْ وَ لَا أَقْوَىٰ أَعْوَانِهِمْ إِلَّا دُوْنَ مَا بَلَغْتَ مِنْ إِصْلَاحِ فَسَادِهِم''[۱] ان کے نزدیک ترین وزراء اور قوی ترین احباب بھی ان کی طرح مدد نہیں کر سکتے تھے، جس طرح تونے ان کی برائیوں کو عوام کی نظروں میں اچھا بنا کر پیش کر کے ان کی مدد کی ہے۔

یہ خط لب و لہجے کے اعتبار سے نہایت ہی سخت اور مضامین و مفاہیم کے لحاظ سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ امام زین العابدین علیہ السلام نے اپنے اس خط کے ذریعے سیاسی

---

[۱] بحار الانوار، ج۷۵، ص۱۳۲

قدرت و اقتدار اور خلفاء کے زیر سایہ پروان چڑھنے والی نام نہاد علمی و فکری سطح اور اختیار کی لہر کو ذلیل و رسوا کر دیا اور وہ لوگ جو دربار کے ساتھ رابطہ استوار کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے ان کی نیندیں اُڑ گئیں اور وہ معاشرے میں ایک سوال بن کر رہ گئے؛ ایک ایسا سوال جو ہمیشہ کے لیے اسلام کے در و دیوار پر ثبت ہو کر رہ گیا اس وقت کا معاشرہ بھی اس سوال سے دوچار تھا اور تاریخ کے ہر دور میں یہ سوال اپنی جگہ برقرار رہے گا۔

میری نظر میں یہ امام زین العابدینعلیہ السلام کی زندگی کا نہایت ہی اہم پہلو ہے اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آپؑ نے اپنی جدوجہد محض ایک محدود طبقے میں علمی و تربیتی تحریک پیدا کرنے تک محدود نہیں رکھی، بلکہ آپؑ سیاسی تحریک میں بھی اس پیمانے پر حصّہ لیتے رہے ہیں۔[۱]

یہ امام زین العابدینعلیہ السلام کی زندگی کا ایک مختصر خاکہ ہے البتہ میں اس نکتے کی طرف بھی اشارہ کر دوں کہ امام زین العابدینعلیہ السلام نے اپنے چونتیس (۳۴) سالہ بابرکت دورِ امامت میں، اگرچہ حکومتی مشینری کے خلاف مسلحانہ جدّ و جہد یا آشکارا تعرُّض کا راستہ اختیار نہیں کیا، لیکن امامت کے بابرکت سلسلے کو وُسعت دینے، مومن و مخلص شاگردوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنے اور اہل بیتعلیہم السلام کی دعوت کو پھیلانے کے حوالے سے اپنا کام کیا اور بنو اُمیہ کی حکومتی مشینری کو اپنی نسبت بدبین اور فکرمند کر دیا، جس کی وجہ سے دربارِ خلافت کی طرف سے متعدّد مرتبہ آپ بزرگوارؑ موردِ تعرُّض بھی قرار پائے اور کم از کم ایک مرتبہ آپؑ کو طوق و زنجیر میں جکڑ کر مدینہ سے شام لے جایا گیا۔

وہ طوق و زنجیر جو امام زین العابدینعلیہ السلام کی نسبت واقعۂ کربلا میں مشہور و معروف ہے، یقینی طور پر معلوم نہیں ہے کہ واقعۂ کربلا میں آپؑ کی گردن میں طوق و زنجیر پہنائے گئے ہوں؛ لیکن اِس واقعے میں یقیناً اسی طرح سے ہے، یعنی آپؑ کو طوق و زنجیر کے ساتھ مدینہ سے اُونٹ پر سوار کرکے شام لے جایا گیا اور دوسرے بہت سے

---

[۱] پاسدار اسلام، شمارہ ۱۱

مواقع پر بھی آپؑ مخالفوں کی طرف سے موردِ شکنجہ اور اذیت و آزار قرار پائے ہیں اور بالآخر سن ۹۵ ہجری میں (ولید ابن عبدالملک کی خلافت کے زمانے میں) حکومتی مشینری کے کارندوں کی ذریعے زہر دے کر شہید کر دیئے گئے۔[1]

---

[1] پاسدار اسلام، شمارہ۱۲

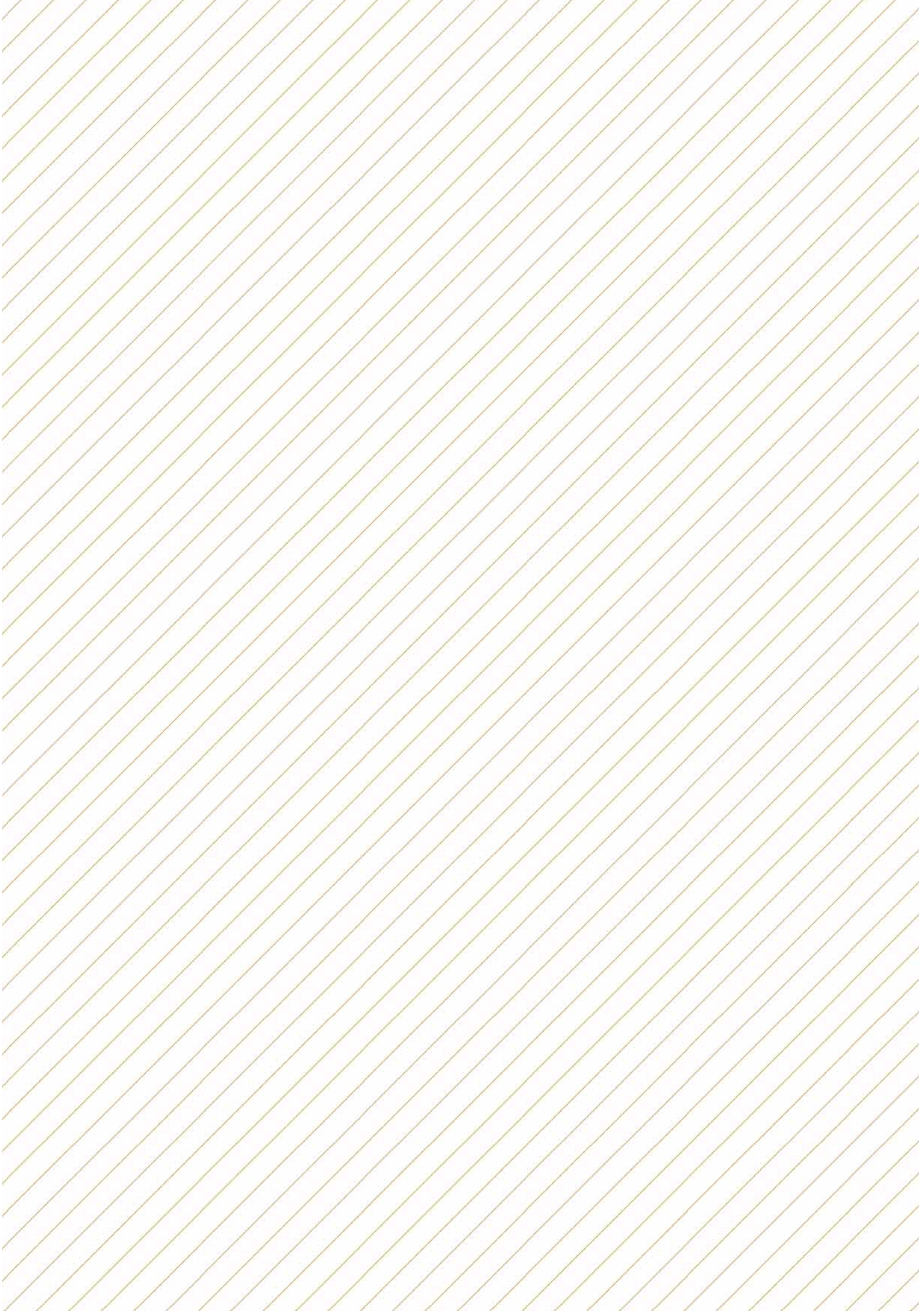

امام محمد باقر
علیه السلام

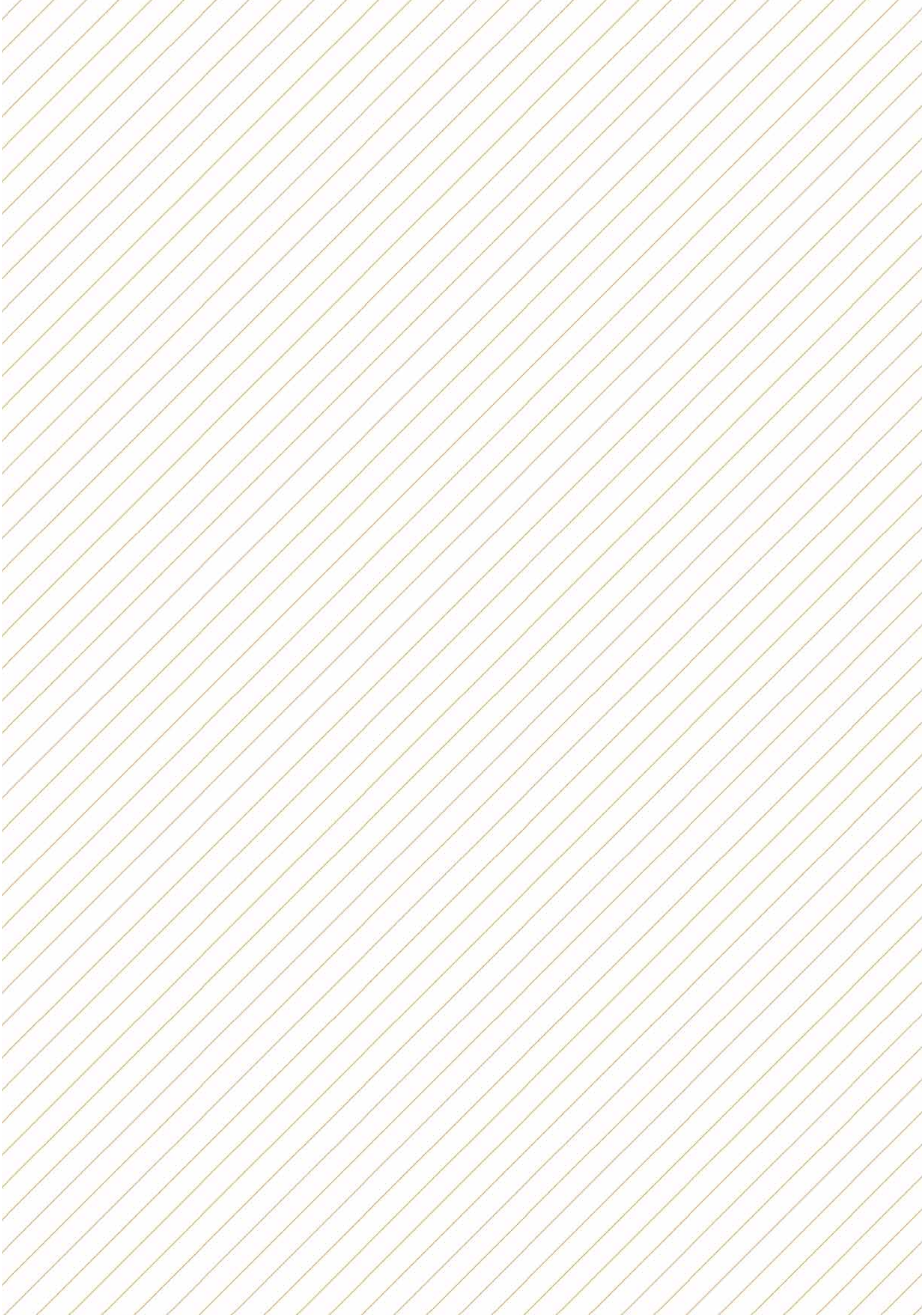

فکری اور تنظیمی تعمیر و ترقی کا دور

پانچویں امام حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا دور منطقی لحاظ سے مکمل طور پر امام زین العابدین علیہ السلام کے دور کا تسلسل ہے کہ اب کچھ لوگ اکٹھا ہونا شروع ہو چکے تھے اور تشیع کو اپنے وجود کا احساس ہونے لگا تھا۔ شیعیت کی تبلیغ اور نشر و اشاعت کا سلسلہ جو واقعہ کربلا اور اس کے بعد پیش آنے والے خونین حادثات (جیسے واقعہ حرّہ اور توّابین کے قیام کے واقعات) اور ظالم خلفاء کی بے جا سختیوں کی وجہ سے موقوف ہو چکا تھا اور ممکنہ حفاظتی اقدامات کے بغیر اپنے نظریات کی نشر و اشاعت نہیں کی جا سکتی تھی، اب شیعیت مملکت اسلامیہ کے گوشہ و کنار اور بالخصوص عراق، حجاز اور خراسان میں اپنی جڑیں مستحکم اور لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی طرف متوجہ کر چکی تھی؛ یہاں تک کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ محدود پیمانے پر فکری لحاظ سے آپس میں ہم آہنگی اور روابط بڑھا کر ایک سیاسی تحریک اور تنظیم کی بنیاد بھی رکھ چکی تھی۔

اب وہ دن گزر چکے تھے کہ جب امام زین العابدین علیہ السلام فرمایا کرتے تھے کہ ”پوری سرزمین حجاز میں ہمارے چاہنے والوں کی تعداد بیس(۲۰) بھی نہیں ہے۔“[1] اب امام محمد باقر علیہ السلام جب مسجد نبویؐ میں تشریف لاتے ہیں تو خراسان اور دیگر علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی ایک بڑی تعداد آپؑ کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ جاتی ہے اور اپنے فقہی مسائل سے متعلق آپؑ سے سوال و جواب کرتی ہے۔

اس دور کے مشہور علماء، جیسے طاؤوس یمانی، قتادہ بن دِعامہ اور ابو حنیفہ جیسے علماء نے (شیعیت اور امامت کے عقیدے سے قطع نظر) جب امام محمد باقر علیہ السلام کے علم و دانش کے چرچے سنے تو آپؑ کے علم سے استفادے یا بحث و مباحثے کے ذریعے آپؑ کو آزمانے کے لیے آپؑ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے ہیں۔ اس زمانے میں کمیت اسدی

---

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، ج۴، ص۱۰۴؛ بحار الانوار، ج۴۶، ص۱۴۳

نامی معروف شاعر کی فصیح و بلیغ زبان میں لکھی ہوئی مشہور منقبت ”ہاشمیات“ ہر شخص کے وردِ زباں تھی جس میں کمیت نے شعری زبان میں ائمہ اطہارؑ کے فضل و کمال، علم و دانش اور معنوی کمالات کو بیان کیا ہے۔

دوسری طرف مروانی خلفاء، عبد الملک ابن مروان (متوفی۸۶ھ ق) کے بیس سالہ دورِ خلافت کے بعد، اپنی انتھک جدّوجہد اور ہر قسم کی مخالفتوں اور خلافت کے دعویداروں کو تہہ تیغ کرکے اپنی کامیابیوں پر مطمئن دکھائی دیتے ہیں اور بغیر کسی محنت و مشقّت کے ملنے والی خلافت کی اپنے پیشروؤں کی طرح قدر دانی بھی نہیں کرتے، نیز اپنے منصب اور عہدے کے جاہ و جلال پر مبنی سرگرمیوں میں کھو جاتے ہیں اور تشیع کی سرگرمیوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتے؛ جس کے نتیجے میں امام محمد باقرؑ اور آپؑ کے اصحاب ایک حد تک تشیع کے اُمور میں خلفاء کی (بے جا) مداخلت سے امان میں رہتے ہیں۔

جی ہاں! کئی لحاظ سے حالات تشیع اور امامت کے حق میں تبدیل ہو چکے ہیں، ایسے حالات کے پیشِ نظر ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ امام محمد باقرؑ اپنے دورِ امامت میں اپنی جدّوجہد اور کوششوں کے ذریعے تشیع کو اس کی آخری منزل کی طرف ایک قدم آگے بڑھانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپؑ کے دورِ امامت کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔[۱]

اسلامی معارف و احکام میں تحریفات کا مقابلہ

حضرت امام محمد باقرؑ کی زندگی اور آپؑ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر بات کی جا سکتی ہے، لیکن میں یہاں آپؑ کی زندگی سے متعلق صرف دو نکات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں:

آپؑ کی زندگی کا پہلا اہم کام: اپنے دورِ امامت میں اسلامی معارف اور احکام میں

---

[۱] پیشوائے صادق، ص۳۲۔۳۳

کی جانے والی تحریفات سے آپؑ کا مقابلہ ہے۔ امام محمد باقر علیہ السلام کے دورِ امامت میں پہلے سے کئی گنا زیادہ منظّم اور وسیع پیمانے پر اسلامی احکام میں تحریف کا مکروہ دھندہ ہو رہا ہے۔ تحریفات کے مقابلے سے کیا مراد ہے؟ تحریفات کے مقابلے سے مراد یہ ہے کہ دینِ مقدسِ اسلام، اپنے بنیادی معارف اور قرآن و سنت سے استنباط شدہ فقہی احکام کے لحاظ سے چند خصوصیات اور شرائط کا حامل ہے، اگر کسی انسانی معاشرے اور زندگی پر یہ احکام لاگو ہوں اور لوگ ان تعلیمات سے آشنائی حاصل کریں اور ان کے پابند ہو جائیں، تو پھر اس اسلامی معاشرے میں بعض چیزوں کو برداشت کرنا ناممکن ہوتا ہے؛ مثلاً کسی ظالم، فاسق، فاجر اور دین سے بے خبر شخص کی حکومت اور اسی طرح مال و دولت کی غیرعادلانہ تقسیم کو کبھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا آج بھی اسلامی ممالک میں رائج بہت سارے مفاسد اور برائیاں جو پائی جاتی ہیں، کسی بھی صورت میں اسلامی تعلیمات سے میل نہیں کھاتیں۔

بعض سلاطین اور حکمران جو خلیفۂ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عنوان سے برسرِ اقتدار آئے تھے (جیسے بنو اُمیہ اور بنو مروان) وہ کسی بھی صورت اسلامی معاشرے پر حکمرانی کے اہل نہیں تھے۔ انہوں نے اپنے دورِ اقتدار میں فسق و فجور، ظلم و جور، نسل پرستی، جہالت اور دیگر برائیوں کو خوب پروان چڑھایا، کیونکہ اگر قرآن مجید اور اسلامی تعلیمات کو ان کی اصلی روح کے مطابق لوگوں کے سامنے بیان کیا جاتا تو پھر ممکن نہ تھا کہ یہ لوگ اپنی حکومت اور اقتدار کو دوام بخش سکتے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اسلامی احکام میں تحریفات کا سہارا لینا شروع کیا اور وہ بھی مختلف شکلوں میں انجام دیتے تھے؛ ان میں سے ایک طریقہ یہ تھا کہ یہ خلفاء اپنے زمانے کے معروف فقہاء، علماء، محدّثین اور قاریانِ قرآن کو خریدتے اور انہیں اپنے پاس بٹھا دیتے تھے اور انہیں کبھی ڈرا دھمکا کر اور کبھی مال و دولت اور عہدوں کا لالچ دے کر اسلامی تعلیمات کی اپنی خواہشات کے مطابق تفسیر و تشریح کرنے پر مجبور کر دیتے تھے۔

قارئینِ کرام! اگر آپ پہلی اور دوسری صدی ہجری کی اسلامی تاریخ پر نگاہ کریں تو آپ کو ایک عجیب و غریب قسم کا منظر دکھائی دے گا۔ بہت سارے مشہور و معروف

مقدّس مآب، متقی اور پرہیز گار لوگ خود کو ان ظالم و جابر حکمرانوں کے درباروں کے لیے وقف کرکے ان کی خدمت میں مصروف نظر آتے ہیں اور یہ لوگوں کے سامنے اسلامی تعلیمات کی عجیب و غریب قسم کی تشریحات کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، مثلاً کوئی عالم یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں "اولو الامر" کی اطاعت کا جو حکم دیا ہے اس سے مراد برسرِ اقتدار حاکم ہے، چاہے اس نے کسی بھی طریقے سے اقتدار حاصل کیا ہو، اگرچہ اس نے ظلم و جبر، مکر و فریب، بندوق کے زور یا اپنی طاقت کے بل بوتے پر ہی کیوں نہ اقتدار حاصل کیا ہو، وہی اولو الامر ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا نامعقول اور باطل نظریہ ہے کہ جب تک اسے کسی بھی طریقے سے اسلامی تعلیمات سے نہ جوڑا جائے کوئی بھی (آزاد منش) انسان اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان بے ضمیر فقہاء اور علماء نے اس قسم کے غلط نظریات کو اسلام کے ساتھ جوڑ دیا۔ اس قسم کے اور بھی بہت سارے غلط نظریات اسلامی تاریخ کی پہلی اور دوسری صدی ہجری میں اکثر و بیشتر نظر آتے ہیں۔

تحریف کی ایک شکل یہ تھی کہ ایسے بے ضمیر علماء اور فقہاء کو خلفاء اپنے ساتھ مکہ اور مدینہ لے جاتے اور مجالس و محافل میں لوگوں کے سامنے لے آتے اور انہیں اپنی تائید کے لیے بہترین وسیلہ سمجھتے تھے۔

ایسے عالم نما، فقیہ نما، مقدّس مآب، پرہیز گار اور متقی لوگ خلفاء کی خدمت کے لیے درباروں میں ہر آن موجود ہوتے تھے یہ حکمرانوں کی خواہشات کو دین کے احکام کے نام پر لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے۔ ان فضول اور غلط نظریات میں سے بہت ساری چیزیں آج بھی تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں اور افسوس کا مقام یہ ہے کہ بہت سارے لوگ ان باتوں پر اب بھی یقین رکھتے ہیں۔

تحریف کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ جب یہ خلفاء طاقت کے نشے میں مست ہو جاتے اور انہیں یہ محسوس ہوتا کہ لوگ ان کی ایسی باتوں کو ماننے پر مجبور ہیں تو پھر (اپنی خواہش کے مطابق) کسی بھی بات یا نظریے کو اس طرح پیش کرتے تھے کہ پورا اسلامی معاشرہ اسے اسلامی تہذیب و ثقافت کے ایک حصہ کے طور پر قبول کر لیتا

تھا۔ یہ لوگ ان باتوں کو اس حد تک پھیلاتے اور دُہراتے تھے کہ لوگوں کے ذہنوں میں نقش ہو جاتی تھیں؛ مثلاً عبد الملک بن مروان کے دورِ اقتدار میں اس کے بعض کارندوں کا یہ عقیدہ تھا کہ خلافت نبوت سے افضل ہے اور وہ اپنے اس غلط اور باطل نظریے کا برملا اظہار بھی کرتے تھے۔

یہ لوگ صرف اس بات سے بھی راضی نہیں تھے کہ عبد الملک بن مروان اور اس کی فاسق و فاجر اولاد کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی اور خلافت کے عظیم منصب کا حقدار قرار دینے پر اکتفا کرتے (کیونکہ خلافت اور جانشینیِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لباس بھی ان کے قد و قامت پر کسی طرح نہیں جچتا تھا، کیونکہ وہ غاصب تھے) بلکہ وہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ خلافت نبوّت سے کہیں زیادہ افضل ہے۔ دین اسلام میں اس قسم کی تحریفات سامنے آگئی تھیں جن کا بنیادی مقصد بنو اُمیہ اور بنو عباس کے ظالم سلاطین کو اپنے اقتدار اور سلطنت کو دوام دینا تھا اور یہی غلط پروپیگنڈہ باعث بنا کہ حکومتِ اسلامی کے حقیقی اور اصلی حقدار اپنے حق سے محروم ہو جائیں۔

اب ایسے حالات میں ائمہ معصومین علیہم السلام کی یہ خواہش تھی کہ ایک صحیح اور درست اسلامی اور علوی حکومت قائم کریں، تو انہیں کیا کرنا چاہیے تھا؟ سب سے پہلا کام تو یہ تھا کہ لوگوں کے ذہنوں کو تبدیل کرتے اور جو غلط اور اسلام مخالف نظریات ان کے ذہنوں میں رچ بس چکے ہیں انہیں لوگوں کے دل و دماغ سے باہر نکالتے اور ان کی جگہ قرآن اور توحید کے مطابق صحیح اور درست نظریات سے لوگوں کے ذہنوں کو منوّر کرتے؛ یہ ایک باقاعدہ ثقافتی جنگ تھی۔ ثقافتی جنگ یہ نہیں کہ کسی جگہ بیٹھ کر صرف اسلامی احکام بیان کیے جائیں، جن میں نہ تو کوئی خاص مقصد ہو اور نہ ہی کوئی انقلابی پہلو نظر آرہا ہو۔ یہ عمل کسی بھی صورت میں مقابلہ یا مبارزہ نہیں کہلا سکتا۔ بلکہ ثقافتی جنگ یہ ہے کہ لوگوں کے ذہنوں کو پہلے سے موجود غلط نظریات اور عقائد سے پاک و صاف کرتے ہوئے ان کے ذہنوں میں اسلامی تہذیب اور عقائد کو اُجاگر کیا جائے، تاکہ ایک اسلامی اور الٰہی حکومت کی تشکیل کے لیے راستہ ہموار ہو سکے اور اسی طرح طاغوتی اور شیطانی طاقتوں اور حکومتوں کا دروازہ مکمل طور پر بند کیا جا سکے۔

چنانچہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے اس کام کا آغاز کیا، اس لیے آپؑ کو ”بَاقِرُ عِلْمِ الْاَوَّلِیْنَ“ کہتے ہیں؛ یعنی ”علم کی گرہیں کھولنے والا یا علم کی گتھیاں سلجھانے والا۔“ آپؑ لوگوں کے سامنے قرآن مجید کی بہترین اور حقیقی تفسیر بیان فرمایا کرتے تھے، یہی وجہ تھی جس شخص کو بھی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی سنہری باتوں کا علم ہوتا وہ آپؑ کا گرویدہ ہو جاتا تھا، بشرطیکہ وہ کسی خاص شخص یا مکتب کے دائرے میں خود کو مقید قرار نہ دیئے ہوئے ہو اور یہی بات وقت کے طاغوتی حکمرانوں سے منہ موڑنے اور ان سے پہلو تہی کی بنیادی وجہ بھی تھی۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ امام محمد باقر علیہ السلام کے زمانے میں متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے بہت سے افراد نے مکتب اہل بیت اطہار علیہم السلام اور نظریۂ امامت کی طرف جھکاؤ پیدا کر لیا، جسے آج کے عرف میں ”تشیع“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تشیع کا مفہوم بھی یہی ہے یعنی مکتب اہل بیت علیہم السلام کی پیروی تاکہ حقیقی اور اصلی اسلام کی حاکمیت قائم ہو سکے، قرآن مجید کی تعلیمات کا بول بالا ہو اور معاشرے میں قرآنی احکام اور اسلامی معارف رائج اور نافذ ہوں۔ جس شخص کا امام محمد باقر علیہ السلام سے رابطہ ہوتا اور وہ آپؑ کی گفتگو سنتا تو اس کے ذہن و دماغ میں ایک تبدیلی اور انقلاب و ہیجان پیدا ہو جاتا، یہی امام محمد باقر علیہ السلام کی زندگی کا پہلا اور بنیادی کام تھا جو بہت ہی اہم اور بنیادی نوعیت کا کام تھا اور آپؑ نے اس معاملے پر بہت زیادہ توجہ بھی دی ہے۔

تنظیم سازی کی بھرپور کوششیں

امام محمد باقر علیہ السلام کی زندگی کا دوسرا اہم کام ”تنظیم سازی“ سے عبارت ہے۔ تنظیم سازی سے کیا مراد ہے؟ یعنی ان دینی معارف، ثقافتی تبدیلیوں اور فرہنگی مبارزات سے معاشرے کو روشناس کرنا۔ ایک مرتبہ انسان بغیر سوچے سمجھے آنکھیں بند کر کے جو چاہے اور جہاں چاہے کی بنیاد پر ان معارف کو بیان کرنا شروع کر دیتا ہے اور کبھی ہر قدم سوچ سمجھ کر اُٹھاتا ہے، اس کی مثال اُس بیج کی سی ہے جسے کسان زمین میں بوتا ہے۔

اب اگر کسان ناتجربہ کار ہو تو بغیر دیکھے بھالے جہاں چاہے بیج پھینک دے گا اور کچھ عرصے بعد پتہ چلے گا کہ بہت سارے بیج نامناسب زمین اور آب و ہوا کی وجہ سے ضائع ہو چکے ہیں اور کچھ بیج سرسبز و شاداب تو ہوئے ہوں گے لیکن راستے میں بونے کی وجہ سے پاؤں تلے روند دیئے جائیں گے اور کچھ بیج سرسبز ہونے کے بعد مناسب جگہ نہ ملنے کی وجہ سے خشک ہو جائیں گے، آخر میں بہت کم مقدار میں بیج نتیجہ خیز ثابت ہوسکیں گے۔ لیکن اگر یہی کسان اور باغبان تجربہ کار ہو تو وہ صرف بیج بونے پر اکتفا نہیں کرے گا بلکہ اس کی حفاظت بھی کرے گا؛ اب حفاظت کیسے کرے گا؟ وہ اپنے باغ اور کھیتی کی حفاظت کے لیے چند افراد کو مامور کرے گا۔ بالکل اسی طرح امام محمد باقر علیہ السلام نے مملکتِ اسلامیہ کے گوشہ و کنار میں اپنے چاہنے والوں اور اسلام کی بلند ترین تعلیمات اور تبلیغات کو صدق دل سے قبول کرنے والوں کے شبہات و اشکالات کا صحیح جواب دینے کی غرض سے اور دشمنانِ اسلام کی طرف سے پیدا کیے جانے والے ابہامات اور سوالات کے درست جواب دینے کے لیے چند خاص افراد کی تربیت فرمائی اور انہیں آپس میں رابطے میں رہنے اور ایک دوسرے سے پیوست رہنے کی ہدایت فرمائی، تاکہ وہ کسی طرح کے شکوک شبہات اور شیطانی وسوسوں سے متاثر نہ ہونے پائیں۔ خلاصہ یہ کہ آپؑ نے ایسا اہتمام عمل میں لایا کہ بالکل مناسب ترین اور زرخیز ترین زمین مہیا فرمائی، جو ان کی شادابی اور ثمر دہی کی ضمانت فراہم کرنے کے لیے کافی تھی۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا ایک اور کارنامہ یہ تھا کہ آپؑ نے اپنے چند مخصوص شاگردوں اور قریبی ساتھیوں کی خصوصی تربیت کا اہتمام کیا اور انہیں ہمیشہ ایک دوسرے سے مربوط رہنے کا درس دے کر عالم اسلام کے گوشہ و کنار میں ایک برجستہ شخصیت کے طور پر اپنی نیابت اور وکالت کا عظیم منصب سونپ دیا، تاکہ یہ لوگ آپؑ کے پیغام اور دینِ مبین اسلام کی تبلیغ اور اسلامی تعلیمات کو عام مسلمانوں تک من و عن پہنچانے کی ذمہ داری بحسن و خوبی نبھا سکیں۔

تنظیم سازی کے اس عمل کا آغاز اگرچہ امام محمد باقر علیہ السلام کے دورِ امامت سے پہلے ہو چکا تھا لیکن آپؑ کے دورِ امامت میں یہ کام حیرت انگیز حد تک بڑھ چکا تھا، البتہ بعد میں امام جعفر صادق علیہ السلام اور امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے دورِ امامت میں یہ کام اپنے عروج پر پہنچ گیا تھا لیکن آپؑ کی بات ہی کچھ اور تھی یقیناً آپؑ کا یہ ایک عظیم کارنامہ تھا جو خطرناک بھی تھا۔

لہٰذا آپ دیکھیں کہ روایات میں آپؑ کے بعض اصحاب کو ''اصحاب السِّر'' یعنی رازدار ساتھی کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ جیسے جناب جابر بن یزید جعفی وغیرہ۔ جابر جعفی آپؑ کے ان خاص اصحاب میں سے ایک تھے، جنہیں اصحاب السِّر ہونے کا اعزاز اور افتخار حاصل ہے۔ اصحاب السِّر کون تھے؟ یہ وہ اصحاب تھے جو دنیائے اسلام کے گوشہ و کنار میں پھیلے ہوئے لوگوں کی ہدایت، راہنمائی اور ان کی دستگیری میں مصروف رہتے تھے۔ یہ لوگ دینِ مبین اسلام اور امامت و شیعیت سے لگاؤ رکھنے والے لوگوں کی راہنمائی پر مامور تھے۔ حکومتی کارندوں کو جب ان کے بارے میں پتہ چلتا تو وہ انہیں سخت سے سخت سزا اور تکلیف دیتے تھے۔

(۳۱۔۰۷۔۱۹۸۷ء)

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے انیس سالہ دورِ امامت (۹۵ھ ق سے لے کر ۱۱۴ھ ق تک) کا اگر سطحی مطالعہ کیا جائے تو اس کا خلاصہ یہ بنتا ہے کہ آپؑ کے والد گرامی (حضرت امام زین العابدین علیہ السلام) نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں آپؑ کو اپنا جانشین اور شیعوں کا امام اور پیشوا منتخب فرمایا۔ آپؑ نے اپنے دیگر فرزندوں اور رشتہ داروں کی موجودگی میں اس عظیم منصب کو امام محمد باقر علیہ السلام کے حوالے کیا اور ساتھ ہی ایک صندوق بھی آپؑ کے سپرد کیا جو روایات کے مطابق، علم و دانش کا ذخیرہ' یا دوسرے لفظوں میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تبرکات اور اسلحے سے بھرا ہوا تھا اور فرمایا: ''اے محمدؑ! اس صندوق کو اپنے گھر لے جاؤ'' پھر آپؑ نے وہاں موجود افراد کو مخاطب کر کے فرمایا: ''یاد رکھو! اس صندوق

۱۔ بحار الانوار، ج۴۶، ص۲۲۹

میں درہم و دینار نام کی کوئی چیز نہیں، بلکہ یہ صندوق علم و دانش سے بھرا ہوا ہے۔"[1]

چنانچہ آپؑ نے اس طریقے سے حاضرین کے سامنے اپنی علمی اور فکری رہبری (یعنی علم و معرفت) اور انقلابی قیادت (یا دوسرے الفاظ میں سلاحِ رسول خداﷺ) کو اپنی میراث کے طور پر متعارف کرایا۔

امام محمد باقرؑ نے منصبِ امامت پر فائز ہونے کے بعد اپنے سچے اور امین اصحاب کے ساتھ ملکر ایک بامقصد اور انقلابی قدم اُٹھاتے ہوئے تشیع کی نشر و اشاعت اور تبلیغِ دین کے دائرے کو شیعہ نشین علاقوں (جیسے مدینہ اور کوفہ) سے لے کر پورے عالم اسلام کو گوشہ و کنار تک پھیلایا، خصوصاً وہ علاقے جو ابھی تازہ اسلامی مملکت کے قلمرو میں داخل ہوئے تھے اور بنو اُمیہ کی حکومت اور ان کی نگاہوں سے بھی دور تھے ان علاقوں میں خراسان کو ایک ممتاز مقام حاصل تھا کیونکہ متعدد روایات میں خراسان کے لوگوں میں شیعیت کے نفوذ کے تذکرے ملتے ہیں۔[2]

جو چیز امام محمد باقرؑ اور ان کے باوفا اصحاب کو اس جہد مسلسل پر اُبھارتی اور انہیں ہر سانس کے ساتھ الٰہی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کرتی تھی، وہ اس معاشرے کے لوگوں کی ذہنی پستی تھی۔ وہ اپنے سامنے ایسے لوگوں کو دیکھ رہے تھے جو غلط تربیت کی وجہ سے نہ صرف خود روز بروز انحطاط اور زوال کا شکار ہوتے جا رہے تھے، بلکہ اپنے ساتھ ساتھ پورے معاشرے کو بھی تباہی کی طرف دھکیل رہے تھے۔

آہستہ آہستہ نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ نہ صرف حکومتی کارندے بلکہ عام لوگ بھی امامؑ کی نجات بخش دعوت پر کان دھرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ جیسا کہ امامؑ فرماتے

---

[1] ۔ بحار الانوار، ج۴۶، ص۲۲۹

[2] ۔ منجملہ ان روایات میں سے ایک روایت جسے ابو حمزہ ثمالی نے نقل کیا ہے یہ ہے: "حَتَّى أَقْبَلَ أَبُو جَعْفَرٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَ حَوْلَهُ أَهْلُ خَرَاسَانَ وَ غَيْرُهُمْ يَسْأَلُوْنَهُ عَنْ مَنَاسِكِ الْحَجِّ" (بحار الانوار، ج۴۶، ص۳۵۷)؛ ایک اور روایت میں خراسان کے ایک عالم کی عمر ابن عبد العزیز سے کی جانے والی عبرت آور گفتگو نقل کی گئی ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں: بحار الانوار، ج۴۶، ص۳۳۶) (مصنف)

ہیں: ”إِنْ دَعَوْنَاهُمْ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَنَا“[1] یعنی اگر ہم انہیں (دین کی طرف) بلائیں تو وہ ہماری بات سننے کو تیار نہیں۔

دوسری طرف اس گمراہ کن ماحول میں جہاں ہر کام، یہاں تک کہ فقہ، تفسیر، علم کلام اور علم حدیث کے درس و تدریس بھی بنو اُمیہ کے ظالم و جابر حکمرانوں کی خواہشات کے مطابق دیئے جاتے ہوں اور جس ماحول میں بہتری کی اُمید کی کوئی کرن دکھائی نہ دیتی ہو، ایسے میں اگر تشیع لوگوں کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے کمرِ ہمت نہ باندھے تو پھر لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے۔ لہٰذا امامؑ فرماتے ہیں: ”وَإِنْ تَرَكْنَاهُمْ لَمْ يَهْتَدُوا بِغَيْرِنَا“[2] یعنی اگر ہم بھی انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں تو پھر ہمارے علاوہ ان کی ہدایت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام کا ضمیر فروش علماء کے خلاف ردِّ عمل

امام محمد باقر علیہ السلام نے معاشرے کی اس بے سروسامانی کی حقیقت اور گہرائی کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے، فکری اور ثقافتی طور پر اثر انداز ہونے والی اس وقت کی طاقتوں یعنی ضمیر فروش شعراء اور علماء کے خلاف، جو کسی بھی معاشرے کو بگاڑنے اور سدھارنے کے اصل ذمہ دار ہوتے ہیں، اپنے شدید ردِّ عمل کا اظہار کیا اور ان کے سروں پر علم کے تازیانے مار کر نہ صرف ان کے مردہ ضمیر جگانے کی کوشش کی، بلکہ ان کے سوئے ہوئے دل اور بے خبر ذہنوں کو بھی جھنجوڑتے ہوئے انہیں اپنی عاقبت سنوارنے کے لیے آمادہ کرنے کی جدّوجہد کی۔

ایک مرتبہ آپؑ نے معترضانہ لہجے میں کثیر نامی شاعر سے پوچھا: کیا تم نے عبد الملک کی تعریف کی ہے؟! تو اس نے عاجزانہ انداز یا سادہ لوحی سے اپنے اس گناہ کے بارے میں اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی اور یوں جواب دیا: میں نے اسے ہادی

---

[1] بحار الانوار، ج۴۶، ص۲۸۸

[2] بحار الانوار، ج۲۶، ص۲۵۳

اور پیشوا نہیں کہا ہے، بلکہ میں نے اپنے اشعار میں اسے ”شیر، سورج، دریا، اژدھا اور پہاڑ“ جیسے الفاظ میں خطاب کیا ہے۔

جبکہ ”شیر“ ایک قسم کا کتا ہے تو ”سورج“ ایک جامد جسم ہے، ”دریا“ ایک بے روح پیکر ہے اور ”اژدھا“ ایک بدبودار جانور ہے، جبکہ ”پہاڑ“ ایک سخت پتھر ہے۔

امامؑ کثیر کی اس توجیہ اور بے تکی وضاحت سن کر معنی خیز انداز میں مسکرائے اور اسی دوران کمیت نامی (انقلابی) شاعر کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنے ”ہاشمیات“[٣] نامی قصیدوں میں سے ایک منقبت پڑھنی شروع کرتا ہے؛ یوں وہ وہاں پر موجود لوگوں اور رہتی دنیا تک کے لیے اس طرزِ فکر کے اختلاف کو بطور یاد گار ہمیشہ کے لیے امر کر دیتا ہے۔[٤]

ابن عباس کا شاگرد عِکرمہ جو اپنی عظیم حیثیت اور شخصیت کی بنا پر لوگوں کے درمیان قابلِ بھروسہ اور معتبر سمجھا جاتا تھا، ایک دفعہ امام محمد باقر علیہ السلام سے ملاقات کی غرض سے حاضر ہوتا ہے اور آپؑ کی باوقار علمی، روحانی اور معنوی شخصیت دیکھ کر یوں متاثر ہو جاتا ہے کہ بے اختیار خود کو امامؑ کے قدموں میں گرادیتا ہے اور بڑے تعجب کے ساتھ اپنے آپ سے کہتا ہے: میں ابن عباس جیسے نامور اور عظیم لوگوں کی محافل میں بیٹھ چکا ہوں لیکن کبھی بھی مجھ پر ایسی کیفیت طاری نہیں ہوئی۔ امامؑ نے (عِکرمہ کے) جواب میں ارشاد فرمایا: ”وَيْلَكَ يَا عُبَيْدَ أَهْلِ الشَّامِ إِنَّكَ بَيْنَ يَدَيْ بُيُوتٍ أَذِنَ اللهُ أَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ“[٥]

---

[٣] ۔ وہ قصیدہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے:

مَنْ لِقَلْبٍ مُتَيَّمٍ مُسْتَهَامٍ　　غَيْرُ مَا صَبْوَةٍ وَ لَا أَحْلَامٍ

اور اس پُر مغز اور معرفت سے سرشار شعر پر ختم ہوتا ہے:

سَاسَةٌ لَا كَمَنْ يَرَى رَعِيَّةَ النَّاسِ　　سَوَاءٌ وَ رَعِيَةُ الْأَنْعَامِ (مؤلف)

[٤] ۔ مناقب، ابن شہر آشوب، ج٤، ص٢٠٧

[٥] ۔ بحار الانوار، ج٤٦، ص٢٥٨

اے شامیوں کے حقیر غلام! تیرے حال پر افسوس! آج تم اس گھرانے میں آئے ہو جسے اللہ تعالیٰ نے بلندی عطا کی ہے اور یہ وہ گھرانہ ہے جو یادِ الٰہی کا مرکز ہے۔

امام محمد باقرؑ ہر مناسب موقع پر شیعیت کی تلخ تاریخ اور واقعات کو دہراتے ہوئے، وقت کے حکمرانوں کی طرف سے اپنے اور اپنے اصحاب پر کی جانے والی سختیوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے، لوگوں کے احساسات اور جذبات کو جگاتے اور ان کے نیم مردہ جسموں اور ان کی رگوں میں جمے ہوئے خون کو جوش دلاتے تھے اور ان کے مردہ دلوں میں ہیجان پیدا کرتے تھے؛ یعنی دوسرے لفظوں میں انہیں ایک انقلابی تحریک اور سخت ترین مقصد کے حصول کے لیے آمادہ ہونے کی ترغیب دلانے کی کوشش کرتے تھے۔

ایک شخص نے آپؑ سے پوچھا: اے فرزندِ رسولؐ! آپؑ کی رات کیسے گزری؟ آپؑ نے فرمایا: ”کیا اب بھی وہ وقت نہیں آپہنچا ہے کہ تم سمجھ سکو کہ ہم کون لوگ ہیں اور ہماری راتیں کیسے گزرتی ہیں؟! ہماری داستان بھی بنی اسرائیل کی سی ہے جس طرح فرعونی معاشرے میں بنی اسرائیل کے مردوں کو قتل کر دیا جاتا تھا اور ان کی عورتوں کو اسیر کیا جاتا تھا! یاد رکھو کہ یہ (بنو اُمیہ) بھی ہمارے بیٹوں کو قتل کر دیتے ہیں اور ہماری عورتوں کو زندہ ہم سے چھین لیتے ہیں۔“ اس غم انگیز اور جذباتی گفتگو کے بعد آپؑ اپنے اصل مطلب (یعنی حکومتِ اہل بیتؑ اور شیعیت کی دعوت) کی طرف آتے ہیں اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

”عربوں کا یہ گمان تھا کہ وہ عجمیوں سے افضل و برتر ہیں اور وہ اس کی یہ دلیل دیتے تھے کہ حضرت محمدؐ عربی ہیں اور عجم بھی ان کے سامنے سرِتسلیم خم کرتے تھے۔ قریش کا خیال تھا کہ وہ عرب کے دیگر قبائل سے بہتر ہیں کیونکہ محمدؐ ان کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں اور دوسرے قبیلوں کے لوگ ان کے سامنے سرِتسلیم خم کرتے تھے۔ پس اگر ان کا یہ دعویٰ سچا ہے تو ہم اہل بیتِ اطہارؑ تو قریش کے دیگر قبائل سے افضل ہوئے کیونکہ ہم تو حضرت محمدؐ کے خاندان سے اور ان کی اولاد ہیں اور کوئی بھی شخص اس نسبت میں ہمارا مقابلہ نہیں کرسکتا۔“

وہ شخص امامؑ کی گفتگو سن کر جذباتی ہو جاتا ہے اور کہتا ہے: اللہ کی قسم! ہم آپؑ کے خاندان سے محبت کرتے ہیں۔ امامؑ نے جب اس شخص کو فکری، قلبی اور عملی لحاظ سے مکمل طور پر (ولایت اور امامت کے) نزدیک ہوتے مشاہدہ کیا تو اس کی مزید آگاہی کے لیے نصیحت کے طور پر یوں ارشاد فرمایا:

”اگر ایسا ہے تو پھر اپنے آپ کو طرح طرح کی بلاؤں کے لیے آمادہ اور تیار رکھو، خدا کی قسم بلائیں ہمارے شیعوں کے اس سے بھی زیادہ نزدیک ہیں جتنا پہاڑ کا دامن سیلاب کے نزدیک ہوتا ہے۔ بلائیں سب سے پہلے ہمیں اپنی لپیٹ میں لیتی ہیں اور پھر تمہارا رخ کرتی ہیں؛ جس طرح (قیامت کے دن) راحت اور سکون سب سے پہلے ہمیں نصیب ہو گا اور پھر تمہیں راحت اور سکون (ہمارے توسّط سے) ملے گا۔“

امام محمد باقرؑ کے اپنے شیعوں کے ساتھ روابط

حضرت امام محمد باقرؑ کے اپنے چاہنے والے شیعوں کے ساتھ انتہائی محدود پیمانے پر روابط تھے۔ اس حوالے سے ہمیں امام محمد باقرؑ کا اپنے شیعوں اور پیروکاروں سے تعلق، ایسا ہی دکھائی دیتا ہے جیسے ایک زندہ و جاوید پیکر اور مفکر دماغ کا بدن کے دیگر اعضاء سے تعلق ہوتا ہے یا دھڑکتے دل کا رابطہ بدن اور اس کے اعضاء سے ہوتا ہے۔

ایک محدود اندازے اور مطمئن دائرے میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام محمد باقرؑ کے اپنے چاہنے والے شیعوں سے جو روابط تھے، وہ مخصوص صفات کے حامل تھے۔ اس سلسلے میں جب ہم آپؑ کی شخصیت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو یوں مشاہدہ کرتے ہیں کہ جیسے ایک زندہ جسم میں مفکر دماغ کا جسم کے دیگر اعضاء و جوارح سے تعلق ہوتا ہے۔

امام محمد باقرؑ کے اپنے شیعوں اور پیروکاروں کے ساتھ روابط کے حوالے سے جو معلومات ہماری دسترس میں ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ ایک طرف اپنے چاہنے والوں کی فکری اور ذہنی تربیت میں مشغول نظر آتے ہیں، تو دوسری طرف

اپنے چاہنے والوں کے ساتھ اپنے تعلقات اور روابط کو بڑی اہمیت دیتے اور منظّم کرتے نظر آتے ہیں۔

چنانچہ ایک مرتبہ فُضَیل بن یسار[1] جو آپؑ کے قریبی اور رازدار صحابی تھے، کو امامؑ کی معیّت میں حج کرنے کا موقع ملا۔ امامؑ نے خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے حاجیوں کو دیکھا تو فُضَیل بن یسار سے فرمایا: زمانہ جاہلیت میں بھی لوگ (مشرکین) اسی طرح خانہ کعبہ کے گرد چکر کاٹا کرتے تھے! جبکہ حکم یہ ہے کہ ہماری طرف چلے آئیں اور ہمارے ساتھ اپنی دوستی اور محبت کا اظہار کریں اور اپنی مدد و نُصرت کا ہمیں یقین دلائیں؛ جیسا کہ قرآن مجید حضرت ابراہیمؑ کی زبانی نقل کرتا ہے کہ: اے ہمارے پالنے والے! لوگوں کے دلوں کو ان (اہل بیت اطہارؑ) کی طرف موڑ دے۔

جابر جُعفی کو اپنی پہلی ہی ملاقات میں یوں نصیحت فرماتے ہیں کہ وہ کسی پہ یہ ظاہر نہ کرے کہ اس کا تعلق کوفہ سے ہے، بلکہ یوں اظہار کرے کہ وہ بھی مدینہ ہی کا باسی ہے۔ آپؑ اپنی اس نصیحت کے ذریعے اس نوخیز نوجوان اور نئے شاگرد کو جس میں پہلے ہی سے اسرار امامت اور تشیع کو اُٹھانے کی بڑی صلاحیت موجود تھی، رازداری برتنے کا سبق سکھاتے ہیں اور بعد میں جاکر آپؑ کے یہی شاگرد، امامؑ کے رازدار کے عنوان سے مشہور ہوتے ہیں۔

حکمرانوں کے ساتھ ان کے تعلقات اس نہج پر پہنچ چکے تھے کہ نُعمان بن بشیر کہتا ہے کہ ایک دفعہ میں جابر کے ساتھ حج کے سفر میں تھا۔ مدینہ پہنچ کر حضرت امام محمد باقرؑ کے ساتھ ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ مدینہ میں چند دن قیام کرنے کے بعد جب جابر امامؑ سے آخری ملاقات کرنے چلا گیا تو واپسی پر وہ بڑا خوش دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں سے ہم کوفہ روانہ ہوئے، دورانِ سفر راستے میں ایک منزل پر کسی شخص سے ملاقات ہوئی۔ (نعمان اُس شخص کی خصوصیات اور جابر اور اُس کے درمیان ہونے والی گفتگو کو اختصار کے ساتھ یوں بیان کرتا ہے کہ) اُس شخص نے

---

[1] امامؑ کی زبانِ مبارک سے جناب فضیل بن یسار کی تعریف جاننے کے لیے قاموس الرجال، ج۹۷، صفحات ۳۴۳۔۳۴۵ کی طرف رجوع کریں۔ (مؤلف)

ایک خط نکالا اور جابر کو دیا۔ جابر نے اس کے ہاتھ سے خط لیا اور بوسہ دینے کے بعد اپنی آنکھوں سے لگایا اور پھر خط کھول کر پڑھنا شروع کر دیا۔ میں مسلسل اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا جابر جوں جوں خط پڑھتا جا رہا تھا اس کے چہرے سے پریشانی کے آثار نمایاں ہوتے جارہے تھے۔ اس نے پورا خط پڑھنے کے بعد اسے تہہ کر دیا۔ ہم نے دوبارہ کوفہ کی طرف اپنا سفر جاری رکھا، لیکن اس کے بعد کوفہ پہنچنے تک میں نے جابر کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ کوفہ پہنچنے کے اگلے دن میں جابر کے احترام کے پیشِ نظر اس سے ملنے اس کے گھر کی طرف چلا، جب اس کے گھر کے نزدیک پہنچا تو اچانک ایک حیرت انگیز منظر کا مجھے سامنا کرنا پڑا۔ میں نے دیکھا کہ جابر چھوٹے بچوں کی طرح ایک لکڑی پر سوار ہے اور اس کے گلے میں بھیڑ (کے پاؤں) کی سوکھی ہڈی لٹکی ہوئی ہے اور وہ بے‌ربط قسم کے اشعار پڑھتے ہوئے پاگلوں کی طرح گھر سے باہر نکل رہا ہے۔ اس نے مجھے دیکھا لیکن مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ میں نے بھی اسے کچھ نہیں کہا، لیکن اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے بےاختیار رونا آگیا۔ اتنے میں (محلّے کے) بچے ہمارے ارد گرد جمع ہونا شروع ہو گئے۔ جابر آگے چلتا گیا اور ”رحبہ“[۱] کے مقام پر پہنچ گیا وہ جہاں بھی جاتا، بچے بھی اس کے پیچھے چلے جاتے۔ لوگ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ جابر پاگل ہو گیا ہے۔ اس واقعے کو ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ خلیفہ (ہشام بن عبد الملک) کا ایک خط حاکمِ کوفہ کو ملا، جس میں لکھا تھا کہ تحقیق کرکے دیکھو کہ یہ جابر بن یزید جُعفی نامی شخص کون ہے؟ اسے گرفتار کر لو اور فوراً اس کی گردن اُڑا کر سر میرے پاس بھیج دو۔ حاکم (کوفہ) نے اپنےدرباریوں اور کارندوں کے ذریعے جابر کا پتہ چلایا تو اس کے کارندوں نے رپورٹ دی: اے امیر آپ کا اقبال بلند ہو! وہ ایک عالم اور علمِ حدیث کا ماہر شخص تھا، اس سال حج کرنے گیا تھا مگر واپسی پر پاگل ہو گیا ہے اور اس وقت بھی وہ ایک لکڑی پر سوار ہو کر ”رَحبہ“ کے مقامِ پر بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مشغول ہے۔ نُعمان کہتا ہے: حاکمِ کوفہ اطمینان اور تسلّی کی خاطر بذاتِ خود جابر کو دیکھنے کے لیے مسجد کوفہ کی طرف چل پڑا اور وہاں جابر کو اپنی لکڑی پر

---

[۱] مسجد کوفہ کا داخلی دروازہ

سوار بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مشغول دیکھ کر کہنے لگا: خدا کا شکر ہے اس نے مجھے جابر کے قتل سے بچا لیا۔[١]

حضرت محمد باقرؑ کے اپنے چاہنے والے قریبی ساتھیوں اور شیعوں کے ساتھ منظّم روابط کی یہ ایک مثال ہے۔ نیز اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ وقت کے حکمران کس قدر امامؑ کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ روابط پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ ظاہر سی بات ہے حکمرانوں کو ہمیشہ اپنی کرسی اور اقتدار کو مستحکم کرنے کی سب سے زیادہ فکر ہوتی ہے۔ اس لیے وہ امامؑ کے اپنے قریبی ساتھیوں سے روابط اور ان کی سرگرمیوں کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے، لہٰذا وہ کم و بیش ایسے معاملات کی کھوج میں رہتے تھے اور فوراً انہیں سختی کے ساتھ دبا دیتے تھے۔[٢] یہی وجہ ہے کہ آہستہ آہستہ امام محمد باقرؑ اور آپؑ کے شیعوں کے دلوں میں وقت کے حکمرانوں کے خلاف قیام کے آثار نمایاں ہوتے رہے اور ائمہ معصومینؑ کی تاریخ میں ایک نئے باب کا پیشِ خیمہ ثابت ہوا۔

اگرچہ اسلامی تاریخ، حدیث اور دیگر موضوعات پر مشتمل کتابوں میں امام محمد باقرؑ کی طرف سے وقت کے حکمرانوں کے خلاف کھلے عام قیام کے کوئی شواہد نہیں ملتے۔ البتہ یہ بھی ان عوامل میں سے ایک ہے کہ وقت کے ظالم اور جابر حکمرانوں کی طرف سے بیجا سختیوں کی وجہ سے امام محمد باقرؑ نے اپنے شیعوں کو تقیہ میں زندگی گزارنے کی ہدایت کی تھی؛ لہٰذا چند گنے چنے اصحاب کے علاوہ، عام لوگوں کو امامؑ کی ذاتی مصروفیات اور سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہوتا تھا۔ لیکن بنو اُمیہ کے طاقتور اور زیرک بادشاہ ہشام بن عبد الملک کے بارے میں تمام مورّخین کا اتفاق ہے کہ وہ بنو اُمیہ کے خلفاء میں سب سے زیادہ با اختیار اور زیرک آدمی تھا، اب اگر وہ امام محمد باقرؑ یا کسی اور شخص کے ساتھ سختی کے ساتھ پیش آتا ہے تو

---

[١] قاموس الرجال، ج٢، ص٣٢٩۔٣٣٠؛ بحار الانوار، ج٤٦، ص٢٨٢۔٢٨٣ (مؤلف)

[٢] اس بات کی تائید جابر کے اس واقعے کے علاوہ دیگر متعدد واقعات، جیسے عبد اللہ بن معاویہ جعفری کے حاکمِ مدینہ کی طرف سے امامؑ کو دھمکی آمیز پیغام پہنچانے سے بھی ہوتی ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں: بحار الانوار، ج٤٦، ص٢٤٦) (مؤلف)

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے جبھی اپنے کردار سے مطمئن نظر نہیں آتا اور ان کے وجود کو اپنے لیے ناقابلِ برداشت قرار دیتا ہے۔

لہٰذا اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اگر امام محمد باقر علیہ السلام فکری، سیاسی اور تنظیمی اُمور سے ہٹ کر صرف علمی مسائل پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے، تو وقت کے ظالم و جابر حکمران بھی آپؑ کے خلاف تشدّد آمیز پالیسی اختیار کرکے اپنے لیے مشکلات پیدا کرنے سے کتراتے؛ کیونکہ اس صورت میں اولاً تو ان کا یہ عمل امام محمد باقر علیہ السلام کو اپنے سامنے جارحانہ رویہ اختیار کرنے پر اُکسانے کے مترادف قرار پاتا، جیسا کہ کچھ ہی عرصہ بعد اس قسم کے تجربات کا ہم مشاہدہ کرسکتے ہیں مجملہ ان میں سے ایک حسین بن علی شہیدفخ[1] کا واقعہ ہے۔

ثانیاً: اس تند اور سخت رویّے اور حکمتِ علمی کی وجہ سے امام محمد باقر علیہ السلام کے شیعوں کو (جن کی تعداد اتنی کم بھی نہ تھی) ناراض کرکے اپنے خلاف مسلح قیام پر مجبور کر دیتا۔ مختصر یہ کہ حکمرانِ وقت کی طرف سے امام محمد باقر علیہ السلام اور آپؑ کے چاہنے والے افراد کے خلاف سخت ترین رویہ اور وہ بھی آپؑ کی زندگی کے آخری ایام میں، اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ خود حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے بھی وقت کے طاغوتی بادشاہوں کو للکارا اور ان کے مظالم کی نشاندہی کرکے ان کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کرنے کی پالیسی مسلسل جاری رکھی تھی۔

امام محمد باقر علیہ السلام کی شام طلبی

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی زندگی کے آخری ایام کا سب سے اہم واقعہ امامؑ کی بنو اُمیہ کے دار الخلافہ یعنی شام طلبی ہے۔ ہشام بن عبد الملک نے اپنی حکومت کے بارے میں امام محمد باقر علیہ السلام کا موقف جاننے کے لیے والی مدینہ ابراہیم بن عبد الملک کو حکم دیا کہ امام

---

[1] حسین ابن علی(شہیدِ فخ) علی ابن حسین ابن حسن ابن امام حسن مجتبیٰؑ کے بیٹے تھے اور ان کی والدہ عبد اللہ ابن حسن کی بیٹی زینب ہیں۔ انہوں نے منصور کے پوتے موسیٰ الہادی کے دور میں خروج کیا تھا اور ''فخ'' مکہ سے ایک فرسخ کے فاصلے پر واقع ایک چشمے کا نام ہے۔

محمد باقر علیہ السلام کو (اور بعض روایات کے مطابق آپؑ کے جوان بیٹے امام جعفر صادق علیہ السلام کو بھی جو آپؑ کے واحد معاون اور مددگار تھے) گرفتار کرکے شام بھیج دیا جائے۔

امامؑ کو گرفتار کرکے شام میں خلیفہ کے دربار میں پیش کیا گیا، ہشام پہلے ہی اپنے کارندوں اور درباری حاشیہ نشینوں کو خصوصی ہدایات دے چکا تھا کہ جب آپؑ دربار میں داخل ہوں تو کس طرح آپؑ پر بےبنیاد الزامات لگانے اور آپؑ کی تذلیل کرنی ہے۔ پروگرام یہ طے پایا تھا کہ سب سے پہلے خود ہشام اور اس کے بعد اس کے درباریوں (جو سب اعلیٰ حکومتی عہدے دار تھے) کی طرف سے الزامات اور تہمتوں کی بوچھاڑ کی جائے گی۔ ہشام بن عبد الملک اپنے اس گھناؤنے عمل سے دو قسم کے مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا:

پہلا یہ کہ وہ اس طرح گالم گلوچ اور بُرا بھلا کہہ کر امامؑ کو نفسیاتی طور پر مفلوج کرنا چاہتا تھا تاکہ اپنی دیرینہ خواہشات کی تکمیل کے لیے زمینہ فراہم کر سکے۔

دوسرا یہ کہ وہ اپنی پارٹی کے اعلیٰ عہدے داروں کی موجودگی میں اپنی مخالف پارٹی کے قائد کو شرمندہ کرنا چاہتا تھا تاکہ (وہ اپنے کارندوں اور بےضمیر علماء، خطباء اور جاسوسوں کے ذریعے اس خبر کو پھیلا کر) اپنی حکومت کے خلاف سازشیں کرنے والوں کو خبردار اور امامؑ کے حامیوں کو کمزور کر سکے۔

امام محمد باقر علیہ السلام دربارِ شام میں تشریف لاتے ہیں۔ دربار کی رسم و رواج کے برعکس، جہاں ہر آنے والا شخص پہلے خلیفہ کو ”امیر المومنین“ کہہ کر سلام کرتا تھا، آپؑ دربار میں موجود حاضرین کی طرف رُخ کرتے ہیں اور اپنے ہاتھ کے اشارے سے سب کو مخاطب کرکے ”السلام علیکم“ کہتے ہیں اور اس کے بعد خلیفہ کی اجازت کا انتظار کیے بغیر اپنی نشست پر بیٹھ جاتے ہیں۔

امامؑ کے اس جرأت مندانہ اقدام سے حسد اور بُغض و کینہ کے مارے ہشام کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے اور وہ زبان درازی کرتے ہوئے کہتا ہے: تم اولادِ علیؑ کا ہمیشہ سے یہی وطیرہ رہا ہے کہ تم ملتِ اسلامیہ کے درمیان پھوٹ ڈالتے اور انہیں

اپنی طرف دعوت دیتے ہو اور اپنی کم عقلی و جہالت کی بنا پر اپنے آپ کو لوگوں کا امام اور پیشوا قرار دیتے ہو۔ اس قسم کی فضولیات بکنے کے بعد وہ خاموش ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد اس کے کارندوں اور وظیفہ خوروں کی باری آتی ہے وہ بھی اپنے اپنے انداز میں امامؑ پر بےبنیاد تہمتوں اور الزامات کی بارش کرتے ہیں۔

امام محمد باقرؑ اس ساری صورت حال کا انتہائی اطمینان اور خاموشی سے جائزہ لیتے ہیں اور جب تمام لوگ (اپنے دل کی بھڑاس نکال کر) خاموش ہو جاتے ہیں تو امامؑ اپنی نشست سے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دربار میں موجود لوگوں کی طرف اپنا رُخ کرکے اللہ کی حمد و ثنا اور حضرت محمدﷺ پر درود و سلام کے بعد چند مختصر جملوں میں ان کے مردہ ضمیروں کو جھنجھوڑتے اور ان کے پراکندہ ذہنوں کو جلا دیتے ہیں اور دوسروں کا آلۂ کار بن کر اپنے اختیار کو کھو دینے والے ان لوگوں کی سخت الفاظ میں مذمّت کرتے اور ان کے سروں پر سرزنش کے تازیانے برساتے ہیں اور پھر اپنے اور اپنے اعلیٰ ترین خاندان کے فخر و مباہات کو اُجاگر کرتے ہیں اور اہل بیت اطہارؑ کی سیرتِ طیّبہ کو اسلامی تعلیمات کے عین مطابق قرار دیتے ہوئے ان کے نیک اور بہترین انجام و عاقبت کو پوری دنیا کی تاریخی حقیقت پر محیط سنتِ الٰہیہ ٹھہراتے ہیں اور یوں ان کی نفسیات کو متزلزل کر دیتے ہیں چنانچہ آپؑ ارشاد فرماتے ہیں:

''أَيُّهَا النَّاسُ! أَيْنَ تَذْهَبُونَ وَأَيْنَ يُرَادُ بِكُمْ؟ بِنَا هَدَى اللّٰهُ أَوَّلَكُمْ وَبِنَا يَخْتِمُ آخِرَكُمْ فَإِنْ يَكُنْ لَكُمْ مُلْكٌ مُعَجَّلٌ فَإِنَّ لَنَا مُلْكاً مُؤَجَّلاً وَلَيْسَ بَعْدَ مُلْكِنَا مُلْكٌ لِأَنَّا أَهْلُ الْعَاقِبَةِ يَقُولُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ: وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ''[1]

اے لوگو! تم کہاں جارہے ہو؟! اور تمہارے بارے میں کیا سوچا جارہا ہے؟ ہم ہی ہیں جن کے وسیلے سے اللہ نے تمہارے اسلاف کی ہدایت کی اور ہم ہی تمہارے اعمال پر مہرِ تصدیق ثبت کرنے والے ہیں۔ اگر آج تمہارے ہاتھ میں ایک عارضی

---

[1] ''أَيُّهَا النَّاسُ''! اے لوگو! آپؑ کا یہ خطاب ان اعلیٰ حکومتی اہل کاروں سے ہے جو دربار میں موجود اور خلیفہ کے دفاع پر کمربستہ تھے، یعنی یہ حقیقت میں ان ظالم و جابر حکمرانوں کے اس جاہ و جلال کی نفی تھی جو انہیں عام لوگوں سے الگ کرتی تھی، یعنی آپؑ نے ایک سادہ خطاب کے ذریعے اپنا اصولی موقف بیان کر دیا۔ (مؤلف)

حکومت ہے تو کل ہمارے ہاتھ میں ایک دائمی حکومت ہوگی اور ہمارے بعد کسی اور کو یہ حکومت نہیں ملے گی، ہم ہی اہل آخرت ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ: آخرت تو بس متقین کے لیے ہے۔[1]

امام محمد باقرعلیہ السلام کے اس مختصر لیکن پُرمغز بیان میں (جو ظلم کے خلاف احتجاج، حکمرانوں کی مذمّت، خوشخبری، دھمکی، اثبات اور ردّ پر مشتمل ہے) اتنی تاثیر اور گہرائی پائی جاتی ہے کہ اگر یہ بات عام ہو جائے اور تمام لوگوں کے کانوں تک پہنچ جائے تو ممکن ہے کہ ہر سننے والا شخص اس جملے کے کہنے والے کی حقانیت اور سچائی کا اعتراف کرے۔

امام محمد باقرعلیہ السلام کی اسارت اور رہائی

اب امامؑ کی اس فصیح و بلیغ گفتگو کا جواب دینے کے لیے ایسے قابل، باصلاحیت اور توانا خطیب کی ضرورت تھی جو لوگوں کے دلوں کو گرما سکے لیکن اس دربار میں ایسا کوئی شخص موجود نہ تھا، ایسی صورت حال میں ان کے پاس انتقام، اہانت اور قید و بند کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔

پس ہشام حکم دیتا ہے کہ امام محمد باقرعلیہ السلام کو قید کر دیا جائے، دراصل وہ اپنے اس حکم کے ذریعے عملی طور پر اپنی نفسیاتی کمزوری اور شکست کا اعتراف کرتا ہے۔ حضرت امام محمد باقرعلیہ السلام قید خانے میں بھی (اپنی علمی صلاحیتوں کے جوہر دکھاتے ہوئے) اپنے روشن اور دل کو چھو لینے والے بیانات اور حقائق کے ذریعے تمام کے تمام قیدیوں کو اپنا ایسا گرویدہ بنا لیتے ہیں کہ کوئی ایک بھی ایسا قیدی باقی نہیں رہتا جو دل و جان سے آپؑ کی محبت کا اسیر نہ ہو گیا ہو۔

قید خانے کی نگرانی پر مامور اہلکار اس صورت حال سے متعلق اپنی رپورٹ ہشام کو پیش کرتے ہیں۔ یہ بات ایک ایسی حکومت کے لیے جس نے چند دہائیوں سے سرزمینِ

---

[1] بحار الانوار، ج۴۶، ص۲۶۴

شام کو علوی نظریات اور تعلیمات سے بچا کر رکھا تھا، کسی بھی صورت میں قابلِ برداشت نہ تھی۔ لہٰذا ہشام حکم صادر کرتا ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو فوراً قید خانے سے باہر نکالا جائے کیونکہ ان کے لیے مدینہ سے زیادہ کوئی مناسب جگہ نہیں وہ وہیں پیدا ہوئے اور وہاں ہی پلے بڑھے ہیں۔

نیز ساتھ ہی یہ حکم بھی صادر کرتا ہے کہ وہاں پہلے سے بھی سخت اور کڑی نگاہ رکھی جائے اور ضرورت پڑنے پر اپنے آخری حربے کا استعمال کرتے ہوئے خاموشی سے اپنے اس حریف کو اس کے اپنے گھر اور اپنے ہی بستر پر انجام کو پہنچایا جائے تاکہ خود ہشام پر ”امامؑ کے قتل“ کا الزام بھی نہ لگ سکے۔

پس ہشام کے حکم سے امام محمد باقر علیہ السلام اور آپؑ کے ساتھیوں کو تیز ترین سواریوں پر (جو بغیر کسی توقف کے مدینہ پہنچا سکیں) سوار کرکے مدینہ کی طرف روانہ کر دیا جاتا ہے اور دمشق سے روانگی سے پہلے ہی راستے بھر کی بستیوں میں اعلان کرا دیا جاتا ہے کہ حکومتِ وقت کے خلاف بغاوت کرنے والوں کا قافلہ ہے لہٰذا کسی کو بھی یہ اجازت نہیں ہے کہ ان کے ساتھ کسی قسم کا کوئی لین دین کرے یا کھانے پینے کی کوئی چیز فروخت کرے۔[1] یہ لوگ مسلسل تین دن اور تین راتیں اسی طرح سفر طے کرتے ہیں اور بالآخر ان

---

[1] بعض روایات کے مطابق شام اور مدینہ کے درمیان تمام شہروں اور بستیوں میں اعلان کرایا گیا تھا کہ (نعوذ باللہ) حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے دین اسلام چھوڑ کر عیسائیت کو اختیار کر لیا ہے۔ (بحار الانوار، ج٤٦، ص٣٠٦)

اسی طرح کا واقعہ انیسویں صدی کی درمیانی دہائیوں کے دوران ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں دیکھا جا سکتا ہے: مولانا (سید احمد) جن کا شمار ہندوستان کے معتبر اور مذہبی علماء میں ہوتا تھا (جو برصغیر کی آزادی کی تحریک میں پیش پیش تھے) تحریکِ مزاحمت کے مخالف بعض مولویوں نے انہیں ”وہابی“ کے طور پر متعارف کروایا۔ اس الزام کے لیے انہیں کسی جواز اور بہانے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس محبوب، مشہور اور مجاہد شخصیت کو بے خبر اور جاہل عوام کی نظروں میں بےاعتماد اور بے اعتبار قرار دیا جائے اور اس مقصد کے لیے وہابیت کا الزام ایک بہترین ذریعہ تھا۔ کیونکہ ان دنوں حجاز اور اس کے ملحقہ علاقوں میں وہابیت نے جس بربریت اور اعتقادی مسائل میں شدت پسندی کا مظاہرہ کیا تھا اس کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ اس دوران اس فرقے نے استعمار کے بطن سے تازہ جنم لیا تھا۔ جس کی وجہ سے عالمِ اسلام میں وہابیوں کے بارے میں بُغض اور کینہ پیدا ہو گیا تھا۔ لہٰذا وہابیت ایک ایسا الزام تھا جو محبوب ترین اشخاص کو بھی عام اور کم فکر لوگوں کی

کا کھانے اور پینے کا ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے۔

اب یہ قافلہ مدیَن شہر پہنچ گیا ہے لیکن شہر کے لوگ حاکم کے ڈر سے اپنے گھروں کے دروازے بند کر دیتے ہیں اور ان کے ساتھ کسی قسم کا معاملہ کرنے اور کھانے پینے کی اشیاء فروخت کرنے سے گریزاں ہیں۔ امام محمد باقرعلیہ السلام کے اصحاب آپؑ سے اپنی بھوک اور پیاس کی شکایت کرتے ہیں۔ اس وقت امام محمد باقرعلیہ السلام شہر کے نزدیک ایک بلند پہاڑی ٹیلے پر جاکر کھڑے ہو جاتے ہیں اور واشگاف آواز کے ساتھ فریاد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”اے شہر کے ظالم اور ستم پیشہ لوگو! میں خدا کا وہ ذخیرہ ہوں کہ جس کے بارے میں خدا نے فرمایا ہے: تمہارے لیے ذخیرۂ خدا بہتر ہے اگر تم لوگ واقعی مومن ہو۔“[1]

امامؑ کا ہوشیاری کے ساتھ بروقت یہ اقدام، حکمرانوں کی سازش کو بےنقاب اور اسے نقش بر آب کردیتا ہے۔ اتنے میں شہر کا ایک ہوشیار اور بہادر (بوڑھا) شخص کھڑا ہوتا ہے اور شہر کے فریب خوردہ اور بےخبر لوگوں کے ضمیر کو جھنجھوڑتا ہے اور

نظروں سے گرانے کے لیے کافی تھا کیونکہ عام اور سادہ لوح افراد نہ تو وہابیت کے بارے میں کچھ جانتے تھے اور نہ ہی ان میں جاننے کی صلاحیت تھی، انہیں یہ تک معلوم نہیں تھا کہ وہابیت کیا ہے؟ اور کہاں سے آئی ہے؟ اور اس کا مقصد کیا ہے؟ وہ کیا کہتے ہیں؟ لوگوں کو کہاں اس بات کا پتہ تھا کہ یہ پاکباز اور دور اندیش علماء جنھوں نے وقت کے استعمار یعنی برطانیہ کے خلاف برسر پیکار ہوکر اپنی زندگی بسر کی ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ وہ وہابی (یعنی انگریزوں کے آلہ کار) ہوں؟ انہیں تو بس اتنا معلوم تھا کہ وہابی ایک غلط اور گمراہ فرقہ ہے اور جب وہ سنتے تھے کہ یہ مجاہد علماء وہابی ہیں تو ان کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ (مزید معلومات کے لیے دیکھئے: کتاب ”ہندوستان کی آزادی میں مسلمانوں کا کردار“۔ (مطبوعہ خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران۔ کراچی) میں

جب حضرت امام محمد باقرعلیہ السلام اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کو شام طلب کرنے اور ان پر عیسائیت کے الزام کو آج سے ایک سو کچھ سال پہلے ہندوستان میں پیش آنے والے اس واقعہ کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے اپنے ارد گرد کے حالات اور واقعات کا تجزیہ کرتا ہوں تو مجھے بڑی حیرت اور تعجب کے ساتھ عربی زبان کا یہ ادبی جملہ یاد آتا ہے کہ: ”اَلنَّاسُ کَالنَّاسِ وَ الْأَیَامُ وَاحِدَۃٌ“ یعنی ہر زمانے کے لوگ ایک جیسے ہوتے ہیں اور زمانے بھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ (مؤلف)

[1] ”بَقِیَّۃُ اللہِ خَیْرٌلَّکُمْ إِن کُنتُم مُّؤْمِنِینَ“ (سورہ ہود، آیت۸٦)

انہیں اس بات سے آگاہ کرتا ہے کہ یاد رکھو! یہ اسی آواز کی صدائے بازگشت ہے جو خدا کے نبی حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی گمراہ قوم کو مخاطب کرکے لگائی تھی۔ وہ (بوڑھا شخص) اپنی اس پیام بھری آواز کے ذریعے لوگوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ اے لوگو! یہ آواز جو تم سن رہے ہو یہ وہی آواز ہے جو کئی سو سال پہلے تمہارے اسلاف نے بھی سنی تھی آج تم اپنے ان اسلاف پر لعنت ملامت کرتے ہو کہ انہوں نے اس آواز کو نظر انداز کر دیا تھا۔ (یاد رکھو!) آج تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا ہے آج وہی آواز فضا میں گونج رہی ہے، آواز دینے والا بھی وہی ہے اور اس آواز کو سننے والے بھی وہی ہیں۔ موقع کی مناسبت سے اس شخص کی یہ باتیں لوگوں کے دلوں پر اثر کرتی ہیں، لوگ اپنے اپنے گھروں کے دروازے کھول دیتے ہیں اور تمام تر حکومتی سازشوں کے باوجود وہ حکومتِ وقت کے ایک دشمن (یعنی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام) کو اپنے سینے سے لگا لیتے ہیں۔[1]

اس تاریخی روایت کا آخری حصّہ ایک طرف کئی جہتوں سے اس وقت کی پُر آشوب سیاسی فضا اور گھٹن کے ماحول کی نشاندہی کرتا ہے تو دوسری طرف بنو اُمیہ کی حکومت کے خلاف حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی سیرت اور کردار کو بھی واضح کرتا ہے۔

جب ہشام کو مدیَن شہر میں پیش آنے والے اس واقعے کی خبر ملی تو اس نے حکم دیا کہ سب سے پہلے اس گستاخ شخص کو اس کے کیے کی سزا دی جائے کہ اسے یہ جرأت کیسے ہوئی کہ وقت کے حکمران کی مرضی کے خلاف بات کرے اور لوگوں کو اتنی بڑی غفلت سے خبردار کر سکے، اسے اس کی اس خیانت کی سزا ملنی چاہیے لہٰذا خلیفہ کے حکم سے اسے قتل کر دیا گیا۔

امام محمد باقر علیہ السلام کا مسلح قیام سے گریز

اس کے باوجود حضرت امام محمد باقر علیہ السلام لوگوں کے سروں پر مسلّط حاکمِ وقت کے خلاف مسلح جدّوجہد اور قیام سے گریز کرتے ہیں۔ آپؑ نہ فقط تلوار ہاتھ میں نہیں لیتے بلکہ اس

---

[1] ۱۔ بحار الانوار، ج۴۶، ص۲۶۴، نقل از اصول کافی

طرح کی جلد بازی میں اقدامات کرنے والوں کو بھی اپنی تلواروں کو نیاموں میں رکھنے اور حالات کی نزاکتوں کا بھرپور اور دل کی آنکھوں سے جائزہ لینے پر زور دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنی زبان کی شمشیر کو بھی اس حد تک استعمال کرتے ہیں جہاں تک ضرورت کا تقاضا ہو۔ اپنے بھائی جناب زید کو بھی جو جذبات اور احساسات کی رُو میں بہہ کر صبر و شکیبائی کھو چکے ہیں، بڑے نصیحت آمیز لہجے میں سمجھاتے ہیں اور مسلح قیام اور جدّوجہد سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش فرماتے ہیں۔

آپؑ اپنے معمولی اور محدود رابطوں سے لے کر ناتجربہ کار عناصر کے ساتھ ہونے والی ملاقاتوں اور تعلقات میں فرہنگی اور فکری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے پر زور دیتے ہیں۔ ایک ایسا کارنامہ جو آپؑ کی سیاسی و فکری آرزوؤں کی بنیاد بھی ہے اور سیاسی طور پر ایک بہترین تقیہ بھی؛ جیسا کہ گذشتہ صفحات میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آپؑ کا یہ حکیمانہ طرزِ عمل اس بات کا ہرگز موجب نہیں بن سکتا ہے کہ اپنے چاہنے والے قریبی ساتھیوں اور تمام شیعوں کو امامت کی تحریک سے بالکل الگ کر دے اور شیعوں کی دیرینہ خواہش یعنی اسلامی اور علوی نظامِ عدل کو معاشرے میں نافذ کرنے کی اُمنگ کو پورا کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش اور جدّوجہد کو ان کے دلوں میں ہمیشہ اُجاگر اور زندہ و جاوید نہ رکھے۔ یا مناسب ترین مواقع میں اس راہ کی تکمیل کے لیے مناسب اقدامات اور ان کے دلوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس طرف راغب نہ کرے۔

اپنے چاہنے والوں کو مستقبل قریب میں ان کی دیرینہ خواہشات کی تکمیل کی نوید حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی سیرتِ طیّبہ کا اُمید بخش پہلو ہے اور آپؑ کی زندگی کا یہ پہلو اس بات کی بھی غمازی کرتا ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اپنے آپ کو شیعوں کی اس تدریجی تحریک میں کہاں اور کس مرحلے میں دیکھتے ہیں۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا گھر آپؑ کے خاندان اور آپؑ کے چاہنے والوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، اتنے میں ایک عمر رسیدہ شخص وارد ہوا اور سلام کرنے کے بعد کہنے لگا: اے فرزند رسولؐ! میری جان آپؑ پر قربان! خدا کی قسم! میں آپؑ اور آپؑ

کے چاہنے والوں سے محبت اور دوستی رکھتا ہوں اور خدا کی قسم! میری یہ دوستی اور محبت دنیاوی زندگی کی طمع اور لالچ میں نہیں ہے۔ میں آپؑ کے دشمنوں سے دشمنی اور ان سے اظہار سے برائت و نفرت کرتا ہوں، میرا یہ کینہ اور ان سے دشمنی اس لیے نہیں کہ میرے اور ان کے درمیان کوئی خونریزی ہوئی ہے۔ خدا کی قسم! میں آپؑ کے اوامر اور نواہی کی پاسداری کرتا ہوں اور اس بات پر مکمل بھروسہ اور عقیدہ رکھتا ہوں کہ ایک نہ ایک دن آپؑ کو خدا کی طرف سے فتح و نصرت ضرور حاصل ہوگی اور میں اس وقت کا شدت سے انتظار کرتا ہوں کیا میرے اس عمل اور کردار کی بنیاد پر میری نجات کی کوئی اُمید ہے؟

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے اس بوڑھے شخص کو اپنے قریب بلایا اوراپنے پاس بٹھا کر ارشاد فرمایا: ”اے بزرگ! ایک شخص نے میرے پدرِ بزگوار امام علی بن الحسین علیہما السلام سے بھی یہی سوال کیا تھا۔ چنانچہ میرے والد بزرگوار نے فرمایا تھا: اگر تم اس آرزو کی تکمیل کے انتظار میں انتقال کر جاؤ تو یقیناً تمہارا حشر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، علی بن ابیطالب علیہما السلام، حسن و حسین علیہما السلام اور مجھ علی ابن الحسین علیہما السلام کے ساتھ ہوگا۔ تمہارا دل ٹھنڈا، تمہاری جان کامیاب اور تمہاری آنکھیں روشن ہو جائیں گی اور خدا کے بزرگ ترین بندوں کے ساتھ آغوشِ رحمت و سکون اور ان کے سائے میں تمہیں جگہ ملے گی اور اگر تم زندہ رہے تو اس دنیا میں ایک دن اپنی آنکھوں سے وہ منظر دیکھو گے کہ جس کے دیکھنے کے سبب تمہاری آنکھیں روشن ہو جائیں گی اور اس وقت ہمارے پہلو میں بہترین مقام اور منزل پر خود کو پاؤ گے۔“ وہ بوڑھا شخص وہاں سے جانے لگا تو امام محمد باقر علیہ السلام نے اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا: ”جو کوئی کسی اہلِ بہشت کو دیکھنا چاہتا ہے تو وہ اس بوڑھے شخص کو دیکھ سکتا ہے۔“[۱]

کبھی کبھار تو آپؑ اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں اور اپنی فتح و کامیابی کا سال بھی لوگوں کے سامنے مشخص فرماتے اور اپنے شیعوں کی دیرینہ خواہش اور آرزو کو جامۂ حقیقت پہناتے ہیں۔

---

[۱] بحار الانوار، ج۴۶، ص۳۶۱۔۳۶۲

ابو حمزہ ثمالی کہتے ہیں: میں نے امام محمد باقرعلیہ السلام سے سنا کہ آپؑ فرماتے تھے: خدا نے اس کام (یعنی حکومتِ الٰہیہ اور علوی نظام) کے لیے ۷۰ھ ق کو معین کیا ہوا تھا لیکن حضرت امام حسینعلیہ السلام کی شہادت پر وہ خاک نشینوں سے ناراض ہوا اور اس کام کو ۱۴۰ھ ق تک مؤخر کر دیا۔ ہم نے اس وعدے کو تمہارے لیے (نزدیک ترین شیعوں کے لیے) کھول کر بیان کر دیا اور تم لوگوں نے اس راز کی پاسداری نہیں کی اور اسے دوسروں کو بتا دیا، اس لیے خداوند عالم نے اس کام کے لیے ہم سے کسی خاص اور معین وقت کا وعدہ نہیں کیا؛ یقیناً خدا جسے چاہے محو کرتا ہے اور جسے چاہے ثبت کرتا اور باقی رکھتا ہے۔ ابو حمزہ ثمالی کہتے ہیں کہ میں نے یہی بات حضرت امام جعفر صادقعلیہ السلام کی خدمت میں عرض کی تو آپؑ نے فرمایا: جی ہاں! بالکل ایسا ہی تھا۔[1]

نظامِ اسلامی کی تشکیل اور حکومتِ علوی سے متعلق حضرت امام محمد باقرعلیہ السلام کے بیانات وہ بھی بنو اُمیہ کے اس پُرآشوب دورِ حکومت میں، جبکہ ہر طرف شیعوں کے لیے زمین تنگ ہوتی جارہی تھی درحقیقت ایک دل انگیز خواب اور ستم دیدہ (افراد اور بالخصوص) شیعوں کی آخری تگ و دو اور آرزو کی تکمیل کے لیے اُمیدِ سحر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جسے وہ ایک یقینی اور خدا کے حتمی فیصلے کے طور پر دیکھتے ہیں اور اسی عقیدے اور نظریے کی بنیاد پر وہ وقت کے مقتدر ترین حکمرانوں کے سامنے بھی سرتسلیمِ خم ہونے کی بجائے اس پُرخطر راہ میں پیش آنے والے ہر طرح کے خس و خاشاک اور نشیب و فراز کا مقابلہ کرتے اور اپنی منزلِ مقصود کی طرف گامزن نظر آتے ہیں۔ حضرت امام محمد باقرعلیہ السلام کے دورِ امامت کے پورے انیس سال ایک زنجیر کی مختلف لڑیوں کی مانند آپس میں جڑے ہوئے روشن اور واضح حکمتِ عملی کے ساتھ گزرے۔

مجموعی طور پر آپؑ کے دورِ امامت کے یہ انیس سال یوں ایک سیدھے اور روشن راستے کی مانند گزر گئے مگر ان انیس سالوں میں آپؑ نے لوگوں کو آئیڈیالوجی کی تعلیم بھی دینی تھی، انفرادی طور پر لوگوں کی تربیت بھی کرنی تھی جنگی حربے بھی

---

[1] ۱۔ الکافی، ج۱، ص۳۶۸

آزمانے تھے تو دوسری طرف تنظیم سازی اور اپنے سیاسی موقف کی حفاظت بھی کرنی تھی اور تقیہ کے اصولوں کو بھی اپنانا تھا اور ساتھ ہی لوگوں کے دلوں میں اُمید کی شمعیں بھی روشن رکھنی تھیں۔ مختصر یہ کہ آپؑ کا انیس سالہ دورِ امامت سخت جدوجہد اور سنگلاخ و دشوار راستوں کو طے کرنے سے عبارت ہے۔ یوں آخر کار آپؑ کی مختصر اور بابرکت زندگی اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔

علوی تحریک کے دیرینہ دشمن اس کے دھڑکتے دل کے خاموش ہونے پر یہ سمجھتے تھے کہ شاید اب وہ سکھ کا سانس لے سکیں گے اور شیعوں کی تبلیغات اور تعلیمات سے مکمل چھٹکارا حاصل کرکے ملک کے اندرونی اور بیرونی دشمن عناصر کا مقابلہ کر سکیں گے۔ ایسے میں اس بھڑکتی ہوئی اور جھلسا دینے والی بھٹی سے بنو اُمیہ کی حکومت کی بنیادوں پر آخری بجلی گرتی ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی وصیت

چنانچہ جس طرح حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے اپنی ساری زندگی بنو اُمیہ کے ہتھکنڈوں کو اُجاگر اور عیاں کرنے میں گزاری اسی طرح اپنی رحلت کے بعد بھی اس کام کو جاری رکھنے کا پورا اہتمام اپنی حیات میں ہی کرتے ہیں، جس طرح آپؑ اپنی زندگی میں لوگوں کو علم و آگاہی فراہم کرتے رہے اسی طرح اپنی رحلت کے بعد بھی اس سلسلے کو جاری رکھنے کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ آپؑ اپنے اصحاب اور بے خبر لوگوں کی کثیر تعداد کے نام جن میں سوچنے اور سمجھنے کی لگن تھی ایک تازہ اور نیا پیغام بھیجتے ہیں۔

آپؑ کا یہ پیغام بھی آپؑ کی زندگی کے مجموعی حالات کی طرح بڑا پُرسکون اور عمیق ہے۔ آپؑ کے اس پیغام سے جہاں آپؑ کے ساتھی اور دوسرے ضرورت مند بہرہ مند ہوتے ہیں وہاں آپؑ کے دشمنوں کی نیند میں بھی کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ یہ امام محمد باقر علیہ السلام کے تقیہ کے اصول پر عمل کی ایک مثال ہے جو اُس مخصوص دور کے عمومی حالات اور آپؑ کے طرزِ عمل کی مکمل عکاسی کرتی ہے۔

جن لوگوں نے بعد میں امام محمد باقر علیہ السلام کی زندگی کے حالات کو تاریخ کے صفحات میں قلمبند کیا ہے وہ بھی آپؑ کے اس عظیم اقدام کے بارے میں جسے آپؑ نے ایک مختصر حدیث کے ذیل میں بیان فرمایا، غفلت یا لاپرواہی کا شکار ہوئے ہیں۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اس حدیث کو نہ دیکھا ہو؟!

مختصر طور پر اتنی سی بات ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اپنی زندگی کے آخری لمحات میں امام جعفر صادق علیہ السلام کو یہ حکم دیتے ہیں کہ آپؑ کی جائیداد کے ایک حصّے (آٹھ سو درہم) کو آئندہ دس سال تک آپؑ کی مجلس عزا اور آپؑ پر گریہ کرنے کے لیے خرچ کیا جائے۔ عزاداری کا مقام میدانِ منیٰ ہے؛ زمان اور وقت حج کے ایام ہیں۔

چونکہ حج ایک ایسا موسم ہوتا ہے جس میں دور دراز کے رہنے والے ہزاروں، لاکھوں افراد ایک ہی وقت میں ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ یہ مختلف زبانوں (اور رنگ و نسل) والے ہم خیال لوگ وہاں جمع ہو کر ایک ہی زبان میں اپنے ربّ کی عبادت کرتے ہیں اور اسی طرح مختلف قوموں سے تعلق رکھنے والے افراد کا ایک پرچم تلے جمع ہونے کا عملی مشاہدہ کرتے ہیں۔

اگر کسی پیغام کو دنیا کے گوشہ و کنار تک پہنچانا مقصود ہو تو اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا ہے۔ دوسری طرف چونکہ مناسکِ حج چند دنوں میں متواتر اور مختلف مقامات پر انجام دیئے جاتے ہیں دیکھنا یہ ہے کہ مجلس عزا منعقد کرنے کے لیے ان میں سے مناسب وقت اور جگہ کونسی ہے؟ مکہ ایک شہر ہے، جہاں لوگ پھیلے ہوئے بھی ہوتے ہیں اور مصروف بھی۔ اس کے علاوہ یہاں لوگ اعمالِ حج بجالانے میں مشغول ہوتے ہیں، طواف، سعی اور نماز وغیرہ۔ مشعر الحرام رات کے ٹھہرنے کی ایک جگہ ہے جہاں مجلس عزا کے لیے نہ تو وقت مناسب ہے اور نہ ہی جگہ۔ مختصر یہ کہ مشعر منیٰ کے راستے پر واقع ایک اسٹیشن سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ عرفات اگرچہ دن کے وقت ٹھہرنے کی جگہ ہے لیکن یہاں بھی ایک مختصر مدت یعنی صرف ایک دن کے لیے ٹھہرتے ہیں، وہ بھی صبح کے وقت تھکے ہارے پہنچتے ہیں اور پھر عصر کے وقت وہاں سے اپنی اگلی منزل کی طرف روانگی کی تیاری ہوتی ہے۔ پس (اس کام کے

لیے) سب سے بہترین جگہ منیٰ ہے، جہاں پر عرفات سے واپسی پر حجاج کرام مسلسل تین دن ٹھہرتے ہیں۔ لہٰذا حجاج کرام کے لیے ایک دوسرے سے واقفیت حاصل کرنے اور آپس میں دردِ دل بیان کرنے کے لیے یہ مناسب ترین جگہ ہے؛ کیونکہ اس دوران کونسا حاجی ایسا ہے جو دن کو مکہ جاکر خانہ کعبہ کی زیارت کرے اور رات کو دوبارہ منیٰ آنے کی زحمت برداشت کر سکے؟ لہٰذا حجاج کرام کے لیے ہر محفل، ہر کاروان اور ہر اجتماع کے پاس جاکر ملنے کا یہ بہترین اور مناسب وقت ہوتا ہے۔ فطری طور پر تمام لوگوں کو اس مجلس عزاء کے بارے میں پتہ چلتا ہے جو ہر سال ان تین دنوں کے دوران اسی مقام پر منعقد کی جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ دنیا بھر کے لوگوں کو پتہ چلنے لگا کہ کئی سالوں سے اہلِ مدینہ (یعنی اسلام کے اصلی مرکز اور صحابہ کرام، فقہائے عظام اور محدثینِ کبار کے مسکن) کا ایک گروہ ہر سال انہیں ایام میں یہاں پر ایک مجلس عزاء برپا کرتا ہے۔

(مگر) کس کے لیے؟ اسلام کی ایک جانی پہچانی شخصیت یعنی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی یاد میں، خاندانِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعلق رکھنے والے ایک عظیم انسان کی یاد میں، تمام فقہائے کرام کے سردار اور محدثینِ عظام کے استاد اور فقہ و حدیث سے تعلق رکھنے والے تمام دانشمندوں کے استاد کی یاد میں۔ یہ لوگ کیوں اس طرح مجلس عزا برپا کر رہے ہیں؟ کیا وہ اپنی طبیعی موت رحلت نہیں فرما گئے تھے؟ کس نے انہیں قتل کیا یا زہر دیا تھا؟ اور کیوں؟ انہوں نے کیا کیا تھا؟ ان کا قصور کیا تھا؟ وہ کہہ کیا رہے تھے؟ کیا ان کا ایک خاص دعویٰ اور نکتہ نظر تھا؟ کیا وہ لوگوں کو اپنی طرف دعوت دے رہے تھے؟ کیا وہ خلیفۂ وقت کے لیے خطرہ تھے وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کے سینکڑوں سوالات اور ابہامات کے پیچھے صاحبانِ عزا اور دوسرے جاننے والوں کی طرف سے کئی جوابات جو اس عظیم اجتماع میں جگہ جگہ دیا کرتے تھے، جو مدینہ یا کوفہ سے اس لیے یہاں آتے تھے تاکہ لوگوں کے سوالات کے جوابات دے سکیں۔ وہ یہاں اس لیے آتے تھے تاکہ اس بہترین موقع سے استفادہ کرتے ہوئے لوگوں کے سامنے اصل حقائق بیان کر سکیں، نیز اپنے بھائیوں اور دوستوں سے ملاقات کر سکیں، انہیں اپنے حالات سے آگاہ کر سکیں اور اپنے لیے نئے احکامات حاصل کر سکیں۔ خلاصہ یہ کہ اس مجلس کا مقصد اس زمانے

کے اس تبلیغاتی مرکز کے سینکڑوں ذرائع سے شیعیت کی تبلیغ اور نشر و اشاعت تھا۔ یہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا کامیاب منصوبہ تھا (جو آپؑ کی رحلت کے بعد جہاد کا منصوبہ ہے) اور یہ ہے وہ بابرکت ہستی کہ جس کی زندگی بھی خدا کے لیے تھی اور موت بھی خدا ہی کے لیے ہوئی "وَجَعَلَنِي مُبارَكاً أَيْنَ ما كُنْتُ... وَسَلامٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا"[1]

امام محمد باقر علیہ السلام کی شہادت کے بعد مجموعی حالات

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے ۵۷ سال کی عمر میں بنی اُمیہ کے مقتدر ترین خلیفہ ہشام بن عبد الملک کے دورِ حکومت میں شہادت پائی۔ سلطنت کے ناگفتہ بہ حالات، بے شمار مصروفیات، مشاغل اور وسیع و عریض مملکت کو درپیش مشکلات بھی اس امر میں رکاوٹ نہ بن سکیں کہ ہشام کو شیعی تنظیم کے اس دھڑکتے دل (یعنی امام محمد باقر علیہ السلام) کے خلاف سازشوں سے غافل کر سکیں۔ ہشام کے حکم سے اس کے کارندوں نے امامؑ کو زہر دیا اور بنو اُمیہ کے طاغوتی حکمرانوں نے مملکت کی مغربی اور مشرقی سرحدوں پر اپنی کامیابیوں اور فتوحات کی لذتوں اور سرمستیوں کو سلطنت کے اندر اپنے سب سے بڑے اور خطرناک دشمن کے قتل سے مکمل کر دیا۔

بنو اُمیہ کی سرکار حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی زندگی کے آخری اور آپؑ کے فرزند امام جعفر صادق علیہ السلام کی زندگی کے ابتدائی سالوں میں اپنے زمانے کے انتہائی سخت اور نازک ترین دور سے گزر رہی تھی۔ جہاں ایک طرف شمال مشرقی سرحد پر (ترکستان اور خراسان) شمال میں (ایشیائے صغیر اور آذربائیجان) اور مغرب میں (افریقہ، اندلس اور یورپ) کی سرحدوں پر حکومت مخالف عسکری طاقتوں کے مظاہرے ہوتے تھے تو دوسری طرف عراق اور خراسان کے نواحی علاقوں اور شمالی افریقہ میں مسلسل جنم لینے

---

[1] اور میں جہاں بھی ہوں میرے وجود کو خدا نے بابرکت قرار دیا ہے۔۔۔ ان پر (ہمارا) سلام ہو جس دن وہ پیدا ہوئے اور جس دن انہیں موت آئے گی اور جس دن وہ دوبارہ زندہ اُٹھائے جائیں گے۔ (سورہ مریم، آیات ۱۵ و ۳۱ سے اقتباس) (پیشوائے صادق، ص ۳۳۔۵۴)

والی شورشیں جو عموماً یہاں کے ناراض اور مظلوم مقامی لوگوں یا کبھی کبھار بنو اُمیہ سے تعلق رکھنے والے سرداروں کے اُکسانے یا ان کی مدد سے سر اُٹھا رہی تھیں۔[۱]

اسی طرح دوسری طرف پوری سلطنت کے نامنظّم اور مخدوش معاشی حالات خصوصاً سرزمین عراق کے مختلف علاقے (جہاں بادشاہ کی املاک کی حفاظت پر مامور لوگ رہ رہے تھے یا وہاں کی بھر پور پیداوار دینے والی اکثر زمینیں خود خلیفہ یا اس کے گماشتوں کی ہوتی تھیں) نیز خود ہشام اور عراق میں اس کے مقتدر گورنر (خالد بن عبد اللہ قسری[۲]) کے خُرد بُرد کے واقعات اور آخر کار بنو اُمیہ کی سرپرستی میں ان کے مشہور حکمران کے ذریعے چلائے جانے والی اس وسیع و عریض مملکت کے مختلف علاقوں خراسان، عراق اور شام میں قحط اور وبائی بیماریوں نے عجیب و غریب حالات پیدا کر دیئے تھے، اس پر عالم اسلام کا سب سے بڑا اور اہم معنوی، فکری اور نفسیاتی نقصان مستزاد تھا۔

اُموی حکمرانوں کی قدرت طلبی اور ظلم و استبداد کے نتیجے میں اسلامی مملکت کے پریشان حال اور غمزدہ ماحول میں جہاں غربت، بدامنی اور بیماریاں وہاں کے بے سہارا لوگوں کے سروں پر بجلی بن کر گر رہیں تھیں، وہاں فضیلت، تقویٰ، اخلاقیات اور معنویات کے پودے کا پروان چڑھانا بظاہر ایک مشکل اور ناممکن عمل دکھائی دیتا ہے۔

۱۔ مورّخین بغیر کسی استثنا کے ان سب کو خوارج سے منسوب کرتے ہیں، جو خود ان بغاوتوں اور تحریکوں کے خلاف اُموی دربارِ خلافت کے مخصوص الزامات کی نشاندہی کرتی ہے ان تمام شورشوں اور تحریکوں میں سے اکثر یا کم از کم بعض گروہ تو حق پر تھے۔ (مؤلف)

۲۔ خالد بن عبد اللہ قسری پر یہ الزام تھا کہ اس کی سالانہ آمدنی تیرہ ملین ہے۔ ہشام نے اسے ایک خط لکھا کہ کوئی شخص اس وقت تک اپنا غلہ فروخت نہ کرے جب تک امیر المومنین (یعنی خلیفہ) کا غلہ فروخت نہیں ہوتا! خالد نے جو دل سے خلیفہ کا ہم خیال نہ تھا اپنے ایک خطبے میں کہا: لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قیمتیں میں بڑھاتا ہوں۔ جو بھی قیمتیں بڑھاتا ہے اس پر اللہ کی لعنت ہو! (یعنی وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ یہ خلیفہ کا کام ہے۔) ہشام کی بیوی کے پاس ایک ایسا لباس تھا کہ جس کے تار سونے کے تھے اور اس پر انتہائی قیمتی نگینے جڑے ہوئے تھے اور وہ اتنا وزنی تھا کہ وہ اسے پہن کر چل بھی نہیں سکتی تھی۔ بڑے بڑے دولتمند اس کی قیمت کا تعین نہیں کر سکے تھے اور خود اس کے پاس ریشم اور سونے سے تیار کیا ہوا ایک ایسا فرش تھا کہ جس کی لمبائی ۱۰۰ہاتھ اور چوڑائی ۵۰ہاتھ تھی۔ (ابن اثیر، ج۵، ص۲۲۰؛ بین الخفاء و الخلفاء، ص۲۸ اور۵۶) (مؤلف)

علماء، قاضی صاحبان، محدثین اور مفسرین جنہیں ان بے سہارا اور مظلوموں کے لیے پناہ گارہ بن جانا چاہیے تھا وہ نہ صرف یہ کہ لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لیے کوئی عملی اقدام نہیں کرتے تھے بلکہ اکثر اوقات وہ خود بھی سیاست دانوں سے بھی زیادہ خطرناک انداز میں لوگوں کی مشکلات میں اضافہ کرنے کے در پے رہتے تھے۔

فقہ، کلام، حدیث اور تصوّف و عرفان کے نامور علماء جیسے حسن بصری، قتادہ بن دعامہ، محمد شہاب زہری، ابن بشر، محمد بن المکندر، ابن ابی لیلیٰ جیسے دسیوں لوگ دربارِ خلافت سے وابستہ ہو کر درحقیقت خلافت کے مہرے یا حکمرانوں کے ہاتھوں کھلونے بن چکے تھے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ ان مشہور و معروف شخصیات کے حالات زندگی کا جائزہ لیا جائے تو محقق اور تجزیہ نگار کے سامنے یہ لوگ اپنی ناپاک خواہشات میں غرق، طاقت اور نام و نمود کے شیدائی، لذتوں کے طلبگار، ڈرپوک، پست فطرت، عافیت طلب، بےبس ریاکار اور بےوقوف زاہد یا علم کلام اور اعتقاد کی خونی مباحث میں سرگرم نظر آتے ہیں۔[۱]

قرآن اور حدیث جنہیں معرفت اور عمدہ و نیک صفات کی بنیاد ہونا چاہیے تھا، ان مقتدر حکمرانوں اور نام نہاد علماء کے ہاتھوں میں بازیچہ بن کر رہ گئے تھے۔

۱۔ ان لوگوں کی بےحیائی، خیانت آمیز اور بےوقوفانہ نظریات کی سینکڑوں مثالوں میں سے ایک مثال یہ ہے کہ: حسن بصری جو حجاج بن یوسف جیسے (ظالم و جابر، خون آشام اور بےنمازی) شخص کے خلاف جہاد کو جائز نہیں سمجھتا تھا اور کہتا تھا کہ میری رائے تو یہ ہے کہ اس کو نہ چھیڑا جائے کیونکہ اگر وہ تم لوگوں پر خدا کا مسلط کردہ عذاب ہے تو تم اس خدائی عذاب کو اپنی تلواروں کی طاقت سے ہٹانے کی طاقت نہیں رکھتے اور اگر وہ تم پر نازل ہونے والی بلا ہے تو صر کرو تاکہ اللہ تعالیٰ خود ہی اس بلا کو ٹال دے کیونکہ وہ بہترین حکم دینے والا ہے! (طبقات ابن سعد، ج۱، ص۱۱۹، نقل از نظریۃ الامامۃ، محمود صبحی، ص۲۳) (مؤلف)

امام جعفر صادق علیہ السلام کی امامت کا آغاز

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس زہر آلود، گھٹن زدہ، تاریک، مشکلات سے پُر اور دُشوار زمانے میں امانتِ الٰہی یعنی ”امامت“ کے اس بارِ گراں کو اپنے کاندھوں پر اُٹھایا۔ اندازہ کیجئے کہ ”امامت“ کا معاملہ کس قدر اہم اور حیات بخش ہے خصوصاً ایسے مظالم اور مشکلات سے پُر زمانے میں ایک ایسی اُمت کے لیے جو پریشان حال، فریب خوردہ، مظلوم اور بے شعور ہو، امامت کو اس مفہوم میں سمجھانا جسے ہم نے شیعہ تہذیب و ثقافت میں سمجھا اور پہچانا ہے، انتہائی اہم اور ضروری ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ امامت دو حیات بخش تحریکوں کا سرچشمہ ہے: صحیح اسلامی فکر کا پرچار اور عادلانہ توحیدی نظام کا قیام۔ امام پر یہ دونوں ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ سب سے پہلی ذمہ داری مکتب کی تشریح، تطبیق اور تفسیر ہے (جس کا لازمہ تحریفات، جاہلانہ رسوم و رواج اور خود غرضیوں سے مقابلہ کرنا ہے)۔

دوسری ذمہ داری عدل و انصاف پر مبنی توحیدی نظام کا قیام ہے اور ایسے نظام کی موجودگی کی صورت میں اس کی حفاظت کرنا ہے۔ اب ایسے پُرآشوب اور ناگفتہ بہ حالات میں امام جعفر صادق علیہ السلام اس بارِ امانت کو اپنے کاندھوں پر لیتے ہوئے ان دونوں ذمہ داریوں کو اُٹھاتے ہیں۔ ایک ہی وقت میں یہ دونوں ذمہ داریاں آپؑ کے سامنے تھیں تو سوال یہ تھا کہ آپؑ کو پہلے کس کو انجام دینا چاہیے؟

یہ بات صحیح ہے کہ سیاسی کاموں میں بہت ساری مشکلات ہوتی ہیں اور یہ کوئی ایسا معمولی کام نہیں کہ جسے اُموی خلیفہ ہشام اپنی تمام تر مصروفیات اور اختلافات کے باوجود آسانی سے کرنے دے اور پھر ایسا کرنے والوں سے اس کا سخت بدلہ نہ لے۔ لیکن فکری اور نظریاتی کام (یعنی تحریفات سے مبارزے کا کام) درحقیقت خلافت کی شہ رگ کو کاٹنا ہے۔ ایک ایسی حکومت کہ جس کے پاس اپنے وجود کو باقی رکھنے کے لیے دین میں انحرافات کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔[1] لٰہذا امامؑ کو اس کام کی ہرگز اجازت نہیں

---

[1] یہ ایک بہت ہی غور طلب بات ہے کہ اسلامی معاشرے کے صحیح اسلامی طرزِ فکر سے واضح انحراف کے باوجود عام لوگوں بلکہ بعض سرداروں کے ذہنوں میں دینی عقیدت اس قدر مضبوط ہوگئی تھی کہ ان کے عمل

دی گئی۔ نہ تو ہشام کی طرف سے اور نہ ہی علمائے عامہ، یعنی وہ علماء جو خود بھی عمومی اور معاشرے میں رائج تنزّلی اور انحراف کی راہ پر بھرپور طریقے سے گامزن تھے، کی طرف سے اس کی اجازت دی گئی۔

دوسری طرف شیعوں کے اپنے انقلابی نظریات پھیلانے کے لیے بھی حالات سازگار ہیں (کیونکہ ملک میں) ایک طرف خانہ جنگی اور فقر و فاقہ ہے تو دوسری طرف ظلم و استبداد کا راج ہے۔ یہ تینوں عوامل کسی بھی معاشرے میں انقلاب برپا کرنے کے بنیادی عوامل ہیں اور پس منظر کا جائزہ لیا جائے تو گذشتہ اماموں نے نہ صرف اپنے قریبی علاقوں بلکہ دُور دراز کے علاقوں میں بھی حالات کو ایک حد تک سازگار بنا دیا ہے۔ ایک ایسے ماحول میں جہاں لوگوں کے ایک گروہ کی موجودگی میں جو نظریہ امامت کو جانتا ہے اور اسے قبول بھی کرتا ہے اور نظریۂ امامت کی پالیسیوں کو عملی جامہ پہنانے کا پورے ذوق و شوق سے منتظر ہے تو ایک دوسرا ایسا گروہ بھی موجود ہے جو اپنے پورے مصمم ارادے کے ساتھ مبارزاتی تنظیم سے ملحق ہو چکا ہے، ایسے میں امامت کی مجموعی پالیسی ایک توحیدی اور علوی انقلاب برپا کرنا ہے۔

اس عمومی پالیسی کا منطقی نتیجہ پورے عالم اسلام میں ایک ہمہ گیر دعوت ہے جس کا مقصد جہاں ایک طرف ہر سطح کے لوگوں کے لیے شیعی نظریات کو قبول کرنے کا مناسب ماحول فراہم کرنا ہے تو وہاں دوسری طرف شیعوں کی خفیہ تنظیم کے لیے مؤثر فداکار افراد بھی تیار کرنا ہے۔

اور زندگی پر اس کا گہرا اثر تھا۔ اسی عمومی عقیدے (جو بدقسمتی سے ایک من گھڑت عقیدہ تھا) ہی کے ذریعے خلفاء اپنی ذلت آمیز زندگی کو محفوظ رکھ سکتے تھے۔ دینی عقیدے کی اس پابندی سے حکمران کیسے استفادہ کرتے تھے اس کی ایک مثال ”بیعت“ کے مسئلے میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ کتنے ہی ایسے لوگ تھے جو خلیفہ کے تمام تر انحرافات کو دیکھنے کے باوجود صرف اس عہد و پیمان کے احترام میں کہ ”بیعت کا عہد“ توڑنا حرام ہے۔ خلیفہ سے کی ہوئی بیعت کا پاس رکھتے تھے اور اس کی باتوں سے روگردانی نہیں کرتے تھے اور کتنے ہی مواقع پر ”وصیت“ اور ”بیعت“ نے نظامِ خلافت کو بچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور یہ ان بدعنوان خلفاء کے خلاف منظم جدوجہد کی راہ میں رکاوٹ بنی ہیں۔ (مؤلف)

امامت کی سچی دعوت کے کام کی دشواری کا راز اسی نکتے میں پوشیدہ ہے۔ (کیونکہ) جب ایک مکمل نظریاتی دعوت، اسلام کے بنیادی اصولوں اور معیاروں کا پاس رکھتے ہوئے حکومت کو لوگوں پر ظلم و استبداد اور ان کے حقِ آزادی کو پامال کرنے سے روکنا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کے فہم و شعور پر تکیہ کرتے ہوئے ان کی فطری خواہشات اور ضرورتوں کا احساس کرتے ہوئے اپنی پیش رفت کو مسلسل جاری رکھا جائے۔

اس کے برعکس ایسی تحریکیں جو بظاہر فکری اور نظریاتی نعروں کے ساتھ اپنے کام کا آغاز کرتی ہیں، لیکن عملی میدان وہ اپنے اخلاقی اور اجتماعی اصولوں کو نظر انداز کرکے معاشرے کے دوسرے طاقتور لوگوں کی طرح اپنی طاقت و قدرت کا اظہار کرتی ہیں اور وہ اس کام میں کوئی مضائقہ بھی نہیں سمجھتی ہیں، ان کو کسی ایسی دشواری اور مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

لہٰذا امامت کی تحریک کے طولانی ہونے اور اس کے مقابلے میں چلنے والی تحریکوں (جیسے بنو عباس کی تحریک) کی پیش رفت اور ان کے مقابلے میں اس تحریک کی کسی حد تک (ظاہری) شکست کی وجہ بھی یہی ہے۔ اس بات کو تاریخی مصادر کی بنیاد پر مزید تفصیل کے ساتھ آئندہ صفحات میں بیان کیا جائے گا۔

مناسب اور سازگار حالات نیز گزشتہ اماموں کی بے پناہ جدّوجہد اس بات کا سبب بنی کہ شیعہ تحریکوں کے طویل اور پُرمشقت سفر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ہی اس اُمید کے سچے مظہر بن گئے کہ جس کے شیعہ کئی سالوں سے منتظر تھے۔ وہ ”قائم“ جو اپنے اسلاف کی طویل جدّوجہد کو نتیجہ خیز بنائے گا اور شیعی انقلاب کو پورے عالم اسلام میں پھیلائے گا (مختلف مواقع پر) امام محمد باقر علیہ السلام کے اشارے کنائے اور کبھی کبھار اس کی وضاحت بھی اس خواہش کو پروان چڑھانے میں مؤثر ثابت ہوئی ہے۔

جابر بن یزید کہتا ہے: کسی شخص نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے ان کے بعد قیام کرنے والے کے بارے میں پوچھا تو آپؑ نے ابو عبد اللہ (یعنی امام جعفر صادق علیہ السلام) کے کاندھے پر تھپکی دیتے ہوئے فرمایا: ”بخدا آل محمدؐ میں قیام کرنے والے یہ ہیں۔“[1]

---

[1] ۱۔ بحار الانوار، ج۴۷، ص۱۳۱؛ پیشوائے صادق، ص۵۴-۶۱

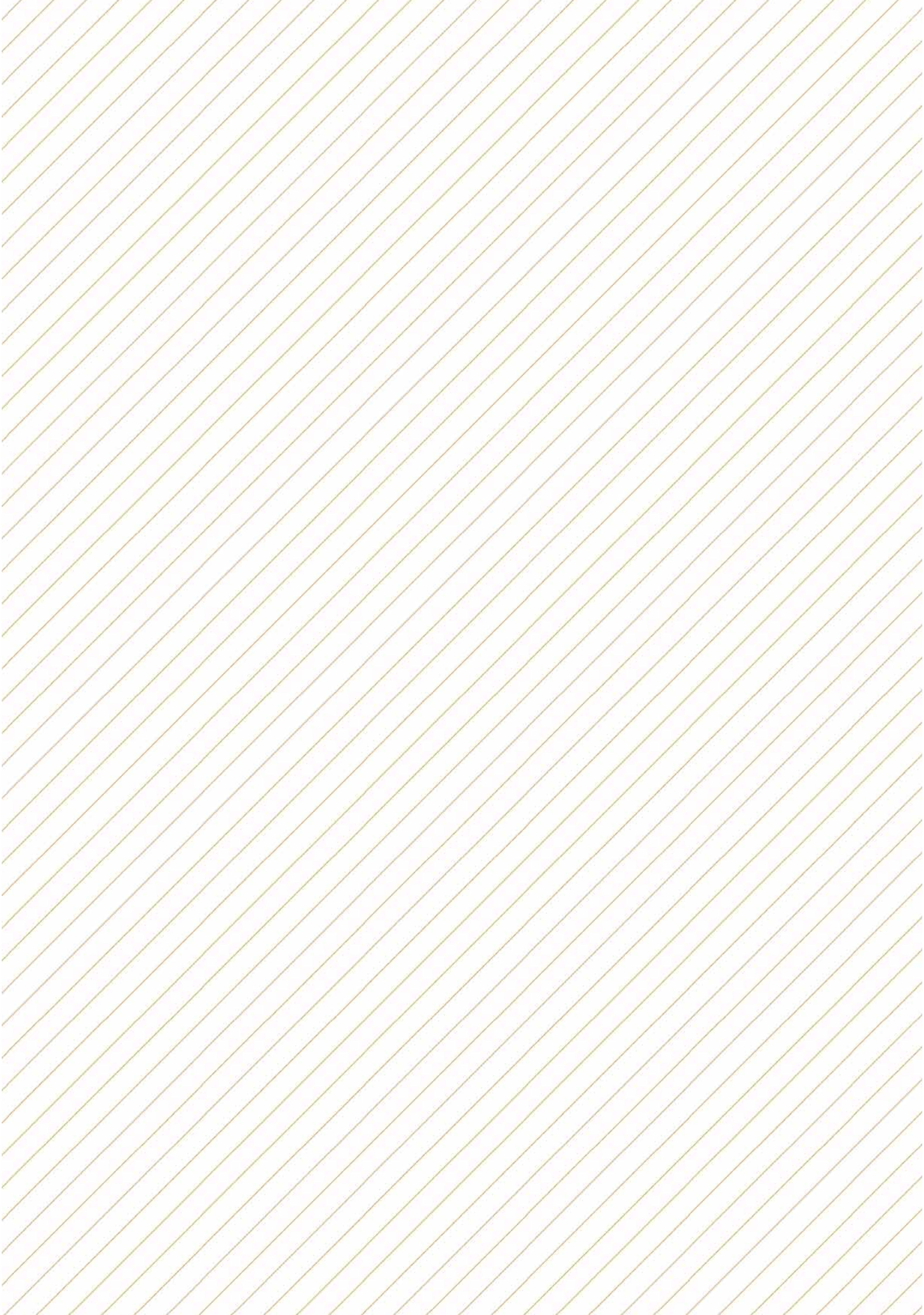

امام جعفر صادق
علیه السلام

امام جعفر صادق علیہ السلام کے حالات زندگی میں ابہامات کا پہلو

یہاں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی زندگی پر تحقیق کرنے والوں کے لیے درپیش ایک افسوسناک حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ امامؑ کے حالاتِ زندگی خصوصاً آپؑ نے امامت کے ابتدائی سال جو بنو اُمیہ کی حکومت کے آخری سالوں میں گزرے ہیں، ان پر ابہامات کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ مختلف قسم کے واقعات اور حادثات سے بھر پور آپؑ کی زندگی میں موجود کشمکش اور اُتار چڑھاؤ کو تاریخ کی سینکڑوں روایات میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر انہیں نہ تو محدّثین نے اور نہ ہی مؤرّخین اور تذکرہ نگاروں نے کسی مرتّب اور مربوط شکل میں پیش کیا ہے۔ آپؑ کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کے وقت اور خصوصیات کا تعیُّن نہیں کیا گیا ہے۔ لہٰذا محققین کو چاہیے کہ اس زمانے کے مجموعی حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے مختلف قرائن اور شواہد کی بنیاد پر ہر روایت کا موازنہ ان معلومات کے ساتھ کر کے، جو اس روایت میں مذکور افراد کے بارے میں دوسری کتابوں میں موجود ہیں، واقعات کے زمان و مکان اور دیگر خصوصیات کا پتہ چلائیں۔ شاید اس سکوت و خاموشی اور ابہام کی ایک علت کو امامؑ کی اپنے اصحاب کے ساتھ تنظیمی سرگرمیوں کی ماہیت میں تلاش کیا جا سکتاہے۔ خفیہ اور تنظیمی اُمور کو معمول کے مطابق خصوصاً جب انہیں صحیح طریقے سے خفیہ طور پر انجام دیا گیا ہو، تو انہیں ہمیشہ خفیہ ہی رہنا چاہیے؛ یعنی جو کام اس دن مخفی تھا اسے بعد میں بھی مخفی ہی رہنا چاہیے کیونکہ اس عمل کو انجام دینے والوں کی رازداری اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ہر ایرا غیرا اس سے واقف اور با خبر ہو۔

لیکن جب بھی وہ کام مکمل ہو جائے گا اور اسے انجام دینے والے اس کے نتائج کنٹرول کرنے کے قابل ہو جائیں گے اور اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیں گے تو وہ خود ہی اپنے اس خفیہ کام کی تفصیلات ظاہر کر دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ بنو عباس کے دور کے بہت سارے راز یہاں تک کہ ان کے سرداروں کے خصوصی احکامات

اور ان کے اپنے ماتحت تنظیمی افراد کے ساتھ خفیہ روابط کی تفصیلات تاریخ میں درج ہیں اور سب ان سے آگاہ ہیں۔

یقیناً اگر علوی تحریک بھی اپنے منطقی انجام تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی اور طاقت و حکومت خود ائمہ طاہرینؑ یا ان کے منتخب افراد کے ہاتھ میں آجاتی تو آج ہم علوی تحریک کے ان تمام خفیہ رازوں اور وسیع تنظیمی نیٹ ورک سے بھی با خبر ہو جاتے۔ ایک اور وجہ جسے مؤرّخین کے آثار اور تاریخ نگاری میں تلاش کرنا چاہیے یہ ہے کہ اگر کسی باضابطہ لکھی جانے والی تاریخ میں کسی محکوم اور مظلوم گروہ کا صرف نام آجائے یا اس کا کوئی واقعہ درج ہو تو یقیناً وہ اسی طریقے سے ہوگا جس طرح اس زمانے کے ظالم و جابر نے چاہا ہوگا یا کہا ہوگا یا جس طرح اسے ظاہر کیا ہوگا۔

ایک سرکاری مؤرِّخ جب کسی مظلوم اور محکوم گروہ کے بارے میں دل آزار باتوں کے علاوہ کچھ اور لکھنا چاہے گا تو اسے بہت سی زحمتوں کے بعد اِدھر اُدھر سے کچھ چیزیں ملیں گی اور انہیں بھی وہ ڈرتے ڈرتے لکھے گا؛ جبکہ حکمرانوں کے بارے میں بہت کچھ دیکھنے کو ملتا ہے کیونکہ انہیں وہ بغیر کسی خوف و خطر اور زحمت کے لکھ سکتا ہے اور اس کی اجرت بھی وصول کر لیتا ہے اور اسے کوئی خطرہ بھی نہیں ہوتا!

اب ہم اس روشن حقیقت کو ایک دوسری حقیقت کے پہلو میں رکھتے ہیں۔ وہ تمام معروف اور معتبر تواریخ جو بعد کی اکثر تحقیقات کے لیے مدرک اور مآخذ شمار ہوتی ہیں اور امام جعفر صادقؑ کے پانچ سو سال بعد تک لکھی جاتی رہی ہیں۔ ان سب پر عباسی رنگ چھایا ہوا ہے کیونکہ عباسی حکومت ساتویں صدی ہجری کے وسط تک باقی رہی ہے اور تمام قدیم اور معروف تواریخ انہیں ظالم لوگوں کے دورِ سلطنت میں لکھی گئی ہیں۔

اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عباسی دور کے کسی بھی مورّخ سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی ہے کہ وہ امام جعفر صادقؑ یا شیعوں کے کسی دوسرے امامؑ کی زندگی کے بارے میں صحیح اور منظّم معلومات حاصل کرکے انہیں اپنی کتاب میں درج کرے گا۔ یہ ہے امام جعفر صادقؑ کی زندگی میں تحریفات اور ابہامات کی

سب سے بڑی وجہ۔

پس وہ واحد راستہ جو ہمیں امام جعفر صادق علیہ السلام کی زندگی کی مجموعی روش سے آگاہ کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم امامؑ کے نظریات اور اخلاق کے کلی اصولوں کی مدد سے ابہامات کے اس ڈھیر میں سے آپؑ کی زندگی کے اہم مظاہر کو تلاش کریں اور اس کی بنیادی روش کی تصویر کشی کریں اور پھر خصوصیات اور باریکیوں کے تعیُّن کے لیے تاریخ کے صفحات میں بکھرے ہوئے قرائن اور دلائل نیز غیر تاریخی قرائن کا انتظار کریں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی شخصیت کے پوشیدہ پہلو

جب حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے دنیا سے رحلت فرمائی اس وقت کے حالات حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اور آپؑ سے پہلے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی بےپناہ کوششوں اور جدّوجہد کے نتیجے میں اہل بیت علیہم السلام کے حق میں بہت بہتر ہو چکے تھے۔ میں دو جملوں میں امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام کا لائحہ عمل آپ (قارئین) کی خدمت میں بیان کرتا ہوں۔

البتہ اس زمانے میں یہ راز کی باتیں سمجھی جاتی تھیں، وہی خفیہ باتیں کہ جن کے بارے میں قارین سنتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ جابر بن یزید جعفی کا شمار رازدار اصحاب میں ہوتا تھا یا یہ حدیث کہ جو بھی ہمارے اسرار کو عیاں کرے اس پر اللہ کی لعنت ہو وغیرہ، یہ سب اس زمانے میں خفیہ باتیں تھیں جن کو عیاں کرنے والے پر اُس وقت اللہ کی لعنت تھی۔ ان کو میں آپ (قارئین) کے سامنے بیان کرنے جا رہا ہوں کیونکہ ہمارے زمانے میں نہ صرف یہ کہ ان باتوں کو عیاں کرنے میں کوئی عیب نہیں ہے بلکہ ایسا کرنا واجب بھی ہے تاکہ لوگ سمجھ سکیں کہ امامؑ کیا کرنا چاہتے تھے۔ ان کو افشاء کرنا صرف ائمہ اطہار علیہم السلام کی زندگی میں منع تھا۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی شہادت کے بعد، امام جعفر صادق علیہ السلام کا لائحہ عمل یہ تھا کہ حکومتِ وقت کے خلاف کھلے عام قیام کیا جائے اور بنو اُمیہ کی سلطنت کا (جہاں آئے روز حکمران تبدیل ہوتے رہتے تھے جس سے ان کی کمزوری کا پتہ چلتا ہے) تختہ اُلٹ دیا جائے۔ خراسان، رئے، اصفہان، عراق، حجاز، مصر، مراکش اور دیگر شیعہ نشین علاقے جہاں امام جعفر صادق علیہ السلام کے شیعوں کا نیٹ ورک پھیلا ہوا تھا، ان تمام علاقوں سے لوگوں کو مدینہ میں جمع کرکے آپؑ شام پر لشکر کشی کرنا چاہتے تھے تاکہ بنو اُمیہ کی حکومت کا خاتمہ کرکے خود ہی خلافت کا پرچم بلند کریں اور مدینہ میں آکر نبویؐ حکومت کا احیاء فرمائیں، یہی امام جعفر صادق علیہ السلام کا منصوبہ تھا۔

لہٰذا حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی زندگی کے آخری ایام میں جب آپؑ سے پوچھا جاتا ہے کہ ”قائم آل محمدؑ“کون ہیں؟ تو آپؑ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف دیکھتے اور فرماتے ہیں کہ گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ قائم آل محمدؐ یہ ہیں۔ البتہ آپ (قارئین کرام) جانتے ہیں کہ قائم آل محمدؐ کوئی خاص نام نہیں ہے بلکہ یہ عام نام ہے۔ یہ صرف امام زمانہ علیہ السلام کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ حضرت امام زمانہ علیہ السلام آلِ محمدؐ کے آخری قائم ہیں لیکن آلِ محمدؐ کے وہ تمام افراد جنہوں نے پوری تاریخ میں قیام کیا ہے (چاہے انہیں کامیابی ملی ہو یا نہ ملی ہو) وہ سب کے سب قائم آلِ محمدؐ ہیں۔ یہ جو روایات میں ہم پڑھتے ہیں کہ جب ہمارا قائم قیام کرے گا تو یہ کام کرے گا، وہ کام کرے گا اور اس طرح معاشرے میں عدل و انصاف قائم کرے گا، اس سے مراد صرف حضرت امام زمانہ علیہ السلام نہیں ہیں، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ آلِ محمدؐ میں سے جو بھی شخص حق کی حکومت اور عدل و انصاف کے لیے جب بھی قیام کرے گا تو وہ یہ کام کرے گا اور یہ بالکل صحیح بھی ہے اور یہ طے پایا تھا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام اس دور کے قائم آلِ محمدؐ بن جائیں۔ کچھ ایسے حالات میں امام جعفر صادق علیہ السلام منصبِ امامت پر فائز ہوئے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام ایک مجاہد، ایک عالم، ایک دانشور اور تنظیمی شخص تھے۔ آپؑ کے عالم اور دانشور ہونے کے بارے میں آپ سب نے بہت کچھ سنا ہے۔ آپؑ کا وہ

مدرسہ جہاں آپؑ درس دیا کرتے تھے وہ آپؑ سے پہلے اور بعد کے ائمہ طاہرین علیہم السلام کی تاریخ زندگانی میں اپنی مثال آپ تھا۔

وہ تمام صحیح اسلامی اور قرآنی تعلیمات جو ایک صدی سے بھی زیادہ عرصے کے دوران خود غرضوں، مفسدوں اور جاہلوں کے ہاتھوں تحریف کا شکار ہوگئی تھیں، آپؑ نے ان سب کو ان کی اصلی روح کے مطابق دوبارہ بیان فرمایا اور یہی چیز اس بات کا سبب بنی کہ دشمن آپؑ کے وجود سے خطرہ محسوس کرنے لگا۔

لیکن قارئینِ کرام! آپ نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے ایک مردِ مجاہد ہونے کے بارے میں بہت کم سنا ہوگا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام ایک وسیع اور نتیجہ خیز جنگ میں مشغول تھے۔ آپؑ کی جنگ اسلام دشمن عناصر سے حکومت اور اقتدار چھین لینے کے لیے تھی، آپؑ کی جنگ اسلامی اور علوی حکومت کے قیام کے لیے تھی؛ یعنی امام جعفر صادق علیہ السلام بنو اُمیہ کی حکومت کا خاتمہ کرکے اس کی جگہ علوی حکومت جو درحقیقت سچی اور حقیقی اسلامی حکومت ہے، کا قیام چاہتے تھے۔ یہ بات ہر اس شخص کے لیے جو غور و خوض کے ساتھ امام عالی مقامؑ کی زندگی کا مطالعہ کرے گا، واضح اور عیاں ہے۔

لیکن تیسرا وہ پہلو جسے بہت سے لوگوں نے تو سنا ہی نہیں ہے وہ ہے آپؑ کا تنظیمی شخصیت کا مالک ہونا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے پیروکار مومنین اور علوی حکومت کے حامیوں کے تعاون سے پورے عالم اسلام یعنی خراسان کے دُور دراز کے علاقوں سے لیکر بحیرۂ روم اور شمالی افریقہ تک ایک عظیم الشان تنظیم قائم کی تھی۔ تنظیم سے کیا مراد ہے؟ یعنی یہ کہ جب کبھی امامؑ چاہتے ہیں کہ ان کی کوئی بات تمام لوگوں تک پہنچ جائے تو آپؑ کے نمائندے پورے عالم اسلام میں لوگوں تک اس بات کو پہنچاتے ہیں تاکہ وہ آپؑ کے پیغام کو جان لیں۔ یعنی ہر جگہ سے شرعی وجوہات، آل علیؑ کی عظیم سیاسی جنگ کے لیے جمع کریں؛ یعنی امامؑ کے نمائندے اور وکلاء ہر شہر میں موجود ہوں تاکہ امامؑ کے پیروکار ان سے رجوع کر سکیں اور اپنے دینی اور اسی طرح سیاسی مسائل دریافت کر سکیں۔ سیاسی فریضہ بھی دینی فرائض کی طرح واجب الاجرا ہے۔ وہ شخص جس کی اطاعت ہم پر واجب ہے اور وہ ولی امر ہے، دینی

معاملات جیسے نماز، زکات، روزہ اور دیگر واجبات میں اس کے دینی فتاویٰ اور اس کے سیاسی فتاویٰ اور سیاسی فرامین میں کوئی فرق نہیں ہے، تمام اُمور میں اس کی اطاعت واجب ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک ایسی عظیم تنظیم قائم کی تھی اور آپؑ اپنی اسی تنظیم اور تنظیمی کارکنوں کی مدد سے بنو اُمیہ کے خلاف جنگ لڑ رہے تھے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے حالاتِ زندگی انتہائی اہم اور سبق آموز ہیں۔ آپؑ نے دس سال تک بنو اُمیہ اور اس کے بعد ایک طویل عرصے تک بنو عباس کے خلاف جہاد کیا۔ بنو اُمیہ کے خلاف آپؑ کی جدّو جہد کامیابی سے ہمکنار ہونے ہی والی تھی کہ بنو عباس موقع پرست لوگوں کی حیثیت سے آگے بڑھے اور حکومت پر قابض ہو گئے۔ اس کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام بنو اُمیہ اور بنو عباس دونوں کے خلاف لڑتے رہے۔

(۰۵-۰۹-۱۹۸۰ء)

طبری (مشہور مورّخ) کے حوالے سے بعض مطالب نقل کیے گئے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے دورِ امامت کے شروع کے دس سال مسلسل بنو اُمیہ کے خلاف جدّوجہد کرتے رہے اور اس دوران امامؑ کی یہ جدّوجہد اور جنگ کھلے عام تھی، یعنی اس دوران امامؑ نے تقیہ اور کتمان جیسے اصولوں کو اختیار نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بنو اُمیہ کے خلفاء (باہمی چپقلش میں) اتنے مصروف تھے کہ انہیں امام جعفر صادق علیہ السلام اور شیعوں کے اُمور پر نظر رکھنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ چنانچہ ایسے حالات میں امامؑ کو بھی اپنی سرگرمیوں کو خفیہ رکھنے کی ضرورت نہیں تھی؛ لٰہذا امام جعفر صادق علیہ السلام عرفہ کے دن عرفات میں پہنچتے اور دنیا بھر سے آئے ہوئے لوگوں کے اس عظیم اجتماع کے سامنے کھڑے ہوتے تھے (جو کہاں کہاں سے آئے ہوئے ہوتے تھے؟ پورے عالم اسلام یعنی افریقہ، مشرقِ وسطیٰ، حجاز، عراق، ایران، خراسان، افغانستان اور مشرقی ترکستان سمیت) دنیا بھر کے لوگ یہاں موجود ہوتے ہیں اگر آپ یہاں کوئی بڑا سیاسی اعلان کرتے ہیں تو اس سے پوری دنیا متاثر ہوتی ہے۔ یہاں اگر کوئی بات کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے کسی انٹر نیشنل چینل پر بات کی ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام اس عظیم الشان اجتماع میں لوگوں کے سامنے کھڑے ہو کر کھلے عام

یہ اعلان کرتے تھے کہ اے لوگو! آج امامت اور حکومت کا حق جعفر بن محمد (یعنی خود امام جعفر صادق علیہ السلام) کو حاصل ہے نہ کہ ابو جعفر منصور کو اور اپنے اس دعوے کی دلیل بھی پیش کرتے تھے، البتہ اس موقع پر آپؑ کوئی کلامی یا عقلی دلیل پیش نہیں کرتے تھے کیونکہ ان لوگوں میں اس قسم کی دلیلیں سننے کا حوصلہ نہ تھا بلکہ آپؑ کے دلائل کا انداز مختلف ہوتا تھا۔

عباسی خلفاء کے مدِّمقابل اپنی امامت کا اعلان

چنانچہ منصور عباسی اور بنو عباس کے دیگر افراد نے لوگوں کو بےوقوف بنانے کے لیے یہ ظاہر کر رکھا تھا کہ وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین ہیں اور انہوں نے ایک نسبی سلسلہ بھی بنا رکھا تھا، وہ کہتے تھے کہ ہم عباس کی اولاد میں سے ہیں؛ یعنی انہوں نے اپنے لیے دو قسم کے سلسلہ نسب بنا رکھے تھے کبھی کچھ کہتے تھے اور کبھی کچھ اور۔

ان میں سے ایک یہ تھا کہ وہ کہتے تھے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا جناب عباس کی اولاد میں سے ہیں چونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت کے حقدار بنو ہاشم تھے اور بنو ہاشم میں بھی سب سے عمر رسیدہ اور بزرگ شخصیت جناب عباس تھے، لہٰذا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد آپؐ کی خلافت پر جناب عباس کا حق تھا۔ اب چونکہ ہم جناب عباس کی اولاد میں سے ہیں لہٰذا یہ حق ہمیں ملا ہے ان کا ایک دعویٰ یہ تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنا ایک اور سلسلہ نسب بھی بیان کرتے تھے، وہ کہتے تھے کہ ہم علی عباسی کی اولاد میں سے ہیں، یعنی علی بن عبد اللہ بن عباس کی اولاد میں سے ہیں۔ یہ بات ان کی صحیح تھی کیونکہ وہ علی عباسی کے پوتے یا بیٹے تھے اور علی بن عبد اللہ بن عباس خود محمد بن حنفیہ کے شاگرد تھے اور محمد بن حنفیہ امیر المومنین علی ابن ابیطالب علیہما السلام کے فرزند تھے اور حضرت علی علیہ السلام، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے داماد ہیں، لہٰذا خلافت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے امام علی علیہ السلام کو ملی ہے اور ان سے محمد حنفیہ کو ملی (نہ کہ امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کو) اور ان سے عبد اللہ بن عباس کے بیٹے کو منتقل ہوئی ہے (جو ہمارے جد ہیں) اور ان سے ہم تک پہنچی ہے لہٰذا ہم خلیفہ ہیں۔ یہ سلسلہ نسب جو وہ یوں بیان

کرتے تھے اس زمانے کے لوگوں کو ذہنی طور پر قائل کرنے والا تھا کیونکہ لوگ ذہنی طور پر انتہائی پسماندہ تھے۔

لہٰذا جب امام جعفر صادق علیہ السلام (عرفات کے میدان میں) لوگوں کے سامنے کھڑے ہو کر امامت کے صحیح سلسلے کو بیان کرتے تو آپؑ یوں فرماتے تھے: ”أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ كَانَ الْإِمَامَ“ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود بھی امام تھے یعنی آپؐ معاشرے کے پیشوا اور رہبر تھے: ”ثُمَّ مِنْ بَعْدِهِ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِب“ یہی شیعوں کا دعویٰ ہے کہ آپؐ کے بعد حضرت علی ابن ابیطالب علیہما السلام امام بنے، ان کے بعد حسن ابن علی علیہما السلام امام ہیں، ان کے بعد حسین ابن علی علیہما السلام امام ہیں، ان کے بعد علی ابن حسین علیہما السلام اور پھر ان کے بعد محمد بن علی علیہما السلام اور پھر ان کے بعد میں (جعفر صادق علیہ السلام) زمانے کا امام ہوں۔

یعنی آپؑ خود کو امام کے طور پر متعارف کراتے ہیں اور اس کام کے لیے بہت بڑی جرأت چاہیے کیونکہ یہ کوئی عام اور سادہ بات نہیں تھی بلکہ یہ حکمرانوں کے خلاف سب سے بڑی بات تھی جسے امام جعفر صادق علیہ السلام بنو اُمیہ کے دورِ خلافت کے اواخر میں کیا کرتے تھے، لیکن بنو عباس کے دور میں آپؑ ایسا نہیں کرتے تھے بلکہ اس وقت تقیہ اور کتمان سے کام لیتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ بنو عباس بھی آلِ علیؑ ہونے کا نعرہ لگاتے تھے یہ لوگ ظاہراً تو آلِ علیؑ کی طرح تھے لیکن عمل کے اعتبار سے بنو اُمیہ جیسے (بلکہ اُن سے بھی پست) تھے۔

بنو اُمیہ کے دورِ حکومت میں یہ آپؑ کی جدّوجہد کا انداز تھا جبکہ بنو عباس کے دورِ حکومت میں (جو طویل دور تھا) امامؑ نے اپنی جدوجہد خفیہ رکھی کیونکہ بنو عباس ایک منحرف گروہ تھا جس نے موقع سے فائدہ اُٹھایا تھا یعنی وہ انقلاب جس کے لیے امام جعفر صادق علیہ السلام نے راستہ ہموار کیا تھا اسے بنو عباس نے ہائی جیک کر لیا تھا اور تمام انقلابات کو ہمیشہ اسی چیز کا خطرہ رہتا ہے کہ کبھی انقلابات اپنے اصلی ہدف کے مطابق صحیح سمت پر گامزن ہوتے ہیں، جبکہ کبھی کبھار بعض انقلابات اپنے صحیح راستے سے منحرف ہو جاتے ہیں، یعنی باطل ظاہراً حق کا نعرہ لگاتے ہوئے انقلاب کو غلط راستے پر لگا دیتا ہے لہٰذا انسان کو ہمیشہ چوکنّا رہنا چاہیے۔ لیکن اس وقت کے لوگ

ایسے ہوشیار نہیں تھے۔ اس لیے کئی سال بعد یعنی بیس، تیس سال بعد بھی دُور دراز کے علاقوں کے لوگ یہ خیال کرتے تھے (جب حکومت بنو عباس کے ہاتھ میں آگئی تھی) کہ یہ ان کی جدّوجہد کا نتیجہ ہے جو انہوں نے آلِ علیؑ کی خاطر کی تھی، وہ یہ سوچ رہے تھے کہ شاید عباسی حکومت ہی آلِ علیؑ کی حکومت ہے، انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ یہ لوگ تو غاصب ہیں۔

(۰۵-۰۹-۱۹۸۰ء)

اس دوران امام جعفر صادق علیہ السلام نے دو مرحلے طے کیے: ایک مرحلہ ایک سو چودہ ہجری سے لیکر منصور کی خلافت تک کا ہے۔ یہ دور امن و سکون کا ہے یہ جو مشہور ہوا ہے کہ بنو اُمیہ اور بنو عباس کی آپس میں چپقلش کی وجہ سے (ہمارے) ائمہؑ کو موقع ملا، وہ یہی دور ہے؛ لیکن امام محمد باقر علیہ السلام کے دور میں ایسا نہیں تھا بلکہ اس وقت بنو اُمیہ کے طاقتور ترین خلیفہ ہشام بن عبد الملک کی حکومت تھی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ: ”كَانَ هَشامُ رَجُلُهُمْ“ یعنی عبد الملک کے بعد بنو اُمیہ کی سب سے بڑی (مقتدر) شخصیت اور مرد ہشام تھا۔ اس لحاظ سے امام محمد باقر علیہ السلام کے دور (امامت) میں حکمرانوں کے درمیان کوئی چپقلش نہیں تھی کہ جس سے امامؑ استفادہ کرتے۔ یہ صرف امام جعفر صادق علیہ السلام کے دورِ امامت کے ساتھ مخصوص ہے اور وہ بھی ایک مخصوص دور تھا، جب بنو عباس کی تحریک آہستہ آہستہ پھیلنا شروع ہوئی تھی اور شیعہ علوی تحریک بھی پوری دنیا میں پھیل چکی تھی۔

جب منصور منصبِ خلافت پر بیٹھ گیا اس وقت سے حالات دوبارہ ناخوشگوار ہونا شروع ہوگئے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کو تقریباً کچھ ایسے ہی حالات کا سامنا کرنا پڑا جو امام محمد باقر علیہ السلام کو درپیش تھے۔ اس وقت گھٹن کا سا ماحول پیدا ہو جاتا ہے اور آپؑ کو وطن بدر کیا جاتا ہے، یاد رہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام بار ہا حیرہ، رُمَیلہ اور مختلف جگہ بھیجے گئے۔ بارہا منصور نے آپؑ کو طلب کیا۔ ایک مرتبہ منصور نے امامؑ کو طلب کیا اور آپؑ سے مخاطب ہو کر کہا:

”قَتَلَنِي اللهُ إِنْ لَمْ أَقْتُلْكَ“[1] ایک مرتبہ منصور نے حاکمِ مدینہ کو یہ حکم دیا: ”أَنْ أَحْرِقْ عَلَى جَعْفَرِبْنِ مُحَمَّدٍ دَارَهُ“ یعنی جعفر بن محمد علیہما السلام کے گھر کو آگ لگا دو۔ (جب منصور کے حکم سے آپؑ کے بیت الشرف کو جلایا گیا) تو امامؑ اس آگ کے درمیان آگئے اور آپؑ نے ایک عجیب و غریب جملہ فرمایا: ”أَنَا ابْنُ أَعْرَاقِ الثَّرَى“[2] آپؑ کے اس کام نے مخالفوں کو مزید رسوا کر دیا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اور منصور کے درمیان شدید اختلافات تھے۔ منصور نے متعدّد بار امام جعفر صادق علیہ السلام کو دھمکیاں بھی دیں۔ البتہ وہ روایات جن میں یہ کہا گیا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے منصور کے سامنے معذرت خواہانہ رویہ اپنایا اور گھٹنے ٹیک دیئے تھے، وہ صحیح نہیں ہیں۔ میں نے ان روایات کا انتہائی باریک بینی کے ساتھ جائزہ لیاہے۔ مجھے ان روایات کے سر پیر کا پتہ کچھ نہیں چلا۔ غالباً یہ وہ روایات ہیں جنہیں ربیع نگہبان نے نقل کیا ہے اور اس شخص کا فاسق ہونا قطعی ہے۔ ربیع کا شمار منصور کے انتہائی قریبی لوگوں میں ہوتا تھا۔ بعض لوگوں نے بغیر کسی تحقیق کے بڑی سادگی سے کہہ دیا ہے کہ ربیع شیعہ تھا (لیکن یہ غلط ہے) وہ کہاں سے شیعہ تھا؟ میں نے ربیع ابن یونس کے حالات زندگی کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ ربیع ابن یونس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہےجو بنو عباس کے ہاں پلے بڑھے تھے اور یہ انہی کے دربار کا ملازم اور منصور کا نگہبان تھا جس نے بعد میں ان کی بڑی خدمت کی ہے؛ منصور کے مرتے وقت اگر ربیع موجود نہ ہوتا تو خلافت منصور کی اولاد کے ہاتھ سے نکل جاتی اور اس کے چچا کے ہاتھ لگ جاتی۔ یہ ربیع ہی تھا کہ جس نے ایک

۱۔ اگر میں آپ قتل نہ کروں تو خدا مجھے قتل کر دے۔ (الاحتجاج علی اہل اللجاج، طبرسی، ج۱، ص۱۶۳)

۲۔ ”وَجَّهَ أَبُو جَعْفَرٍ الْمَنْصُورُ إِلَى الْحَسَنِ بْنِ زَيْدٍ وَ هُوَ وَالِيهِ عَلَى الْحَرَمَيْنِ أَنْ أَحْرِقْ عَلَى جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ دَارَهُ فَأَلْقَى النَّارَ فِي دَارِ أَبِي عَبْدِ اللهِ فَأَخَذَتِ النَّارُ فِي الْبَابِ وَ الدِّهْلِيزِ فَخَرَجَ أَبُو عَبْدِ اللهِ علیہ السلام يَتَخَطَّى النَّارَ وَ يَمْشِي فِيهَا وَ يَقُولُ: أَنَا ابْنُ أَعْرَاقِ الثَّرَى أَنَا ابْنُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلِ الله“؛ منصور دوانقی نے ایک شخص کے ذریعے حسن بن زید کو جو اس کی طرف سے مکہ اور مدینہ کا گورنر تھا یہ پیغام بھیجا کہ جعفر بن محمدؑ (یعنی امام جعفر صادقؑ) کے گھر کو آگ لگا دو۔ چنانچہ امامؑ کے گھر کو نذر آتش کیا گیا جب آگ نے امامؑ کے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو آپؑ آگ پر قدم رکھ کر یہ کہتے ہوئے آگ پر سے گزر رہے تھے: میں زمین کی دھڑکتی ہوئی رگوں کا بیٹا ہوں، میں ابراہیم خلیل اللہ کا فرزند ہوں۔ (الکافی، ج۱، ص۴۳۷)

جعلی وصیت نامے کے ذریعہ منصور کے بیٹے مہدی کو خلافت تک پہنچایا، اس کے بعد اس کا بیٹا فضل بن ربیع بھی اپنے باپ کی طرح بنو عباس کا وفادار رہا۔ اسی طرح اس گھرانے کے سارے افراد بنو عباس کے مخلصین اور ان کے وفاداروں میں سے تھے، انہیں اہل بیت علیہم السلام سے کوئی لگاؤ اور ارادت نہیں تھی۔ لہٰذا ربیع نے جو کچھ بھی نقل کیا ہے وہ سب جھوٹ پر مبنی ہے کیونکہ وہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کو اس دور کے اسلامی معاشرے میں ایک ایسے شخص کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا کہ جس نے خلیفۂ وقت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے تھے تاکہ دوسرے (حکومت مخالف) لوگ بھی اس سے عبرت حاصل کرسکیں۔ حالانکہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اور منصور کے درمیان شدید اختلافات پائے جاتے تھے یہاں تک کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کو ۱۴۸ھ ق میں جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔

(۱۹۔۰۷۔۱۹۸۶ء)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے حالات زندگی کا مطالعہ کرنے سے جو اہم نکات ہمارے سامنے واضح ہو جاتے ہیں اور ہمارے موضوعِ بحث سے مربوط بھی ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ مسئلہ امامت کی تبلیغ و تشریح۔

۲۔ شیعہ فقہ کے مطابق احکامِ دین کی تبلیغ اور تشریح اور اسی طرح شیعہ نظریے کے مطابق قرآن مجید کی تفسیر و تشریح۔

۳۔ شیعوں کی خفیہ سیاسی و نظریاتی تنظیم کی تشکیل۔[۱]

امام جعفر صادق علیہ السلام کی امامت کی طرف دعوت

اب ہم اپنی اصل بحث کی طرف آتے ہیں؛ یعنی ہمارے دوسرے ائمہ معصومین علیہم السلام کی طرح حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے بھی ”امامت“ کو اپنی دعوت کا اصلی اور نمایاں

---

[۱] پیشوائے صادق، ص۶۷

محور قرار دیا تھا۔ اس تاریخی حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے واضح مدارک وہ بہت ساری روایتیں ہیں جو آپؑ کی زبانی امامت کے دعوے کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ جیسا کہ ہم بعد میں وضاحت کریں گے کہ امامؑ اس مسئلے کی تبلیغ اور اشاعت کے وقت اپنے آپ کو جہاد کے ایک ایسے موڑ پر محسوس کرتے ہیں کہ آپؑ براہ راست اور واضح طور پر وقت کے حکمرانوں کی نفی کرتے ہیں اور لوگوں کے سامنے خود کو ولایت و امامت کے اصلی حقدار کے طور پر متعارف کراتے ہیں۔

اصولاً اس کام کو اس وقت انجام دینا چاہیے جب مقابلے کے سارے گزشتہ مراحل کامیابی کے ساتھ طے کر لیے گئے ہوں۔ ایک وسیع حلقے میں سیاسی اور اجتماعی بیداری پیدا ہوگئی ہو، ہر جگہ آمادگی کا احساس کیا جارہا ہو، نظریاتی حوالے سے بھی ایک قابل توجہ گروہ وجود میں آچکا ہو، ایک کثیر تعداد کے سامنے حق اور عدل و انصاف پر مبنی حکومت کی ضرورت ثابت ہو گئی ہو اور آخر کار اس گروہ کے قائد اور رہبر نے بھی جنگ کا مصمّم ارادہ کر لیا ہو (ورنہ تو) ان تمام مقدّمات کے بغیر معاشرے کے حکمران اور امامِ برحق کے طور پر کسی ایک مشخّص فرد کا نام پیش کرنا جلد بازی اور ایک بے فائدہ منصوبہ کہلائے گا۔

ایک اور نکتہ کہ جس پر بھی توجہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ امامؑ کسی موقع پر بھی صرف اس بات پر اکتفا نہیں فرماتے کہ امامت کو صرف اپنے لیے ثابت کریں بلکہ آپؑ اپنے نام کے ساتھ ساتھ ائمۂ برحق اور اپنے گزشتہ اسلاف کے ناموں کا بھی ذکر کرتے ہیں اور اہل بیت علیہم السلام کی امامت کو آپس میں متصل سلسلے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ شیعہ عقائد کے مطابق آپؑ نے اپنے اس موقّف کے ذریعے گزشتہ حکمرانوں کو غاصب اور طاغوتی قرار دیا ہے نیز اس زمانے کے شیعوں کے جہاد کو گزشتہ زمانے کے جہاد کا تسلسل بیان کیا ہے۔ درحقیقت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنی اس دعوت کے ذریعے اپنی امامت کو گزشتہ ائمہ اطہار علیہم السلام کی امامت کا لازمی نتیجہ قرار دیا ہے۔ آپؑ نے اپنے اس دعوائے امامت کو مضبوط بنیاد کا حامل ثابت کیا ہے اور اس سلسلے کو ایک قابلِ اطمینان تسلسل کے ذریعے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متصل ثابت کیا ہے۔ اب ہم یہاں پر امامؑ کی دعوت کے چند نمونے

بیان کرتے ہیں:

اس باب میں، میں نے سب سے دلچسپ اور قابلِ توجہ جو روایت دیکھی ہے وہ عمرو بن ابی المقدام کی روایت ہے جس نے حیرت انگیز طریقے سے اس کی منظر کشی کی ہے۔ ۹ذی الحجہ (یعنی عرفہ) کا دن ہے اس دن کے مخصوص اعمال بجا لانے کے لیے یہاں لوگوں کا ایک جمِّ غفیر موجود ہے۔ تمام مسلمان علاقوں کی نمائندگی کرتے ہوئے خراسان کے دُور افتادہ علاقوں سے لیکر بحیرۂ روم کے ساحلوں تک کے لوگ موجود ہیں۔

اس دور میں یہاں پر کی جانے والی ایک صحیح بات، اس زمانے کے وسیع ترین ذریعۂ ابلاغ کا کام کر سکتی تھی۔ ایسے موقع پر امامؑ لوگوں کے درمیان پہنچ جاتے ہیں اور ایک پیغام دے دیتے ہیں۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام لوگوں کے درمیان کھڑے اونچی آواز (ایک ایسی اونچی آواز جو ہر جگہ اور ہر کان میں گونجتی اور سننے والوں کے ذریعہ پوری دنیا میں پھیل جاتی ہے) کے ساتھ اپنے اس پیغام کو تین مرتبہ دُہراتے ہیں۔ اس کے بعد آپؑ دوسری طرف رُخ کرتے ہیں اور تین مرتبہ وہی پیغام دُہراتے ہیں۔ اس کے بعد تیسری سمت رُخ کرتے ہیں اور اسی پیغام کو تین مرتبہ پیغام دُہراتے ہیں۔ اس کے بعد چوتھی سمت رُخ کرکے تین مرتبہ اسی پیغام کا اعلان کرتے ہیں۔ گویا اس طرح امامؑ بارہ مرتبہ اپنے پیغام کو دُہراتے ہیں اور وہ پیغام یہ تھا:

”أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ كَانَ الْإِمَامَ ثُمَّ كَانَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ ثُمَّ الْحَسَنُ ثُمَّ الْحُسَيْنُ ثُمَّ عَلِيُّ بْنُ الْحُسَيْنِ ثُمَّ مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيٍّ ثُمَّ ...“[1]

اسی طرح ایک اور روایت جو ”ابو الصباح الکنانی“ سے منقول ہے کہ جس میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے خود اپنے اور شیعوں کے دوسرے اماموں کی یوں توصیف بیان کی ہے: ”ہم وہ ہیں کہ جن کی اطاعت اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر فرض کی ہے انفال[2] اور صَفو المال ہمارے اختیار میں ہے۔“

---

[1] بحار الانوار، ج۴۷، ص۵۸

[2] انفال اس مالِ غنیمت کو کہا جاتا ہے جو جنگ کیے بغیر اسلامی حکومت کے ہاتھ لگ جائے۔

صَفو المال اس مخصوص مال کو کہتے ہیں جسے ظالم و جابر حکمران اپنے لیے مخصوص کر لیتے ہیں اور اس کو مستحق افراد کی پہنچ سے دور رکھتے ہیں اور جب مسلمان مجاہدین کی کامیابی کے بعد یہ غصب شدہ مال، شکست خوردہ ظالم حکمرانوں کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو وہ دوسرے مالِ غنیمت کی طرح تقسیم نہیں ہوتا کہ کسی ایک شخص کے ہاتھ لگے اور اس کی جھوٹی شان و شوکت اور تفاخُر کا ذریعہ بنے؛ بلکہ اسے حاکمِ اسلامی کے حوالے کیا جاتا ہے اور وہ اسے مسلمانوں کے اجتماعی مفاد میں استعمال کرتا ہے۔ امامؑ نے اس روایت میں اپنے آپ کو صَفو المال نیز انفال (جس کا تعلق بھی امامؑ ہی سے ہے) کے مالک کے طور پر متعارف کروایا ہے اور اپنے اس بیان کے ذریعے یہ واضح کردیا ہے کہ آج اسلامی معاشرے کے (حقیقی) حاکم وہ خود ہیں اور ان تمام چیزوں کو آپؑ کے ہاتھ اور اختیار میں ہونا چاہیے اور آپؑ کی زیرِ نظر درست مصارف میں استعمال ہونا چاہیے۔

ایک اور حدیث میں آپؑ اپنے آباء و اجدادؑ کا ایک ایک کرکے نام لیتے ہیں اور ان کی امامت اور ان کے فرامین پر عمل کرنے اور ان کی اطاعت کے واجب و لازم ہونے کی گواہی دیتے ہیں اور اپنے نام تک پہنچ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ امامؑ کی اس گفتگو کو سننے والے بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ امام محمد باقر علیہ السلام کے بعد علم و حکمت کی یہ میراث امام جعفر صادق علیہ السلام ہی کے اختیار میں ہے۔ یوں آپؑ اپنے حق حکمرانی کو ثابت کرنے کے ساتھ دلیل اور استدلال کے انداز میں اپنے جدّ بزرگوار حضرت علی ابن ابیطالب علیہما السلام کے ساتھ اپنے اتصال اور ارتباط کو بھی بیان کرتے ہیں۔[۱] اصول کافی کتاب ”الحجّت“ کے مختلف ابواب اور بحار الانوار کی سینتالیسویں جلد میں ایسی بہت ساری احادیث دیکھی جا سکتی ہیں جن میں واضح یا بطورِ کنایہ امامت کے دعوے اور اس کی طرف دعوت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ دوسرے قطعی ثبوت، وہ شواہد ہیں کہ جن میں مملکت اسلامی کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے امامؑ کے وسیع تبلیغی نیٹ ورک کا تذکرہ موجود ہے اور ایسے

---

[۱] الکافی، ج۱، ص۱۸۶

نیٹ ورک کے وجود کو مسلم قرار دیتے ہیں۔ یہ شواہد اتنے زیادہ اور مدلّل ہیں کہ اگر ایک بھی واضح حدیث موجود نہ ہوتی تب بھی ان پر کوئی شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ائمہ معصومین علیہم السلام کے غیر تدوین شدہ زندگی ناموں کا مطالعہ کرنے والا محقّق اپنے آپ سے یہ سوال کرتا ہے کہ:

کیا بنو اُمیہ کے آخری دور میں اماموں کے پاس مملکتِ اسلامی کے گوشہ و کنار میں ایسے داعی اور مبلغین موجود نہیں تھے جو لوگوں میں ان کی امامت کی تبلیغ کرتے اور ان سے اماموں کی اطاعت و حمایت کا وعدہ لیتے؟

تو پھر اس صورت میں اس تنظیمی وابستگی کی علامات کی کیا توجیہ کی جائے گی جو ائمہ اطہار علیہم السلام اور ان کے شیعوں کے درمیان مالی اور نظریاتی تعلق کے حوالے سے واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہیں؟ مملکتِ اسلامی کے گوشہ و کنار سے مدینہ لائی جانے والی شرعی وجوہات؟ دینی مسائل سے متعلق اتنے سوالات؟ ہر طرف پھیلی ہوئی تشیع کی جانب دی جانے والی دعوت؟ اسی طرح مملکتِ اسلامی کے اہم علاقوں میں آلِ علیؑ سے لوگوں کی گہری محبت؟ امامؑ کے ارد گرد خراسانی، سیستانی، کوفی، بصری، یمنی اور مصری محدّثین اور راویوں کا جمِّ غفیر؟ وہ کونسی طاقت تھی جو ان تمام چیزوں کو وجود میں لے آئی تھی؟ کیا ان متناسب اور باہم مربوط حقائق اور مظاہر کو کسی حادثے یا اتفاقی طور پر وجود میں آنے والے واقعات کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے؟

اُن تمام مخالفانہ اور جھوٹے پروپیگنڈوں کے باوجود جو بنو اُمیہ کے خلفاء کی پروپیگنڈہ مشینری کے ذریعے بلا استثناء ہر جگہ پھیلائے جا رہے ہوتے تھے یہاں تک کہ منبروں سے خطبوں میں حضرت علی بن ابیطالب علیہ السلام کے نام کو اسلام کے ایک مجرم کے طور پر لیا جاتا تھا۔ ایسے میں کیا ایک مضبوط تبلیغاتی نیٹ ورک کے بغیر یہ ممکن تھا کہ دُور دراز علاقوں میں آلِ علیؑ کو اس حد تک محبوبیت اور جاذبیت مل جائے کہ بعض لوگ صرف ان کی زیارت اور ان سے استفادہ کرنے نیز ان سے اپنی دوستی اور تعلق کا اظہار کرنے کے لیے اتنا طویل سفر طے کرکے حجاز اور مدینہ پہنچ جائیں اور دینی علم جو شیعوں کے عقیدے کے مطابق، سیاست اور حکومت کی طرح ہے خود انہیں سے

حاصل کریں اور متعدّد مواقع پر صبر کا دامن چھوڑتے ہوئے ان سے عسکری اقدامات (راویوں کی اصطلاح میں جسے قیام یا خروج کہا جاتا ہے) کی خواہش کریں؟ اگر شیعوں کا اسلحہ صرف ائمہ ہدیٰؑ کا علم و زُہد تھا تو پھر ان سے مسلح قیام کی درخواست کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟

ممکن ہے کہ کوئی یہ سوال کرے کہ واقعاً اگر کوئی ایسا وسیع اور کارآمد تبلیغاتی نیٹ ورک موجود تھا تو پھر تاریخ میں اس کا کوئی نام و نشان کیوں نہیں ملتا یا وضاحت کے ساتھ اس حوالے کوئی واقعہ کیوں نقل نہیں ہوا ہے؟ بطورِ خلاصہ اس کا جواب (جیسا کہ پہلے بھی اس مطلب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے) یہ ہے کہ اس کا نام و نشان نہ ملنے کی پہلی وجہ ائمہ طاہرین علیہم السلام کے اصحاب کی اس پابندی میں تلاش کرنا چاہیے جسے انہوں نے "تقیہ" کے معتبر اور ترقی یافتہ اصول کے تحت عائد کر رکھا تھا۔ یہ پابندی ہر کس و ناکس کے امامؑ کی تنظیم میں داخل ہونے میں رکاوٹ بنتی تھی اور پھر اس کے بعد شیعوں کے جہاد اور حکومت کے حصول میں ناکامی میں تلاش کرنا چاہیے کہ یہ خود بھی مختلف عوامل کا نتیجہ ہے؛ اگر بنو عباس بھی اقتدار حاصل کرنے میں ناکام ہو چکے ہوتے تو یقیناً ان کی خفیہ سرگرمیاں اور ان کی تحریک سے وابستہ تلخ و شیریں یادیں، جن کا تعلق ان کی تبلیغاتی سرگرمیوں سے تھا، لوگوں کے سینوں میں رہ جاتیں اور کسی کو ان کے بارے میں کچھ پتا نہ چلتا اور تاریخ میں بھی یہ باتیں درج نہ ہوتیں۔[1]

جب ہم تقیہ کی بات کرتے ہیں تو ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ تقیہ کا تعلق اس دور سے تھا جب معاشرے پر ایک حکومت مسلط تھی اور شیعہ چھپے ہوئے تھے اور حکومت کے ڈر سے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے، ایسا نہیں ہے کیونکہ اس وقت بھی تقیہ ڈر اور خوف کی وجہ سے نہیں تھا۔ "اَلتَّقِيَّةُ تُرسُ الْمُؤْمِنِ"[2] تقیہ مومن کی سپر (ڈھال) ہے۔ سپر کہاں استعمال ہوتی ہے؟ سپر میدانِ جنگ میں استعمال ہوتی ہے یعنی لڑائی کے دوران۔ پس تقیہ کا تعلق لڑائی سے ہے کیونکہ یہ ایک ڈھال، مورچہ اور سپر ہے۔

---

[1] ۱۔ پیشوائے صادق، ۷۴۔۸۰

[2] ۲۔ بحار الانوار، ج۷۲، ص۳۹۴

اس دور میں بھی ایسا ہی تھا۔ جب ہم تقیہ کرتے تھے تو اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ ہم اپنی تلوار سے دشمن کے نجس جسم پر وار کرتے تھے لیکن اس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ دشمن نہ تو ہماری تلوار دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی اس ہاتھ کو جس میں تلوار ہوتی تھی اور نہ ہی اپنے اُوپر وار ہوتے ہوئے دیکھ سکتا اور نہ سمجھ سکتا تھا، وہ صرف اس کی تکلیف کو محسوس کر تا تھا۔ تقیہ اسی بہترین حکمتِ عملی کا نام تھا۔ اس دور میں جو لوگ تقیہ کرتے تھے وہ اس طرح کا طریقہ کار اختیار کرتے تھے۔ وہ خفیہ طور پر دشمن کی نظروں سے دور کسی خفیہ مکان میں ہزاروں تدبیروں اور طریقوں کو اپناتے ہوئے ایک اعلامیہ مرتّب کرتے تھے اور جب یہ اعلامیہ لوگوں کے درمیان نشر ہوتا تھا تو وہ مکمل طور پر حکومت کی مٹی پلید کر دیتا تھا۔ یہ کام تلوار کے وار کی طرح ہوتا تھا کہ اُٹھتا تو دشمن کی کمر اور پیشانی کو لگ جاتا تھا۔ ہم تقیہ کرتے تھے یعنی دشمن کو یہ سمجھنے کاموقع ہی نہیں دیتے تھے کہ کیا ہو رہا ہے کیونکہ تقیہ سپر ہوتا ہے اور تقیہ کرنے والا اس سپر کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ تقیہ کا پہلے بھی یہی مطلب تھا اور اب بھی تقیہ کا یہی معنی ہے۔

(۲۹_۰۱_۱۹۹۰ء)

شیعہ فقہ کے مطابق احکامِ دین کی تبلیغ

یہ بھی امام جعفر صادق علیہ السلام کے کردار کی ایک واضح اور روشن مثال ہے، جس کی بنا پر آپؑ کو ہمارے دوسرے ائمہؑ پر ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے۔یہاں تک کہ شیعی فقہ ”فقہ جعفری“ کے نام سے موسوم ہوئی۔ جن لوگوں نے آپؑ کی زندگی کے سیاسی پہلو کو نظر انداز کیا ہے وہ بھی اس بات پر متفق ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے دور کے ایک بہت ہی بڑے (یا بڑے مدارس میں سے ایک) علمی اور فقہی مدرسے کے مہتمم تھے۔

امامؑ کی زندگی کا وہ گوشہ جو آپؑ کی زندگی پر تحقیق کرنے والے اکثر محققین کی نظروں سے اوجھل رہا ہے وہ آپؑ کے سیاسی اور مزاحمتی عمل کا پہلو ہے۔ جسے اب ہم آپ (قارئین) کی خدمت میں بیان کرنے جا رہے ہیں۔

بطورِ تمہید یہ بات جان لینا بھی ضروری ہے کہ اسلام میں خلافت کا عہدہ اس لحاظ سے دوسرے حکومتی عہدوں سے مختلف ہے کہ یہ صرف ایک سیاسی عہدہ نہیں، بلکہ یہ سیاسی کے ساتھ ایک مذہبی عہدہ بھی ہے۔ اسلامی مملکت کے سربراہ کے لیے "خلیفہ" کا عنوان اور لقب ہی اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ وہ ایک سیاسی راہنما سے بڑھ کر ہے۔ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین ہوتا ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دین کے بانی اور معلم اخلاق تھے۔ البتہ اس کے ساتھ ساتھ وہ حکمران اور سیاسی راہنما بھی تھے۔ پس اسلام میں خلیفہ، سیاست کے علاوہ لوگوں کے دینی اُمور کا ذمہ دار اور ان کا مذہبی پیشوا بھی ہے۔

یہ مسلمہ حقیقت اس بات کا سبب بنی کہ اسلامی خلافت میں اوائل کے بعد آنے والے حکمرانوں نے جو اسلامی تعلیمات سے یا تو بالکل ہی بے بہرہ ہوتے تھے یا بہت ہی کم واقف تھے، اس کمی کو خود سے وابستہ دینی شخصیات کے ذریعے پورا کرنے کا فیصلہ کیا اور درباری فقہاء، مفسرین اور محدّثین کو اپنے ساتھ ملا کر خلافت کو ایک مرتبہ پھر دین اور سیاست سے مزیّن کرنے کی کوشش کی۔

حکومتی حلقوں میں شریعت مآب لوگوں کی موجودگی کا دوسرا فائدہ یہ بھی تھا کہ وہ ظالم و جابر حکمرانوں کی خواہشات اور مصلحتوں کے تقاضوں کے مطابق آسانی سے دینی احکام میں تغیّر و تبدّل کر دیتے تھے اور استنباط و اجتہاد کے پردوں میں (جنہیں عام لوگ سمجھنے سے قاصر تھے) اپنے مجازی خداؤں (بادشاہوں) کی خوشنودی کی خاطر حکمِ خدا میں ردّ و بدل کر دیتے تھے۔

گزشتہ صدیوں کے مؤلّفین اور مورّخین نے جعلی حدیثوں اور تفسیر بالرائے کی ایسی وحشت ناک مثالیں پیش کی ہیں کہ جن میں سے اکثر کے پیچھے سیاسی طاقتوں کا ہاتھ نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ یہ کام جو شروع کے دور میں (یعنی پہلی صدی ہجری کے آخر تک) زیادہ تر احادیث اور روایات میں نظر آتا تھا اس نے آہستہ آہستہ فتویٰ کی شکل اختیار کرلی۔ لہٰذا بنو اُمیہ کے آخری اور بنو عباس کے ابتدائی دورِ خلافت میں ایسے بے شمار فقہاء موجود تھے جو قیاس اور استحسان[۱] جیسے بدعت آمیز طریقوں سے

---

[۱] استحسان حسن سے مأخوذ ہے جس کے لغوی معانی مستحسن جاننا، اچھا قرار دینا اور کسی چیز کو پسند کرنے کے

استفادہ کرتے ہوئے احکام اسلامی کو اپنی رائے (جو درحقیقت حکمرانوں کی رائے ہوا کرتی تھی) کے مطابق صادر کیا کرتے تھے۔

یہی کام وہ قرآن کی تفسیر کے ساتھ بھی انجام دیتے تھے۔ مفسّر کی اپنی رائے کے مطابق قرآن کی تفسیر کا یہ عمل اُن کاموں میں سے ایک تھا جو آسانی سے لوگوں کی نظروں کے سامنے حکمِ خدا میں ردّ و بدل کرتا اور انہیں اس چیز کا جس کا مفسر خواہشمند ہوتا تھا (اور اس کی خواہش بھی اکثر وہی ہوتی تھی جو حاکم کی خواہش ہوا کرتی تھی) معتقد بناتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ اسلام کے قدیم ترین ادوار ہی سے فقہ، حدیث اور تفسیر کلی طور پر دو حصّوں اور گروہوں میں تقسیم ہو چکی تھیں۔ ایک گروہ غاصب حکمرانوں کے ساتھ وابستہ تھا جو بہت سارے موارد میں حقائق کو حکومتوں کی مصلحتوں پر قربان کر دیا کرتا اور انتہائی سستے داموں حکمِ خدا میں تحریف کر دیتا تھا۔

جبکہ اس کے مقابلے میں دوسرا گروہ اصیل اور امین تھا جو کسی بھی مصلحت کو احکامِ الٰہی کی صحیح تفسیر پر مقدّم نہیں سمجھتا تھا جس کے نتیجے میں اسے ہر قدم پر حکومت اور اس کے زرخرید فقہاء کی مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا اور اسی دن (یعنی ابتدا ہی) سے اکثر اوقات (احکامِ الٰہی میں) غیر قانونی اور غیر رسمی ردّ و بدل کا سلسلہ جاری رہا۔

ہیں اور اسی طرح طلبِ حسن کے معنی میں ہے تاکہ اس کی پیروی کی جا سکے اور اصطلاح میں استحسان کسی ایک مسئلے سے اُس جیسے دوسرے مسائل کی طرف عدول کو کہتے ہیں۔ مجتہد اپنی عقل کے فیصلے کے مطابق جس چیز کو اچھا سمجھے، وہ جو عقلِ انسانی میں تبادُر کرتی ہے اور ۔ ۔ ۔؛ اس لحاظ سے استحسان کا قیاس کے ساتھ استصلاح اور مصالح مرسلہ کے قاعدے میں ربط پایا جاتا ہے اور مذکورہ عدول بھی قیاس ہی پر استوار ہے۔ شیعہ فقہاء کی قاعدۂ استحسان سے حاصل شدہ حکم کی مخالفت کی دلیل یہ ہے کہ اس نقطہ نظر کے مطابق کسی بھی حکم کو شریعتِ الٰہی سے منسوب کرنے میں مفتی کے ذوق اور سلیقہ کی بنیاد پر اُسے کھلی چھٹی دے دی گئی ہے کہ جسے وہ اچھا خیال کرے وہ واجب اور جسے قبیح اور قابل تنفر سمجھے، وہ حرام ہو جائے گا بغیر اس کے کہ اس طرح کی نسبت کسی دلیل یا نص کی محتاج ہو۔ حالانکہ شیعہ فقہاء شارع کی طرف سے کسی مستند دلیل کے بغیر کسی بھی حکم کو اس کی طرف نسبت نہیں دیتے اور ان کی نظر میں تشریع کا کام مکمل طور پر قانون کے مطابق (اور ضابطہ مند) ہے۔ (سائٹ پُرسمان)

اس وضاحت کے بعد ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے میں فقہ جعفری کا اس دور کی رسمی فقہوں کے ساتھ کسی ایک سادہ دینی عقیدے میں اختلاف نہیں تھا بلکہ وہ اس کے ساتھ ساتھ دو اور قابلِ اعتراض پہلو بھی رکھتی تھی۔

پہلی اور اہم ترین چیز یہ کہ حکمرانوں کا دینی شعور سے بے بہرہ ہونا اور لوگوں کے فکری اُمور کو حل کرنے میں ان کی کمزوری کا واضح ثبوت (یعنی درحقیقت منصبِ خلافت کے لیے ان کی عدم صلاحیت کو ثابت کرنا) تھا اور دوسری چیز رسمی فقہ میں کی جانے والی تحریفات کے ان موارد کی نشاندہی کرنی تھی جہاں فقہی احکام کے بیان کرنے میں فقہاء نے مصلحتوں اور حکمرانوں کی خواہش کو مدِّنظر رکھتے ہوئے فتویٰ صادر کیا تھا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام حکومت سے وابستہ علماء کی روش سے ہٹ کر اپنی علمی بساط پھیلا کر اسلامی فقہ و معارف کے بیان اور تفسیر قرآن کے ذریعے عملاً حکومت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ امامؑ نے اپنے اس عمل کے ذریعے تمام مذہبی کارندوں اور حکومت سے وابستہ فقہاء جو حکومت کا ایک اہم حصّہ شمار ہوتے تھے، کا راستہ روکا تھا اور حکومت کو اس کے مذہبی پہلو سے تہی دست کر دیا تھا۔

خلیفۂ وقت کے مدِّمقابل امامؑ کا موقف

بنو اُمیہ کی حکومت امام جعفر صادق علیہ السلام کی حکومت مخالف اور علمی و فقہی سرگرمیوں پر کس حد تک نظر رکھتی تھی اس کا ہمارے پاس کوئی واضح اور قطعی ثبوت تو موجود نہیں ہے، لیکن قوی گمان یہ ہے کہ بنو عباس اور ان میں سے بھی بالخصوص منصور کے دورِ خلافت میں، جو ایک ہوشیار اور ذہین آدمی تھا اور جس نے خلافت سے پہلے اپنی ساری زندگی بنو اُمیہ کے خلاف جدّوجہد میں گزاری تھی، اسی وجہ سے وہ علویوں کے جہاد اور ان کے مجاہدین کے حوالے سے گہری آگاہی رکھتا تھا، بنو عباس کے حکومتی عہدے دار بھی اس بالواسطہ جہاد کے اصلی کردار کی جانب پوری توجہ رکھتے تھے۔ امامؑ کی علمی اور فقہی سرگرمیوں کے خلاف منصور کی دھمکیاں، سختیاں اور بے شمار دباؤ کہ جس کا تذکرہ

بہت ساری تاریخی روایات میں بھی ملتا ہے، اس کی وجہ بھی یہی احساس تھا۔ نیز منصور کا حجاز اور عراق کے معروف فقہاء کو اپنے دار الحکومت میں اکٹھا کرنے کی اس قدر تاکید (کہ اس کا ثبوت بھی تاریخی روایات میں موجود ہے) بھی اسی احساسِ ضرورت ہی کی وجہ سے تھی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے قریبی ساتھیوں اور اصحاب کے ساتھ گفتگو اور لیکچرز کے دوران خلفاء کے علم و دانش سے تہی دست ہونے کو اس بات کی دلیل بناتے تھے کہ اسلام کی نظر میں انہیں حکومت کا حق حاصل نہیں ہے؛ یعنی یہ کہ امامؑ اپنے اس معترضانہ نظریے کو فقہ اور قرآن کے لیکچرز کی صورت میں واضح طور پر بیان فرماتے تھے۔ چنانچہ آپؑ سے منقول ایک روایت میں آپؑ فرماتے ہیں:

”نَحنُ قَومٌ فَرَضَ اللهُ طَاعَتَنَا وَأَنتُم تَأْتَمُّونَ بِمَنْ لَا یُعْذَرُ النَّاسُ بِجَهَالَتِهِ“[1]

”ہم وہ ہیں جن کی اطاعت کو اللہ نے واجب قرار دیا ہے جبکہ تم ایسے شخص کی پیروی کرتے ہو کہ جس کی جہالت کی بنا پر لوگ اللہ کے ہاں کوئی عذر پیش نہیں کر سکیں گے۔“

یعنی وہ لوگ جو اپنے جاہل راہنماؤں اور حکمرانوں کی وجہ سے انحراف کا شکار ہو چکے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے راستے کو چھوڑ کر کسی دوسرے راستے پر چل پڑے ہیں، ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ عذر پیش نہیں کر سکیں گے کہ ہم نے اپنی تشخیص سے غلط راستے کا انتخاب نہیں کیا بلکہ یہ ہمارے راہنما اور پیشوا تھے کہ جنہوں نے اپنی جہالت کی وجہ سے ہمیں اس راستے پر ڈال دیا ہے۔ کیونکہ ایسے راہنماؤں اور قائدین کی اطاعت بذات خود ایک غلط کام ہے۔ لہٰذا اس کے ذریعے بعد کے غلط کاموں کی توجیہ نہیں کی جاسکتی۔[2]

۱۔ الکافی، ج۱، ص۱۸۶

۲۔ قرآن کریم میں بھی اس بات کو کئی مقامات پر مختلف انداز سے دہرایا گیا ہے: ضلالت اور گمراہی کی راہ پر گامزن تابعین اور متبوعین کے جھگڑے کو بیان کیا ہے تو تابعین کے اس شکوے کا ذکر بھی کیا ہے کہ ہمارے قائدین نے ہمیں گمراہی کی راہ پر لگایا تھا اور آخر کار لوگوں کو یہ باور بھی کرایا گیا ہے کہ کسی سے بھی اس قسم

اسلام کے انقلابی معاشرے میں سیاسی راہنمائی وہی انقلابی رہبری ہوتی ہے جو فکری اور نظریاتی رہبری کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہ وہ بنیادی نقطہ ہے جو امام جعفر صادق علیہ السلام سے پہلے اور آپؑ کے بعد کے سارے اماموںؑ کی تعلیمات سے واضح ہوتا ہے۔

ایک روایت میں حضرت امام علی رضا علیہ السلام اپنے جدّبزرگوار امام محمد باقر علیہ السلام کے حوالے سے سلسلہ امامت میں "سلاح"کو قومِ بنی اسرائیل میں "تابوت" کی مانند قرار دیتے ہیں:

"ہمارے پاس "سلاح" کی مثال ایسی ہے جیسے بنی اسرائیل کے پاس تابوت کی تھی، جس کے پاس تابوت ہوتا تھا نبوت (اور بعض روایات میں حکومت) بھی اسی کے پاس ہوتی تھی۔ ہمارے درمیان بھی جس کے پاس سلاح ہو، رہبری اور قیادت بھی اسی کا حق ہوتا ہے۔"

(اس تعبیر کی علامتی صورت اور اس کے گہرے مفہوم پر غور کیجئے) اس موقع پر راوی سوال کرتا ہے: "فَیَکُونُ السِّلَاحُ مُزَایِلاً لِلْعِلْمِ" یعنی کیا یہ ممکن ہے کہ سلاح (ہتھیار) کسی ایسے شخص کے پاس ہو کہ جس میں دین کی آئیڈیالوجی ہی نہ ہو؟[1] تو امامؑ جواب میں فرماتے ہیں: نہیں۔[2] یعنی معاشرے کی حکمرانی اور اُمتِ مسلمہ کی انقلابی قیادت اس شخص کے پاس ہوگی جس کے پاس سلاح (ہتھیار) کے ساتھ علم بھی ہوگا۔

پس امامؑ ایک طرف دین کے علم اور قرآن کی صحیح فہم کو امامت کی شرط قرار دیتے ہیں تو دوسری طرف وسیع علمی بساط بچھا کر دینی علوم میں دلچسپی رکھنے والوں کی ایک کثیر تعداد کو اپنے گرد جمع کرکے مخصوص طرز پر تعلیم دیتے ہیں، جو فقہ، حدیث اور تفسیر کے مروجہ طریقوں سے مختلف تھی اور مجموعی لحاظ سے بھی درباری علماء، محدِثین اور مفسرین کی

کا عذر قبول نہیں کیا جائے گا اور دونوں قسم کے گمراہوں کو ایک جیسی سزا دی جائے گی۔ رجوع کیجیئے، سورہ بقرہ، آیت۱۶۷؛ سورہ شعراء، آیت۹۱۔۱۰۲؛ سورہ سبا، آیت۳۱۔۳۳؛ سورہ نساء، آیت۹۷ (مؤلف)

[1] لفظ "مُزَایِلًا" کے اس معنی کو مشہور حدیث شناس علامہ مجلسیؒ سے لیا گیا ہے جسے انہوں نے کتاب "مرآۃ العقول" میں بیان فرمایا ہے۔ (مؤلف)

[2] اصول کافی، ج۱، ص۲۳۸

دین شناسی سے بالکل مختلف انداز تھا۔ علمی طور پر اپنی دین شناسی جبکہ خلفاء (اور ان سے وابستہ مشہور و معروف علماء) کی دین سے ناواقفیت کو ثابت کرتے ہیں۔ یوں آپؑ متواتر، عمیق اور نرم انداز میں اعتراض کے ذریعے اپنے جہاد کو ایک نیا رُخ دیتے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا کہ بنو عباس کے ابتدائی حکمران، اقتدار میں آنے سے پہلے، سالوں سال آلِ علیؑ اور ان کے اصحاب و انصار کے ساتھ رہتے رہے تھے اور وہ علوی مبارزات کے ماحول، ان کے اسرار اور پیچ و خم سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ اُموی اسلاف سے زیادہ ان دروس، ابحاث اور حدیث و تفسیر کے ذریعے آل محمدؑ کے حکومت مخالف کردار سے اچھی طرح واقف تھے۔

گویا اسی وجہ سے ہی منصور عباسی نے امام جعفر صادق علیہ السلام کے ساتھ اپنے ذلّت آمیز اختلافات اور تنازعات کے دوران، مدتوں امامؑ کو لوگوں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھےاور انہیں دینی تعلیم دینے نیز لوگوں کو امامؑ کی خدمت میں آمد و رفت رکھنے اور ان سے سوالات کرنے سے منع کیا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ مفضل بن عمر (ایک مشہور و معروف شیعہ محدّث) سے روایت ہے کہ اگر کسی کو کوئی خاندانی معاملہ جیسے طلاق یا کوئی اور مسئلہ درپیش آتا تھا تو وہ آسانی کے ساتھ امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس کا جواب نہیں پوچھ سکتا تھا۔[1]

خفیہ نظریاتی اور سیاسی تنظیموں کا وجود

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے والد اور جدّ بزرگوار (یعنی حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام زین العابدین علیہما السلام) کی بے پناہ جدّوجہد اور ان کے بعد اپنی کوششوں سے پورے عالم اسلام میں مومنین کا ایک ایسا گروہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے جو نظریاتی مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ انقلابی، فداکار اور ہر قسم کے خطرات سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔ یہ کوئی عام لوگوں کا گروہ نہیں تھا اس کا یہ طلب بھی نہیں کہ اس گروہ میں معاشرے کے اونچ طبقے کے لوگ شامل تھے۔ نہیں! بلکہ یہ عام مزدور، تاجر، غلام اور

---

[1] ا۔ مناقب، ابن شہر آشوب، ج۴، ص۲۳۸؛ پیشوائے صادق، ص۸۸۔۹۵

اس قسم کے لوگ تھے۔ لیکن معنوی حوالے سے کسی بھی صورت میں عام لوگوں جیسے نہیں تھے۔ بلکہ یہ وہ لوگ تھے کہ جن کی زندگی کا مقصد اور ہدف ان کا نظریہ تھا ایسے لوگ ہر جگہ موجود تھے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے پیروکار ہر جگہ موجود تھے۔ آپ یہ خیال نہ کریں کہ وہ صرف مدینے ہی میں موجود تھے، نہیں! بلکہ کوفے میں مدینے سے بھی زیادہ تھے۔ یہاں تک کہ خود شام میں بھی ایسے لوگ موجود تھے۔ یہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی اسی عظیم تنظیم کے نیٹ ورک کی وجہ سے ممکن ہوا تھا۔ علوی تحریک، شیعی تحریک، یہ جو ہم نے عرض کیا کہ اس تنظیمی نیٹ ورک سے مراد شیعہ ہیں تو اس کا مطلب یہی ہے۔

یہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی زندگی کا ایک غیر معروف باب ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے کہ جس پر میں تاکید اور اصرار کر رہا ہوں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی زیر قیادت ایک ایسا عظیم تنظیمی نیٹ ورک اور ایک منظّم تحریک موجود تھی جس کا وجود پورے عالم اسلام میں تھا تو اس نکتے میں وزن ہے۔

(۰۵-۰۹-۱۹۸۰ء)

اسلامی مملکت کے دُور دراز علاقوں میں پھیلا ہوا ایک وسیع نیٹ ورک جو بالخصوص عربی عراق اور خراسان کے نواحی علاقوں میں مسئلہ امامت کے حوالے سے نمایاں اور ثمر بخش سرگرمیوں میں مصروف تھا لیکن یہ مسئلے کا صرف ایک رُخ اور اس کا ایک معمولی حصّہ ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اور ہمارے دوسرے ائمہ طاہرین علیہم السلام کی سیاسی زندگی میں خفیہ تنظیموں کا وجود ان کی ہنگامہ خیز زندگیوں کا اہم ترین، جذبات انگیز ترین اور ساتھ ہی مجہول ترین اور مبہم ترین باب بھی ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی عرض کیا کہ کسی ایسی تنظیم کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے واضح مآخذ کی توقع نہیں کی جاسکتی اور ایسی توقع رکھنی بھی نہیں چاہیے کہ کسی امامؑ یا ائمہؑ کے قریبی ساتھیوں میں سے کسی نے شیعی نظریاتی اور سیاسی تنظیم کے وجود کا واضح اعتراف کیا ہوگا؛ کیونکہ یہ کوئی ایسی چیز ہے ہی نہیں کہ جس کا اعتراف کیا جائے۔ بلکہ توقع تو یہ ہونی اور رکھنی چاہیے کہ اگر کسی دن دشمن خفیہ تنظیم کا کھوج لگا لے

اور اس کے بارے میں خود امامؑ یا آپؑ کے ساتھیوں میں سے کسی سے پوچھے تو وہ صراحتاً اس کا مکمل انکار کریں اور اس بات کو بدگمانی یا (بے جا) تہمت قرار دیں کیونکہ خفیہ سرگرمیوں کی خاصیت ہی یہی ہوتی ہے۔

البتہ ائمہ اطہار علیہم السلام کی زندگی پر تحقیق کرنے والے محققین سے بھی یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ بغیر کسی ثبوت اور قابل اطمینان دلیل کے کسی ایسی تنظیم کے وجود کو قبول کریں۔ ضروری ہے کہ قرائن اور شواہد کو دیکھتے ہوئے ایسے واقعات جو بظاہر سادہ ہونے کی وجہ سے عام لوگوں کی توجہ حاصل نہیں کر پاتے ہیں، ان کے باطن میں جھانکا جائے کیونکہ ان میں غور و فکر کرنے سے بہت ساری خفیہ باتوں کا پتہ چل جاتا ہے۔ اگر اس نگاہ سے ائمہ معصومین علیہم السلام کی ڈھائی سو سالہ زندگی کا جائزہ لیا جائے تو ان کے ماتحت اور حکم پر چلنے والی ایک خفیہ تنظیم کا وجود تقریباً مسلم دکھائی دیتا ہے۔[1]

خفیہ تنظیمیں

تنظیم سے کیا مراد ہے؟ واضح رہے کہ اس تنظیم سے مراد موجودہ زمانے کے مفہوم میں ایک منظّم پارٹی (کہ جس کا مختلف علاقوں میں ایک منظم نیٹ ورک ہو) نہیں ہے اور نہ ہی اس وقت ایسا ہو سکتا تھا۔ بلکہ یہاں تنظیم سے مراد کچھ لوگوں کا کسی مشترکہ ہدف کے لیے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا، ایک دھڑکتے ہوئے دل اور ایک بیدار دماغ رکھنے والے شخص کی سرپرستی میں اپنے فرائض انجام دینا اور آپس کے روابط اور تعلقات کو فروغ دینا ہے۔

لوگوں کا یہ گروہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے زمانے میں (یعنی سقیفہ سے لیکر آپؑ کے ظاہری خلافت پر فائز ہونے تک کے پچیس سالوں میں) آپؑ کے خاص اصحاب پر مشتمل تھا۔ جو اعلانیہ حق کے ساتھ تھے اور ان عام لوگوں کے برعکس جنہوں نے خلافت کو تسلیم کر لیا تھا، یہ اس بات کے معتقد تھے کہ مسلمانوں میں خلافت کا حق ان کی سب سے برتر اور فداکار ہستی (یعنی حضرت علیؑ) کو حاصل ہے۔ کیونکہ انہوں نے حضرت

---

[1] پیشوائے صادق، ص٩٦۔٩٧

علیؑ کی خلافت اور جانشینی کے بارے میں حضور اکرمﷺ کے اعلان کو فراموش نہیں کیا تھا اور شروع دن سے ہی سقیفہ والوں کی مخالفت اور امیر المومنین حضرت علیؑ سے اپنی وفاداری کا واضح اعلان کر رکھا تھا۔ اس کے بعد جب ایک عظیم مصلحت کی بنا پر امیر المومنینؑ خاموشی اختیار کرنے بلکہ شروع کے خلفاء کے ساتھ تعاون کرنے پر مجبور ہوئے تو انھوں نے بھی معاشرے کے ایک عام فرد کی طرح زندگی بسر کرنا شروع کر دی لیکن وہ کسی بھی صورت میں اپنے نظریے اور درست نقطۂ نظر سے دستبردار نہ ہوئے اور ہمیشہ حضرت علیؑ ہی کی پیروی کرتے رہے، اسی وجہ سے انہیں ”شیعیانِ علیؑ“ کا نام دیا گیا اور یہ لوگ اپنے مخصوص نظریات اور سوچ کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ اس گروہ کی بعض مشہور اور قابلِ افتخار شخصیات میں سلمان فارسی، ابوذر غفاری، اُبی بن کعب، مقداد، عمار یاسر اور حذیفہ یمانی کا نام سرفہرست آتا ہے۔

تاریخی شواہد اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ یہ گروہ شیعی طرزِ فکر (یعنی ایک فکری اور سیاسی رہبر کی حیثیت سے امام کی اطاعت کی ضرورت) کی ہمیشہ مصلحت اور حکمت کے ساتھ لوگوں کے درمیان تبلیغ کرتا رہتا تھا اور آہستہ آہستہ ان کے ہم خیال لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ان لوگوں کا یہ کام علوی حکومت کے قیام کے لیے ایک ضروری تمہید شمار ہوتا تھا۔

اس کے بعد جب ٣٥ھ ق میں امیر المومنینؑ منصبِ خلافت پر فائز ہوئے تو جس گروہ نے شیعہ معیاروں پر حکومت اور امامت پر یقین رکھتے ہوئے نظریاتی لحاظ سے پورے ایمان کے ساتھ آپؑ کی حکومت کو قبول کیا تھا، وہ شیعوں کا یہی گروہ تھا۔ یعنی یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے گذشتہ پچیس سالوں کے دوران بالواسطہ یا بلاواسطہ امام علیؑ سے تربیت حاصل کی تھی۔ ان کے علاوہ باقی لوگ (یعنی لوگوں کی اکثریت) اگرچہ وہ بھی امامؑ ہی کی خلافت میں زندگی بسر کر رہے تھے اور عملاً بھی شیعی فکر کی جانب گامزن تھے لیکن وہ ایسی فکری اور روحانی وابستگی کے حامل نہیں تھے جو انہیں شیعہ تنظیم میں شامل کر سکے۔

امامؑ کے طرفداروں اور حامیوں میں ان دو قسم کے نظریات رکھنے والے لوگوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے جہاں ایک طرف عمار، مالک اشتر، حجر ابن عدی، سہل ابن حُنَیف

اور قیس ابن سعد جیسے نامور اشخاص نظر آتے ہیں تو دوسری طرف آپؑ کی امامت کو ظاہری طور پر قبول کرنے والے افراد میں ابو موسیٰ اشعری، زیاد ابن ابیہ اور سعد ابن وقاص جیسے کم اندیش لوگوں کا ایک گروہ بھی تھا۔ ان لوگوں کا امامؑ کے ساتھ برتاؤ اور ان کے طرزِ عمل کی وضاحت کی جا سکتی ہے۔

ہمیں یہ بات بھی مان لینی چاہیے کہ اگر واقعاً شیعی تنظیم کی بنیاد اس ملاقات میں رکھی گئی تھی (جس کا تذکرہ حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے حالات زندگی میں بیان کیا گیا ہے) تب بھی اس کے لیے منصوبہ بندی اور میدان ہموار ہونے کی پیشگوئی مدّتوں پہلے امام علی علیہ السلام کی طرف سے اپنے اصحاب اور قریبی ساتھیوں کے ساتھ ایک گفتگو میں کی گئی تھی۔

حضرت امام حسن علیہ السلام کی صلح کے واقعے کے بعد ایک انتہائی اہم قدم جو اُٹھایا گیا وہ شیعی نظریات کا پھیلاؤ اور تنظیمی لوگوں کے درمیان قربت اور روابط کو مضبوط بنانا تھا، جس نے اس وقت بنو اُمیہ کے ظالم بادشاہ کے ظالمانہ تسلط اور ظلم و جور کے خلاف ایک متحرک اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی شکل اختیار کر لی تھی اور ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ گھٹن اور دباؤ کسی منظم گروہ کی توڑ پھوڑ کا سبب بننے کی بجائے، اس کے اور زیادہ پھلنے پھولنے، مضبوط ہونے اور وسیع ہونے کا موجب بن جاتا ہے۔

چنانچہ مطمئن اور قابلِ اعتماد شیعوں کی افرادی طاقت کی جمع آوری اور اُموی حکمرانوں کی سازشوں، شیعہ مخالف اقدامات سے انہیں محفوظ رکھنا، ایک محدود لیکن گہرے پیمانے پر اسلام کی اصلی اور حقیقی افکار کا پرچار کرنا، باصلاحیت لوگوں کو ساتھ ملانا اور انہیں شیعوں میں شامل کرکے شیعوں کی تعداد اور قوت میں اضافہ کرنا اور ایک مناسب وقت کا انتظار کرنا، جب مناسب موقع ملے تو بنو اُمیہ کے جاہل نظامِ سلطنت کے خلاف عَلَم بغاوت بلند کرتے ہوئے ان کے ایوانوں کی اینٹ سے اینٹ بجانا اور ایک بار پھر سے اسلام کے حقیقی نظام اور علوی طرزِ حکومت کا قیام عمل میں لانا وغیرہ، امام حسن علیہ السلام کی پالیسی اور وہ بنیادی اسباب تھے جن کی وجہ سے آپؑ کے لیے صلح قبول کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ واقعۂ صلح کے بعد جب شیعوں کا ایک گروہ مُسیّب ابن نَجَبہ اور سلیمان ابن صُرَد خُزاعی کی قیادت میں مدینہ (جہاں امام حسن علیہ السلام حال ہی میں کوفہ سے لوٹ کر آئے تھے اور اس شہر کو ایک مرتبہ پھر سے اپنا نظریاتی اور سیاسی مرکز بنا لیا تھا) میں آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عسکری قوت کی از سر نو تیاری، کوفہ پر قبضہ اور شام پر حملہ (جیسی) تجاویز پیش کیں تو آپؑ نے اس وفد میں سے ان دو افراد کا انتخاب کیا اور انہیں تنہائی میں اپنے پاس بلایا اور اپنے بیانات کے ذریعے انہیں اس منصوبے کے غلط ہونے کا یقین دلایا لیکن افسوس کہ اس نشست اور میٹنگ میں کیے جانے والے فیصلوں کی کمیت اور کیفیت کے بارے میں کسی قسم کے معلومات تاریخ کے سینے میں محفوظ نہیں ہیں اور جب یہ دونوں افراد اپنے ساتھیوں اور ہم سفر لوگوں کے پاس واپس لوٹے تو مختصر اور دھیمے الفاظ میں انہیں یہ بات سمجھائی کہ مسلح قیام کا معاملہ اب ختم ہو گیا ہے لہٰذا آپ لوگ واپس کوفہ پہنچ کر اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو جائیں۔

انہیں قرائن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے (مصر کے معاصر مورِخ) طٰہ حسین اس بات کے معتقد ہیں کہ شیعوں کی تنظیم سازی کی پہلی اینٹ اسی روز اور اسی میٹنگ میں رکھ دی گئی تھی کہ جب ان دو مشہور شیعہ شخصیات نے امام حسن علیہ السلام سے ملاقات اور مذاکرات کیے تھے۔

امیر المومنین امام علی علیہ السلام ان حالات کی پیشگوئی اور ایسی صورت حال سے مقابلے کے لیے نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”جب تم مجھے کھو دو گے تو بہت سی ایسی چیزیں دیکھو گے کہ جن کو دیکھنے کے بعد تم موت کی تمنا کرو گے۔ معاشرے میں ناانصافی، دشمنی، اجارہ داری، اللہ کے حق کو حقیر سمجھنا اور جان کا خوف؛ جب اس طرح کے حالات کا مشاہدہ کرو تو تمہیں چاہیے کہ سب مل کر خدا سے اپنا رشتہ جوڑو اور انتشار کا شکار نہ ہو جاؤ، مقاومت، نماز (یعنی خدا کی یاد) اور تقیہ (اپنے کاموں کو خفیہ رکھنے) کو اپنی عادت بنا لو۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اس عمل کو پسند نہیں فرماتا کہ وہ بدلتے حالات کے

ساتھ اپنا رنگ بدلتے رہیں۔ حق اور اہلِ حق کو نظر انداز نہ کروکیونکہ جو شخص ہماری جگہ کسی غیر کا انتخاب کرے گا وہ اپنی دنیا کو کھو دے گا اور گناہوں کا سنگین بار لیے آخرت کے سفر پر روانہ ہو گا...''[1]

یہ گفتگو واضح طور پر بنو اُمیہ کے اقتدار کے دگر گوں حالات کی تصویر کشی کرنے کے ساتھ ساتھ، آپس میں ہم آہنگ اور مربوط رہنے کی ہدایت پر مشتمل ہے اور ایک شیعی تنظیم کے وجود پر ایک خوبصورت دستاویزی ثبوت ہے اور یہ وہی پالیسی ہے جو امام حسن علیہ السلام اور دو نمایاں ترین شیعہ شخصیات کے درمیان ہونے والی ملاقات میں طے کی گئی تھی۔

یقیناً تمام پیروکاروں اور شیعوں کو اس انتہائی دانشمندانہ پالیسی کی اطلاع نہیں تھی۔ امام حسن علیہ السلام پر آپؑ کے دوستوں کی جانب سے اعتراضات اور تنقید کی وجہ بھی یہی تھی؛ لیکن ان اعتراضات کے جواب میں مسلسل آپؑ کی طرف سے یہ کہنا کہ ''کیا معلوم شاید یہ تمہارے لیے ایک قسم کی آزمائش اور تمہارے دشمن کے لیے زوال کا سبب ہو؟''[2] اسی سیاست اور تدبیر کی جانب اشارہ تھا۔

معاویہ کے بیس سالہ دورِ اقتدار کے دردناک حالات کے حوالے سے اکثر مورّخین نے علویوں کے خلاف کی جانے والی وسیع تبلیغات کی کیفیت کے بارے میں لکھا ہے، یہاں تک کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام پر لعن طعن کرنا ایک رائج سنت اور رسم بن چکی تھی اور امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کی طرف سے (اس رسم کے خلاف) کسی نمایاں سرگرمی کے ظاہر نہ ہونے کی وجہ، صرف یہی باہمی تنظیم تھی کہ جس نے پورے حجاز اور عراق میں شیعہ نظریات کی نشوونما اور ان کی تعداد میں اضافے

---

[1] ''قَالَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ: لَوْ قَدْ فَقَدْتُمُونِي لَرَأَيْتُمْ بَعْدِي أَشْيَاءَ يَتَمَنَّى أَحَدُكُمُ الْمَوْتَ مِمَّا يَرَى مِنَ الْجَوْرِ وَ الْعُدْوَانِ وَ الْأَثَرَةِ وَ الِاسْتِخْفَافِ بِحَقِّ اللهِ وَ الْخَوْفِ عَلَى نَفْسِهِ فَإِذَا كَانَ ذَلِكَ فَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعاً وَ لا تَفَرَّقُوا وَ عَلَيْكُمْ بِالصَّبْرِ وَ الصَّلَاةِ وَ التَّقِيَّةِ وَ اعْلَمُوا أَنَّ اللهَ عَزَّ وَ جَلَّ يُبْغِضُ مِنْ عِبَادِهِ التَّلَوُّنَ لَا تَزُولُوا عَنِ الْحَقِّ وَ أَهْلِهِ فَإِنَّ مَنِ اسْتَبْدَلَ بِنَا هَلَكَ وَ فَاتَتْهُ الدُّنْيَا وَ خَرَجَ مِنْهَا آثِماً . . .'' (تحف العقول، طبع اعلمی، ص٨٢)

[2] ایک ایسے معاشرے میں جہاں پر مختلف قسم کی تنظیمیں سرگرم عمل ہوں وہاں پر مختلف پہلوؤں سے اس قسم کے حالات کا مقائسہ ممکن ہے۔ (مؤلف)

کا امکان پیدا کیا تھا۔

اس صلح کے بیس سال بعد جب ہم اس علاقے کے لوگوں کے نظریات کا جائزہ لیتے ہیں تو کوفہ کی عظیم اور نامور ترین شخصیات شیعوں کی صف میں دکھائی دیتی ہیں۔ اسی طرح مکہ معظّمہ، مدینہ منوّرہ اور بعض دوسرے دُور دراز کے علاقوں میں بھی شیعہ زنجیر کے حلقوں کی طرح ایک دوسرے سے متصل اور ایک دوسرے کے حالات سے باخبر دکھائی دیتے ہیں۔ جب چند سال بعد ایک شیعہ رہنما (حجر بن عدی) کو شہید کر دیا جاتا ہے تو ملک کے کئی حصّوں میں گھٹن اور شدید دباؤ کے باوجود (اس حکومتی اقدام پر) صدائے احتجاج اور حکومت کے خلاف آوازیں بلند کی گئیں اور خراسان میں ایک مشہور و معروف شخصیت اس سانحے پر غیظ و غضب کے بعد شدید غم سے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔[۱]

معاویہ کی موت کے بعد ہزاروں لوگوں نے خطوط لکھ کر حضرت امام حسین علیہ السلام کو قیام کے لیے کوفہ آنے کی دعوت دی اور امامؑ کی شہادت کے بعد سینکڑوں لوگ امام عالی مقامؑ کا انتقام لینے والے گروہوں سے جاملے اور توابین یا مختار اور ابراہیم بن مالک اشتر کے سپاہیوں میں شامل ہو کر بنو اُمیہ کی حکومت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔

تاریخ کا مطالعہ اور تجزیہ کرنے والا شخص اپنے آپ سے پوچھتا ہے کہ کیا شیعی نظریات اورعقائد کا اس حد تک پھلنا پھولنا، ہم خیال اور ہم فکر شیعوں کے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر یکجہتی سے تنظیمی سرگرمیوں کو انجام دیئے بغیر ممکن ہو سکتا ہے؟ (یعنی ایک ایسی تنظیم کہ طہ حسین نے جس کے امام حسن علیہ السلام کی صلح کے فوراً بعد وجود میں آنے کا امکان ظاہر کیا ہے۔) یقیناً اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ کیونکہ مسلمانوں پر مسلط اُموی حکمرانوں کا منظم پروپیگنڈہ جو سینکڑوں قاضیوں، قاریوں، خطیبوں اور گورنروں کے ذریعے کیا جارہا تھا، اس کا مقابلہ ایک ایسے منظم تبلیغاتی نظام کے بغیر ممکن نہ تھا جس کے اراکین آپس میں متحد اور ایک ہی جہت کے حامل ہوں، لیکن اس نیٹ ورک کا وجود زیرِ زمین ہو، یہاں تک کہ بعض موارد میں ان حکومتی لوگوں

---

[۱] صلحِ امام حسنؑ، تالیف شیخ راضی آل یاسین، ترجمہ (فارسی) آیت اللہ سید علی خامنہ ای (مدّظلہ)

کے عزائم کو ناکام بنایا گیا ہو۔

معاویہ کی موت کے قریب شیعوں کی یہ منظم سرگرمیاں بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں اوران میں مزید اضافہ ہو رہا تھا یہاں تک کہ جب حاکمِ مدینہ کو امام حسین علیہ السلام کی خفیہ سرگرمیوں کی اطلاع دی گئی تو اس نے معاویہ کے نام خط لکھا: اما بعد! عمر ابن عثمان (مخبر) نے مجھے اطلاع دی ہے کہ عراق اور حجاز کی بعض معروف اور مشہور شخصیات کی حسینؑ کے ہاں آمد و رفت ہے مجھے شک ہے کہ وہ قیام کرنے والے ہیں اور میں نے اس سلسلے میں تحقیق کی ہے اور مجھے پتا چلا ہے کہ وہ (امام حسین علیہ السلام) مخالفت کا پرچم بلند کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا آپ اپنی رائے اور حکم صادر کیجئے۔[1]

شہادت امام حسین علیہ السلام کے بعد شیعوں کی منظّم سرگرمیاں

سانحہ کربلا اور امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد عراق میں شیعوں کی منظّم سرگرمیاں مزید منظم تر اور متحرک ہوچکی تھیں اور اس کی علت یہ تھی کہ ان حالات کو کوفہ کے شیعوں (جن میں سے بہت سے افراد اپنی غفلت اور لاپرواہی کی وجہ سے حکومت کے ہاتھوں نقصان اُٹھا چکے تھے اور وہ معرکہ کربلا میں شرکت سے قاصر رہے تھے) کی نفسیاتی کیفیت نے پیدا کیا تھا اور امام حسین علیہ السلام کا ساتھ نہ دینے کا افسوس اور درد اس کیفیت کو مزید جلا بخشتا تھا۔

تیسری صدی ہجری کے مشہور و معروف مورّخ طبری لکھتے ہیں کہ "یہ گروہ (یعنی شیعہ) مسلسل اسلحہ جمع کرنے اور جنگ کی تیاری میں مشغول تھا اور لوگوں کو (خواہ وہ شیعہ ہوں یا غیرشیعہ) خونِ حسینؑ کے انتقام کی دعوت دے رہا تھا اور لوگ بھی گروہ در گروہ ان کی دعوت پر لبیک کہہ رہے تھے اور ان میں شامل ہو رہے تھے ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ یزید بن معاویہ مر گیا۔"[2]

---

[1] ثورة الحسین، ص١١٨، نقل از اعیان الشیعہ اور الاخبار الطوال

[2] طبری، ج٧، نقل از جہاد الشیعہ، ص٢٨

"جہادالشیعہ" کی مؤلّفہ نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد شیعہ ایک منظّم گروہ کی صورت میں ظاہر ہوئے یہ لوگ جو سیاسی اور دینی و مذہبی نظریات میں بالکل متفق تھے، ان کے پاس بڑے بڑے سردار اور جنگجو موجود تھے اور توابین کا گروہ اس تحریک کا ہراول دستہ تھا۔"[۱]

تاریخیِ واقعات کے مطالعے اور ان مورِّخین کے تجزیوں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ معاویہ کے دور کے حادثات اور امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد پیش آنے والے ان واقعات کی قیادت اور منصوبہ بندی کرنے والوں کا تعلق صرف شیعوں سے تھا۔ ورنہ تو ایسے بہت سارے لوگ تھے جو انسانی ہمدردی یا اُموی حکمرانوں سے ناراضگی اور یا دوسری وجوہات کی بنا پر مختلف معرکوں میں عملی طور پر شیعوں کے ہم قدم اور ان کے دوش بدوش کھڑے اور ان کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ لہٰذا ہمیں یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ تاریخ کے اس دور میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات میں شریک ہونے اور ان میں فعال یا معمولی کردار ادا کرنے والے سارے لوگ شیعہ تھے اور وہ سب کے سب ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی تشکیل کردہ اس تنظیم کے ممبر تھے۔ (نہیں، ایسا نہیں ہے)۔

مندرجہ بالا وضاحت کی روشنی میں ایک اہم نکتے پر غور و فکر کی تاکید کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ زیر بحث زمانے تک (یعنی امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد بھی) امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے دور کی طرح لفظِ شیعہ کی اصطلاح کا اطلاق صرف ان لوگوں پر ہوتا تھا جو عقائد، نظریات اور عمل کے اعتبار سے سچے اور پکے تھے اور ان کا امام وقتؑ کے ساتھ رابطہ مستحکم اور مشخص ہوتا تھا۔

یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے امام حسن علیہ السلام کی صلح کے بعد آپؑ ہی کے حکم پر شیعوں کی ایک منظم اور مربوط تنظیم کو تشکیل دیا تھا اور یہی لوگ تھے جنہوں نے اپنی زبردست تبلیغات کے ذریعہ لوگوں کو اس تنظیم میں داخل کیا اور بہت سارے ایسے لوگوں کو جو عقائد اور نظریات کے اعتبار سے خود اُن جیسے نہیں تھے لیکن پھر بھی

---

[۱] جہاد الشیعہ، ص۲۷

انہیں شیعی کاروائیوں میں شامل کر لیا تھا۔

بے شک حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول وہ روایت جو ہم نے اپنی گذشتہ گفتگو کے شروع میں نقل کی تھی کہ (جس کے مطابق سانحہ کربلا کے بعد شیعوں کی تعداد تین یا پانچ افراد تک محدود رہ گئی تھی) اس میں ایسے ہی لوگوں کو مدِّنظر رکھا گیا ہے؛ یعنی اس سے ائمہ اطہار علیہم السلام کے سچے اور حقیقی شیعہ مراد ہیں۔ جنہوں نے علوی انقلاب، علوی اور ہاشمی تحریک کے ہراول دستے کے طور پر ان کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنا کردار ادا کیا تھا۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی خفیہ اور بظاہر آہستہ کوششوں سے یہ گروہ اپنی استعداد کو عملی شکل دینے اور دوسروں کو راغب کرنے اور اپنی تعداد میں اضافہ کرنے میں کامیاب ہوا اور امام جعفر صادق علیہ السلام اپنی ایک اور روایت میں جیسا کہ بیان کیا گیا، فرماتے ہیں: ”لوگ شامل ہوتے گئے اور ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔“

امام زین العابدین علیہ السلام، امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے ادوارِ امامت میں بھی مسلسل یہ گروہ موجود رہا جو اپنی سرگرمیوں سے خلافت کے اعلیٰ عہدے داروں کو ہراساں کرتا اور کبھی کبھار تو انہیں سختی کے ساتھ دفاعی پوزیشن لینے پر بھی مجبور کرتا تھا۔

مختصر یہ کہ تاریخِ اسلام کی ابتدائی صدیوں اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے ادوار میں شیعی تہذیب اور اسی طرح غیر شیعی شعور و ادراک میں لفظِ شیعہ کا اطلاق ان لوگوں پر نہیں ہوتا تھا جو صرف محبانِ اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے اور ان کی حقانیت اور دعوت پر یقین رکھتے تھے؛ (اگرچہ امامِ وقتؑ کے پرچم تلے اور آپؑ کی رہبری اور پیشوائی میں عملی طور پر انہوں نے کوئی کردار ادا نہ کیا ہو) بلکہ اس کے علاوہ شیعہ ہونے کے لیے ایک بنیادی اور حتمی شرط بھی ہوا کرتی تھی اور وہ یہ تھی: ”امامؑ سے نظریاتی اور عملی وابستگی اور امامؑ کی قیادت اور رہبری میں ایسی سرگرمیوں میں شرکت جو وہ اپنے غصب شدہ حقوق کی بازیابی اور علوی و اسلامی حکومت کے قیام کے لیے نظریاتی، سیاسی اور عسکری لحاظ سے انجام دیتے ہیں۔“ یہ وابستگی وہی ہے جسے شیعی تہذیب (اور اصطلاح) میں ”ولایت“ کہا

جاتا ہے۔ درحقیقت شیعہ نام ہی ”امامت“ کی پارٹی کا تھا۔ وہ پارٹی جو امامؑ کی قیادت اور رہبری میں مخصوص سرگرمیوں میں مصروفِ عمل ہوتی تھی اور گھٹن کے اس ماحول میں دیگر مخالف پارٹیوں اور تحریکوں کی طرح خفیہ طور پر تقیہ میں زندگی گزار رہی ہوتی تھی۔ یہ تمام ائمہ اہل بیت علیہم السلام بالخصوص امام جعفر صادق علیہ السلام کی زندگی کا ایک خلاصہ اور نچوڑ ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ خفیہ تنظیم یا منصوبہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کے ثبوت کے لیے ہم واضح دلائل ڈھونڈیں۔ کیونکہ کسی خفیہ گھر کے دروازے پر کسی ایسی تختی کی توقع کبھی نہیں رکھنی چاہیے کہ جس پر یہ لکھا گیا ہو کہ ”یہ ایک خفیہ گھر ہے۔“ اگرچہ حتمی قرائن کے وجود کے بغیر اس بات کو مسلمہ بھی نہیں سمجھا جا سکتا؛ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ ہم قرائن اور شواہد کی تلاش میں بھی رہیں۔[1]

---

[1] ۔ پیشوائے صادق، ص۹۷۔۱۰۷

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

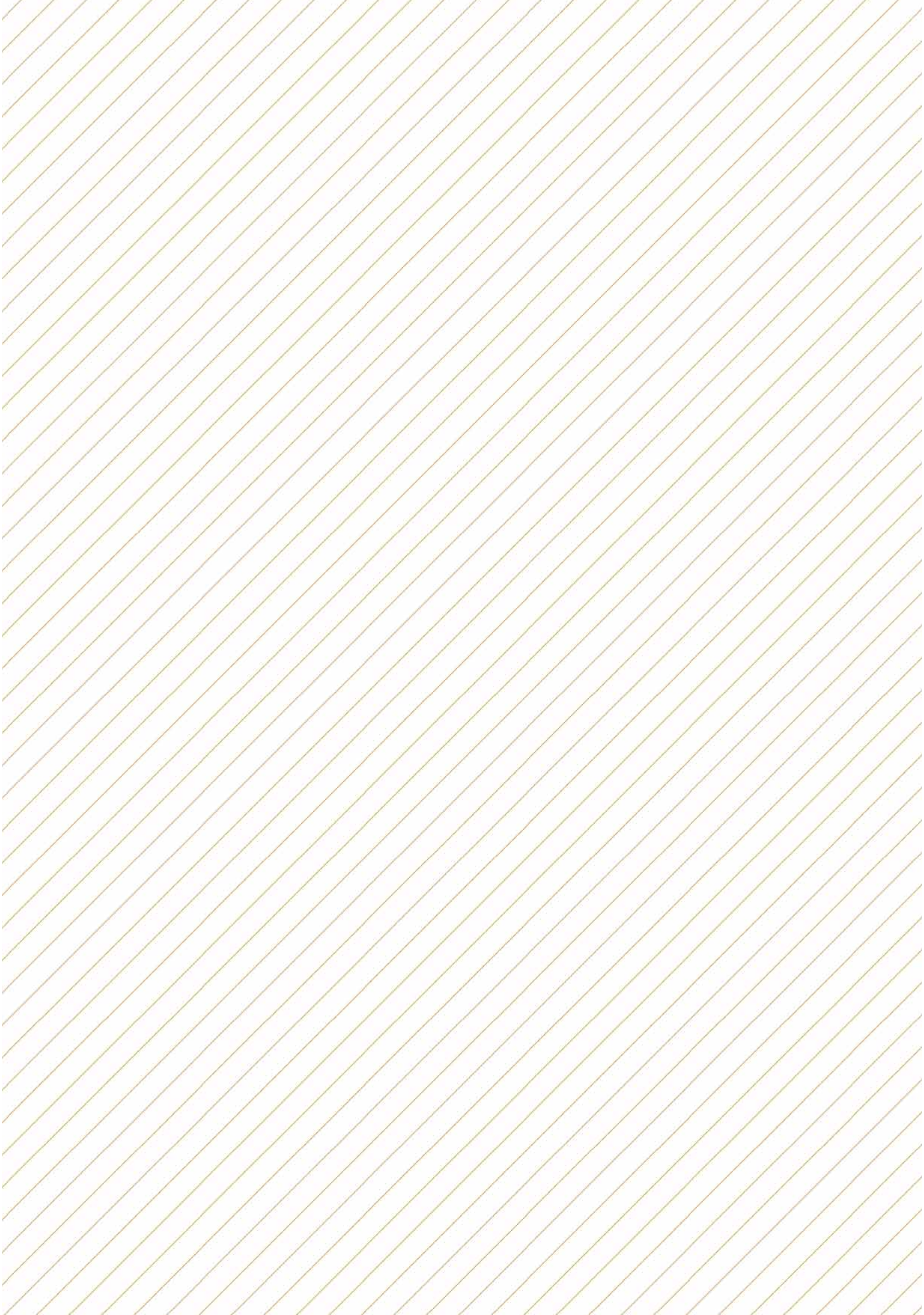

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی امامت کا دور

تاریخ اسلام کے سال ۱۴۸ ہجری سے لے کر سال ۱۸۳ ہجری تک کے اس پینتیس (۳۵) سالہ دورانیے، یعنی حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے دورِ امامت کا شمار ائمہ معصومین علیہم السلام کی زندگی کے ایک اہم ترین دور میں سے ہوتا ہے۔ اِس عرصے میں بنو عباس کے دو مقتدر ترین خلفاء (منصور دوانیقی اور ہارون عباسی) اور دو جابر ترین خلفاء (مہدی عباسی اور ہادی عباسی) نے حکومت کی۔ بنو عباس نے اِس عرصے میں اپنی حکومت کے خلاف خراسان، افریقہ، جزیرۂ موصل، دیلمان، جرجان، شام، نصیبین، مصر، آذربائیجان، ارمنستان اور دوسرے علاقوں میں اُٹھنے والی شورشوں اور بغاوتوں کو سختی کے ساتھ کچل کر انہیں اپنا مطیع اور فرمانبردار بنا لیا تھا اور انہوں نے اپنی سلطنت کے مشرقی، مغربی اور شمالی علاقوں کو اسلامی مملکت کے وسیع قلمرو میں داخل کر لیا تھا اور اِن مفتوحہ علاقوں سے حاصل ہونے والے غنائم اور دوسرے محصولات نے بنو عباس کی سلطنت کو مزید استحکام بخشا تھا۔

اِس دور میں بہت سی نظریاتی اور عقیدتی تحریکیں اپنے عروج پر پہنچی ہوئی تھی، جبکہ بہت سی تحریکوں نے اسی دور میں جنم لیا تھا۔ لوگوں کے اذہان اختلافی باتوں سے بھرے ہوئے تھے اور یہ چیز جہاں ایک طرف حکمرانوں کے لیے بہترین موقع فراہم کرتی تھی تو دوسری طرف ایک آفت کی صورت میں صحیح اسلامی معارف اور تعلیمات کا پرچار کرنے والوں کے سامنے ایک رکاوٹ بن گئی تھی اور صحیح اسلامی معارف اور علوی تحریک کی طرف دعوت دینے والوں کے لیے میدان تنگ ہو چکا تھا۔

شعر و ہنر، فقہ و حدیث یہاں تک کہ زُہد و تقویٰ جیسی صفات بھی اربابِ اقتدار کی خدمت پر کمربستہ ہو چکی تھیں اور مکمل طور پر یہ اربابِ اقتدار کے ہاتھوں ایک کھلونے کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ اس وقت نہ تو بنی اُمیہ کے آخری دورِ خلافت کی طرح کوئی حکومت مخالف تحریک زوروں پر تھی اور نہ ہی بنو عباس کے ابتدائی دس

سالہ دورِ خلافت کی طرح اور نہ ہی ہارون عباسی کی موت کے بعد کے زمانے کی طرح کہ جب مسلط حکومت کو کسی نہ کسی قسم کا خوف لاحق رہتا تھا، کوئی ایسا سنگین خطرہ خلافت کی بنیادوں کو لاحق نہیں تھا، جو خلیفۂ وقت کو اہل بیت علیہم السلام کی گہری اور مسلسل دعوت سے غافل کر سکے۔

اِس دور میں ایک ہی بات جو اہل بیت علیہم السلام اور ان کے سچے پیروکاروں کی نظریاتی اور سیاسی جنگ اور جدّ و جہد کو تسلسل کے ساتھ آگے بڑھا سکتی تھی، وہ اِن بزرگوار ہستیوںؑ کی انتھک محنت، سخت تلاش و کوشش اور اس الٰہی شیوہ، یعنی تقیہ سے متوسّل ہونا تھا۔ یہاں سے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے جہاد کی حیرت انگیز عظمت اور ہیبت آشکار ہوتی ہے۔

میں یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ مؤرّخین کو تاریخ اسلام قلمبند کرتے وقت حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے حالات زندگی کے جس پہلو پر ہوشیاری کے ساتھ سب سے زیادہ توجہ دینی چاہیے تھی جبکہ اتنی توجہ نہیں دی گئی، وہ آپؑ کی زندگی کا عظیم اور بے نظیر ”طویل المدّت اسیری“ کا پہلو اور واقعہ ہے، جس کے نتیجے میں مؤرّخین آپؑ کے اس عظیم جہاد سے غافل رہے ہیں۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے ۳۵ سالوں پر محیط اِس دورِ امامت میں آپؑ کی مسلسل جدّ و جہد اور جہاد، آپؑ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں، واقعات اور آپؑ کی علمی و روحانی زندگی، آپؑ کا الٰہی مقام، آپؑ کا خاندان، اصحاب اور شاگردوں سے متعلق واقعات اور اُن کے علمی اور کلامی مباحثوں کے تذکروں اور اِس قسم کی دوسری چیزوں کو بیان کیے بغیر آپؑ کے حالاتِ زندگی کا مکمل احاطہ ممکن نہیں ہو سکتا، بلکہ اس طرح کا زندگی نامہ ناقص اور نامکمل رہ جائے گا۔ یہ آپؑ کی بابرکت زندگی کا وہ حصّہ ہے جس کی وضاحت کے ذریعے آپؑ کی حیات کے مختلف پہلوؤں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر ایک ایسی مکمل اور واضح تصویر پیش کی جا سکتی ہے جس میں آپؑ کی حیات کے ہر واقعے کی حقیقت کو بیان کیا جا سکے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام مفضّلؒ سے یہ کیوں فرماتے ہیں کہ: اِس جوان کی امامت کے بارے میں صرف قابلِ اعتماد لوگوں کو بتایا کرو؟ اور عبدالرحمن ابن حجاج کو واضح طور پر بتانے کے بجائے اشاروں کنایوں میں فرماتے ہیں کہ: کیا زرہ ان کے جسم پر برابر آئی ہے؟ اور اپنے انتہائی قریبی اصحاب جیسے صفوان جمالؒ کے سامنے آپؑ کا علامتوں اور نشانیوں کے ساتھ تعارف کراتے ہیں؟ یہاں تک کہ اپنے وصیت نامے میں اپنے فرزند (امام موسیٰ کاظم علیہ السلام) کا نام بطورِ وصی، چار دوسرے لوگوں کے بعد درج کرتے ہیں کہ جن میں سب سے پہلا نام منصور عباسی کا اور اس کے بعد حاکمِ مدینہ کا اور اس کے بعد دو عورتوں کے نام ہیں؛ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی شہادت کے بعد شیعہ اکابرین کے ایک بڑے طبقے کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ آپؑ کے جانشین یہی بیس (۲۰) سالہ جوان ہیں؟ کیوں ہارون عباسی کے ساتھ اپنی ایک گفتگو کے دوران جب وہ آپؑ کے بھتیجے کا قول نقل کرتا ہے کہ ''خَلِیْفَتَانِ یَجِیءُ اِلَیْهِمَا الْخَرَاجِ'' تو آپؑ نرم انداز میں گفتگو کرتے ہوئے انکار آمیز رویّہ اپناتے ہیں؟ لیکن اس سے کچھ ہی دیر پہلے حسن ابن عبد اللہ نامی ایک زاہد اور پرہیزگار شخص سے گفتگو کے دوران امام کی معرفت کے حوالے سے بات کرتے ہوئے خود کو ''مُفْتَرَضُ الطَّاعَة'' امام و پیشوا، یعنی اِس مقام کے حامل کے طور پر تعارف کرواتے ہیں کہ جس پر اُس وقت عباسی خلیفہ براجمان تھا؟

کیوں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اپنے ایک چاہنے والے شخص ”علی ابن یقطین“ کو جو ہارون کے دربار میں ایک اہم عہدے پر فائز تھے، تقیّہ پر عمل کرنے کا حکم دیتے ہیں، جبکہ صفوان جمال کی اسی دربار کی خدمت کرنے پر اُن کی سرزنش کرتے ہوئے خلیفہ کے ساتھ تعلقات منقطع کرنے کا حکم دیتے ہیں؟ کس طریقے سے اور کن ذرائع سے وسیع و عریض اسلامی ریاست میں اپنے چاہنے والوں اور پیروکاروں کے ساتھ رابطہ برقرار کیے ہوئے ہیں جو چین تک پھیلا ہوا ہے؟

آخر کیوں منصور، مہدی، ہادی اور ہارون عباسی میں سے ہر ایک اپنے دورِ اقتدار میں امامؑ کو قتل، قید اور جلاء وطن کرنے پر کمربستہ ہو جاتا ہے؟ آخر بعض روایات سے یہ کیوں معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ اپنے پینتیس (۳۵) سالہ دورِ امامت میں بعض

اوقات شام کے دیہاتوں، قصبوں یا طبرستان کے بعض علاقوں میں روپوشی کی زندگی گزارتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں؟ اور خلیفۂ وقت آپؑ کی تلاش میں رہتا ہے اور امامؑ اپنے دوستوں اور پیروکاروں کو یہ تاکید فرماتے ہیں کہ اگر خلیفہ میرے بارے میں پوچھے تو اُس سے کہیں کہ ہم امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو نہیں جانتے ہیں یا کہیں کہ ہمیں معلوم نہیں کہ اِس وقت آپؑ کہاں ہیں؟

آخر کیا وجہ ہے کہ ہارون ایک مرتبہ سفر حج کے دوران بہت زیادہ شان و شوکت کے ساتھ آپؑ کا احترام کرتے ہوئے، خاطر مدارت کرتا ہے تو دوسری مرتبہ کے سفر میں آپؑ کو گرفتار کرتے ہوئے جلاء وطن کرنے کا حکم دیتا ہے؟ اور کیوں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے ہارون کے دورِ خلافت کی ابتداء میں جبکہ ہارون نے نرم رویّہ اختیار کیا ہوا تھا اور علویوں کو قید سے رہا بھی کر رہا تھا، باغِ فدک کی حدود بیان کرتے ہوئے وسیع و عریض اسلامی ریاست کے تمام علاقوں کو اس میں شامل قرار دیا؛ یہاں تک کہ خلیفہ کو اعتراض کرتے ہوئے یہ کہنا پڑا کہ: تو پھر آپؑ آ جائیں اور میری جگہ بیٹھ جائیں؟ اور کیوں اسی مہربان خلیفہ کا رویّہ کچھ ہی سالوں بعد اِس قدر تلخ اور سخت ہو جاتا ہے کہ آپؑ کو زندان میں ڈال دیتا ہے اور سالہا سال قید رکھنے کے بعد قید خانے میں بھی آپؑ کا وجودِ مقدس اُس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے اور وہ انتہائی سفّاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپؑ کو زہر دے کر شہید کرا دیتا ہے؟

اِس قسم کے دوسرے سینکڑوں توجہ طلب، پُرمعنی اور بظاہر آپس میں بے ربط اور کبھی تو آپس میں متضاد واقعات سے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی زندگی بھری ہوئی ہے اور یہ واقعات اس وقت بامعنی اور مربوط ثابت ہوں گے جب ہم اِس عظیم امامؑ کی امامت کے آغاز سے لے کر شہادت تک کی زندگی کے تمام واقعات کا تسلسل کے ساتھ جائزہ لیں۔

یہ چیز وہی ائمہ معصومین علیہم السلام کی ڈھائی سو سالہ زندگی کے دوران جہاد اور مبارزہ آرائی سے عبارت ہے جو ہر دور میں مختلف شکل اور مختلف انداز میں جاری رہی ہے اور اس کا پہلا ہدف و مقصد؛ خالص اسلامِ محمدیؐ کی تبیین و تشریح، قرآن کی صحیح و واقعی تفسیر اور اسلامی معارف کی واضح و روشن تصویر پیش کرنا ہے اور دوسرا ہدف و مقصد؛ اسلامی معاشرے میں

امامت اور سیاسی حاکمیت کے مسئلے کو (بہترین اور صحیح انداز سے) اُجاگر کرنا ہے اور تیسرا ہدف و مقصد؛ اس معاشرے کی تشکیل کے لیے سعی و کوشش کرنا ہے جس کے وجود میں لانے کے لیے پیغمبر عظیم الشان اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دوسرے انبیائے الٰہی علیہم السلام مبعوث ہوئے؛ یعنی (معاشرے میں) عدل و انصاف کا قیام اور دشمنانِ خدا کو تختِ حکومت و سلطنت سے برطرف کرتے ہوئے، اُن کی جگہ حقیقی الٰہی خلفاء اور خدا وند متعال کے نیک و صالح بندوں کو (لوگوں کی) زندگی کے تمام اُمور کی باگ ڈور سپرد کرنا ہے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے اپنی پوری زندگی اِسی مقدّس جہاد کے لیے وقف کر رکھی تھی، آپؑ کا درس و تدریس، تعلیم و تربیت، فقہ، حدیث اور تقیہ سب کا محور یہی تھا۔ البتہ آپؑ کا دور بعض امتیازی خصوصیات کا حامل بھی تھا، پس اِس لحاظ سے آپؑ کا جہاد بھی اپنے زمانے کے تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے لے کر حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام تک ہمارے آٹھ اماموںؑ میں سے ہر ایک نے اپنے زمانے کے مخصوص حالات کے مطابق اپنا جہاد جاری رکھا۔ مجموعی طور اِن آٹھ اماموں کا دور ہمارے ائمہ اطہار علیہم السلام کی ڈھائی سو سالہ دورِ حیات کے چوتھے مرحلے کو تشکیل دیتا ہے کہ جو خود بھی کئی مرحلوں میں تقسیم ہوتا ہے۔

(۱۸۔۱۰۔۱۹۸۹ء)

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی زندگی میں تقیہ کا اصول اور انتھک جدّ و جہد

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی زندگی ایک حیرت انگیز اور تعجّب آور زندگی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ امامؑ کی خصوصی زندگی کے حالات سے صرف آپؑ کے قریبی لوگ ہی باخبر تھے۔ آپؑ کے قریبی رشتہ داروں اور اصحاب میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جو یہ نہ جانتا ہو کہ امامؑ کی جدّ و جہد کا مقصد کیا ہے۔ خود امامؑ اپنے ارشادات اور اشاروں کنایوں میں لوگوں کو یہ سمجھاتے رہتے تھے کہ آپؑ کا مقصد کیا ہے۔ یہاں تک کہ امامؑ کی رہائشگاہ، یعنی وہ حجرہ جس میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام قیام فرماتے تھے وہ ایسا تھا کہ راوی (جس کا تعلق امامؑ کے قریبی اصحاب میں سے ہے) کہتا ہے کہ میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

کے حجرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ اس میں تین چیزیں رکھی ہوئی تھیں؛ ایک سخت قسم کا کھردرا لباس، جو عام قسم کے آرام دہ لباسوں کے برعکس ہوتا ہے، یعنی آج کی اصطلاح میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک جنگی لباس، جس کو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے پہنا ہوا تو نہیں تھا لیکن ایک علامت کے طور پر حجرے میں رکھا ہوا تھا اور دوسری چیز ''سَیْفٌ مُعَلَّقٌ''، یعنی ایک تلوار تھی جو چھت یا دیوار کے ساتھ لٹکی ہوئی تھی اور تیسری چیز ''مُصْحَف''، یعنی قرآن کریم رکھا ہوا تھا۔

قارئین کرام! آپ غور کیجئے کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے اِس مخصوص حجرے میں، جہاں آپؑ کے قریبی اصحاب کے علاوہ کوئی اور نہیں جا سکتا، وہاں آپؑ نے کتنی خوبصورت چیزیں علامت کے طور پر رکھی ہوئیں تھیں۔ یہ چیزیں خود بتاتی ہیں کہ یہ ایک نظریاتی قسم کے جنگجو مجاہد انسان کا حجرہ ہے۔ تلوار کی موجودگی اِس بات کی علامت ہے کہ آپؑ جہاد کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جنگی لباس کی موجودگی اِس بات پر شاہد ہے کہ آپؑ کی زندگی ایک سخت قسم کی جنگی اور انقلابی زندگی ہے اور قرآن کریم کی موجودگی اِس بات کی نشانی ہے کہ آپؑ اپنی زندگی کو قرآنی اصولوں کے مطابق گزارنا چاہتے ہیں۔ پس اس مقصد کے حصول کے لیے ان وسائل سے استفادہ کرتے تھے جس کے نتیجے میں سختیاں اور تکالیف بھی جھیلتے تھے، البتہ امامؑ کے دشمنوں کو بھی اِس بات کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور تھا۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی زندگی یعنی آپؑ کی امامت کا آغاز ایک مشکل ترین زمانے میں ہوا۔ میرے خیال میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے علاوہ دیگر ائمہ اطہار علیہم السلام کی زندگیوں میں ایسا سخت دور کبھی نہیں آیا تھا۔ جب سال ۱۴۸ ہجری میں اپنے والدِ گرامی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی شہادت کے بعد امام موسیٰ کاظم علیہ السلام منصبِ امامت پر فائز ہوئے تو اُس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ بنو عباس اپنی خلافت کی ابتداء میں پیدا ہونے والے داخلی اختلافات اور آپس کی جنگوں سے فراغت پا چکے تھے۔ بڑے بڑے سرکشوں اور باغیوں کو جن کی طرف سے اُن کی حکومت کو خطرات لاحق تھے، جیسے بنی الحسن، محمد ابن عبد اللہ ابن حسن، ابراہیم ابن عبد اللہ ابن حسن

اور امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی اولاد میں سے دیگر افراد کہ جن کا شمار بنو عباس کی حکومت کے سخت ترین مخالفین میں ہوتا تھا، ان سب کی سختی کے ساتھ سرکوبی کرنے کے بعد، انہیں خاموش کر دیا گیا تھا۔ بہت سے حکومت مخالف سرداروں اور سرکشوں کو بنو عباس نے قتل کرکے ان کی لاشوں کو ایک مخصوص اسٹور میں جمع کیا ہوا تھا جس کے بارے میں منصور عباسی کے مرنے بعد پتہ چلا کہ اُس نے بہت سی حکومت مخالف اہم شخصیات اور دیگر افراد کو قتل کرکے اِن کی لاشوں کو ایک جگہ جمع کر رکھا تھا، جہاں ان کے ڈھانچے اس وقت تک بھی موجود تھے۔

منصور عباسی نے اپنے دورِ خلافت میں بنی الحسن، بنی ہاشم اور یہاں تک کہ خود اپنے قریبی رشتہ داروں میں سے بہت ساری اہم اور مشہور شخصیات کو قتل کرایا تھا جن کے ڈھانچوں سے ایک اسٹور بھر چکا تھا۔ منصور عباسی جب اِن تمام افراد سے نمٹ چکا تو اب امام جعفر صادق علیہ السلام کی باری آئی اور اُس نے آپؑ کو بھی زہر دے کر شہید کر دیا۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی شہادت کے بعد بنو عباس کی سیاسی زندگی میں اب کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی تھی۔ کچھ اِس قسم کے حالات میں جب منصور عباسی اپنے اقتدار کے عروج پر تھا تو حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے دورِ امامت کا آغاز ہوا۔ جبکہ آپؑ ابھی نوجوان ہی تھے۔ تمام تر حفاظتی انتظامات کے ساتھ، یہاں تک کہ جو لوگ امام جعفر صادق علیہ السلام کے بعد یہ جاننا چاہتے تھے کہ وقت کے امامؑ کون ہیں اور انہیں کس سے رجوع کرنا چاہیے؟ تو وہ بڑی مشکل سے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام تک پہنچ پاتے تھے اور آپؑ بھی انہیں یہ نصیحت فرماتے تھے کہ خبردار ہوشیار رہنا اگر دشمن کو معلوم ہوگیا کہ تم لوگ مجھ سے ملتے ہو، مجھ سے رابطے میں ہو اور مجھ سے اسلامی تعلیمات حاصل کرتے ہو تو اس کا مطلب ’’الذّبح‘‘ یعنی قتل ہو جانا ہے۔ پس امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کچھ ایسے حالات میں منصبِ امامت پر فائز ہوئے اور اپنی جدّ و جہد کا آغاز فرمایا۔

اب اگر کوئی سوال کرے کہ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے منصبِ امامت پر فائز ہونے کے بعد، کس طرح جدّ و جہد کی، کونسا کارنامہ انجام دیا، کن لوگوں کو جمع کیا، کہاں کہاں تشریف لے گئے اور آپؑ کے اِس پینتیس (۳۵) سال دورِ امامت میں کون کونسے

واقعات رونما ہوئے، تو بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اِن سوالات کا میرے پاس کوئی واضح جواب نہیں ہے اور یہ چیز ایک ایسے شخص کے لیے انتہائی دکھ کی بات ہے جو صدرِ اسلام پر تحقیق کرتا ہو، کیونکہ اِس حوالے سے ہمارے پاس کوئی چیز موجود نہیں ہے، یعنی امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے ۳۵ سالہ دورِ امامت کے حالات و واقعات مرتّب اور مدوّن صورت میں موجود نہیں ہیں۔ میں یہ جو عرض کر رہا ہوں کہ اِس حوالے سے کوئی کتاب نہیں لکھی گئی اور نہ کسی نے کوئی تحقیق کی ہے، تو میرا مطلب یہ ہے کہ محققین کو یہ کام کرنا چاہیے کیونکہ بہت سی پراکندہ اور بکھری ہوئی باتیں اور واقعات موجود ہیں جنہیں جمع کرکے اِن سے بہت کچھ سیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے پینتیس (۳۵) سالہ دورِ امامت میں بنو عباس کے چار خلفاء نے حکومت کی ہے؛ اُن میں سے ایک منصور عباسی ہے جو امامؑ کے پہلے دس سالہ دورِ امامت میں برسرِاقتدار رہا۔ اُس کے بعد اس کا بیٹا مہدی عباسی خلیفہ بنا اور وہ بھی دس سال تک اقتدار پر بیٹھا رہا۔ مہدی کے بعد اُس کا بیٹا ہادی ایک سال تک منصبِ خلافت پر بیٹھا اور ہادی کے بعد ہارون عباسی تقریباً بارہ تیرہ سال تک برسرِ اقتدار رہا۔ ہارون عباسی سمیت اِن تمام خلفاء کے دورِ حکومت میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام لوگوں کو امامت کی طرف دعوت دیتے رہے اور اِن چاروں خلفاء میں سے ہر ایک کسی نہ کسی طریقے سے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو کوئی نہ کوئی تکلیف پہنچانے کی کوششیں بھی کرتا رہا ہے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی جلاء وطنی اور بار بار اسارت

منصور دوانیقی نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو بغداد طلب کیا؛ یعنی آپؑ کو اپنے گھر اور اپنے شہر سے جلاء وطن کرکے زبردستی بغداد طلب کیا۔ البتہ یہ باتیں جو میں عرض کر رہا ہوں یہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی زندگی میں پیش آنے والے بعض واقعات ہیں۔ جب انسان آپؑ کی حیاتِ طیّبہ کا بغور مطالعہ کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ کی زندگی اِس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ انہیں واقعات میں سے ایک یہ ہے کہ آپؑ کو زبردستی

مدینہ سے بغداد لایا گیا۔ بغداد لانے کے بعد ایک عرصہ تک آپؑ کو نظر بند رکھا گیا اور آپؑ پر بہت زیادہ سختی کی گئی۔ جیسا کہ روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ کو بالکل تنہا اور سخت پہرے میں رکھا گیا تھا۔ یہ آپؑ کی زندگی کا ایک واقعہ ہے، لیکن یہ سلسلہ کتنے عرصے تک جاری رہا؟ یہ معلوم نہیں ہے۔ بظاہر ایک اور مرتبہ پھر اسی منصور ہی کے دورِ خلافت میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو جلاء وطن کرکے عراق کے علاقے ''ابجر'' بھیجا گیا۔ راوی کہتا ہے کہ جب میں وہاں پر حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؑ نے اِن واقعات کی تفصیل مجھ سے بیان کی۔

مہدی عباسی کے دورِ خلافت میں بھی امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو کم از کم ایک مرتبہ مدینہ سے بغداد لایا گیا۔ راوی کہتا ہے کہ جس راستے سے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام بغداد جا رہے تھے یا آپؑ کو لے جایا جا رہا تھا ''فِی الْمَقْدَمَةِ الْاُوْلٰی'' یعنی جب پہلی مرتبہ آپؑ کو بغداد لے جایا جا رہا تھا (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ کو کئی مرتبہ بغداد لے جایا گیا اور میرے خیال میں مہدی عباس کے دورِ خلافت میں آپؑ کو دو یا تین مرتبہ مدینہ منورہ سے بغداد لے جایا گیا ہے) چنانچہ راوی کہتا ہے کہ میں امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے افسوس اور اپنی پریشانی کا اظہار کیا تو حضرتؑ نے فرمایا: ”تم پریشان مت ہو میں اِس سفر سے صحیح و سالم واپس لوٹ جاؤں گا اِس سفر میں یہ لوگ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔“ یہ ہے مہدی عباسی کا دورِ خلافت۔

ہادی عباسی کے دورِ خلافت میں بھی امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو بغداد لا کر شہید کرنے کی کوششیں کی گئی تھیں، لیکن اہل بیتِ رسولﷺ کے ساتھ بنو عباس کے اس رویّے پر ہادی عباسی کے دربار سے وابستہ ایک فقیہ کو دلی صدمہ ہوا اور اُس نے ہادی عباسی کو اپنے اِس منصوبے سے دستبردار ہونے پر آمادہ کیا۔ اسی طرح ہارون عباسی کے دورِ خلافت میں بھی حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو بغداد بلایا گیا۔ میرے خیال میں ہارون کے دورِ خلافت میں بھی آپؑ کو ایک سے زیادہ مرتبہ اپنے شہر مدینہ منورہ سے جدا کیا گیا، لیکن مسلم یہ ہے کہ حضرتؑ کو ایک بار یقینی طور پر مدینہ سے بغداد لاکر وہاں کے مختلف قید خانوں میں قید رکھا گیا یہاں تک کہ بغداد ہی میں ”سندی ابن شاہک“

کے قید خانے میں آپؑ کو (زہر دے کر) شہید کر دیا گیا۔

قارئین کرام! ذرا غور کیجیے کہ اِس چونتیس یا پینتیس سالہ دور میں آپؑ اپنے فرائضِ منصبی کو نبھاتے ہوئے مسلسل نظریۂ امامت کی تبلیغ میں مشغول دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اِس دوران آپؑ کے زمانے کے خلفاء نے متعدّد بار آپؑ کو شہید کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ منصور دوانیقی کا بیٹا مہدی عباسی جب پہلی مرتبہ خلیفہ بنا تو اس نے اپنے وزیر اور قریبی نگہبان شخص ''ربیع'' سے کہا کہ موسیٰ ابن جعفرؑ کا کام تمام کرنے کا کوئی منصوبہ بناؤ۔ کیونکہ اسے بخوبی معلوم تھا کہ اگر اس کے لیے کوئی خطرہ لاحق ہے تو وہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ہی کی طرف سے ہے۔ اسی طرح جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ ہادی عباسی نے بھی اپنی خلافت کے آغاز ہی میں حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو قتل کرنے کا ارادہ کیا، یہاں تک کہ اس نے اس حوالے سے ایک شعر بھی کہا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے: ”بنو ہاشم کے ساتھ نرمی سے پیش آنے کا زمانہ اب ختم ہو گیا ہے اب تو میں نے یہ مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ تم میں سے کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا اور موسیٰ ابن جعفرؑ وہ پہلے شخص ہیں جن کا کام سب سے پہلے تمام کروں گا۔“ ہادی کے بعد اس کا بیٹا ہارون عباسی بھی یہی کچھ کرنا چاہتا تھا اور اس نے ایسا کر بھی دکھایا اور وہ اِس قبیح جرم کا مرتکب بھی ہوا۔ اب آپ غور کیجیے کہ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے کس قسم کے حالات میں زندگی گزاری ہے۔

اِس کے علاوہ بھی امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی زندگی کے بہت سارے اذیت ناک چھوٹے بڑے واقعات موجود ہیں۔ یقیناً آپؑ کی زندگی کا ایک حصّہ روپوشی میں بھی گزرا ہے اور لوگوں کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ آپؑ کہاں ہیں؟ اِس دوران خلیفۂ وقت لوگوں کو بلا بلا کر ان سے پوچھتا رہتا تھا کہ کیا تم نے موسیٰ ابن جعفرؑ کو دیکھا ہے؟ اور وہ کہتے تھے: نہیں ہم نے تو انہیں نہیں دیکھا! یہاں تک کہ (جیسا کہ روایت میں ہے) حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے ایک شخص سے کہا کہ تجھ سے میرے بارے میں ضرور پوچھا جائے گا لیکن تم بالکل انکار کر دینا اور اُن سے کہنا کہ میں نے انہیں نہیں دیکھا ہے اور بعد میں ایسا ہی ہوا اور اس شخص کو زندان میں ڈالا گیا تاکہ اس سے یہ بات

اُگلوائی جا سکے کہ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کہاں پر روپوش ہیں۔

آپ اندازہ کیجئے کہ ایسی زندگی گزارنے والا شخص کون ہو سکتا ہے؟ ایک ایسا شخص جو صرف دینی احکام اور اسلامی معارف بیان کرتا ہو اور حکومتی معاملات سے کوئی سرو کار نہ رکھتا ہو، وہ کبھی ایسی مشکلات کا شکار نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے بارے میں، میں نے ایک روایت میں پڑھا ہے کہ آپؑ اپنی روپوشی کے دوران شام کے گاؤں، دیہاتوں میں زندگی گزار رہے تھے۔ ”وَقَعَ مُوسیٰ بْنُ جَعْفَرٍ بَعْضَ قُرَای الشَّامِ هَارِباً مُتَنَكِّراً فَوَقَعَ فِي غَارٍ“[1] یعنی روایات میں ہے کہ ایک مدّت تک امام موسیٰ کاظم علیہ السلام مدینہ میں موجود ہی نہیں تھے بلکہ شام کے دیہاتوں میں حکومتی جاسوس آپؑ کا پیچھا کر رہے تھے اور آپؑ اپنا لباس بدل کر اجنبی شخص کے بھیس میں ایک دیہات سے دوسرے دیہات چلے جاتے تھے۔ چلتے چلتے آخر ایک غار تک پہنچتے ہیں اور اُس میں داخل ہو جاتے ہیں، جہاں ایک نصرانی بھی موجود تھا۔ حضرتؑ اس شخص کے ساتھ اسلام کی حقانیت کے بارے میں بحث و مناظرہ کرتے ہیں؛ یعنی اِس حال میں بھی آپؑ الٰہی فریضے کی انجام دہی سے، یعنی حقیقت بیان کرنے سے غافل نہیں رہتے۔ آپؑ اس نصرانی کے ساتھ بحث و مباحثہ کرتے ہیں اور اسے مسلمان بناتے ہیں۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی زندگی، جُہد مسلسل کا نمونہ

آپ دیکھیں کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی زندگی کس قدر پُرجوش اور ولولہ انگیز واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ آج ہم یہاں بیٹھ کر یہ سوچتے ہیں کہ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ایک مظلوم، خاموش اور غیر جانبدار شخص تھے جو مدینہ میں خاموشی سے زندگی گزار رہے تھے اور حکومتی کارندوں نے ایسے ہی آپؑ کو گرفتار کرکے بغداد، کوفہ یا بصرہ میں قید کیا اور بعد میں زہر دے کر آپؑ کو شہید کر دیا گیا۔ جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے، بلکہ اس کے پیچھے ایک طویل جدّ و جہد اور تنظیمی اُمور کار فرما تھے۔ یہ ایک ایسی جنگ کا نتیجہ ہے کہ

---

[1] بحار الانوار، ج۴۸، ص۱۰۵

جس میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام پورے عالمِ اسلام میں موجود اپنے بہت سارے پیروکاروں اور چاہنے والوں کے ہمراہ حکومتِ وقت کے خلاف مشغولِ عمل تھے، یہی وجہ ہے کہ آپؑ کا وہ نافرمان بھتیجا جو دربارِ خلافت سے وابستہ تھا، ہارون عباسی کے ساتھ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے بارے میں بات کرتے ہوئے یوں اظہار کرتا ہے: ''خَلِیْفَتَانِ یَجِیْءُ اِلَیْہِمَا الْخَرَاجُ'' وہ کہتا ہے کہ اے ہارون! تم یہ خیال نہ کرنا کہ روئے زمین میں صرف تم ہی خلیفہ ہو اور لوگ صرف تمہیں خراج دیتے ہیں، بلکہ اِس وقت عالمِ اسلام میں دو خلیفہ ہیں؛ ایک تم ہو اور دوسرے موسیٰ کاظم علیہ السلام ہیں۔ جس طرح لوگ تمہیں خراج دیتے ہیں، ایسے ہی امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو بھی دیتے ہیں اور یہ ایک حقیقت بھی تھی۔ اگرچہ وہ تو یہ باتیں اپنی خباثت کی وجہ سے کر رہا تھا اور وہ اِن باتوں کے ذریعے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے خلاف خلیفہ کو بھڑکا رہا تھا، لیکن یہ اپنی جگہ ایک حقیقت بھی تھی کہ پورے عالمِ اسلام میں ایسے لوگ موجود تھے جن کے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے ساتھ تعلقات اور روابط تھے لیکن وہ اِس حد تک نہیں تھے کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کھلم کھلا کوئی مسلحانہ جدّ و جہد کر سکتے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کچھ ایسے حالات میں زندگی گزار رہے تھے یہاں تک کہ ہارون عباسی کی باری آ پہنچی، جب ہارون خلیفہ بن گیا تو اسلامی معاشرے میں کسی قسم کے اختلاف و انتشار کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ حکومتِ وقت کسی قسم کی پریشانی کے بغیر یک سوئی کے ساتھ اپنے معاملات چلانے میں مشغول تھی؛ لیکن اِس کے باوجود امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے حالاتِ زندگی اور آپؑ کی وسیع تبلیغات کا سلسلہ کچھ اِس طرح جاری تھا کہ اس سے نمٹنا حکمرانوں کے لیے کوئی آسان کام نہ تھا۔ چونکہ ہارون عباسی سیاست سے باخبر اور ایک انتہائی ہوشیار شخص تھا لہٰذا ہارون عباسی نے جو اقدامات کیے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ بذاتِ خود مکہ چلا گیا۔ مشہور مؤرّخ طبری کا خیال ہے کہ بظاہر تو ہارون عباسی حج کے لیے مکہ گیا تھا لیکن اُس کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ خود مخفی طور پر مدینہ جا کر حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو قریب سے دیکھے کہ آپؑ ہیں کیا؟ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ عظیم شخصیت جس کے بارے میں اتنی ساری باتیں کی جا رہی ہیں، جس کے اتنے سارے چاہنے والے موجود ہیں، یہاں تک کہ بغداد میں بھی ان سے محبت کرنے والے

بہت سارے افراد موجود ہیں، یہ کس قسم کی شخصیت کے مالک ہیں؟ کیا واقعاً ان سے ڈرنا چاہیے یا نہیں؟ لہٰذا وہ مدینہ آتا ہے اور امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے کئی ملاقاتیں کرتا ہے۔ یہ ملاقاتیں ناقابلِ تصوّر حدّ تک اہم اور حسّاس ہیں۔ ان میں سے ایک ملاقات مسجد الحرام میں ہوئی جس میں بظاہر اجنبی کے طور پر امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ہارون کے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں اور دونوں کے درمیان سخت باتوں کی تکرار ہوتی ہے جس میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام لوگوں کی موجودگی میں ہارون کی شان و شوکت خاک میں ملا دیتے ہیں۔ اُس وقت ہارون امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو نہیں پہچانتا تھا۔

اِس کے بعد ہارون عباسی مدینہ آتا ہے اور وہاں بھی امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے ساتھ کئی ملاقاتیں کرتا ہے یہ ملاقاتیں انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ میں اِس حدّ تک اشارہ کرنے پر اکتفاء کرتا ہوں تاکہ جو لوگ اہلِ مطالعہ اور اہلِ تحقیق ہیں اور اِس قسم کے مسائل میں دلچسپی رکھتے ہیں وہ اِن مسائل پر تحقیق کریں اور اِن کی بنیادوں تک پہنچ جائیں۔ مجملہ یہ کہ ہارون عباسی اِن ملاقاتوں میں وہ سارے کام کرتا ہے جو اپنے کسی مخالف شخص کو رام کرنے، نیز ایک حقیقی مجاہد کو زیر کرنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں، یعنی دھمکی، لالچ اور دھوکہ دہی وغیرہ۔

(۱۲_۰۴_۱۹۸۵ء)

ہارون عباسی خلیفہ بننے کے بعد جب پہلی مرتبہ مدینہ آیا تو اُس نے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو بڑی عزّت دی اور آپؑ کا احترام کیا۔ اِس سلسلے میں مامون کی زبانی ایک مشہور واقعہ بھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب ہم مدینہ گئے تو ایک دفعہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ایک گدھے پر سوار ہو کر اس محل میں پہنچے جہاں میرے والد ہارون نے قیام کر رکھا تھا اور جب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سواری سے اُترنے لگے تو ہارون نے قسم دے کر کہا: نہیں! آپؑ میری مسند تک اپنی سواری پر ہی تشریف لائیں۔ چنانچہ آپؑ اپنی سواری پر ہی ہارون کی مسند تک چلے آئے۔ اِس کے بعد ہارون انتہائی عزّت و احترام سے آپؑ کے ساتھ پیش آیا اور جب آپؑ جانے لگے تو ہم سے کہا کہ تم سب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی سواری کی رکاب تھامے رکھو۔ البتہ دلچسپ بات یہ ہے کہ مامون

اپنی اسی روایت میں کہتا ہے کہ میرا باپ ہارون جو سب کو پانچ ہزار اور دس ہزار دینار دیتا تھا اُس نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو صرف دو سو دینار دیئے، جبکہ اس سے پہلے ہارون نے امامؑ سے احوال پرسی کی تھی تو آپؑ نے فرمایا تھا کہ میری اولاد زیادہ ہے جس کی وجہ سے بے شمار مسائل ہیں اور میری مالی حالت بھی اچھی نہیں ہے۔

ہارون کے ساتھ امامؑ کی یہ گفتگو بھی بڑی دلچسپ ہے۔ میری نظر میں ہارون عباسی کے ساتھ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی اِس قسم کی گفتگو ہمارے لیے بالکل واضح اور قابلِ فہم ہے کہ کس طرح ایک انسان کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ ہارون جیسے شخص سے اپنے مسائل بیان کرے اور کہے کہ جی ہاں! ہماری مالی حالت خراب ہے، گزر بسر نہیں ہو رہا اور اِس قسم کی باتوں کا مطلب کسی سے اپنی حاجت طلب کرنا اور دستِ نیاز دراز کرنا نہیں، بلکہ جو شخص ایسے تجربات سے گزر چکا ہو، وہ بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ اِن باتوں کا مطلب کیا ہوتا ہے؟

میں جانتا ہوں کہ آپ میں سے بہت سارے لوگوں نے شاہی دورِ حکومت کے اُن مشکل اور کٹھن ایام میں اِس قسم کے بہت سے طریقے اپنائے ہوں گے، اس لیے یہ باتیں آپ لوگوں کے لیے بالکل قابلِ فہم ہیں۔ اب جب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ہارون عباسی سے اِس طرح کی باتیں کرتے ہیں تو اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہارون کو چاہیے کہ امامؑ سے یہ کہتے ہوئے کہ اگر آپؑ کو یہ پریشانیاں درپیش ہیں تو یہ لیجئے پچاس ہزار دینار آپؑ کی خدمت میں حاضر ہیں۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ صرف دو سو دینار امامؑ کی خدمت میں پیش کیے۔

مامون کہتا ہے کہ بعد میں، میں نے اپنے باپ ہارون سے پوچھا کہ آپ نے کیوں ایسا کیا؟ تو ہارون نے کہا: اگر میں انہیں اس سے زیادہ دینار دے دیتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ (اِن پیسوں سے) ہاتھوں میں تلواریں لیے بیٹھے خراسانیوں کو میرے خلاف منظّم کریں اور دو لاکھ لوگوں کو لے کر مجھ پر حملہ آور ہو جائیں۔ یہ تھے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے بارے میں ہارون کے تاثرات اور خیالات، جو اس کے اپنے اعتبار سے صحیح بھی تھے۔ اب بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ امامؑ

(ہارون کے سامنے) توریّہ اور تقیّہ سے کام لے رہے تھے؛ لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ یہ ایک حقیقت تھی کیونکہ جس دور میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ہارون عباسی کے خلاف جہاد میں مشغول تھے اگر اُس وقت آپؑ کے پاس پیسے ہوتے تو ایسے بہت سارے لوگ موجود تھے جو امامؑ کے ہمرکاب ہو کر (حکمرانوں کے خلاف) جنگ کے لیے تیار ہو جاتے۔ اِس کی بہت سی مثالیں ہمارے ائمہ معصومین علیہم السلام کے علاوہ، دوسرے حکومت مخالف عناصر کے یہاں بھی ملتی ہیں۔ جیسا کہ ہارون سے پہلے موسیٰ الہادی کے دورِ خلافت میں حسین ابن علی (شہیدِ فخؒ) اور دوسرے لوگوں کی تحریکیں اِس بات کی واضح علامت ہیں، تو آپ اندازہ لگایئے کہ اگر خود ائمہ معصومین علیہم السلام حکمرانوں کے خلاف قیام فرماتے تو اِس صورت میں کتنے لوگوں کو اپنے ارد گرد جمع کرتے، اس نکتے کو ہارون عباسی بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔

(۱۹۔۰۷۔۱۹۸۶ء)

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو فدک کی پیشکش اور امامؑ کا جواب

ہارون عباسی نے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے ساتھ اپنی اِن ملاقاتوں میں جن اُمور پر بات چیت کی، اُن میں سے ایک فدک کا معاملہ بھی ہے۔ وہ کہتا ہے: آپ بنو ہاشم ”فدک“ سے محروم ہو گئے اور آل علیؑ سے فدک کو چھین لیا گیا۔ اب میں فدک آپ لوگوں کو واپس لوٹانا چاہتا ہوں، آپؑ بتائیں کہ فدک کہاں تک ہے اور اِس کی حدود کیا ہیں؟ تاکہ میں اسے آپ لوگوں کو لوٹا سکوں۔

ظاہر ہے کہ یہ فدک کے نام پر ایک دھوکہ اور فریب تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اہلِ بیت علیہم السلام کا غصب شدہ حق انہیں واپس دلانے کے بہانے لوگوں کے ذہنوں میں اپنے بارے میں اچھے تاثرات پیدا کرے۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے ہارون سے فرمایا: بہت اچھا! اب جبکہ تم فدک ہمارے حوالے کرنا ہی چاہتے ہو تو میں اس کی حدود بیان کرتا ہوں۔ امامؑ نے فدک کی حدود بیان کرنا شروع کیں اور اُس زمانے کی پوری اسلامی مملکت کو فدک کی حدود میں شامل قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ فدک یہ ہے۔ یعنی کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اُس وقت ہمارا

دعویٰ صرف ایک ایسے باغ پر تھا جس میں چند ایک کھجور کے درخت لگے ہوئے تھے؟ یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ یاد رکھو! اُس وقت بھی ہمارا دعویٰ صرف ایک باغ اور کھجور کے چند درختوں پر نہیں تھا بلکہ مسئلہ پیغمبر اکرم ﷺ کی خلافت اور جانشینی کا تھا، مسئلہ اسلامی حکومت کی رہبری اور قیادت کا تھا۔ لیکن اُس دور کے لوگوں کے خیال میں جو چیز ہمیں خلافت سے محروم کر سکتی تھی، وہ فدک کو ہم سے چھین لینا تھا۔ اس لیے ہم اس کے مقابلے میں مزاحمت کرتے تھے اور آج بھی ہماری جس چیز کو تم نے غصب کر رکھا ہے وہ صرف باغِ فدک نہیں کہ جس کی کوئی اہمیت نہیں ہے، بلکہ وہ پوری اسلامی مملکت ہے۔ لہٰذا امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اسلامی مملکت کی حدود اربعہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ فدک یہ ہے۔ اب اگر تم فدک واپس لوٹانا چاہتے ہو تو اسے ہمارے حوالے کر دو۔ یعنی آپؑ واضح الفاظ میں اسلامی مملکت کی قیات و رہبری اور خلافت کا دعویٰ کرتے ہیں۔

(۱۲_۰۴_۱۹۸۵ء)

چنانچہ واقعہ کچھ یوں ہے کہ ہارون عباسی نے کہا: ”خُذْ فَدَکاً حَتَّی أَرُدَّهَا اِلَیْکَ“ آپؑ فدک کی سرحدیں معیّن فرمایئے تاکہ میں اسے آپؑ کو واپس لوٹا دوں۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے شروع میں تو اِس کام سے انکار کیا (لیکن جب ہارون نے اصرار کیا تو آپؑ نے فرمایا:) ”لَا آخُذُهَا اِلَّا بِحُدُوْدِهَا“؛ یعنی میں اِس کی اصلی حدود کے ساتھ ہی لوں گا۔ ہارون کہتا ہے: بہت اچھا! آپؑ حدود کو معیّن تو کیجئے۔ بہت ہی دلچسپ بات ہے کہ آپؑ فدک کی حدود بیان کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں: ”أَمَّا الْحَدُّ الْاَوَّلُ فَعَدَن“ اِس کی پہلی سرحد ”عَدَن“ ہے۔ اب یہ دونوں مدینہ یا بغداد میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں اور آپؑ نے فرمایا کہ اِس کی پہلی حدّ تو عدن ہے جو جزیرۃ العرب کی آخری سرحد ہے۔ ”فَتَغَیَّرَ وَجْهُ الرَّشِیْدِ“ یہ سن کر ہارون کے چہرے کا رنگ بدل گیا: ”وَ قَالَ أَیْهاً“ اور اُس نے کہا: تعجب ہے! ”قَالَ: وَ الْحَدُّ الثَّانِی سَمَرْقَنْد“ امامؑ نے فرمایا: اِس کی دوسری سرحد ”سمرقند“ ہے۔ ”فَارْبَدَّ وَجْهُهُ“ یہ سن کر ہارون کا چہرہ ماند پڑ گیا! ”وَ الْحَدُّ الثَّالِثُ اِفْرِیْقِیَة“ اِس کی تیسری سرحد افریقہ (تیونس) ہے۔ ”فَاسْوَدَّ وَجْهُهُ“ یہ سن کر ہارون کے چہرے کا رنگ سیاہ ہو گیا۔ ”وَ قَالَ هِیَه“ ہارون نے ہنستے ہوئے تعجب سے کہا: یہ کیسی باتیں کرتے ہیں! ”قَالَ وَ الرَّابِعُ سَیْفُ الْبَحَرِ

مِمَّا يَلِي الْجُزُرَ وَ اِرْمِيْنِيَة'' امامؑ نے فرمایا: اِس کی چوتھی سرحد ارمنستان تک پھیلے ہوئے سمندر کے ساحل اور جزائر ہیں (یعنی مڈیٹیرین سمندر ”Mediterranean Sea“ کے اطراف تک کا پھیلا ہوا تمام علاقہ)۔[1] ''قَالَ الرَّشِيْدُ: فَلَمْ يَبْقَ لَنَا شَيْءٌ'' یہاں ہارون نے کہا: اس طرح تو ہمارے لیے کوئی چیز باقی نہیں رہتی ہے۔ ''فَتَحَوَّلَ اِلَى مَجْلِسِي'' پھر تو آپؑ آیئے اور میری جگہ پر بیٹھ جایئے۔ ''قَالَ مُوْسَى قَدْ أَعْلَمْتُكَ أَنَّنِي اِنْ حَدَّدْتُهَا لَمْ تَرُدُّهَا'' امام عالی مقامؑ نے فرمایا: میں نے تو تم سے کہا تھا کہ اگر میں اِس (فدک) کی سرحدیں معیّن کروں گا تو تم اسے واپس نہیں لوٹاؤ گے۔ ''فَعِنْدَ ذٰلِكَ عَزَمَ عَلَى قَتْلِهِ''[2] اِس کے بعد ہارون نے امامؑ کے قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

(۱۹۔۰۷۔۱۹۸۶ء)

مدینہ کے اِس سفر کے دوران جب ہارون عباسی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضۂ اطہر میں داخل ہوا اور اپنے آس پاس موجود لوگوں کے سامنے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنی رشتہ داری ظاہر کرنے کی خاطر کھڑے ہو کر اس نے یوں سلام کیا: ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَابْنَ عَمّ'' یعنی ہارون ''يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ'' نہیں کہتا، بلکہ کہتا ہے: اے میرے چچا کے بیٹے! تجھ پر میرا سلام ہو۔ یعنی ہارون لوگوں کے سامنے یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا کا بیٹا ہے۔ اتنے میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام بغیر کسی توقّف کے آگے بڑھتے ہیں اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ضریح مبارک کے سامنے کھڑے ہو کر کہتے ہیں: ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا اَبَاً'' اے بابا جان! آپؐ پر میرا سلام ہو؛ یعنی اگر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تیرے چچا زاد ہیں تو میرے بابا ہیں۔ یوں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے تمام لوگوں کے سامنے ہارون عباسی کی ظاہری شان و شوکت کو خاک میں ملا دیا۔

جو لوگ ہارون عباسی کے حواری تھے انہیں بھی اِس بات کا بخوبی احساس ہو گیا تھا

---

[1] ۔ ”Mediterranean Sea“ وہ سمندر ہے جو ”اوقیانوس اطلس“ سے متصل ہے اور یہ سمند شمال سے یورپ، جنوب سے افریقہ اور مشرق سے ایشیاء کے تین برِّ اعظموں کو آپس میں ملاتا ہے اور اسے ”بحرِ روم“ اور ”بحرابیض“ بھی کہتے ہیں۔

[2] ۔ بحار الانوار، ج۴۸، ص۱۴۴

کہ اگر حکومتی مشینری کو کسی شخص کی طرف سے کوئی خطرہ لاحق ہے تو وہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ہی ہیں۔ ہارون کے اِس سفر مدینہ کے دوران حکومتی مشینری سے وابستہ ایک شخص وہاں کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا کہ امامؑ اشراف اور اہم شخصیات کی طرح کسی اعلیٰ نسل کے قیمتی گھوڑے پر سوار ہونے کے بجائے، انتہائی سادگی کے ساتھ ایک گدھے پر سوار ہو کر تشریف لاتے ہیں اور لوگ آپؑ کے احترام میں راستے سے ہٹ جاتے ہیں۔ اُس شخص نے پوچھا کہ یہ کون تھا کہ جس کے آنے پر تمام لوگ اُس کے سامنے احترام سے جھک گئے، یہاں تک کہ خلیفہ کے ارد گرد گھومنے والوں نے بھی انہیں جگہ دی ہے؟ اس شخص سے کہا گیا کہ یہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ہیں۔ امامؑ کا نام سنتے ہی وہ کہنے لگا: افسوس ہو اِس قوم (یعنی بنو عباس) کی حماقت اور بےوقوفی پر! جو شخص اِن کے مرنے کی تمنّا کرتا ہے، جو اِن کی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجانا چاہتا ہے، یہ لوگ اس شخص کا اتنا احترام کر رہے ہیں؟

پس سب کو معلوم تھا کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا وجود، حکومتی مشینری کے لیے خطرے کی علامت ہے کیونکہ آپؑ ایک ایسے رہبر اور قائد تھے، جو علم و معرفت، تقویٰ و پرہیزگاری اور عبودیت و بندگیِ الٰہی میں اِس قدر مشہور تھے کہ جو لوگ آپؑ کو جانتے تھے وہ آپؑ کی اِن تمام اوصاف سے بھی باخبر تھے اور پورے عالمِ اسلام میں آپؑ کے دوستوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ آپؑ اتنے شجاع اور بہادر تھے کہ کسی بھی ظالم و جابر کی شان و شوکت سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؑ ہارون عباسی کی ظاہری شان و شوکت کو خاطر میں لائے بغیر بےدھڑک حق بات کہہ دیتے ہیں۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی مظلومانہ شہادت

ایک ایسی مجاہد و مبارز شخصیت کا وجود، جس کا رابطہ اللہ سے ہو، جسے اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل بھروسہ ہو اور پورے عالمِ اسلام میں جس کے چاہنے والوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہو، جو معاشرے میں حقیقی معنوں میں ایک اسلامی حکومت قائم کرنے اور اسلامی

نظام نافذ کرنے کے حوالے سے ایک منصوبہ بھی رکھتا ہو، یقیناً ایسے شخص کا وجود ہارون کی حکومت کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ ہو سکتا تھا۔ لہٰذا ہارون عباسی اپنے سامنے سے اِس بڑی رکاوٹ اور خطرے کو ہٹانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ چونکہ ہارون ایک چالاک سیاست دان اور سمجھ دار آدمی تھا اس لیے اُس نے ایک دم سے یہ کام انجام نہیں دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طریقے سے بالواسطہ اِس کام کو انجام دیا جائے۔ لہٰذا اُس نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو قید کرنے کا منصوبہ بنایا تاکہ قید خانے میں آپؑ کے ساتھ کوئی ساز باز کر سکے اور آپؑ کو کوئی عہدہ دے کر یا ڈرا دھمکا کر اپنے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر سکے۔

چنانچہ اُس نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو مدینے میں اِس طریقے سے گرفتار کی جائے کہ اہلِ مدینہ کو پتا بھی نہ چل سکے کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے ساتھ کیا معاملہ ہوا ہے۔ لہٰذا مدینے میں دو سواریاں اور محمل تیار کیے گئے اور ان میں سے ایک کو عراق اور دوسری کو شام کی طرف لے جایا گیا، تاکہ لوگوں کو یہ پتا نہ چل سکے کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو کہاں لے جایا گیا ہے؟ امامؑ کو گرفتار کرکے دارالحکومت بغداد لایا گیا اور وہاں پر ایک طویل عرصے تک قید خانے میں رکھا گیا۔ البتہ یہ احتمال ہے لیکن یہ حتمی نہیں ہے کہ آپؑ کو ایک مرتبہ قید سے رہا کرکے دوبارہ گرفتار کر لیا گیا ہو۔ لیکن یہ بات مسلم ہے کہ آخری مرتبہ آپؑ کو اسی مقصد کے تحت گرفتار کیا گیا تاکہ آپؑ کو قید خانے ہی میں شہید کر دیا جائے اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔

البتہ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی شخصیت قید خانے میں بھی ایک ایسی مشعل کی مانند تھی جو اپنے تمام اطراف کو روشن کرتی ہے۔ آپ توجہ کیجئے سچی بات تو یہ ہے کہ اسلامی فکری تحریک اور قرآن کی نظر میں جہاد کبھی نہیں رُکتا۔ یہاں تک کہ مشکل ترین حالات میں بھی وہ جاری و ساری رہتا ہے۔۔۔ یہ وہی کام ہے جسے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے انجام دیا۔ اِس سلسلے میں بے شمار واقعات اور احادیث و روایات موجود ہیں۔ انہیں روایات میں سے ایک انتہائی دلچسپ روایت یہ ہے جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ مشہور زندان بان ”سندیؔ ابن شاہک“ ایک انتہائی طاقتور، سنگدل، بنو عباس کا پالتو اور حکومتی و خلافتی مشینری

کا وفادار شخص تھا۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اسی شخص کے قید خانے میں تھے جس نے آپؑ کو اپنے گھر کے زیرِ زمین ایک انتہائی تنگ و تاریک تہہ خانے میں قید کر رکھا تھا۔ سندیؔ ابن شاہک کے اہلِ خانہ بعض اوقات کسی سوارخ سے قید خانے کا جائزہ لیتے تھے۔ جس کی وجہ سے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے طرزِ زندگی نے انہیں حیرت زدہ اور متاثر کر دیا تھا اور ان لوگوں کے دلوں میں اہلِ بیتِ اطہار علیہم السلام کی محبت پیدا ہو گئی تھی۔ اسی سندیؔ ابن شاہک کی اولاد میں سے "کشاجم" نامی شخص کا شمار تشیع کے بزرگوں میں ہوتا ہے جو شاید ایک یا دو نسل کے بعد تھا۔ تمام تاریخ نویسوں نے لکھا ہے کہ کشاجم اپنے زمانے کے مشہور اُدباء، شعراء اور اہلِ تشیع کے بزرگان میں سے تھا؛ یعنی اُس کا نام کشاجم السندی تھا اور وہ سندیؔ ابن شاہک کی نسل سے تھا۔

یہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا طرزِ زندگی ہے جسے آپؑ نے قید خانے میں اختیار کر رکھا تھا۔ البتہ اِس دوران بھی حکمران آپؑ کو ڈراتے، دھمکاتے اور طمع و لالچ دینے کی مسلسل کوششیں کرتے رہے، وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح امامؑ کو راضی کر لیں؛ لیکن آپؑ خوفِ الٰہی، لطفِ الٰہی اور اپنے پروردگار کی ذاتِ بابرکت پر بھروسے کے ذریعے حکمرانوں کے مقابلے میں پوری قاطعیت سے ڈٹے رہے اور یہی آپؑ کی ثابت قدمی ہے جس کی وجہ سے آج دینِ اسلام اور قرآن محفوظ ہیں۔ یہ یاد رکھیں کہ ظلم و جَور اور فسق و فجور کے مقابلے میں ہمارے ائمہ معصومین علیہم السلام کی اسی استقامت کے نتیجے میں حقیقی اسلام آج تک باقی ہے۔ آج اگر عالمِ اسلام یا عالمِ انسانیت کے سامنے اسلام، قرآن اور سنتِ پیغمبرؐ نام کی کوئی چیز کتابوں میں باقی ہے چاہے وہ اہلِ تشیع کی کتابوں میں ہو یا اہلِ سنت کی کتابوں میں، تو یہ سب کچھ ائمہ معصومین علیہم السلام کی ڈھائی سو سالہ (۲۵۰) انتھک جدّ و جہد اور سخت جہاد ہی کے مرہونِ منت ہے۔ ورنہ بنو اُمیہ اور بنو عباس دور کے ضمیر فروش اہلِ قلم اور خطباء نے اسلامی تعلیمات میں اتنے انحرافات پیدا کر دیئے تھے کہ ایک دو صدیوں کے بعد اسلام کا نام و نشان بھی باقی رہنا مشکل تھا۔ کوئی قرآن باقی نہیں رہتا اور اگر باقی بچتا تو بھی وہ صحیح و سالم نہیں ہوتا بلکہ تحریف شدہ ہوتا۔

تاریخ اسلام کے یہ لہراتے پرچم، یہ نور افشاں مشعلیں، یہ اُونچے اور روشن منارے کہ جن کے صبر و استقامت نے اسلام کی روشنی کو اِس طرح دنیا میں پھیلایا کہ جو لوگ باطل کے اندھیرے میں حقائق کو مسخ کرنا چاہتے تھے، جو معاشرے کو تاریکی میں ڈبونا چاہتے تھے وہ اپنے اِس ہدف میں مکمل طور پر ناکام رہے۔ ائمہ معصومین علیہم السلام کے شاگردوں میں صرف شیعہ ہی نہیں تھے بلکہ تمام اسلامی فرقوں کے لوگ شامل تھے؛ یعنی ائمہ اطہار علیہم السلام کے شاگردوں میں بہت سے ایسے لوگ بھی موجود تھے جو شیعہ عقائد کے حامل نہیں تھے، وہ نظریۂ امامت کو نہیں مانتے تھے لیکن وہ ائمہ معصومین علیہم السلام سے تفسیر، قرآن، حدیث اور سنتِ پیغمبرؐ کا درس لیتے تھے۔ لہٰذا ائمہ اطہار علیہم السلام کے صبر و استقامت نے آج تک اسلام کو زندہ رکھا ہے۔

آخر کار حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو قید خانے میں زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔ ائمہ اطہار علیہم السلام کی تاریخ کے تلخ ترین واقعات میں سے ایک یہی امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی شہادت ہے۔ البتہ حکمران اِس واقعے پر بھی پردہ ڈالنا چاہتے تھے۔ اس لیے آپؑ کی زندگی کے آخری دنوں میں سندی ابن شاہک بغداد کے بعض مشہور سرداروں اور بزرگوں کو آپؑ کی خدمت میں بلا کر لاتا ہے اور کہتا ہے: آپ لوگ دیکھ لیں کہ موسیٰ ابن جعفرؑ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں، انہیں کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہے۔ اِس موقع پر آپؑ بغداد کے اکابرین سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں: ”جی ہاں! لیکن آپ لوگوں کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ انہوں نے مجھے زہر دے دیا ہے۔“ اِن ظالموں نے امامؑ کو کھجور کے چند دانے کھلا کر اس حالت میں زہر دے کر شہید کیا جب آپؑ کے ہاتھ پاؤں اور گردن طوق و زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے اور اسی حالت میں امامِ مظلوم اور بزرگوارؑ کی روحِ پُرفتوح نے قید خانے سے ملکوتِ اعلیٰ کی طرف پرواز کی۔

لیکن اِس کے باوجود بھی ظالم حکمران آپؑ سے ڈرتے تھے؛ آپؑ کے جنازے سے ڈرتے تھے، آپؑ کی قبرِ مطہر سے خائف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب قید خانے سے آپؑ کا جنازہ باہر نکالا جا رہا تھا تو وہ لوگ یہ اعلان کرتے جا رہے تھے کہ یہ اُس شخص کا جنازہ ہے جس نے حکومتِ وقت کے خلاف بغاوت کی تھی۔ یہ سب کچھ اِس لیے کہہ رہے تھے تاکہ

آپؑ کی شخصیت اور کردار کو لوگوں کی نظروں کے سامنے داغدار کیا جا سکے۔ اُس وقت حکومتی مشینری کے لیے حالات اِس قدر مخدوش ہو چکے تھے کہ حکومتی عہدوں پر فائز افراد میں سے ایک شخص سلیمان ابن جعفر (سلیمان ابن جعفر ابن منصور عباسی، یعنی ہارون عباسی کا چچازاد بھائی جس کا شمار بنو عباس کے اہم افراد میں ہوتا تھا) نے جب دیکھا کہ اِس صورت میں تو اُن کی مشکلات میں اضافہ ہو سکتا ہے تو اُس نے ایک نئے منصوبے کو اپنے ذمے لیا اور اُس نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے جسدِ مطہر کو ایک قیمتی کفن پہنایا اور جنازے کو انتہائی عزّت و احترام کے ساتھ بغداد کے نزدیک قریش کے قبرستان میں اُس مقام پر، جسے ہم آج ”کاظمین“ کے نام سے جانتے ہیں، دفنا دیا اور یوں حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی جدّ و جہد اور جہاد سے بھرپور زندگی اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔

(۱۲ـ۰۴ـ۱۹۸۵ء)

امام رضا
علیه السلام

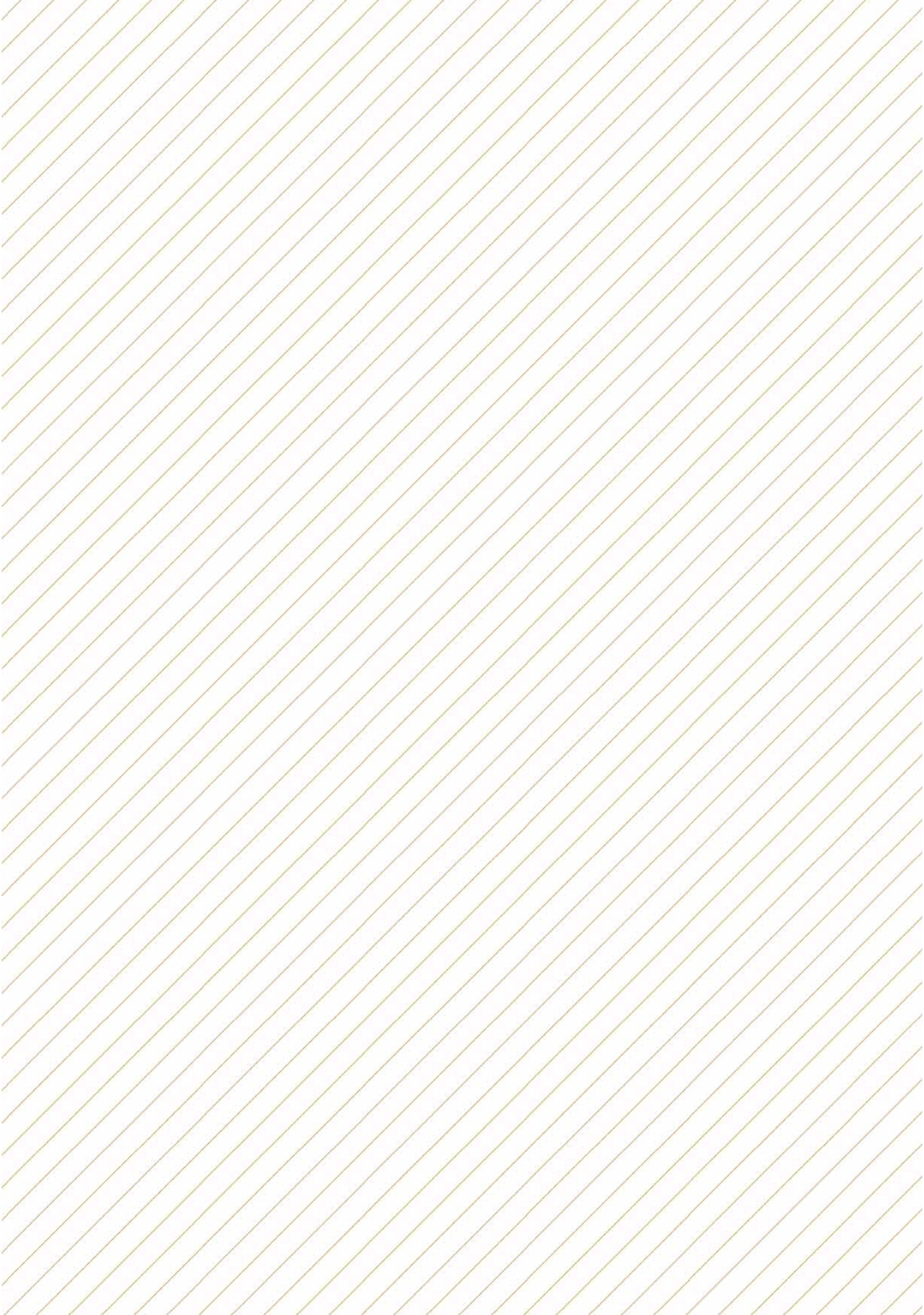

امام علی ابن موسیٰ الرضا علیہ السلام کی امامت کا آغاز

جب حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو ہارون عباسی نے سالوں قید میں رکھنے کے بعد زہر دے کر شہید کر دیا تو عباسی سلطنت کے وسیع قلمرو میں مکمل طور پر ایک جمود کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس تاریک اور ظلمت کے زمانے میں امام علی ابن موسیٰ الرضا علیہما السلام کے اصحاب میں سے ایک کے بقول: ''ہارون کی تلوار سے خون ٹپک رہا تھا''[1] ہمارے معصوم اور بزرگوار امام علی ابن موسیٰ الرضا علیہما السلام کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ آپؑ نے تشیع کے اس پودے کو طوفانی حوادث کی گزند سے محفوظ رکھا اور اپنے پدرِ بزرگوارؑ کے اصحاب اور ساتھیوں کو تتّر بتّر اور نااُمید ہونے سے بچایا اور اپنی جان کو جو مکتبِ تشیع کے لیے اصلی ستون اور روح کی حیثیت رکھتی تھی، تقیہ کے حیرت انگیز اصول پر عمل کر کے محفوظ رکھا اور مقتدرترین عباسی خلفاء کے مکمل تسلط اور حاکمیت کے زمانے میں بھی امامت کی تحریک کو قائم اور جاری رکھا۔

تاریخ امام علی ابن موسیٰ الرضا علیہما السلام کی زندگی کے ان واقعات کو بیان کرنے سے قاصر ہے جو دس سال ہارون عباسی کے عہد میں اور پانچ سال اس کی خلافت کے بعد خراسان اور بغداد کی خانہ جنگی کے دوران رونما ہوئے۔ لیکن تدبّر اور عقلی دلائل سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اس زمانے میں بھی امام علی رضا علیہ السلام نے اپنے آباء و اجداد علیہم السلام کی اس طویل المدّت تحریک اور جدّ و جہد کو جو کربلا اور اس کے بعد ہر عہد میں جاری و ساری رہی، اسی سمت میں اور انہیں مقاصد کے حصول کے لیے جاری رکھا۔

۱۹۸ ہجری قمری میں جب مامون اپنے بھائی امین کے خلاف حصولِ اقتدار کی جنگ سے فارغ ہوا اور بغیر کسی مخالفت کے خلافت کو اپنی مٹھی میں لے لیا تو اس کا اگلا اہم ہدف علویوں اور شیعہ تحریکوں سے نمٹنا قرار پایا اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس نے سابقہ خلفاء کے تجربات کو اپنے سامنے رکھا، وہ تجربے جو اس نے اس

---

[1] قال محمد بن سنان: ''وسیف ھارون یقطر الدّم'' (الکافی، ج۸، ص۲۵۷)

تحریک کی دن بدن بڑھتی ہوئی طاقت، اس کے پھیلاؤ اور گہرے اثرات سے حاصل کیے تھے اور خلافت اپنی طاقت کے باوجود اس کو نابود تو کیا حتی کہ اس تحریک کو محدود کرنے اور رکوانے میں بھی ناکام رہی تھی۔ وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ ہارون اپنی شان و شوکت، رُعب و وحشت اور امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو کافی مدت تک زندان میں قید و بند کی حالت میں رکھنے اور بالآخر حضرتؑ کو زہر دینے کے باوجود بھی ان تحریکوں اور تشیع کی سیاسی، تبلیغی، فکری اور مسلّحانہ جدّ و جہد کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا اور اب ایسی حالت میں جبکہ مامون اپنے اجداد کی طرح اقتدار کا مالک بھی نہ تھا نیز اس کے علاوہ بنی عباس کی خانہ جنگی کی وجہ سے عباسی حکومت بڑی مشکلات میں گھری ہوئی تھی، ایسی صورت حال میں ضروری تھا کہ وہ علویوں کی اس تحریک کے خطرے کی طرف پہلے سے کہیں زیادہ توجہ دے۔

شاید مامون شیعوں کے بڑھتے ہوئے اس خطرے کو محسوس کرنے میں حق بجانب بھی تھا کیونکہ گمان کیا جا سکتا تھا کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی شہادت کے بعد پندرہ سالہ وقفے اور خاص طور پر پانچ سالہ خانہ جنگی کے دوران شیعہ تحریک کو علوی حکومت قائم کرنے کے بیشتر مواقع فراہم ہوئے تھے۔

مامون نے اس خطرے کو اپنی دور اندیشی سے بھانپ لیا اور اس کے مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس تحریک کی اہمیت اور مامون کی دور اندیشی کا نتیجہ یہ نکلا کہ امام علی رضا علیہ السلام کو مدینہ سے خراسان آنے کی دعوت اور آپؑ کو ولی عہدی قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اس واقعے کی مثال اپنی نوعیت کے لحاظ سے امامت کی پوری تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔

امام رضا علیہ السلام کی ولایتِ عہدی اور مامون کے مقاصد

اب مناسب ہو گا کہ ہم یہاں پر ولی عہدی کے واقعات کا مختصر تجزیہ کریں۔ اس واقعے میں امام علی ابن موسیٰ الرضا علیہما السلام کو ایک بہت بڑے تاریخی حادثے سے دوچار ہونا پڑا ایک ایسی مخفی اور پوشیدہ سیاسی کشمکش کے دوران یہ واقعہ پیش آیا کہ اس میں فتح یا شکست

تشیع کی تقدیر بدل سکتی تھی۔

اس جنگ میں مدِّمقابل مامون تھا جس کو ہر طرح کے اختیارات اور ساز و سامان حاصل تھا اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ میدان میں اُترا تھا۔ مامون نے اپنی پوری ہوشیاری، منصوبہ بندی اور بےمثال فہم و شعور کے ساتھ ایک ایسے میدان میں قدم رکھا تھا کہ اگر وہ اس میں کامیاب ہو جاتا اور جس طرح اس نے اپنا پروگرام بنایا تھا اس پر عمل پیرا ہوتا تو یقیناً اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا جسے ہجرت کے چالیس سال بعد، یعنی حضرت امیر المومنین علی ابن ابیطالب علیہما السلام کی شہادت سے لے کر اب تک تمام اُموی یا عباسی خلفاء اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود حاصل نہیں کر سکے تھے؛ یعنی ممکن تھا کہ وہ تشیع کے درخت کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکتا اور اس تحریک کو جو طاغوتی خلفاء اور ان کے گماشتوں کی آنکھوں میں ہمیشہ کانٹوں کی طرح چبھتی رہتی تھی مکمل طور پر ختم کر دیتا۔

لیکن امام علی رضا علیہ السلام الٰہی تدبیر کے بل بوتے پر مامون پر غالب آئے اور اس کو اسی سیاسی جنگ کے میدان میں جو خود اس کا تیار کردہ تھا مکمل طور پر شکست دے دی اور نہ صرف یہ کہ تشیع کو کمزور یا ختم ہونے سے بچایا بلکہ سال ۲۰۱ ہجری قمری، یعنی آپؑ کی ولی عہدی کے سال کو تشیع کی تاریخ میں سب سے بابرکت سال شمار کیا جاتا ہے۔ علوی تحریک میں نئی جان آگئی اور یہ سب کچھ صرف امام علی رضا علیہ السلام کی الٰہی تدبیر اور حکیمانہ طرزِ عمل کی برکت سے حاصل ہوا اور تشیع اس آزمائش سے سرخرو ہو کر نکلی۔

اب ہم یہاں پر تاریخ کے اس حیران کن واقعے پر مزید روشنی ڈالنے کے لیے مامون کی چال بازیوں اور امام علی رضا علیہ السلام کی حکمت عملیوں اور تدابیر کا مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں۔ مامون کے امام علی رضا علیہ السلام کو خراسان آنے کی دعوت دینے میں درج ذیل چند اہم مقاصد پوشیدہ تھے:

۱۔ پہلا اور اہم مقصد شیعوں کی زبردست اور پُرجوش انقلابی تحریک کو ایک معمولی اور بےخطر سیاسی تحریک کی کیفیت میں تبدیل کرنا تھا۔ جس طرح میں نے پہلے بھی

عرض کیا کہ شیعہ تقیہ کے اصول پر عمل کرکے اپنی اس انتھک اور کبھی نہ ختم ہونے والی تحریک کو آگے بڑھا رہے تھے جس میں دو انتہائی اہم خصوصیات شامل تھیں جو خلافت کو کمزور کرنے میں بہت زیادہ مؤثر ثابت ہوئیں تھیں، ان خصوصیات میں ایک مظلومیت اور دوسری قداست اور معصومیت تھی۔

شیعہ ان دو مؤثرترین خصوصیات کا سہارا لے کر تشیع کی آئیڈیالوجی کو جس کی بنیاد ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی مخصوص اسلامی تفسیر اور تشریح سے عبارت تھی لوگوں کے دلوں اور ذہنوں میں راسخ کرتے رہے اور جو شخص بھی اس میں تھوڑی بہت دلچسپی کا اظہار کرتا شیعہ اس کو اِس طرزِ فکر کی طرف مائل کرکے اپنا گرویدہ اور مومن بنا لیتے تھے اور اس طرح تشیع کا دائرۂ اسلامی دنیا میں روز بروز وسیع تر ہوتا چلا جا رہا تھا اور یہی مظلومت اور قداست تھی جو شیعی طرزِ فکر کی پشت پناہی میں ہر جگہ اور ہر دور میں مسلّحانہ اور انقلابی تحریک کی صورت میں نظامِ خلافت کے خلاف منظّم صف آرائی کرتی رہی تھی۔

مامون چاہتا تھا کہ ایک ہی مرتبہ اس پوشیدہ اور تقیہ کی کیفیت کو اس تحریک کے بانی سے چھین لے اور امامؑ کو اس انقلابی میدان سے سیاسی میدان میں لے آئے اور اپنی اس چال سے مقصدِ تشیع اور اس پوشیدہ و مخفی عمل کو جو روز بروز ترقی کی منازل طے کر رہا تھا، بالکل صفر درجے تک پہنچا دے۔ اس کے علاوہ مامون اس چال کے ذریعے ان دو مؤثرترین خصوصیات کو بھی پیروانِ حضرت علی علیہ السلام سے چھین لینا چاہتا تھا اور یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ گروہ جس کا پیشوا دربارِ خلافت میں ایک ممتاز شخصیت کا مالک اور مطلق العنان بادشاہِ وقت کا ولی عہد اور تمام مملکت کے اُمور پر قابض ہو وہ نہ تو مظلوم ہے اور نہ ہی مقدّس و معصوم۔

ممکن تھا یہ منصوبہ تشیع کے اس اساسی طرزِ فکر کو بھی دوسرے گروہوں کے عقیدوں اور افکار کی صورت میں تبدیل کر دیتا جس کے ماننے والے اس وقت موجود تھے، یعنی تشیع کے طرزِ فکر کو خلافت کی مخالفت سے باز رکھے اگرچہ اس طرزِ فکر کو ارکانِ حکومت اور ان کے حامی پسند نہیں کرتے تھے لیکن عوام اور بالخصوص مستضعفین

اس نظریے کے طرفدار تھے۔

۲۔ دوسرا مقصد تشیع کے اس دعویٰ کو جس کے مطابق بنو اُمیہ اور بنو عباس کی خلافتیں غاصبانہ اور ناجائز تھیں، باطل کر کے ان خلافتوں کو جائز قرار دلوانا تھا۔ مامون اپنی اس مکارانہ چال کے ذریعے تمام شیعوں پر یہ بات ثابت کر دینا چاہتا تھا کہ شیعوں کے بنیادی اصول پر مبنی یہ دعویٰ جس کی رُو سے اُموی اور عباسی حکومتیں غاصبانہ اور ناجائز تھیں، ایک بےبنیاد بات ہے اور صرف بُغض و کینے کی وجہ سے یہ نظریہ گھڑا گیا ہے کیونکہ اگر گذشتہ خلافتیں ناجائز اور ظالمانہ تھیں تو مامون کی خلافت بھی تو گذشتہ خلافتوں کا تسلسل ہے لہٰذا وہ بھی ناجائز اور غاصبانہ ہے، پھر امام علی رضاؑ نے مامون کی ولی عہدی کیوں قبول کی ہے؟ اب چونکہ حضرت امام علی رضاؑ کے اس خلافت کے ارکان میں شامل ہونے اور مامون کی جانشینی قبول کرنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انہوں نے مامون کی خلافت کو قانونی اور جائز سمجھا ہے لہٰذا دوسرے خلفاء بھی قانونی اور جائز تھے اور شیعوں کا دعویٰ باطل تھا۔ اپنی اس چال سے مامون نہ صرف حضرت امام علی رضاؑ کے ذریعے اپنی حکومت اور گذشتہ تمام حکومتوں کے جائز ہونے کا اعتراف کروانا چاہتا تھا بلکہ شیعوں کے بنیادی عقائد میں سے ایک اہم عقیدے یعنی یہ کہ گذشتہ حکومتیں ظلم کی بنیاد پر قائم ہوئیں تھیں، کو باطل قرار دینا چاہتا تھا۔

دوسری طرف امام علی رضاؑ کی ولی عہدی سے شیعوں کا یہ دعویٰ باطل ہو جاتا کہ ائمہ اطہارؑ زاہد، پارسا اور دنیا سے لاتعلق ہیں بلکہ یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ یہ حضراتؑ صرف اس صورت میں دنیا سے بےرغبتی کا اظہار کرتے تھے جب دُنیوی نعمتیں ان کی دسترس سے باہر ہوتی تھیں، لیکن اب جب کہ دُنیاوی نعمتوں کے دروازے ان پر کھل گئے ہیں تو وہ ان کی طرف بھاگے چلے آئے اور دوسرے لوگوں کی طرح لذّتوں سے بہرہ مند ہونے لگے ہیں۔

۳۔ تیسرا مقصد یہ تھا کہ مامون اپنے اس عمل کے ذریعے اماؑم کو جو ہمیشہ ایک حریف اور مبارز کی مرکزی حیثیت رکھتے تھے، اپنے اقتدار کے کنٹرول میں لے آنا

اور ان کے علاوہ تمام علوی سرداروں، مجاہدوں اور انقلابیوں کو بھی اپنے قابو میں کر لینا چاہتا تھا اور یہ وہ کامیابی تھی جو آج تک اُموی یا عباسی خلفاء میں سے کسی کو بھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔

۴۔ مامون کا چوتھا مقصد یہ تھا کہ چونکہ لوگوں کے درمیان امام رضا علیہ السلام کی شخصیت کو ایک عوامی عنصر اور اُمیدوں کا مرکز، سوالوں اور شکایتوں کے مرجع و محور ہونے کی حیثیت حاصل تھی، اس لیے مامون امام عالی مقامؑ کو حکومتی کارندوں کے محاصرے میں محدود کرنا چاہتا تھا تاکہ اس عمل سے آہستہ آہستہ اس عوامی عنصر کا خاتمہ کرکے آپؑ اور عوام کے درمیان جو محبت، عطوفت اور عقیدت کا رشتہ برقرار ہے، اسے ختم کر سکے۔

۵۔ پانچواں مقصد یہ تھا کہ مامون ولی عہدی کے ذریعے اپنے لیے معنوی مقام اور آبرومندانہ حیثیت حاصل کر لینا چاہتا تھا، قدرتی بات تھی کہ اس نے اس دور میں ایک ایسے شخص کا اپنی ولی عہدی کے لیے انتخاب کیا تھا جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد میں سے تھا، مقدّس اور روحانی تھا اور مامون نے ان کے مقابلے میں اپنے بھائیوں اور بیٹوں کو بھی اس افتخار سے محروم کر دیا تھا، سب لوگ اس کی تعریف اور تمجید کرتے، کیونکہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ دیندار لوگ جب دُنیاداروں کی پشت پناہی کرنے لگتے ہیں تو دینداروں کی عزّت میں کمی آ جاتی ہے اور دُنیاداروں کی عزّت بڑھ جاتی ہے۔

۶۔ چھٹا مقصد یہ تھا کہ مامون کے خیال میں امام علی رضا علیہ السلام ولی عہدی قبول کرنے سے خلافت کے طرفداروں میں شمار ہو جاتے۔ ظاہر ہے کہ امامؑ جیسے عالم اور متقی شخص جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرزند ہونے کے ناطے لوگوں کی نظروں میں اعلیٰ مقام اور عزّت رکھتے تھے، اگر آپؑ حکومت کے تمام کاموں کو سراہنے اور توجیہ کرنے کا ذمہ لے لیں تو کوئی شخص بھی حکومت کی مخالفت کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا اور خلافت کے لیے بھی کوئی ڈر اور خوف باقی نہیں رہتا تھا اور یہ وہ مضبوط قلعہ تھا جو خلافت کے تمام غلط اور بُرے کاموں پر پردہ ڈال سکتا تھا۔

مامون کی اس چال میں اس کے علاوہ اور بھی بہت سے اغراض و مقاصد پنہاں تھے، جیسا کہ تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مامون کی یہ چال اس قدر پیچیدہ، دُشوار اور گہری تھی کہ سوائے خود اس کے کوئی دوسرا شخص اس کو عملی جامہ پہنانے میں اچھی طرح کامیاب نہیں ہو سکتا تھا یہی وجہ ہے کہ مامون کے قریبی دوست اور رشتہ دار بھی اس کے اغراض و مقاصد سے بے‌خبر تھے۔ بعض تاریخی واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ فضل ابن سہل بھی جو کہ مامون کا وزیر، کمانڈر اِنچیف اور خلیفہ کے دربار کا مقرَّب ترین شخص تھا، اس چال کی حقیقت سے لاعلم تھا۔ مامون اس ڈر سے کہ کہیں اس پیچیدہ چال کی کامیابی کے راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو جائے، اپنی اس چال کی اصلی وجہ چھپانے کے لیے جھوٹی داستانیں گھڑ گھڑ کر لوگوں کو سناتا تھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مامون کی سیاست بے‌مثال پختگی اور گہرائی سے بھرپور تھی لیکن اس میدانِ جنگ میں اس کے مدِّمقابل بھی حضرت امام علی ابن موسیٰ الرضا علیہ السلام جیسی شخصیت تھی اور یہی وجہ ہے کہ آپؑ نے مامون کی شیطانی چال کے باوجود اس کی پختہ اور ہمہ گیر تدبیر کو ایک بے‌اثر اور بچوں کے بیہودہ کھیل میں تبدیل کر دیا۔

مامون اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے کافی محنت اور سرمایہ صَرف کرنے کے باوجود اس چال سے نہ صرف یہ کہ کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکا بلکہ اس کی اپنی سیاست بھی خود اس کی مخالفت میں تبدیل ہو گئی۔ وہ تیر جس کو اس نے حضرت امام علی ابن موسیٰ الرضا علیہ السلام کی عزّت و آبرو اور ان کے مقاصد کو برباد کرنے کے لیے تیار کیا تھا خود اسی کو اپنا نشانہ بنا گیا۔ جیسا کہ کچھ عرصہ بعد خود اس کو مجبوراً قبول کرنا پڑا کہ اس کی گذشتہ تمام تدبیروں پر پانی پھر گیا ہے اور آخر کار اس کو بھی امامؑ کے خلاف وہی طریقۂ کار استعمال کرنا پڑا جسے اس کے تمام آباء و اجداد استعمال کرتے رہے تھے، یعنی ”قتل“ اور مامون جس نے یہ سب کوششیں اور چالیں صرف اس لیے انجام دیں تھیں کہ وہ ایک مقدّس مآب، خردمند اور پاک و صاف خلیفہ بننے کی آرزو کو پا سکے، آخر کار اسی کوڑے دان میں جا گرا جس میں اس سے پہلے کے تمام خلفاء گر چکے تھے؛ یعنی وہ بھی بُرے کاموں، فحّاشی، ظلم و ستم اور عیاشی میں مشغول ہو گیا۔

مامون کی زندگی کے وہ پندرہ سال جو امام علی ابن موسیٰ الرضا علیہ السلام کی ولی عہدی کے بعد گزرے ان میں اس کی ریاکارانہ طرزِ حیات کی پردہ دری کی بہت سی مثالیں موجود ہیں؛ جن میں سے یحییٰ ابن اکثم جیسے بدکار اور عیاش شخص کا قاضی القضاۃ مقرر کرنا اور اپنے گانے بجانے والے گوئیّے چچا ابراہیم ابن مہدی کی ہم نشینی اختیار کرنا اور دارالحکومت بغداد میں عیش و عشرت اور بے حرمتی کا بازار گرم کرنا شامل ہیں۔

امام رضا علیہ السلام کی تدابیر اور اقدامات

اب ان واقعات کے دوران خود حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی سیاست، تدابیر اور اقدامات کیا رہے ان سب کی وضاحت ضروری ہے:

۱۔ جب حضرت امام علی ابن موسیٰ الرضا علیہ السلام کو مدینہ سے خراسان آنے کی دعوت دی گئی تو آپؑ نے مدینہ کے لوگوں پر اپنی دلی کیفیت، مامون کے خلاف نفرت و ناراضگی اور غم و غصّے کو ظاہر کر دیا، یعنی آپؑ کے ارد گرد جتنے لوگ جمع تھے سب یہ جان گئے کہ مامون بدنیتی سے امامؑ کو ان کے وطن سے جدا کر رہا ہے۔

امام علی رضا علیہ السلام نے مامون سے متعلق اپنی دلی کیفیت کو جس طرح بھی ممکن ہوا سب پر ظاہر کر دیا، حرمِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اپنے خاندان کے لوگوں سے جدا ہوتے ہوئے، مدینہ سے باہر نکلتے وقت، خانہ کعبہ کے گرد الوداعی طواف کے دوران، گفتار، رفتار، زبانِ دعا اور زبان گریہ و زاری سے سب پر ظاہر کر دیا کہ یہ سفر آپؑ کے لیے موت کا سفر ہے۔ وہ لوگ جو مامون کے خیال کے مطابق اس سے حسنِ ظن رکھتے اور اس دعوت کے قبول کرنے کی وجہ سے امام عالی مقامؑ سے بدظن ہو جاتے، اس سفر کے آغاز ہی میں یہ جان گئے کہ اصل قصّہ کیا ہے؟ لہٰذا ان کے دل اب مامون کے خلاف دشمنی اور کینہ سے لبریز ہو گئے کیونکہ وہ ان کے عزیز اور بزرگوار امام علیہ السلام کو زبردستی ان لوگوں سے چھین کر قتل گاہ کی طرف لے جا رہا تھا۔

۲۔ جب "مرو" میں آپؑ کی ولی عہدی کا مسئلہ پیش آیا تو آپؑ نے سختی کے ساتھ

اسے قبول کرنے سے انکار کیا اور جب تک مامون نے کھلم کھلا آپؑ کو قتل کی دھمکی نہیں دی، آپؑ نے ولی عہدی قبول نہیں کی۔ یہ بات ہر جگہ پھیل گئی کہ حضرت امام علی ابن موسیٰ الرضا علیہ السلام نے مامون کے اصرار کے باوجود ولی عہدی اور اس سے پہلے خلیفہ بننے کی تجویز ٹھکرا دی ہے۔ ارکانِ حکومت نے جو کہ مامون کی اس چال کی نزاکت سے واقف نہیں تھے، امام عالی مقامؑ کے انکار کے مسئلے کی جگہ جگہ تشہیر شروع کردی یہاں تک کہ فضل ابن سہل کو بھی ارکانِ حکومت اور منتظمین کے مجمع میں یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ"میں نے اس سے پہلے خلافت کو اس قدر ذلیل و خوار حالت میں کبھی نہیں دیکھا تھا کہ امیر المومنین (مامون) اپنے دونوں ہاتھوں سے خلافت علی ابن موسیٰ الرضا (علیہ السلام) کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں مگر علی ابن موسیٰ الرضا (علیہ السلام) اس کو ٹھکرا رہے ہیں۔"[۱]

خود امام رضا علیہ السلام بھی ہر مناسب موقع پر اس عہدے کے مجبوری میں قبول کرنے کو لوگوں کے سامنے بیان کرتے رہتے تھے اور ہمیشہ کہتے تھے: "جب مجھے قتل کی دھمکی دی گئی تو میں نے مجبوراً ولی عہدی کو قبول کیا۔" ظاہر ہے یہ بات ایک بہت ہی حیران کن سیاسی حادثے کی طرح ایک شخص سے دوسرے شخص اور شہر بہ شہر پھیل گئی اور تمام دنیائے اسلام اس زمانے میں یا اس کے بعد یہ بات سمجھ گئی کہ مامون جیسا شخص جو ولی عہدی سے معزول کیے جانے اور خلافت کے حصول کے لیے اپنے بھائی امین کے مقابلے میں کئی سال تک جنگ کرتا رہا اور جس نے ہزاروں لوگوں کو حتی کہ اپنے بھائی امین کو بھی اسی وجہ سے قتل کر دیا تھا اور نفرت و دشمنی کی وجہ سے اپنے بھائی کے سر کو شہر بہ شہر پھراتا رہا تھا! لیکن اس زمانے میں ایک شخص یعنی حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی طرح کا ایسا بھی موجود ہے جو ولی عہدی کے منصب کو لاپروائی اور بے اعتنائی کی نگاہ سے دیکھتا اور صرف مجبوری یا قتل کی دھمکی کی صورت میں قبول کرنے پر تیار ہوا ہے۔

---

۱. "... فَمَا رَأَيْتُ خِلَافَةً قَطُّ كَانَتْ اَضْيَعَ مِنْهَا اِنَّ أَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ يَتَقَصَّى مِنْهَا وَ يَعْرِضُهَا عَلَى عَلِيِّ بْنِ مُوْسىٰ وَ عَلِيُّ بْنُ مُوْسىٰ يَرْفُضُهَا وَ يَأْبىٰ" (الارشاد فی معرفه حجج الله علی العباد، ج۲، ص۲۶۰)

اگر ان واقعات سے حضرت امام علی ابن موسیٰ الرضاعلیہ السلام اور مامون عباسی سے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں پرورش پانے والے افکار کا جائزہ لیا جائے تو نتیجہ بالکل اس کے برعکس نکلے گا جس کے لیے مامون نے یہ سب کچھ کیا تھا۔

۳۔ ان تمام چیزوں کے باوجود امام علی ابن موسیٰ الرضاعلیہ السلام نے ولی عہدی کو صرف اس شرط پر قبول کیا کہ آپؑ حکومت سے متعلق کسی کام میں مداخلت نہیں کریں گے اور جنگ، صُلح، معزول و منصوب اور سرکاری معاملات سے الگ تھلگ رہیں گے۔

مامون نے یہ سمجھا کہ چونکہ یہ مسئلہ ابھی تازہ ہے اس لیے اس نے اس شرط کو معمولی سمجھ کر قبول کر لیا اور یہ سوچا کہ بعد میں امامؑ کو آہستہ آہستہ سرکاری کاموں کی طرف مائل کر لے گا۔ ظاہر سی بات ہے کہ اگر امامؑ اپنی شرط پر قائم رہتے ہیں تو مامون کے تمام منصوبوں پر پانی پھر جاتا اور اس کے بیشتر مقاصد نابود ہو جاتے کیونکہ امامؑ برائے نام ولی عہد بنے اور مجبوراً حکومت کی سرکاری سہولتوں سے بہرہ مند ہونے کے باوجود اپنے چہرے کے تاثرات سے ظاہر کرتے رہتے تھے کہ وہ حکومتِ وقت کے مخالف ہیں نہ کوئی حکم صادر کرتے اور نہ ہی کسی کو کسی کام سے منع کرتے ہیں، نہ کسی ذمہ داری یا کام کو قبول کرتے اور نہ ہی حکومت کی طرفداری کرتے ہیں۔ لہٰذا قدرتی بات تھی کہ امامؑ ان کے اقدامات کو سراہتے بھی نہیں تھے۔

ظاہر ہے کہ حکومت کی سرکاری مشینری میں جو شخص اپنی مرضی سے تمام حکومتی فرائض سے کنارہ کشی اختیار کر لے، ممکن نہیں کہ وہ شخص حکومت کا سچا بہی خواہ اور طرفدار ہو۔ مامون بھی اس نقص کو اچھی طرح محسوس کرتا تھا اس لیے ولی عہدی کا مرحلہ طے پا جانے کے بعد سے بارہا یہ کوشش کرتا رہا کہ امام عالی مقامؑ کو ان کے قول و قرار کے برعکس حیلے بہانے سے سرکاری کاموں کی طرف مائل کر کے ان کی حکومت سے متعلق سیاسی جدّ و جہد کے اصول کو توڑ دے لیکن ہر مرتبہ امامؑ نے ہوشیاری سے اس کے ارادوں پر پانی پھیر دیا۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ معمّر بن خلاد امام علی رضاعلیہ السلام سے نقل کرتا ہے کہ ایک

مرتبہ مامون نے امامؑ سے کہا کہ: ”اگر ممکن ہو تو جن علاقوں کی اندرونی حالت ٹھیک نہیں ہے اور وہاں کے لوگ آپؑ کی بات مانتے بھی ہیں، کچھ لکھ دیجئے۔“ تو امامؑ نے انکار کیا اور اپنے گذشتہ قول و قرار کی یاد دہانی کروائی۔ یعنی یہ کہ امامؑ کسی بھی سرکاری کام میں بالکل مداخلت نہیں کریں گے۔ ایک اور دوسری بہت ہی خاص اور دلچسپ مثال عید کی نماز کا واقعہ ہے، یعنی مامون اس بہانے سے کہ ”لوگ آپؑ کی قدر و منزلت کو جانیں اور ان کے دلوں کو سکون نصیب ہو“ امامؑ کو نمازِ عید فطر کی امامت کروانے کی دعوت دیتا ہے۔ امامؑ انکار کرتے ہیں یہاں تک کہ جب مامون بہت زیادہ اصرار کرتا ہے تو امامؑ اس شرط پر اس کی بات کو قبول کرتے ہیں کہ آپؑ عید کی نماز پیغمبر اکرمﷺ اور حضرت علی ابن ابیطالبؑ کے طریقے سے ادا کریں گے اور پھر امامؑ اس موقع سے اس طرح فائدہ اُٹھاتے ہیں کہ مامون کو اپنے اصرار پر نادم ہونا پڑتا ہے اور امامؑ کو آدھے راستے سے واپس بلا لیتا ہے، یعنی وہ ایک اور چوٹ اپنی اس ریاکارانہ حکومت کو پہنچاتا ہے۔[1]

۴۔ اصل فائدہ جو امام عالی مقامؑ نے اس ولی عہدی سے حاصل کیا وہ اس سے بھی کہیں زیادہ بڑھ کر ہے۔ امامؑ نے ولی عہدی قبول کرکے ایک ایسی تحریک شروع کی جس کی ائمہ اطہارؑ کی پوری تاریخ میں؛ یعنی ۴۰ ہجری قمری میں اہل بیتؑ کی خلافت ختم ہونے کے بعد سے اس وقت تک اور سلسلۂ خلافت ختم ہونے تک، کوئی مثال نہیں ملتی اور وہ شیعوں کے امامت کے دعوے کو تمام اسلامی دنیا میں کھلم کھلا ظاہر کرنا، تقیہ کے ضخیم اور موٹے پردے کو ہٹانا اور تشیع کے پیغام کو تمام مسلمانوں کے کانوں تک پہنچانا تھا، خلافت کے عظیم تبلیغی وسائل امامؑ کے اختیار میں تھے۔ آپؑ ان وسائل کے ذریعے ان باتوں کو جو ایک سو پچاس سال کے عرصے میں خفیہ اور پوشیدہ طور پر، سوائے خاص اور قریبی اصحاب اور ساتھیوں کے کسی سے بھی نہیں کہی گئی تھیں، اب اونچی آواز سے سنانے لگے اور اس زمانے کے ہر ممکن اور موجود اختیارات اور وسائل سے جو صرف خلفاء یا ان کے قریبی اور خاص لوگوں کے اختیار میں ہوتے تھے، فائدہ اُٹھایا اور یہ معلومات لوگوں کے کانوں تک پہنچائیں۔

---

[1] ۱۔ الارشاد، شیخ مفیدؒ، ترجمہ رسول محلاتی، ج۲، ص۲۵۷-۲۵۸

امام علی ابن موسیٰ الرضاﷷ علماء کے مجمع یا مامون کے دربار میں ہونے والے تمام مناظروں میں، امامت کے بارے میں قوی ترین دلائل پیش کرتے تھے۔ ”جوامع الشریعہ“ خط میں جو کہ آپؑ نے فضل ابن سہل کو لکھا تھا، شیعوں کے تمام خاص اور اہم فقہی و عقیدتی مطالب بیان کیے ہیں، امامت کے بارے میں مشہور و معروف حدیث جس کو ”مرو“ میں عبد العزیز ابن مسلم کے لیے بیان کیا، اسی طرح بے شمار قصیدے جو آپؑ کی ولی عہدی کے سلسلے میں آپؑ کی مدح میں لکھے گئے جن میں سے بعض مثلاً دِعبل خزاعی اور ابو نُواس کے قصیدے جو عربی کے برجستہ اور مشہور قصیدوں میں شمار کیے جاتے ہیں، امامؑ کی عظیم کامیابی کو ظاہر کرتے ہیں۔

جس سال امام علی ابن موسیٰ الرضاﷷ کی ولی عہدی کا واقعہ پیش آیا، شہر مدینہ اور شاید بیشتر اسلامی علاقوں میں نمازِ جمعہ کے خطبوں میں اہل بیت علیہم السلام کی فضیلت بیان کی گئی ورنہ اہل بیت پیغمبرﷺ کو ستّر سال تک منبروں سے بُرا بھلا کہا گیا اور بعد میں بھی کافی عرصہ تک کسی میں جرأت نہیں ہوتی تھی کہ اہل بیت علیہم السلام کے فضائل بیان کرے، لیکن اب اہل بیت علیہم السلام کا نام ہر جگہ عزّت اور احترام سے لیا جانے لگا تھا۔ اس واقعے سے ان کے طرفداروں کو بھی روحانی اور قلبی طاقت حاصل ہوئی، بے خبر اور لاتعلق افراد بھی اس بات سے آشنا ہوئے اور اہل بیت علیہم السلام کے گرویدہ ہونے لگے اور سخت و جانی دشمن بھی کمزوری اور ناکامی کا احساس کرنے لگے۔ شیعہ محدّثین اور خطباء بھی عقائد سے متعلق وہ مسائل جنہیں صرف تنہائی میں ہی اپنی زبان پر لا سکتے تھے، اب کھلے عام بڑے بڑے جلسوں اور عام جگہوں پر بھی بیان کرنے لگے۔

۵۔ اگرچہ مامون کی دلی خواہش تھی کہ امام علی ابن موسیٰ الرضاﷷ لوگوں سے دور رہیں اور وہ اس دوری کو آپؑ اور لوگوں کے درمیان معنوی اور قلبی رشتوں کو توڑنے کا آخری وسیلہ سمجھتا تھا، لیکن امامؑ اپنی ہر فرصت سے فائدہ اُٹھا کر لوگوں سے ملتے اور اس رشتے کو قائم رکھتے تھے۔ مامون نے جان بوجھ کر امامؑ کے مدینہ سے مرو تک کے راستے کا اس طرح انتخاب کیا تھا کہ کوفہ اور قم جیسے مشہور اور معروف شہروں،

جہاں کے لوگوں کے دلوں میں اہل بیت علیہم السلام کی محبت تھی، آپؑ کے راستے میں نہ آنے پائیں لیکن اس کے باوجود امامؑ نے ان اجنبی راستوں میں بھی جہاں موقع ملا اپنے اور لوگوں کے درمیان نئے رابطے قائم کیے۔ اہواز میں امامت سے متعلق آیتوں کی نشاندہی کی، بصرہ میں ان لوگوں کے دلوں میں بھی محبت کی لہر دوڑا دی جو آپؑ کو نہیں چاہتے تھے۔ نیشاپور میں حدیث ”سلسلۃ الذہب“کو ہمیشہ کے لیے یادگار کے طور پر چھوڑا اور ان کے علاوہ اور بھی دوسری معجزانہ نشانیاں لوگوں پر ظاہر کیں۔ اس طویل سفر کے دوران ہر جگہ لوگوں کی ہدایت کرنے کی فرصت سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ مرو میں بھی جو اصل منزل اور دار الخلافہ تھا جب کبھی فرصت ملتی آپؑ سرکاری محاصرے کو توڑ کر لوگوں کے جمّ غفیر میں پہنچ جاتے تھے۔

۶۔ نہ صرف مکتبِ تشیع کے پیروکاروں کو امام علی رضا علیہ السلام کی طرف سے خاموشی کا کوئی اشارہ نہ ملا بلکہ واقعات گواہ ہیں کہ امامؑ کا یہ نیا منصب لوگوں کی ہمت اور جوش کا باعث بنا اور انقلابی لوگ جو اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ دُشوار گزار پہاڑیوں اور دور دراز دیہاتوں میں سختی اور مشکل میں گزارنے پر مجبور تھے، اب امام علی ابن موسیٰ الرضا علیہ السلام کی حمایت کی وجہ سے سرکاری منتظمین کی نظروں میں بھی مختلف شہروں میں عزّت اور آبرو کی نظر سے دیکھے جانے لگے تھے۔ مخالف اور تند و تیز زبان شاعر ”دِعبل خزاعی“ جس نے کبھی بھی کسی خلیفہ، وزیر یا امیر کو پسند نہیں کیا اور کبھی بھی ان کے درباروں میں حاضر نہیں ہوا اور خلافت کے طرفداروں میں سے کوئی بھی اس کی تیز زبان سے محفوظ نہیں رہتا تھا اور اسی وجہ سے حکومت ہمیشہ اس کے پیچھے لگی رہتی تھی اور کئی سالوں سے مختلف شہروں اور دیہاتوں میں خانہ بدوشی کی زندگی بسر کر رہا تھا، اب وہ بھی اپنے محبوب امامؑ کی خدمت میں حاضر ہو سکتا تھا۔ اس نے اپنے سب سے مشہور و دلنشین قصیدے کو جسے اُموی اور عباسی خلافتوں کے خلاف علوی تحریک کا منشور قرار دیا جاتا ہے، آپؑ کی خدمتِ اقدس میں پڑھا اور بہت ہی مختصر مدّت میں اس کے یہ اشعار پوری اسلامی دنیا میں پھیل گئے یہاں تک کہ جب وہ امامؑ کی خدمت میں حاضری دے کر واپس آ رہا تھا تو اُس نے اپنے ان اشعار کو ڈاکوؤں کے سردار کی زبان سے سنا۔

مامون کی شکست اور امام رضاعلیہ السلام کی شہادت

اب ایک بار پھر اس پراسرار کشمکش کی پوری کیفیت کا اجمالی جائزہ لیتے ہیں کہ جسے مامون نے اپنے ذہن سے اختراع کیا تھا اور اپنے اس مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے، جن کی طرف اشارہ کیا گیا امام علی ابن موسیٰ الرضاعلیہما السلام کو میدان میں اُترنے پر مجبور کر دیا تھا، ولی عہدی کے اعلان کے ایک سال بعد کی صورت حال یہ تھی:

مامون نے امام علی ابن موسیٰ الرضاعلیہما السلام کے لیے بہت زیادہ اختیارات اور عزّت و احترام کے مواقع فراہم کیے، لیکن سب جانتے ہیں کہ یہ عالی مقام ولی عہد کسی بھی سرکاری اور حکومتی کام میں دخالت نہیں کرتے اور دِلی طور پر حکومت کے ہر کام سے متنفّر اور بیزار ہیں۔ تمام لوگوں پر یہ بات ظاہر تھی کہ انہوں نے ولی عہدی کی تجویز کو اسی شرط پر قبول کیا تھا کہ کوئی بھی سرکاری کام انجام نہیں دیں گے۔

مامون نہ صرف ولی عہدی کے حوالے سے بلکہ اپنی نجی گفتگو اور دوسرے احکامات میں بھی آپؑ کی فضیلت، پرہیزگاری، بلند حسب و نسب اور علمی مرتبے کی تعریف کرتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں کی نظروں میں جن میں سے بعض نے صرف امام علی رضاعلیہ السلام کا نام سنا تھا اور بعض لوگ آپؑ کو جانتے بھی نہیں تھے اور شاید وہ گروہ جو ہمیشہ اپنے دلوں میں آپؑ کے خلاف دشمنی رکھتا تھا، اب امام عالی مقامؑ ایک ایسی قابلِ تعظیم و تکریم شخصیت اور خلافت کے لیے شائستہ اور لائق فرد کی حیثیت رکھتے تھے جو خلیفۂ وقت کے مقابلے میں سن و سال، علم و تقویٰ اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت رکھنے کی وجہ سے بہتر اور برتر تھے۔

مامون آپؑ کی موجودگی میں نہ صرف یہ کہ اپنے شیعہ مخالفین کو اپنے متعلق بدگمان ہونے سے نہ بچا سکا بلکہ ان کی تیز زبانوں کو اعتراض سے روکنے میں بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ جبکہ دوسری طرف امام علی ابن موسیٰ الرضاعلیہما السلام کی موجودگی ان شیعوں کے لیے باعثِ امان، اطمینانِ قلب اور قوتِ خاطر ثابت ہوئی۔ مدینہ، مکہ اور اسلامی دنیا کے خاص علاقوں میں نہ صرف امام علی رضاعلیہ السلام کا نام دُنیاوی تعلق اور

جاہ و مقام کی آرزو کے الزام سے پاک ثابت ہوا، بلکہ آپؑ کی ظاہری شان و شوکت نے آپؑ کی معنوی عزّت کو مزید بڑھا دیا۔ تعریف کرنے والوں کی زبانیں سالہا سال بعد ہمیشہ کے لیے آپؑ کے مظلوم اور معصوم آباء و اجداد علیہم السلام کی فضیلتیں بیان کرنے کی خاطر کھل گئیں۔

مختصر یہ کہ مامون اس بڑے جُوئے میں نہ صرف یہ کہ کچھ حاصل نہ کر سکا بلکہ اس نے اپنا بہت کچھ کھو دیا تھا اور ڈر تھا کہ باقیماندہ چیزوں کو بھی ہاتھ سے دے دے گا۔ یہی وہ گھڑی تھی جب مامون کو اپنی اس شکست اور نقصان کا احساس ہوا تو کوشش کرنے لگا کہ اپنی اس بڑی غلطی کا ازالہ کرے اور اب اس کے علاوہ اسے کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ اتنی زحمتوں اور سرمایہ گذاری کے باوجود نظامِ خلافت کے سخت اور کٹّر دشمن یعنی اہل بیت علیہم السلام سے مقابلے کے لیے اسی طریقۂ کار کو استعمال کرے جس سے اس کے ظالم آباء و اجداد کام لیا کرتے تھے، یعنی مخالفین کا قتل۔

ظاہراً اتنی شاندار موقعیت کے بعد امام علی رضا علیہ السلام کا قتل کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مختلف روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ امام عالی مقامؑ کو شہید کرنے کے قطعی فیصلے سے پہلے اس نے دوسرے ذرائع بھی اختیار کیے تھے تاکہ اپنے اس آخری مقصد کو آسانی سے حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ ان میں بے سر و پا باتوں اور افواہوں کا پھیلانا، امامؑ کے بارے میں غلط بیانی سے کام لینا وغیرہ سرِفہرست ہیں۔ جس کے نتیجے میں اچانک ”مرو“ میں یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ امام علی ابن موسیٰ الرضا علیہما السلام تمام لوگوں کو اپنا غلام سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام سوائے مامون کے ماتحت عملے کے اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

جب اباصلت ہرویؒ نے امامؑ کو یہ خبر پہنچائی تو آپؑ نے فرمایا: ”پروردگارا، اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے! تو گواہ ہے کہ ہرگز نہ میں نے اور نہ ہی میرے آباء و اجداد علیہم السلام میں سے کسی نے ایسی کوئی بات کہی اور یہ بھی ظلم و ستم کے اُن سلسلوں میں سے ایک ہے جو ان لوگوں کی طرف سے ہم پر ڈھایا جاتا ہے۔“ مناظروں کے جلسوں کا انعقاد بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا ہر اس شخص کے ساتھ

تواتر کے ساتھ مناظرے منعقد کیے جاتے جس کے بارے میں امامؑ پر فتح حاصل ہونے کی کمترین بھی اُمید ہوتی تھی۔ جب امامؑ نے مختلف مذاہب اور ادیان کے لوگوں کو مناظروں کی عام بحثوں میں شکست دے دی اور آپؑ کی علمی اور قطعی حجت کی شہرت ہر جگہ پھیل گئی تو مامون نے یہ سوچا کہ ہر متکلم اور مخالف کو امامؑ سے مناظرے کے لیے دعوت دی جائے، ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی امامؑ کو شکست دے سکے۔ البتہ جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہ مناظرے جتنے زیادہ منعقد ہوتے تھے امامؑ کی علمی حیثیت اتنی ہی زیادہ ظاہر ہوتی جاتی تھی اور مامون اپنی چال کے برخلاف نتیجہ سے نااُمید تر ہوتا جاتا تھا۔

روایتوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مامون نے امام علی رضاعلیہ السلام کے قتل کی سازش کو ایک یا دو مرتبہ اپنے نوکروں اور ارکانِ حکومت کے ذریعے تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی اور ایک مرتبہ آپؑ کو سرخس کے قید خانے میں بھی ڈالا، لیکن ان طریقوں سے بھی مامون کے ماتحتوں کے دلوں میں امامؑ کی معنوی فضیلت اور عقیدت میں اضافے کے سوا کچھ فائدہ نہ پہنچا اور مامون پہلے سے بھی زیادہ مجبور اور آپؑ سے بدگمان نظر آنے لگا۔ آخر کار اُس نے اس کے علاوہ کوئی اور چارۂ کار نہ دیکھا کہ اپنے ہاتھوں سے اور کسی کی مدد کے بغیر امامؑ کو زہر دے دے اور اس نے ایسا ہی کیا اور سال ۲۰۳ ہجری قمری صفر کے مہینے میں؛ یعنی آپؑ کو مدینہ سے خراسان بلائے جانے کے تقریباً دو سال اور آپؑ کی ولی عہدی کا حکم صادر کرنے کے ایک سال اور کچھ مہینے بعد اپنے ہاتھوں کو امام علی رضاعلیہ السلام کے قتل اور کبھی فراموش نہ ہونے والے اس سیاہ کارنامے سے آلودہ کر لیا۔

یہ مختصر جائزہ ائمہ اہل بیتعلیہم السلام کی ڈھائی سو سالہ سیاسی زندگی کے ایک اہم ترین باب سے متعلق ہے جس کے بارے میں اُمید کی جاتی ہے کہ محققین، مفکرین اور مورّخین، تاریخ اسلام کے قرون اُولیٰ کے ان واقعات کو زیادہ سے زیادہ واضح کرنے کے لیے ہمت سے کام لیں گے اور اس موضوع کے تفسیری، تشریحی اور تحقیقی پہلوؤں پر زیادہ سے زیادہ توجہ دیں گے۔

(۰۹-۰۸-۱۹۸۴ء)

امام محمد تقی
امام علی نقی اور
امام حسن عسکری علیہم السلام

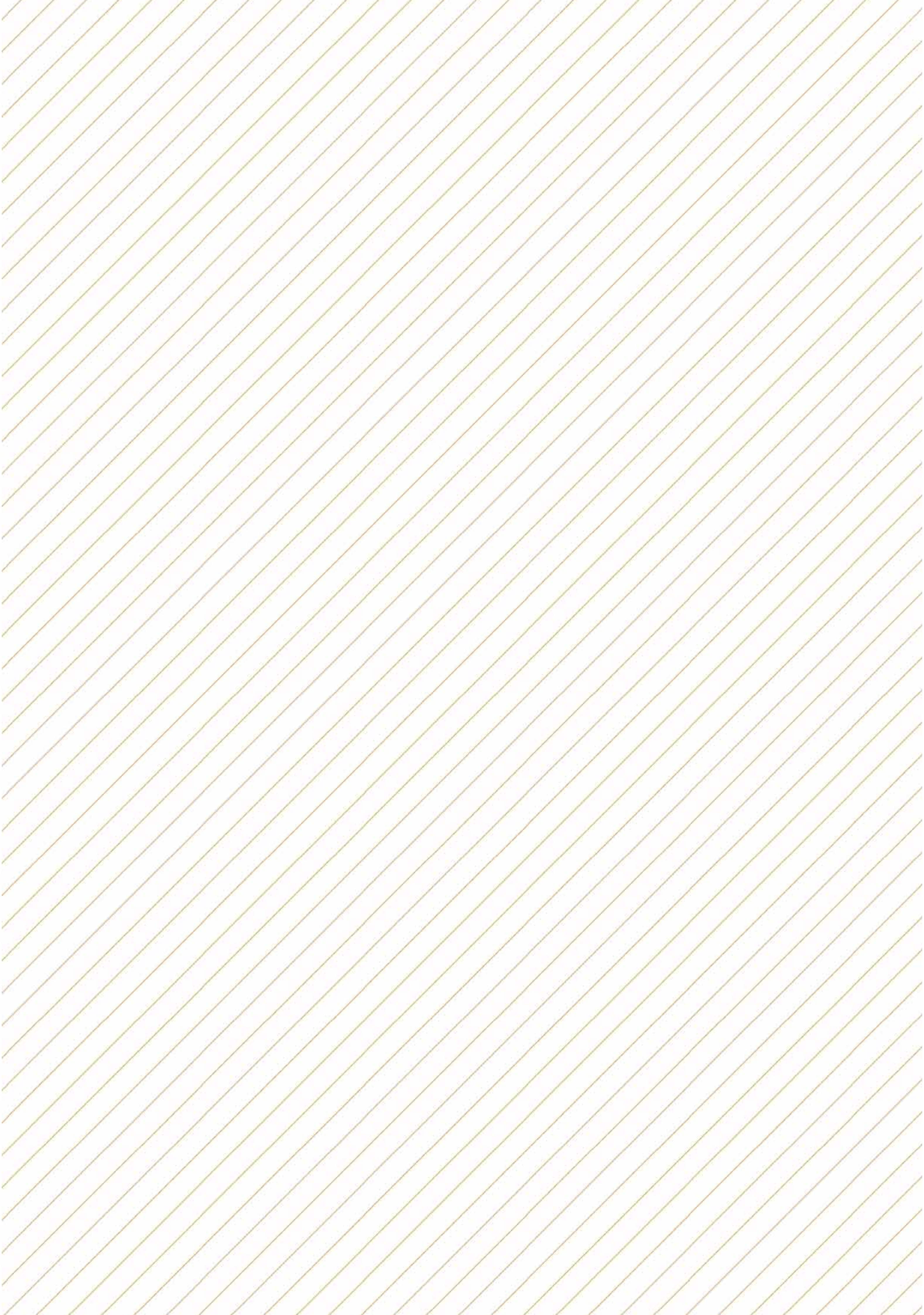

طویل المدّت پروگرام کے تحت وسیع بنیاد پر تنظیمی سرگرمیاں

ہمارے دوسرے ائمہ طاہرین علیہم السلام کی طرح حضرت امام محمد تقی علیہ السلام کی زندگی بھی ہمارے لیے قابلِ اقتداء، اور نمونہ عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اِس نیک اور شائستہ بندے کی مختصر زندگی بھی کفر و طغیان کے خلاف برسرِپیکار کاموں میں گزری ہے۔ آپؑ نوجوانی ہی میں منصبِ امامت پر فائز ہوئے اور اپنی پوری زندگی اللہ تعالی کے دشمنوں سے جہاد کرتے رہے اور صرف پچیس (۲۵) سال، یعنی عین جوانی کے عالم میں ہی آپؑ کا وجودِ مبارک دشمنوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا اور آپؑ کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔ جس طرح ہمارے دیگر ائمہ اطہار علیہم السلام میں سے ہر ایک نے اپنے جہاد کے ذریعے اسلام کی پُرافتخار تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا، امام محمد تقی علیہ السلام نے بھی اپنے عمل کے ذریعے جہاد کرکے ہمارے لیے ایک اہم درس دیا ہے اور وہ درس یہ ہے کہ جب کبھی بھی منافق اور ریاکار حکمرانوں اور قدرتمندوں سے واسطہ پڑ جائے تو ہمیں ہمت سے کام لیتے ہوئے انتہائی ہوشیاری کے ساتھ مومنین کو اس سے باخبر کرنا، انہیں دشمن کے ساتھ مقابلے کے لیے تیار اور آمادہ کرنا چاہیے۔ اگر دشمن کھلے عام اور آشکارا طور پر اپنی دشمنی کا اظہار کرے اور ریاکاری کا مظاہرہ نہ کرے تو پھر اس سے نمٹنا آسان ہوتا ہے۔ لیکن جب دشمن مامون عباسی کی طرح اپنے چہرے پر تقدّس کا نقاب ڈال کر اسلام کی باتیں کرنے لگے تو پھر لوگوں کے لیے ایسے دشمن کی پہچان مشکل ہو جاتی ہے۔ ہمارے زمانے میں، بلکہ پوری تاریخ میں طاقتور لوگوں کی یہی کوشش رہی ہے کہ جب وہ سامنے آ کر مقابلہ کرنے سے عاجز ہوتے ہیں تو پھر ریاکاری اور منافقت سے کام لیتے ہیں۔ حضرت امام علی رضا علیہ السلام اور حضرت امام محمد تقی علیہ السلام نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ مامون کے چہرے سے ریاکاری اور منافقت کر پردے کو اُتار کر پھینک دیں اور وہ اپنے اِس مقصد میں کامیاب بھی ہوئے۔

(۱۰-۱۰-۱۹۸۰ء)

یہ بزرگوار امامؑ مقاومت و استقامت کی نشانی اور علامت ہیں۔ ایک ایسے عظیم انسان ہیں کہ جنہوں نے اپنی پوری مختصر سی زندگی بنو عباس کے اس ریاکار خلیفہ -مامون عباسی- سے مقابلے میں گزاری اور کبھی پیچھے نہیں ہٹے اور مشکل سے مشکل حالات کو برداشت کیا اور تمام ممکن طریقوں سے ان کا مقابلہ کیا۔ حضرت امام محمد تقی علیہ السلام وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے آزادانہ بحث و مباحثے کا آغاز کیا اور مامون کی موجودگی میں مختلف مذاہب کے علماء، فقہاء اور دانشوروں کے ساتھ دقیق ترین اور مشکل ترین موضوعات پر دلیل اور استدلال کے ساتھ بحث کرتے ہوئے، اپنی برتری ثابت کی ہے۔ لہٰذا آزادانہ بحث و مباحثے کا یہ اسلوب ہماری میراث ہے اور یہ ہمارے ائمہ معصومین علیہم السلام کے دور میں رائج رہا ہے اور حضرت امام محمد تقی علیہ السلام کے دور میں آپؑ ہی کے ذریعے اس خوبصورت طریقے کا آغاز ہوا ہے۔

(۱۵-۰۵-۱۹۸۱ء)

حضرت امام علی نقی علیہ السلام کا سیاسی دور

(اسی طرح) حضرت امام علی نقی علیہ السلام اور آپؑ کے دور کے خلفاء کے درمیان ہونے والی (سرد) جنگ میں ظاہری اور باطنی طور پر جسے فتح نصیب ہوئی، وہ امام علی نقی علیہ السلام ہی تھے۔ اس امام عالی مقامؑ کے دورِ امامت میں یکے بعد دیگرے چھ خلفاء آئے اور واصلِ جہنم ہوتے گئے ان میں سے آخری خلیفہ "معتزّ" تھا جس نے امام علی نقی علیہ السلام کو شہید کیا اور اس کے کچھ ہی دنوں بعد خود بھی مر گیا۔ ان خلفاء کی اکثریت بڑی ذلّت کی موت مری ہے۔ ایک اپنے ہی بیٹے کے ہاتھوں مارا گیا تو دوسرے کو اس کے بھتیجے نے قتل کر دیا اور اس طرح بنو عباس کے خلفاء کی ہوا اُکھڑتی چلی گئی۔ لیکن اس کے برعکس امام علی نقی علیہ السلام اور امام حسن عسکری علیہ السلام کے دور کے اُن انتہائی سخت اور دُشوار ترین حالات کے باوجود شیعیانِ اہلِ بیت علیہم السلام کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہوتا رہا اور وہ قوی اور طاقتور ہوتے چلے گئے۔ حضرت امام علی نقی علیہ السلام نے بیالیس (۴۲) سال عمر پائی جس میں سے بیس (۲۰) سال آپؑ سامراء میں رہے جہاں پر آپؑ کی ایک زرعی زمین تھی جس میں آپؑ کھیتی

باڑی کر کے اپنی زندگی کا گزر بسر کرتے تھے۔ سامراء شہر کو دراصل ایک فوجی چھاؤنی کی حیثیت حاصل تھی جسے معتصم عباسی نے تعمیر کروایا تھا، تاکہ وہ اپنے قریبی ترک غلاموں کو جو ترکستان، سمرقند، منگولیا اور مشرقی ایشیاء سے لائے گئے تھے، ہمارے ترک لوگوں، جو آذربائیجان اور دوسرے علاقوں سے تعلق رکھتے تھے، اُن کے ساتھ سامراء میں آباد کر سکے۔ یہ لوگ چونکہ نومسلم تھے اس لیے ائمہ اہلِ بیت علیہم السلام اور مومنین کو نہیں پہچانتے تھے، بلکہ اسلام سے بھی اچھی طرح واقف نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگوں کے لیے پریشانیاں کھڑی کرتے اور عربوں یعنی بغداد کے لوگوں کے ساتھ سخت اختلافات رکھتے تھے۔ حضرت امام علی نقی علیہ السلام کے دور میں اسی سامراء شہر میں بزرگ شیعہ ایک خاصی بڑی تعداد میں جمع ہو گئے تھے اور امامؑ انہیں منظّم کرنے نیز انہیں کے ذریعے (خطوط اور دیگر ذرائع سے) امامت کے پیغام کو پورے عالمِ اسلام تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔ قم، خراسان، رئے، مدینہ، یمن اور دیگر دُور دراز کے علاقوں اور پوری دنیا میں انہیں افراد نے شیعہ مکتبِ فکر کو پھیلایا اور اس مکتب پر ایمان رکھنے والے افراد کی تعداد میں روز بروز اضافہ کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ حضرت امام علی نقی علیہ السلام نے یہ تمام کام انہیں چھ خلفاء کی خونچکاں شمشیروں کے سائے تلے اور ان کی مرضی کے برخلاف انجام دیئے ہیں۔ حضرت امام علی نقی علیہ السلام کی شہادت کے بارے میں ایک معروف حدیث ہے جس کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ سامراء میں اچھی خاصی تعداد میں شیعہ اس طرح سے اکٹھے ہو گئے تھے کہ دربارِ خلافت انہیں پہچان نہیں پاتا تھا، کیونکہ اگر وہ انہیں پہچان جاتا تو ان سب کو تہ تیغ کر دیتا۔ لیکن چونکہ ان افراد نے اپنا ایک مضبوط نیٹ ورک بنا لیا تھا اس لیے خلافت بھی ان لوگوں کی شناخت نہیں کر سکتی تھی۔

اِن عظیم شخصیات (ائمہ معصومین علیہم السلام) کی ایک دن کی سعی و کوشش، برسوں کا اثر رکھتی تھی، اِن کی مبارک زندگی کا ایک دن، برسوں تک کام کرنے والے ایک گروہ کی کارکردگی سے زیادہ معاشرے پر اثر ڈالتا تھا۔ ائمہ اطہار علیہم السلام نے اس طرح دین کی حفاظت کی؛ ورنہ جس دین کے علمبردار متوکل، معتز اور مامون جیسے افراد ہوں اور جس کے علماء یحییٰ ابن اکثم جیسے لوگ ہوں جو دربارِ خلافت کے عالمِ دین کہلانے کے باوجود، انتہائی درجے کے فاسق و فاجر تھے، ایسی صورتِ حال میں دین کو تو بالکل بچنا ہی نہیں چاہیے

تھا اور انہیں ابتدائی ایام میں اِس کی بیخ کنی ہو جانی چاہیے تھی، اس دین کا خاتمہ بخیر ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن ائمہ طاہرینؑ کی اِس جدّ و جہد اور سعی و کوشش نے نہ صرف تشیع کا، بلکہ قرآن مجید، اسلام اور دینی تعلیمات کا بھی تحفّظ کیا۔ یہ ہے خدا کے خالص، مخلص بندوں اور اولیائے الٰہی کی خصوصیت۔ اگر اسلام میں ایسے کمربستہ افراد نہ ہوتے تو بارہ سو، تیرہ سو برسوں کے بعد اسے حیاتِ نو نہ ملتی اور وہ اسلامی بیداری پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہوتا، بلکہ اسے دھیرے دھیرے ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ اگر اسلام کے پاس ایسے افراد نہ ہوتے جنھوں نے پیغمبر اسلامﷺ کے بعد ان عظیم اسلامی تعلیمات کو انسانی ذہنوں اور اسلامی تاریخ میں زندہ و جاوید کر دیا تو اسلام ختم ہو جاتا اور اس کی کوئی بھی چیز باقی نہ رہتی اور اگر کچھ بچ بھی جاتا تو اس کی تعلیمات میں سے کچھ بھی نہیں بچتا۔ یہودیت اور عیسائیت کی طرح کہ اب ان کی اصل تعلیمات میں سے تقریباً کچھ بھی باقی نہیں بچا ہے۔ یہ قرآن مجید کا صحیح و سالم باقی رہ جانا، حدیث نبویؐ کا باقی رہ جانا، اتنے سارے احکام اور تعلیمات کا باقی رہ جانا اور اسلامی تعلیمات کا ایک ہزار سال بعد، انسان کی وضع کردہ تعلیمات سے آگے بڑھ کر اپنے آپ کو ظاہر کرنا، کوئی معمولی بات نہیں، بلکہ انتہائی غیر معمولی بات ہے جو مجاہدت اور سخت جدّ و جہد کے ساتھ انجام پائی ہے۔ البتہ اس عظیم کام کی راہ میں ظلم و ستم کا شکار ہونا، اسیر ہونا اور قتل ہونا بھی عام سی بات تھی، تاہم ائمہ اہلِ بیتؑ کے لیے یہ کوئی اچنبھے اور حیرت کی بات نہیں تھی۔

حضرت امام علی نقیؑ کا بچپنا

حضرت امام علی نقیؑ کے بچپن کے بارے میں ایک روایت ہے کہ جب معتصم نے سال ۲۱۸ہجری میں حضرت امام محمد تقیؑ کو ان کی شہادت سے دو سال قبل، مدینہ سے بغداد طلب کیا تو اس وقت حضرت امام علی نقیؑ کی عمر مبارک چھ سال تھی۔ آپؑ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ مدینہ میں رہ گئے تھے۔ جب امام محمد تقیؑ کو بغداد لایا گیا تو معتصم نے آپؑ کے اہلِ خانہ کے بارے میں تحقیق اور چھان بین کی اور جب اسے پتہ چلا کہ آپؑ کے بڑے فرزند علی ابن محمدؑ کی عمر چھ سال ہے تو اس نے کہا یہ خطرناک بات ہے، ہمیں

اس کی کوئی چارہ جوئی کرنی چاہیے۔ لہٰذا معتصم نے اپنے ایک قریبی شخص کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ بغداد سے مدینہ جائے اور وہاں اہلِ بیتؑ کے کسی دشمن شخص کو تلاش کر کے اِس بچے کو اس کے حوالے کر دے تا کہ وہ شخص استاد کے طور پر اس بچے کی تعلیم و تربیت کرے اور اسے خاندانِ رسالت کا دشمن اور دربارِ خلافت کا دوست بنائے۔ وہ شخص بغداد سے مدینہ آیا اور الجُنَیدی نامی مدینہ کے ایک عالم کو، جو اہلِ بیت علیہم السلام کے بہت بڑے مخالفین اور دشمنوں میں سے شمار ہوتا تھا -اور اس قسم کے علماء اس وقت مدینہ میں موجود تھے- اسے اس کام کے لیے مامور کیا اور اس سے کہا کہ مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ تمہیں اس بچے کا استاد اور مربّی مقرّر کروں تا کہ تم کسی کو اس سے ملنے جلنے نہ دو، اس کی ویسی ہی پرورش کرو جیسی ہم چاہتے ہیں۔ اس شخص کا نام (یعنی الجُنَیدی) تاریخ میں درج ہے۔ اس وقت حضرت امام علی نقی علیہ السلام کی عمر، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ صرف چھ سال تھی اور معاملہ حکومت کا تھا، اس لیے کون اس کے سامنے کھڑا ہو سکتا تھا؟ کچھ دنوں کے بعد دربارِ خلافت سے وابستہ ایک شخص نے الجُنَیدی سے ملاقات کی اور اس سے اس بچے کے بارے میں پوچھا، جسے اس کے حوالے کیا گیا تھا۔ الجنیدی نے حیرت سے کہا: بچہ؟! یہ کوئی بچہ ہے؟! میں ادبیات کی کوئی بات اسے بتانا چاہتا ہوں تو وہ ادب کے ایسے ایسے گوشے میرے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے کہ جن کا مجھے بھی علم نہیں ہوتا! ان لوگوں نے کہاں سے تعلیم حاصل کی ہے؟! کبھی کبھی جب وہ حجرے میں داخل ہونا چاہتا ہے تو میں اس سے کہتا ہوں کہ پہلے قرآن مجید کی ایک سورہ کی تلاوت کرو اور پھر حجرے میں داخل ہو (اس کا مطلب یہ ہے کہ الجنیدی امام عالی مقامؑ کو پریشان کرنا چاہتا تھا) تو وہ پوچھتا ہے کہ کونسی سورہ پڑھوں؟ میں اس سے کہتا ہوں کہ کوئی بڑی سی سورہ؛ مثلاً سورۂ آلِ عمران پڑھو۔ تو وہ بچہ پوری سورۂ آلِ عمران کی تلاوت کر دیتا ہے اور اس کے مشکل الفاظ کے معنی بھی مجھے بتاتا ہے۔ یہ لوگ عالم ہیں، حافظِ قرآن ہیں، قرآن مجید کی تاویل اور تفسیر کے عالم ہیں اور تم اسے بچہ کہہ رہے ہو؟! یہ لڑکا جو بظاہر ابھی بچہ ہے، درحقیقت اللہ کا ولی اور آیتِ مجیدہ ”وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا“[۱] کا مصداق ہے۔ اِس بچے کا اس استاد سے کچھ عرصہ تک رابطہ جاری رہا اور بالآخر وہ استاد

---

[۱] اور ہم نے انہیں بچپنے ہی میں حکمت عطا کر دی۔ (سورۂ مریم، آیت ۱۲)

خود اہلِ بیت علیہم السلام کا سچا شیعہ بن گیا۔

شد غلامی که آب جو آرد
آب جوی آمد و غلام بِبُرد[۱]

تمام میدانوں میں ائمہ اہلِ بیت علیہم السلام کو غلبہ حاصل تھا اور ان کے دشمن ناکام تھے۔ دِعبل خزاعی کہ جس کی بنو عباس کے خلفاء میں سے کسی کے ساتھ نہیں بنتی تھی، اس نے اپنے اشعار کے ذریعے ان کی مٹی پلید کر رکھی تھی اور اس نے ان میں سے ہر ایک کے بارے میں تاریخ میں ایک سند چھوڑی ہے۔ وہ معتصم عباسی کے بارے میں اپنے چند اشعار میں کہتا ہے کہ ہم نے تو کتابوں میں پڑھا تھا کہ بنو عباس کے سات خلفاء ہوں گے اور اب آٹھویں کی بات کرتے ہیں یہ آٹھواں خلیفہ کون ہے؟ کیا وہ اصحابِ کہف کی طرح ہیں کہ جن کا آٹھواں ان کا کتّا تھا! اس کے بعد وہ خود ہی کہتا ہے: تم کہاں اور وہ کتّا کہاں! اس کتے سے تو کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا تھا جبکہ تم سر سے پیر تک گناہوں سے آلودہ ہو۔

(۲۰-۰۸-۲۰۰۴ء)

حضرت امام علی نقی علیہ السلام کی سامراء آمد

امام علی نقی علیہ السلام کو مدینہ سے سامراء لایا گیا تاکہ آپؑ ان کی نگرانی میں رہیں؛ لیکن انہوں نے دیکھا کہ اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر آپ قارئین "مناقب"[۲] اور دوسری تاریخ کی کتابوں میں ان تینوں اماموں کے حالاتِ زندگی کا جائزہ لیں اور مطالعہ کریں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے کی بہ نسبت ان بزرگان کے دور میں شیعوں کے باہمی تعلقات زیادہ فعال اور مستحکم تھے۔

---

[۱] گلستان سعدی، باب سوم؛ (شعر کا مفہوم یہ ہے کہ ایک غلام کو جو کی شراب؛ یعنی فقاع لانے کے لیے مامور کیا گیا، لیکن جو کی شراب تو آگئی البتہ وہ غلام ہاتھ سے نکل گیا۔)

[۲] مناقب آل ابی طالب علیہ السلام، ابن شہر آشوب، ج۴، ص۴۴۷-۳۳۷

دنیا کے کونے کونے سے لوگ خطوط لکھ رہے تھے، خمس وغیرہ کے پیسے بھیجتے تھے اور احکامات حاصل کرتے تھے، باوجود اس کے کہ یہ ائمہ معصومین علیہم السلام محدودیت اور حصار میں تھے۔ امام علی نقی علیہ السلام سامراء کے لوگوں میں بھی ہر دل عزیز اور محبوب بن گئے تھے۔ سب آپؑ کا احترام کرتے تھے اور بے احترامی کرنے کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ آپؑ کی شہادت اور نیز امام حسن عسکری علیہ السلام کی شہادت کے بعد سامراء شہر میں آہ و فغاں اور غوغا برپا ہو گیا تھا۔ یہیں سے حکمران سمجھ گئے کہ کوئی راز کی بات ضرور ہے لہٰذا اسے سمجھا جائے اور اس کا کوئی علاج کیا جائے۔ وہ امام اور امامت کے تقدُّس کا راز بھانپ گئے اور ایک دن متوکل عباسی نے امام علی نقی علیہ السلام کو شراب کی ایک محفل میں بلا لیا تاکہ یہ خبر ہر جگہ پھیل جائے کہ امام عالی مقام علیہ السلام متوکل کے یہاں ایک ایسی محفل میں گئے ہیں جہاں شراب و کباب کا اہتمام کیا گیا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ اس خبر کے کیا کیا اثرات مرتّب ہو سکتے تھے!

آپؑ نے اس موقعہ پر ایک مجاہد اور ایک مبارز کی نظر سے اس تمام منظر کو دیکھا اور اس سازش کے مقابلے میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ امام علی نقی علیہ السلام نے متوکل کے دربار میں جاکر شراب و کباب کی اس محفل کو ایک روحانی و معنوی محفل میں تبدیل کر دیا؛ یعنی آپؑ نے وہاں جاکر حقائق بیان کرکے اور عبرت آموز اشعار کے ذریعے متوکل کو ایسا مغلوب کر دیا کہ آخر کار متوکل اپنی جگہ سے اُٹھا اور غالیہ[۱] نامی عطر آپؑ کی خدمت میں پیش کیا اور نہایت ہی ادب و احترام کے ساتھ آپؑ کو وہاں سے رخصت کیا۔ اس موقعہ پر امام علی نقی علیہ السلام نے متوکل سے مخاطب ہو کر فرمایا: ”تم یہ خیال کرتے ہو کہ یہاں پر بیٹھے ہوئے ہو اور موت کا پنجہ تمہیں نہیں دبوچے گا؟“ اسی طرح آپؑ نے موت کے مراتب کو یہاں تک کہ (مرنے کے بعد) متوکل کے جسم میں پڑنے والے کیڑوں مکوڑوں تک کے بارے میں بیان فرمایا اور اس محفل کو بالکل ہی تبدیل کرکے رکھ دیا اور دربار سے باہر تشریف لے گئے۔ ایک ایسی جنگ کہ جس کی ابتداء کرنے والا ایک بداخلاق اور طاقتور خلیفہ تھا جبکہ دوسری طرف اس کے مقابلے میں تنہا ایک جوان تھا جو بظاہر اس کے مقابلے میں انتہائی کمزور تھا، مگر اس

---

[۱] ایسا عطر جو مشک اور عنبر سے تیار کیا جاتا ہے۔

نے ایک نفسیاتی جنگ کو چھیڑا ایسی جنگ جس میں تلوار اور نیزوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں اگر ہم میں سے کوئی ہوتا تو ہرگز یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن یہ امام علی نقی علیہ السلام ہیں جو وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس طرح بات کرنا جانتے ہیں کہ خلیفہ کو بُرا نہ لگے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ آپؑ کھڑے ہو جاتے اور شراب کا جام اُٹھا کر زمین پر پٹخ دیتے؛ لیکن یہ کوئی اچھا ردِّعمل نہ ہوتا اور نہ ہی اِس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نکل سکتا تھا۔ لہٰذا آپؑ نے اس موقعہ پر کسی اور طریقے سے اپنا ردِّعمل ظاہر کیا۔ اس واقعے کا یہ پہلو انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ لہٰذا ائمہ معصومین علیہم السلام کی زندگی کے اس پہلو پر توجہ کیجئے کہ یہ ہستیاں مسلسل حالتِ جنگ میں تھیں؛ ایک ایسی جنگ کہ جس کی روح سیاسی تھی۔ کیونکہ ان کے مقابلے میں جو لوگ اقتدار کی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے وہ بھی دین کے مدّعی تھے اور بظاہر دینی اُمور کا خیال بھی رکھتے تھے، یہاں تک کہ بعض دینی معاملات میں ائمہ طاہرین علیہم السلام کے نظریات کو بھی قبول کر لیتے تھے۔ جیسا کہ مامون عباسی کے بارے میں آپ سنتے رہتے ہیں کہ اس نے بعض معاملات میں بظاہر امام علی رضا علیہ السلام کے نظریات کو قبول کیا تھا۔ یعنی وہ کبھی کبھار امامؑ کے فقہی نظریات کو قبول کرنے میں کوئی عار بھی محسوس نہیں کرتا تھا۔

ائمہ طاہرین علیہم السلام کی خلفاء سے جنگ کا سبب

جو چیز ائمہ اہل بیت علیہم السلام اور خلفاء کے درمیان جنگ کا سبب بنی ہوئی تھی، وہ یہ تھی کہ اہل بیت اطہار علیہم السلام اپنے آپ کو امام سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ ”ہم امام ہیں“ خلفاء کے ساتھ جنگ کی اصلی اور سب سے بڑی وجہ بھی یہی تھی۔ کیونکہ جو لوگ اقتدار کی کرسی پر بیٹھے تھے اور اپنے آپ کو رہبر اور پیشوا سمجھتے تھے، وہ دیکھ رہے تھے کہ ایک امام اور رہبر میں جو شرائط پائی جانی چاہییں، وہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام میں پائی جاتی ہیں، جبکہ ان میں یہ شرائط موجود نہیں ہیں۔ لہٰذا وہ ائمہ طاہرین علیہم السلام کے وجود کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے اور ان سے جنگ (اور ان کے خلاف سازشیں و پروپیگنڈہ) کرتے تھے اور ائمہ طاہرین علیہم السلام بھی ایک مضبوط اور محکم چٹان کی مانند ان کے مقابلے میں ڈٹے رہتے تھے۔ ظاہری بات ہے

کہ اس جنگ کے دوران اسلامی معارف، فقہی احکام اور اخلاقیات ، جن کی ائمہ معصومین علیہم السلام ترویج کرتے تھے، ان کا اپنا ایک اثر تھا۔ زیادہ سے زیادہ شاگردوں کی تربیت اور شیعوں کے آپس کے تعلقات کی وجہ سے روز بہ روز شیعت پھیلتی چلی گئی اور ائمہ اطہار علیہم السلام نے ہی تشیع کو باقی رکھا ہے۔ آپ اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ ڈھائی سو سال تک حکومت جس نظریے کے خلاف ڈٹی رہی ہو ، اس کا تو کوئی اثر باقی نہیں رہنا چاہیے تھا بلکہ اسے تو سرے سے مٹ ہی جانا چاہیے تھا، لیکن آپ دیکھیں کہ آج دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور تشیع کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی ہے۔ اِس نکتے کو ان اشعار میں بخوبی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے جو امام جعفر صادق علیہ السلام، امام علی نقی علیہ السلام اور امام حسن عسکری علیہ السلام کے بارے میں پڑھے جاتے ہیں۔ یہ حضراتؑ جدّ و جہد اور مبارزہ آرائی کرتے اور اسی راہ میں اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرتے تھے۔ یہ ایک ایسا راستہ ہے جو ایک مشخّص اور معیّن ہدف کی جانب جا رہا ہے کبھی ان میں سے کوئی ایک لوٹ رہا ہوتا ہے تو دوسرا اسی راستے میں آگے بڑھ رہا ہوتا ہے، لیکن سب کا ہدف و مقصد ایک ہی ہے۔ یہ حضراتؑ، امام حسین علیہ السلام سے جو اِس جدّ و جہد کے بانی ہیں، ان سے بھی زیادہ کامیاب رہے تھے؛ کیونکہ امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد تو ”اِرۡتَدَّ النَّاسُ بَعۡدَ الۡحُسَیۡنِ إِلَّا ثَلَاثَۃً“ کوئی باقی بچا ہی نہیں تھا، لیکن آپ ملاحظہ کیجیے کہ امام علی نقی علیہ السلام کے دور میں پورا عالمِ اسلام آپؑ کی مٹھی میں تھا یہاں تک کہ بنو عباس کو بھی بے بس ہونا پڑا اور انہیں یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انہیں کیا کرنا چاہیے، لہٰذا آخر کار انہیں بھی شیعت کی طرف ہی مائل ہونا پڑا۔ بنو عباس کے ایک خلیفہ نے ایک تحریری فرمان جاری کیا کہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام کا نام خطبے میں لیا جائے اور بتایا جائے کہ اہل بیتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حق پر ہیں۔ یہ تحریر تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے۔ لیکن جب خلیفہ کے وزیر کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ فوراً خلیفہ کے پاس پہنچ گیا اور اس سے کہا: یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ وہ یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکا کہ اہل بیتؑ حق پر نہیں ہیں! بلکہ یہ کہا: اس وقت طبرستان کے پہاڑی اور دیگر علاقوں میں کچھ لوگوں نے اہل بیت علیہم السلام کے نام پر قیام کر رکھا ہے اگر آپ کی یہ بات ان لوگوں تک پہنچ گئی تو وہ لشکر بنا کر آپ کی جان کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ خلیفہ نے جب دیکھا کہ یہ صحیح کہہ رہا ہے تو کہا: حکم نامے کا اعلان نہ کیا جائے؛ یعنی یہ لوگ اپنی حکومت کے ہاتھ سے چلے جانے سے ڈرتے تھے،

اگر عقیدہ قبول بھی کر لیتے تھے تو دنیا اور سلطنت کی محبت، خود ان کے اور ان کے قلبی اعتقاد کے درمیان حائل ہو جاتی تھی۔

(۲۱-۰۹-۲۰۰۱ء)

یہ کہ ان بزرگوار ہستیوںؑ نے انتہائی غریب الوطنی کے عالم میں زندگی گزاری ہے، حقیقت میں بھی ایسا ہی ہے؛ کیونکہ مدینہ سے دور، خاندان سے اور اپنے وطن سے دور زندگی گزاری ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان تینوں ائمہ طاہرین علیہم السلام؛ یعنی امام محمد تقی علیہ السلام سے لے کر امام حسن عسکری علیہ السلام تک کی زندگیوں میں ایک اور نکتہ بھی پایا جاتا ہے وہ یہ کہ جتنا ہم حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کی زندگی کے آخری حصّے کی طرف آگے بڑھتے جاتے ہیں ان بزرگواروںؑ کی غربت میں اضافہ ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جبکہ امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے مقابلے میں، ان تینوں اماموںؑ کے دور میں تشیع کا دائرہ تقریباً دس گنا وسیع تر ہو چکا تھا اور یہ ایک عجیب بات ہے، شاید حکمرانوں کی طرف سے انہیں دباؤ میں (اور زیر نظر) رکھنے کی بنیادی وجہ بھی یہی تھی۔

امام علی رضا علیہ السلام کی خراسان آمد کے اثرات

حضرت امام علی رضا علیہ السلام کا ایران کی طرف سفر اور خراسان آمد بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ شاید آپؑ نے جن چیزوں کا محاسبہ کیا تھا وہ یہی چیز تھی۔ کیونکہ اس سے پہلے شیعہ منتشر تھے ان کے آپس میں کوئی روابط اور تعلقات نہیں تھے، جس کی وجہ سے وہ نااُمیدی کی زندگی گزار رہے تھے اور خلفاء کی حکومت کا دئرہ کار ہر جگہ موجود تھا۔ جبکہ اس سے پہلے ہارون عباسی کی فرعونی حکومت تھی۔ حضرت امام رضا علیہ السلام جب خراسان کی طرف تشریف لا رہے تھے تو جہاں جہاں سے آپؑ کا گزر ہوا وہاں آپؑ نے لوگوں کو علم، عظمت و بزرگی اور صدق و نورانیت کے وہ جوہر دکھائے کہ انہوں نے اس سے پہلے کسی ایسی شخصیت کو دیکھا ہی نہ تھا کیونکہ اس سے پہلے کتنے شیعہ ایسے ہوں گے جنھوں نے خراسان سے جاکر مدینہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے ملاقات کی ہوگی؟

لیکن اِس طولانی سفر کے دوران لوگوں نے نزدیک سے امام علی رضا علیہ السلام کی زیارت کی تو یہ ان کے لیے ایک عجیب بات تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھ رہے ہوں۔ آپؑ کی وہ ہیبت، جاہ و جلال اور روحانی عظمت، آپؑ کی عزت، آپؑ کا اخلاق، آپؑ کا تقویٰ، آپؑ کی نورانیت، آپؑ کا وہ علم کہ جو چاہو پوچھو، فوراً جواب حاضر ہے۔ خلاصہ یہ کہ لوگوں نے آج تک کسی ایسی شخصیت کو دیکھا ہی نہیں تھا جس نے لوگوں کے اندر ایک ولولہ پیدا کر دیا ہو۔

امام علی رضا علیہ السلام خراسان کے علاقے ”مرو“ پہنچ گئے جو اس دور میں (نام نہاد) اسلامی حکومت کا مرکز تھا اور موجودہ ترکمانستان میں واقع ہے۔ اپنی آمد کے ایک دو سال کے بعد جب آپؑ کو (زہر دے کر) شہید کر دیا گیا تو آپؑ کی شہادت سے لوگوں کے دل داغدار ہوئے، جہاں امامؑ کی تشریف آوری سے لوگوں کو نادیدہ چیزوں کے دیکھنے اور ناشنیدہ باتوں کے سننے کا موقع ملا، وہاں آپؑ کی (مظلومانہ) شہادت نے بھی لوگوں کو غمزدہ اور ان کے دلوں پر عجیب قسم کے اثرات مرتّب کیے۔ حقیقت میں دیکھا جائے تو ایسا نہیں تھا کہ اس پوری فضاء پر تشیع کا رنگ چھا گیا ہو اور سب لوگ شیعہ ہو گئے ہوں، نہیں! بلکہ یہ سب اہل بیت علیہم السلام کے چاہنے والے بن گئے تھے۔ پس ایک ایسے ماحول میں شیعہ بکھرے ہوئے اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

آپ ملاحظہ کیجئے کہ اسی دوران قم میں ”اشعریین“ یعنی اشاعرہ فرقے والے، ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ یہاں کیوں آئے؟ یہ تو عرب ہیں، یہ لوگ اچانک قم پہنچے اور وہاں پر علمِ حدیث اور معارفِ اسلامی کے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا اور قم کو اپنا مرکز بنا لیا۔ اسی طرح شہر رئے میں بھی شیخ یعقوب کلینیؒ [۱] جیسے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اب یہ شہر رئے میں شیخ کلینیؒ جیسے لوگ ایسے ہی پیدا نہیں ہوئے، بلکہ اس کے لیے شیعہ اور نظریاتی ماحول کا ہونا ضروری ہے تاکہ کسی جوان کی ایسی تربیت کی جا سکے کہ وہ آگے جا کر شیخ کلینیؒ بن سکے۔ اس کے بعد بھی یہ تحریک

---

[۱] ابو جعفر محمد ابن یعقوب کلینی رازی المعروف ”شیخ کلینیؒ“ جو اصول کافی کے مولف ہیں، انہوں نے تیسری صدی ہجری کے دوسرے نصف حصّے اور چوتھی صدی ہجری کے پہلے نصف حصّے میں زندگی گزاری اور ۳۲۹ھ ق کو وفات پائی۔

یوں ہی جاری رہی، آپ دیکھئے کہ شیخ صدوقؒ [۱] ہرات، خراسان اور دیگر مقامات تک چلے جاتے ہیں تاکہ شیعوں کے لیے احادیث جمع کر سکیں؛ یہ انتہائی اہم بات ہے۔ شیعہ محدثین خراسان میں کیا کر رہے تھے؟ اسی طرح شیعہ محدثین "سمرقند" میں کیا کر رہے تھے؟ سمرقند میں کون ہیں؟ شیخ عیاشی سمرقندیؒ [۲]۔ یہ اسی شہر میں رہتے تھے اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ "فِي دَارِهِ الَّتِي كَانَتْ مُرْتَعاً لِلشِّيْعَةِ وَأَهْلِ الْعِلْمِ" [۳] یہ بات شیخ کشیؒ [۴] کے بیانات میں موجود ہے۔ شیخ کشیؒ، خود سمرقند کے رہنے والے تھے۔

امام علی رضا علیہ السلام کی شہادت کے بعد تنظیمی سرگرمیوں میں تیزی

بنا بر ایں امام علی رضا علیہ السلام کی تحریک اور بعد از آں آپؑ کی مظلومانہ شہادت نے یہ کام کر دیا کہ ائمہ اطہار علیہم السلام کو ایک ایسا ماحول فراہم ہوا اور ائمہ معصومین علیہم السلام نے بھی اِس ماحول سے بھرپور استفادہ کیا۔ ائمہ اطہار علیہم السلام نے لوگوں کو جو خطوط لکھے ہیں یا ائمہؑ کے یہاں لوگوں کا جو آنا جانا رہا، یہ سب کچھ بغیر کسی پروگرام کے نہیں ہوا ہے۔ بلکہ یہ ائمہ اطہار علیہم السلام کی تحریک کی خفیہ سرگرمیوں کا ایک حصّہ تھا۔ ورنہ اگر یہ سب کھلے عام ہوتا تو حکومتی کارندے انہیں گرفتار کرتے اور ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیتے۔ متوکل عباسی جیسا ظالم و جابر شخص کہ جس نے لوگوں کو کربلا جانے سے منع کر رکھا تھا، کیا وہ لوگوں کو آرام سے امامؑ کی خدمت میں پہنچ کر اپنے مسائل کا حل دریافت کرنے اور آپؑ کے جوابات سے لوگوں کو مطلع کرنے کی اجازت دیتا؟ کیا وہ لوگوں کو امامؑ کی خدمت میں

---

[۱] ابو جعفر محمد ابن علی ابن بابویہ قمی المعروف "شیخ صدوقؒ" کا شمار چوتھی صدی ہجری کے معروف شیعہ فقہاء اور علماء میں ہوتا ہے۔ آپ ۳۰۶ھ ق میں قم المقدس میں پیدا ہوئے۔ مکتب تشیع کی کتب اربعہ میں سے "من لا یحضرہ الفقیہ" جیسی مایہ ناز کتاب آپ ہی کی تالیفات میں سے ہے، اس عظیم الشان عالی قدر فقیہ نے ۳۸۱ھ ق کو شہر رئے میں وفات پائی۔

[۲] محمد ابن مسعود عیاشی سمرقندی کا شمار تیسری صدی ہجری کے اواخر اور چوتھی صدی ہجری کے ابتدائی حصّے کے مشہور شیعہ علماء و مفسرین میں ہوتا ہے۔

[۳] ان کا گھر شیعہ حضرات، علماء اور دانشوروں کا محلِ اجتماع تھا۔ (رجال النجاشی، ص۳۷۲)

[۴] محمد ابن عمر ابن عبد العزیز المعروف "شیخ کشی" جن کی کنیت ابو عمرو ہے، کا تعلق چوتھی صدی ہجری کے درمیانی حصّے کے مشہور و معروف علماء اور علمِ رجال و حدیث کے اساتذہ اور شیعہ محدثین میں ہوتا ہے۔

دوسروں کی وجوہات شرعیہ پہنچانے اور ان کی رسید حاصل کرکے لوگوں تک پہنچانے کی اجازت دیتا؟ یہ تمام باتیں ان تینوں اماموںؑ کی عظیم تبلیغی اور تعلیمی نیٹ ورک کے وجود کا ثبوت ہیں۔ حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی شہادت کے بعد سے لے کر حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کی شہادت تک ایسے ایسے کام ہوتے رہے۔ حضرت امام علی نقی علیہ السلام اور حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام اسی سامراء شہر میں جو درحقیقت ایک فوجی چھاؤنی تھا (کوئی ایسا بڑا شہر نہ تھا بلکہ ایک نیا دار الحکومت تھا "سُرَّ مَنْ رَأى"[1] جہاں پر وزراء، رؤساء اور حکومتی اہلکاروں کے علاوہ، اتنے تھوڑے سے لوگ وہاں موجود تھے جن کی حکومتی اہلکاروں کو ضرورت تھی) پورے عالمِ اسلام کے لوگوں سے اپنے قریبی تعلقات برقرار کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ جب ہم ائمہ معصومین علیہم السلام کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں تو سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کیا کرتے تھے۔ وہ صرف نماز اور روزہ کے مسائل بیان کرنے اور طہارت و نجاست کے حوالے سے سوالات کے جواب دینے پر اکتفاء نہیں کرتے تھے، بلکہ وہ اسلامی معنی میں اپنے آپ کو لفظِ "امام" کا اصلی مصداق سمجھتے ہوئے لوگوں کے ساتھ گفتگو کیا کرتے تھے۔

میری نظر میں دوسرے پہلوؤں کے ساتھ ساتھ یہ پہلو زیادہ توجہ کا حامل ہے۔ آپ دیکھئے کہ حضرت امام علی نقی علیہ السلام کو مدینہ سے سامراء بُلا کر جوانی ہی میں (یعنی بیالیس(۴۲) سال کی عمر میں) شہید کر دیا جاتا ہے؛ اسی طرح امام حسن عسکری علیہ السلام اٹھائیس (۲۸) سال کی عمر میں شہید کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ائمہ معصومین علیہم السلام اور ان کے پیروکاروں اور شیعوں کی تنظیمی سرگرمیاں پوری تاریخ میں جاری و ساری رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حکومتی اہلکار اور کارندے ہمیشہ چوکس رہتے تھے، لیکن اس کے باوجود ائمہ اطہار علیہم السلام اپنے مقصد میں کامیاب رہے ہیں؛ یعنی وہ اپنی تمام تر مظلومیت کے باوجود، عزّت و عظمت کے مالک رہے ہیں۔

(۱۰-۰۵-۲۰۰۳ء)

---

[1] دیکھنے والوں کو خوش کرنے والا شہر۔ اس سے مراد سامراء ہے۔ لیکن یہی شہر سامراء حضرت امام علی نقی علیہ السلام اور حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کی شہادت کے بعد "سَاءَ مَنْ رَأَى" یعنی "جس نے دیکھا وہ غمگین ہوا" اور سامراء اسی کا مخفّف ہے۔

کسی بھی زمانے میں شیعوں کے درمیان تعلقات اور پورے عالمِ اسلام میں شیعی تنظیم، ان تینوں اماموںؑ کے زمانے کی طرح نہیں پھیلی، وکلاء اور نوّابوں کی موجودگی اور وہ داستانیں جو حضرت امام علی نقی علیہ السلام اور حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کے حوالے سے بیان کی جاتی ہیں (مثلاً یہ کہ جب کوئی شخص پیسے لے کر آیا تو امامؑ نے معین فرما دیا کہ ان سے کیا کرنا چاہیے) وہ بھی اِس بات پر دلالت کرتی ہیں۔ یعنی سامراء میں ان دونوں اماموں (امام علی نقی علیہ السلام اور امام حسن عسکری علیہ السلام) کے محکوم ہونے کے باوجود اور اسی طرح ان سے پہلے امام محمد تقی علیہ السلام اور امام علی رضا علیہ السلام کے بھی زیر نظر اور محدود ہونے کے باوجود، لوگوں کے ساتھ بہت گہرے اور وسیع تعلقات تھے، اگرچہ امام علی رضا علیہ السلام سے پہلے بھی یہ روابط اور تعلقات موجود تھے، لیکن امام علی رضا علیہ السلام کے خراسان تشریف لانے سے ان تعلقات میں مزید وسعت پیدا ہوگئی تھی۔

(۰۹_۰۸_۲۰۰۵ء)

ہمارے ائمہ طاہرین علیہم السلام نے اِس ڈھائی سو سالہ دورِ امامت میں (حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت سے لے کر حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کی شہادت تک) بہت زیادہ تکلیفیں اُٹھائی ہیں، اُن پر مظالم ڈھائے گئے ہیں، انہیں مظلومانہ طور پر شہید کیا گیا ہے؛ لہٰذا اُن کا حق بنتا ہے کہ اُن کی مظلومیت پر گریہ کیا جائے اور آنسو بہائے جائیں؛ کیونکہ اُن کی مظلومیت نے لوگوں کے دلوں اور جذبات و احساسات کو ہلا کر رکھ دیا ہے؛ لیکن انہوں نے اپنی مظلومیت کے باوجود فتح حاصل کی ہے اُن میں سے ہر ایک امامؑ نے اپنے مدِّمقابل پر غلبہ حاصل کیا ہے اور مجموعی اعتبار سے بھی تمام ائمہ اطہار علیہم السلام کامیاب اور فاتح رہے ہیں۔

(۲۰_۰۸_۲۰۰۴ء)

امام مهدی
عجل الله تعالی فرجه الشریف

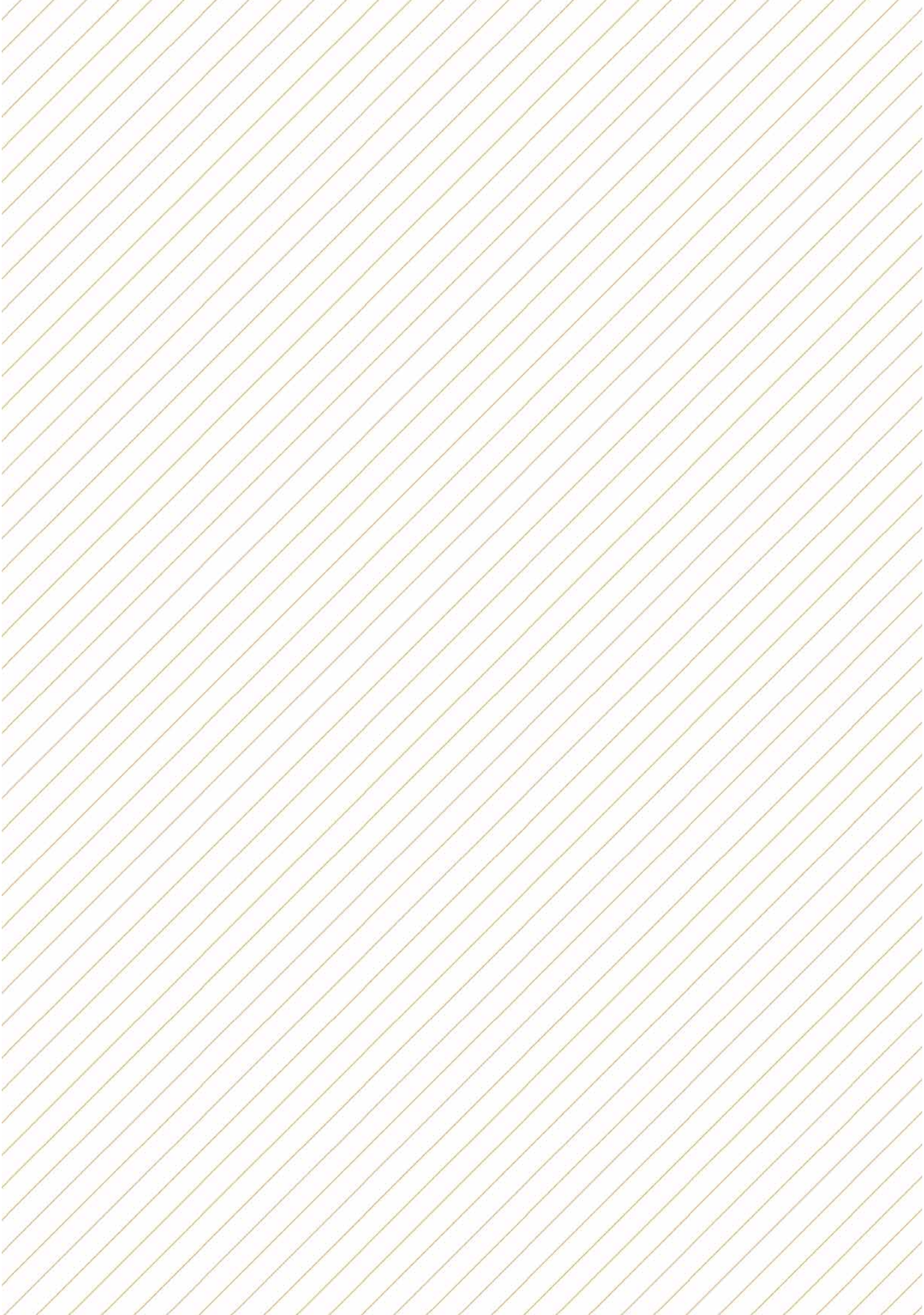

عقیدۂ مہدویت

تمام مسلمانوں کا اصلِ مہدویت (کے مسئلے) پر اتفاق ہے دیگر ادیانِ عالم کے لوگ بھی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق آخری زمانے میں ایک نجات دہندہ کے انتظار میں ہیں۔ ان لوگوں نے بھی اس مسئلے کے ایک حصّے کو صحیح سمجھا ہے لیکن وہ اس کے اہم حصّہ، یعنی نجات دہندہ کو پہچاننے میں غلطی کا شکار ہیں جبکہ اہل تشیع اپنے معتبر ذرائع کے مطابق اس شخصیت کو اس کے نام، خاندان، تاریخ ولادت اور دیگر تمام خصوصیات کے ساتھ جانتے ہیں۔

(۲۰۔۹۔۲۰۰۵ء)

ہم شیعوں کے عقیدے کی خصوصیت یہ ہے کہ تشیع میں اس حقیقت کو صرف ایک آرزو اور تخیّلاتی عقیدے سے نکال کر ایک زندہ حقیقت میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل تشیع جب ”مہدی موعودؑ“ اور اس نجات دہندہ کے انتظار کی بات کرتے ہیں تو صرف تخیّلات میں غوطہ زنی نہیں کرتے، بلکہ ایک ایسی حقیقت کی جستجو کرتے ہیں جو اِس وقت موجود ہے۔ حجتِ خدا کی صورت میں لوگوں کے درمیان زندہ ہیں، لوگوں کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں، لوگوں کو دیکھ رہے ہیں، ان کے ساتھ ہیں، ان کے درد اور تکلیف کو محسوس کرتے ہیں۔ انسانوں میں سے جو لوگ اہلِ سعادت ہوں، جن میں صلاحیت و ظرفیت پائی جاتی ہو، بعض اوقات ایک اجنبی کے طور پر آپؑ کی زیارت کرتے ہیں، وہ موجود ہیں، ایک حقیقی اور معین انسان کے عنوان سے جو ایک خاص نام رکھتا ہے جس کے ماں باپ معلوم ہیں وہ لوگوں کے درمیان رہتا ہے اور ان کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہے، یہ ہم شیعوں کے عقیدے کی خصوصیات میں سے ہے۔

وہ لوگ بھی، جو دوسرے مذاہب کے ہیں اور اس عقیدے کو قبول نہیں کرتے، آج تک کوئی ایسی معقول دلیل پیش نہیں کر سکے جو اس فکر و عقیدے کو رد کرے اور اسے خلافِ حقیقت ثابت کرے۔ بہت سی روشن، واضح اور مضبوط دلیلیں جن کی بہت سے اہل سنت نے بھی تصدیق کی ہے، پورے یقین کے ساتھ اس عظیم انسان، خدا کی اس عظیم حجت اور اس تابناک و درخشاں حقیقت کے وجود پر ان ہی خصوصیات کے ساتھ جو ہم اور آپ جانتے ہیں، دلالت کرتی ہیں اور آپ دوسرے مکاتبِ فکر کی بہت سی بنیادی کتابوں میں ان کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

امام حسن عسکری علیہ السلام کے مبارک اور پاک طینت فرزند کی تاریخ ولادت معلوم ہے، ان سے متعلق تمام تفصیلات معلوم ہیں، ان کے معجزات معین ہیں، خدا نے ان کو طولانی عمر دی ہے اور یہی ہستی دنیا کی تمام اُمتوں، قبیلوں، مذہبوں، نسلوں اور زمانوں کی آرزوؤں کو مجسّم کرنے والی ہے اور یہ اس اہم مسئلے کے بارے میں مکتبِ تشیع کی ایک خصوصیت ہے۔

(۷۔۸۔۲۰۰۸ء)

عقیدۂ مہدویت کی بنیاد

عقیدۂ مہدویت کے حوالے سے چند نکات بہت اہم ہیں جن کا خلاصہ میں یہاں بیان کروں گا:

پہلا نکتہ یہ ہے کہ حضرت امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا مقدّس وجود تاریخ بشریت کے آغاز سے لیکر آج تک جتنی بھی الٰہی دعوتیں اور انبیاءؑ کی تحریکیں چلی ہیں، ان کا تسلسل ہے۔ جیسا کہ آپ قارئین کرام دعائے ندبہ میں پڑھتے ہیں کہ: ''فَبَعْضٌ أَسْكَنْتَهُ جَنَّتَكَ''[1] جس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور ''إِلَى أَنِ انْتَهَيْتَ بِالْأَمْرِ''[2] سے مراد خاتم الانبیاء

---

[1] ۱۔ پس تو نے ان میں سے بعض کو اپنی جنت میں ٹھہرایا۔

[2] ۲۔ (ہر زمانے میں رسول بھیجے) یہاں تک سلسلۂ نبوت کو اپنے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم کر دیا۔

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

پھر آپؐ کے بعد ائمہ معصومین علیہم السلام کی ولایت اور امامت کا سلسلہ شروع ہو کر حضرت امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ یہ تاریخ بشریت میں انبیاءؑ اور اوصیاءؑ کا ایک تسلسل ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ پوری تاریخ میں انبیاء علیہم السلام کی تحریکوں اور الٰہی دعوتوں کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا ہے۔

چنانچہ بشریت ہمیشہ سے خدا کے بھیجے ہوئے انبیاءؑ، دعوتِ الٰہیہ اور اس کی طرف بلانے والے عظیم راہنماؤں کی محتاج رہی ہے اور یہ احتیاج آج بھی باقی ہے اور گزرتے وقت کے ساتھ بشریت انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات سے اور قریب سے قریب تر ہوتی جارہی ہے۔

آج انسانی معاشرے نے فکری، مدنی اور معرفت کے لحاظ سے انبیاء علیہم السلام کی بہت ساری تعلیمات کو (کہ آج سے صدیوں قبل بشریت ان کو درک اور قبول کرنے پر راضی نہ تھی) بخوبی درک کر لیا ہے؛ جیسے عدل و انصاف، آزادی اور دوسری انسانی اقدار اور اس قسم کی باتیں جو آج دنیا میں رائج ہیں یہ سب انبیاءؑ ہی کی تعلیمات ہیں۔ پہلے زمانے کے عام انسان اور عمومی اذہان اس قسم کے مفاہیم کو درک نہیں کر سکتے تھے۔ انبیاء کرامؑ کا تسلسل اور ان کی دعوت کا پھیلاؤ اور معاشروں میں ان کی نشر و اشاعت، اس بات کا سبب بنی کہ یہ افکار نسل در نسل لوگوں کے ذہنوں، لوگوں کی فطرت اور لوگوں کے دلوں میں رچ بس جائیں۔

داعیانِ الٰہی کا یہ سلسلہ اب بھی ختم نہیں ہوا ہے بلکہ حضرت بقیۃ اللہ، امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا مقدّس وجود اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جیسا کہ زیارتِ آل یاسین میں آپ (قارئین) پڑھتے ہیں:

"السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا دَاعِيَ اللَّهِ وَرَبَّانِيَ آيَاتِه"

یعنی ہم حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام یہاں تک کہ خود حضرت

---

[1] اے اللہ کی طرف دعوت دینے والے اور اس کی آیات کے عظیم عالم تجھ پر سلام ہو۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دوسرے انبیاءؑ اور مصلحین کی الٰہی دعوتوں کو حضرت امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے وجودِ مقدس میں مجسّم پاتے ہیں۔ یہ عظیم ہستی درحقیقت ان سب کی وارث ہیں۔ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوتوں اور ان کی تحریکوں کے پرچم آپؑ ہی کے ہاتھوں میں ہیں؛ پوری تاریخ میں انبیاء علیہم السلام نے بشریت کو جن معارف اور تعلیمات سے روشناس کرایا ہے آپؑ بھی لوگوں کو انھی کی طرف دعوت دے رہے ہیں یہ ایک انتہائی اہم نکتہ ہے۔

انتظارِ فَرَج کا مفہوم

عقیدۂ مہدویت کے حوالے سے دوسرا اہم نکتہ انتظارِ فَرَج ہے۔ انتظارِ فرج ایک بہت ہی وسیع موضوع ہے۔ ایک انتظارِ فرج یعنی آخری فَرَج وگشائش کا انتظار ہے۔ انسان جب عالمی طاغوتوں کو قتل و غارت گری، ظلم و تعدّی کرتے اور لوگوں کو اپنے زرخرید غلام بنانے کے درپے دیکھے تو ہرگز یہ خیال نہ کرے کہ دنیا کی تقدیر میں یہی کچھ لکھا ہوا ہے، وہ یہ نہ سوچے کہ اس کے علاوہ کوئی اور چارۂ کار نہیں ہے لہٰذا ہمیں ان مظالم کو سہنا ہی ہوگا۔ نہیں! ایسا نہیں ہے بلکہ یہ جان لینا چاہیے کہ یہ کھٹن وقت اور حالات بہت ہی جلد گزرنے والے ہیں کیونکہ ”لِلْبَاطِلِ جَوْلَةٌ“[1] اور ہاں جو چیز اس دنیا اور اس کی فطرت سے تعلق رکھتی ہے وہ عدل و انصاف پر مبنی ایک حکومت کا قیام ہے اور وہ قائم ہو کر رہے گی۔ گویا آج ہم جس زمانے میں جی رہے ہیں اور اپنی آنکھوں سے بشریت کو ظلم و ستم سہتے ہوئے دیکھ رہے ہیں یہی انتظارِ فرج کا ایک مصداق، اس دنیا کی انتہا اور اس کی آخری لہر ہے۔ البتہ انتظارِ فرج کے اور بھی مصادیق ہیں۔

جب ہم سے کہا جاتا ہے کہ فَرَج کا انتظار کرو تو اس کے معنی فقط یہ نہیں کہ ہم فرجِ نہائی کا انتظار کریں بلکہ اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ اس راہ میں جو بھی رکاوٹیں ہیں انہیں دور کرنے کی کوشش کریں۔ فرج یعنی گشائش۔ ایک مسلمان انتظارِفرج سے یہ درس حاصل کر لیتا ہے اور یہ سیکھ لیتا ہے کہ انسانی زندگی میں کوئی بھی رکاوٹ

---

[1] باطل کے لیے صرف ایک طلاطم اور جولانی ہے۔ (یعنی وہ تیزی سے آتا اور گزر جاتا ہے۔) (غرر الحکم و دُرر الکلم، ص۷۱)

ایسی نہیں ہے کہ جسے دور نہ کیا جا سکتا ہو۔ لٰہذا ضروری ہے کہ انسان کو کبھی بھی مایوس ہو کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ کر یہ نہیں کہنا چاہیے کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے، ایسا نہیں ہے، بلکہ انسانی زندگی کی آخری سرحد پر جسے اس نے ظالموں اور ستمگروں سے مقابلے میں گزارا ہے خورشیدِ فرج طلوع ہو کر رہے گا۔ پس انسانی زندگی کو درپیش تمام مسائل و مشکلات اور رکاوٹیں بھی اسی متوقع فرج کے انتظار میں ہیں یہ ایک ایسا سبق ہے کہ جس سے ساری انسانیت کی اُمیدیں وابستہ ہیں اور یہی پوری انسانیت کے لیے انتظارِ فرج کا واقعی اور حقیقی درس ہے۔

لٰہذا انتظارِ فرج کو بہترین عمل قرار دیا گیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انتظار ایک عمل ہے بے عملی نہیں۔ ہمیں غلط فہمی میں رہتے ہوئے یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ انتظار کا مطلب یہ ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے کچھ ہونے کے منتظر رہیں، بلکہ انتظار ایک عمل کانام ہے، تیاری اور آمادگی کا نام ہے، اپنے دل و دماغ کو تقویت پہنچانے کا نام ہے۔ انتظار کا مطلب انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں نشاط و تازگی کے ساتھ تلاش و جستجو ہے۔ انتظار حقیقت میں اس آیتِ مجیدہ کی تفسیر کا نام ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے: “وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ”[۱] اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے: “إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ”[۲] یعنی اقوام اور ملتوں کو کبھی بھی فرج اور کشادگی سے مایوس اور نااُمید نہیں ہونا چاہیے۔ اُس وقت جب ایرانی قوم نے (جبر و استبداد کے خلاف) قیام کیا تھا تو اس نے بھی اسی اُمید کی بناپر قیام کیا تھا اور آج اس کی وہ اُمید پوری ہوگئی ہے اور اُس نے اپنے اس قیام سے ایک بہت بڑا نتیجہ حاصل کیا ہے اور آج بھی اپنے مستقبل سے اُمیدیں وابستہ کیے ہوئے پورے نشاط و تازگی کے ساتھ مصروفِ عمل ہے۔ یہ اُمید کا نور ہی ہے جو جوانوں کے اندر جذبہ،

۱۔ اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ جن لوگوں کو زمین میں کمزور بنا دیا گیا ہے ان پر احسان کریں اور انہیں لوگوں کا پیشوا بنائیں اور زمین کا وارث قرار دیں۔ (سورہ قصص، آیت۵)

۲۔ زمین اللہ کی ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے اور انجامِ کار بہر حال صاحبانِ تقویٰ کے لیے ہے۔ (سورہ اعراف، آیت۱۲۸)

شوق اور ہیجان پیدا کر دیتا ہے، دلوں سے افسردگی اور نااُمیدیوں کا خاتمہ کر دیتا ہے اور معاشرے کے اندر تحقیق و جستجو کے جذبے کو زندہ کر دیتا ہے۔ یہی انتظارِ فرج کا نتیجہ ہے۔

لٰہذا اس اعتبار سے جہاں ہمیں آخری فرج کا انتظار کرنا چاہیے وہاں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر مرحلے میں ایک فرج کا بھی انتظار کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنے دلوں پر مایوسی کے بادلوں کو چھانے نہیں دینا چاہیے۔ بلکہ ہمیں ہمیشہ انتظارِفرج میں رہنا چاہیے اور ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ یہ فرج اور کشادگی ہو کر رہے گی بشرطیکہ ہمارا انتظار حقیقی اور واقعی انتظار ہو، عمل اور جدوجہد کے ساتھ ہو، شوق اور جذبے کے ساتھ ہو۔

(۲۰-۹-۲۰۰۵ء)

آج ہم فَرَج (کشائش) کے منتظر ہیں۔ یعنی ہمیں یہ انتظار ہے کہ عدل و انصاف قائم کرنے والا کوئی طاقتور اور مضبوط ہاتھ آجائے اور معاشرے سے ظلم و ستم کو جس نے پوری بشریت کو جکڑ رکھا ہے، اُکھاڑ پھینکے اور ظلم و جور کی فضاؤں کو دگرگوں کردے اور انسانوں کی زندگی میں نسیمِ عدل کے جھونکوں سے تازگی لائے تاکہ سارے انسان عدل و انصاف کو محسوس کر سکیں اور یہ ایک زندہ اور باخبر انسان کی دائمی ضرورت ہے، ایک ایسا انسان جو صرف اپنے آپ میں مگن نہ ہو، صرف اپنی زندگی میں مست نہ ہو۔ وہ انسان جو وُسعتِ نظری سے کام لیتے ہوئے عام انسانوں کی زندگیوں کا جائزہ لے رہا ہو، وہ فطری طور پر انتظار ہی کی حالت میں ہوتا ہے۔ یہی انتظار کا معنی ہے؛ یعنی انسان کا زندگی کی موجودہ حالت سے مطمئن نہ ہوتے ہوئے اسے قبول نہ کرنا اور ایک قابلِ قبول حالت تک پہنچنے کی کوشش کرنا اور یہ مسلم ہے کہ یہ قابلِ قبول حالت ولیِ خدا حضرت حجۃ ابن الحسن امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے قوی اور توانا ہاتھوں سے پیدا ہو کر رہے گی۔ لٰہذا ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے آپ کو ایک مجاہد اور ایک ایسے انسان کے طور پر تیار کریں جو ایسے حالات سے نبرد آزما ہو سکے۔ انتظارِ فرج کے معنی یہ نہیں کہ انسان کسی کام کو ہاتھ لگائے بغیر بیٹھ جائے، اپنی طرف سے اصلاح کی کوئی کوشش نہ کرے اور صرف اِس بات پر خوش ہو جائے کہ ہم تو امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے منتظرین میں

سے ہیں۔ یہ انتظار نہیں۔ تو پھر انتظار کیا ہے؟ ایک ایسے قوی و قدرتمند الٰہی اور ملکوتی ہاتھ کا انتظار کہ وہ آئے اور انہی انسانوں کی مدد سے دنیا سے ظلم و ستم کی حکومت کا خاتمہ کر دے اور حق کو غلبہ عطا کرے۔ لوگوں کی زندگی میں عدل و انصاف کا بول بالا کرے، توحید کے پرچم کو لہرائے اور انسانوں کو خدا کے واقعی اور حقیقی بندے بنائے اور اس کام کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے کی ضرورت ہے۔

رول ماڈل انسانی معاشرے کی تشکیل

اسلامی جمہوریہ کی تشکیل اسی عظیم الشان تاریخی انقلاب کی ایک تمہید ہے۔ عدل و انصاف کے قیام کے لیے اُٹھائے جانے والے یہ سب اقدام اس عظیم الشان ہدف کی طرف ایک قدم ہیں، انتظار کے معنی یہ ہیں۔ انتظار حرکت کا نام ہے خاموشی اور بیٹھ جانے کو انتظار نہیں کہتے۔ انتظار اسے نہیں کہتے کہ انسان اس خیال کے ساتھ بیٹھ جائے کہ ہر کام خود بخود ہو جائے گا بلکہ انتظار کا مطلب حرکت کرنا ہے، انتظار تیار رہنے کو کہتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اس تیاری کو اپنے وجود میں اور اپنے گرد و پیش کے ماحول میں بھی ظاہر کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری قوم کو اتنی بڑی نعمت سے نوازا ہے۔ ملتِ ایران نے یہ عظیم قدم اُٹھانے میں کامیابی حاصل کی ہے اور حقیقی انتظار کے ماحول کو تیار کیا ہے، انتظارِ فرج کے یہی معنی ہیں۔

(۱۷۔۸۔۲۰۰۸ء)

مہدوی معاشرہ یعنی وہ دنیا کہ جس میں حضرت امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف تشریف لائیں گے تاکہ اسے ایک ایسی دنیا بنا سکیں کہ جس کی تشکیل کے لیے تمام انبیاءؑ آئے ہیں، یعنی تمام انبیاءؑ اس امر کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے تمہید کی حیثیت رکھتے تھے تاکہ ایک رول ماڈل انسانی معاشرہ تشکیل دیا جا سکے جو بالآخر مہدی موعودؑ ہی کے ہاتھوں اس دنیا میں قائم ہو کر رہے گا اور اس کی مثال ایک ایسی بلند وبالا عمارت سے دی جا سکتی ہے کہ جس کی تعمیر کے لیے کوئی زمین سے کوڑا کرکٹ صاف کر رہا ہوتا ہے، تو کوئی زمین کو ہموار کر رہا ہوتا ہے، کوئی زمین پر نقشہ کھینچ رہا ہوتا ہے، تو

کوئی کھدائی کا کام کرتا ہے، کوئی پلرز نکال رہا ہوتا ہے، تو کوئی دیواریں چُن رہا ہوتا ہے۔ الغرض اس عمارت کی تعمیر پر مامور افراد یکے بعد دیگرے آتے جاتے ہیں اور عمارت کی تعمیر و توسیع کے کاموں کو انجام دیتے جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہ بلند و بالا عمارت اپنی بنیادوں پر استوار ہو جاتی ہے۔ چنانچہ تاریخ بشریت میں انبیاء الٰہی علیہم السلام بھی یکے بعد دیگرے آتے رہے اور انسانی تہذیب و تمدن کو الٰہی اقدار سے ہم آہنگ کرتے اور اسے ایک ایسے رول ماڈل انسانی معاشرے کی طرف بڑھاتے رہے جس کی تشکیل ان کا آخری ہدف تھا۔ تمام انبیاء کرام علیہم السلام اپنے اپنے اہداف میں کامیابی سے سرفراز ہوتے رہے یہاں تک کہ کوئی ایک نبی بھی اپنے اس دیرینہ مقصد میں ناکام و نامراد نہ ہوا۔ یہ ایک سنگین بوجھ تھا جسے ان عظیم ہستیوں کے کاندھوں پر رکھ دیا گیا تھا اور انہوں نے اپنی تمام تر توانائیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اسے آگے بڑھانے کی پوری کوشش کی اور اسے اپنے منزل سے نزدیک کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جب ان میں سے کوئی اپنی عمر کی آخری سرحد کو چھو لیتا تو کوئی اور آگے بڑھتا اور اس سنگین بار کو اپنے کاندھوں پر اُٹھا لیتا اور اسے اس کی منزل کے قریب کرتا جاتا تھا۔ ولی عصر حضرت امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف جو ان تمام انبیاءؑ کے وارث بھی ہیں وہ ظہور فرمائیں گے اور آخری قدم چل کر اس بارِ سنگین کو اس کی حقیقی منزل و مقصود تک پہنچاتے ہوئے ایک الٰہی معاشرہ تشکیل دیں گے۔

اب میں یہاں پر اس معاشرے کی خصوصیات کے حوالے سے کچھ چیزیں بیان کرنا چاہوں گا۔ البتہ اگر اسلامی کتابوں اور اسلام کے اصلی منابع میں ذرا غور فرمائیں تو آپ اس معاشرے کی تمام خصوصیات کے حوالے سے معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ دعائے ندبہ ہی کو لے لیجئے جسے آپ حضرات ہر جمعہ کو پڑھتے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے آئندہ بھی پڑھتے رہیں گے، اس میں بھی اس معاشرے کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں جیساکہ آپ پڑھتے ہیں کہ: ''اَیۡنَ مُعِزُّ الۡاَوۡلِیَآءِ وَ مُذِلُّ الۡاَعۡدَآءِ'' گویا اس معاشرے میں اولیائے الٰہی کی عزت ہوگی اور دشمنانِ اسلام ذلیل و خوار ہوں گے۔ یعنی اس معاشرے کے اقدار اور معیار اس قسم کے ہوں گے۔ ''اَیۡنَ الۡمُؤَمَّلُ

لِاِحْیَآءِ الْکِتَابِ وَ الْحُدُوْدِ‘‘ وہ ایک ایسا معاشرہ ہوگا جہاں حدودِ الٰہی نافذ ہوں گی یعنی وہ تمام حدود جنہیں خدا اور اسلام نے معین فرمایا ہے حضرت امام مہدی عج کی حکومت میں ان کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا۔ حضرت امام زمانہ عج اپنے ظہور کے بعد جس معاشرے کی تشکیل کریں گے اس کی کئی ایک خصوصیات ہوں گی میں یہاں پر ان میں سے چند ایک کو بیان کر دیتا ہوں آپ بھائیوں اور بہنوں سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ قرآن مجید اور دعاؤں کی تلاوت کرتے وقت اپنے اذہان کو ان چیزوں کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کریں، صرف دعائیں پڑھنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان دعاؤں کو سمجھنا اور ان سے درس لینا بھی ضروری ہے۔ حضرت امام زمانہ عج اپنے معاشرے کی بنیاد مندرجہ ذیل چند خصوصیات پر رکھیں گے:

پہلی خصوصیت: سب سے پہلے آپؑ ظلم و استبداد کی جڑوں کو اُکھاڑ پھینکیں گے؛ یعنی آپؑ جس معاشرے کو تشکیل دیں گے اس میں ظلم و جور کا نام و نشان تک نہ ہوگا اور یہ صرف کسی ایک خطّے میں نہیں، پورے عالم اسلام سے بلکہ پوری دنیا سے ظلم و جور کا خاتمہ ہوگا اور وہ بھی نہ تو اقتصادی طور پر ظلم ہوگا اور نہ سیاسی، نہ فرہنگی اور نہ ہی کسی اور اعتبار سے یعنی کسی بھی قسم کا ظلم و جور اس معاشرے میں نہیں ہوگا۔ بلکہ آپؑ کے قائم کردہ معاشرے سے استحصال، طبقاتی نظام، ناانصافی، زبردستی اور ہٹ دھرمی اور زیادتی کا قلع قمع ہو جائے گا۔ یہ ہے امام زمانہ عج کے قائم کردہ معاشرے کی پہلی خصوصیت۔

دوسری خصوصیت: حضرت امام زمانہ عج جو مثالی معاشرے قائم کریں گے اس کی دوسری خصوصیت یہ ہوگی کہ اس معاشرے میں لوگوں کی فکری سطح بلند ہوگی، علمی لحاظ سے بھی اور اسلامی لحاظ سے بھی؛ یعنی امام زمانہ عج کے دور میں آپ کو پوری دنیا میں فکری اور فرہنگی اعتبار سے جہالت اور ناخواندگی کا کوئی نام و نشان تک نہیں ملے گا۔ اس معاشرے میں لوگ دینی مسائل کو آسانی سے سمجھ لیں گے اور یہ (جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ) انبیائے الٰہی علیہم السلام کے بڑے اہداف میں سے ایک ہے۔ جیسا کہ امیر المومنین امام علیؑ نہج البلاغہ میں اس مطلب کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے فرماتے ہیں:

''وَ یُثِیرُوا لَهُمْ دَفَائِنَ الْعُقُول''[1] ہمارے یہاں روایتوں میں آیا ہے کہ جب حضرت امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف ظہور فرمائیں گے تو اس وقت گھریلو خواتین بھی اپنے گھروں میں بیٹھے بیٹھے قرآن کھول کر اس میں سے دین کے حقائق استخراج کریں گی اور انہیں سمجھ لیں گی۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت لوگوں کی دینی اور اسلامی سوچ کا معیار اتنا بلند ہوگا کہ معاشرے کے تمام لوگ، یہاں تک کہ وہ گھریلو خواتین جن کا معاشرے سے کوئی زیادہ سر و کار نہیں رہتا وہ بھی اپنے گھروں میں بیٹھے بیٹھے فقہ کی ماہر ہوں گی، دین کی ماہر ہوں گی۔ وہ قرآن کھول کر دین کے حقائق خود قرآن سے اخذ کر سکیں گی۔

آپ غور فرمائیں! جس معاشرے کے تمام افراد (مرد اور خواتین) قرآن مجید کو سمجھتے ہوں اور اس سے احکام استنباط کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں وہ معاشرہ کتنا نورانی ہوگا جس میں جہالت اور تاریکی کا کوئی عنصر نہیں پایا جاتا ہے تو پھر ایسے معاشرے میں آج کی طرح کے مختلف طرزِ تفکر اور طرزِ زندگی کا وجود بھی ہرگز نہ ہوگا۔

تیسری خصوصیت: حضرت امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے قائم کردہ معاشرے (یا دوسرے لفظوں میں مہدوی معاشرے) کی تیسری خصوصیت یہ ہوگی کہ اس دور میں تمام انسانی توانائیاں اور زیر زمین موجود ذخائر ظاہر ہو جائیں گے۔ زمین کے اندر ایسی کوئی چیز باقی نہیں رہے گی کہ جس سے انسان استفادہ نہ کر سکتا ہو، سارے قدرتی وسائل، ساری زمینیں انسان کو غذائی اجناس فراہم کر سکیں گی۔ اسی طرح زیر زمین موجود وہ تمام قدرتی وسائل جو کئی صدیوں تک لوگوں کے لیے کشف نہیں ہوئے تھے جیسے ایٹم اور دیگر الیکٹرک کے برقی ذرائع۔ یہ چیزیں کئی صدیاں گزرنے تک لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ تھیں اور انسان ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا لیکن بعد میں آہستہ آہستہ ظاہر ہوتی گئیں۔ اس قسم کے بے شمار قدرتی وسائل جو اَب بھی انسانی نظروں سے پوشیدہ ہیں، وہ سب حضرت

---

[1] وہ ضلالت اور گمراہی کی تاریکی کی وجہ سے کفر کے پردوں میں چھپے ہوئے عقل کے دفینوں کو پردوں سے باہر نکالیں اور ان سے استفادہ کریں گے۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۱)

امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے دور میں آشکار ہو جائیں گے۔ حضرت امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے قائم کردہ معاشرے کی دیگر خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہوگی کہ اس دور میں عزّت و احترام کا معیار اور محور اخلاقی فضیلت ہوگی؛ یعنی جو زیادہ بااخلاق اور باتقویٰ ہوگا وہ زیادہ عزت و احترام کا حقدار ہوگا۔

(۲۷-۶-۱۹۸۰ء)

ایک اور روایت میں آیا ہے:

''اَلْقَائِمُ مِنَّا مَنْصُورٌ بِالرُّعْبِ مُؤَيَّدٌ بِالنَّصْرِ تُطْوَى لَهُ الْأَرْضُ وَتَظْهَرُ لَهُ الْكُنُوزُ وَيَبْلُغُ سُلْطَانُهُ الْمَشْرِقَ وَالْمَغْرِبَ''[1] یعنی ہمارے قائم عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف اپنے رُعب و دبدبے کے ذریعے منصور ٹھہریں گے اور ظالم و جابر حکومتیں اور طاغوتی سلطنتیں آپؑ سے مرعوب ہوں گی۔ یہ وہ چیز ہے جس کی ایک ہلکی سی جھلک آج آپ اپنی مملکت میں مشاہدہ کر رہے ہیں۔ آج ہماری حکومت، ہمارا معاشرہ اور ہمارا اسلامی نظام کہ جو (اس عالمی) اسلامی حکومت کی ایک چھوٹی سی جھلک ہے، بلکہ یہ کہا جائے کہ ہماری حکومت اس بحرِ بیکران اور عظمتِ الٰہی کے سامنے ایک قطرے کی مانند ہے، اس نے آج دنیا کی ظالم و جابر اور استکباری طاقتوں کے دلوں پر جو رُعب و دبدبہ ڈالا ہے وہ خود ہماری کامیابی کا باعث بنا ہے۔ آج دنیا کی استکباری طاقتیں اسلامی جمہوریہ سے، ہمارے انقلاب سے، ہماری ملت سے اور ہمارے نظام سے خائف ہیں۔ اسی ڈر اور خوف کی وجہ سے وہ ہمیشہ یہ کوشش کرتی نظر آتی ہیں کہ دنیا کے ظالموں اور مستکبروں کے سامنے مزاحمت کرنے والی اِس حکومت کو ختم کر دیں لیکن ان کی کوششوں کے برخلاف (جیسا کہ آپ مشاہدہ کر رہے ہیں) دنیا کے سیاسی میدان میں اسلام اور مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ کامیابیاں نصیب ہو رہی ہیں۔

---

[1] ہمارے قائم عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف دشمنوں کے دلوں میں اپنے رُعب و دبدبے کے ذریعے منصور ٹھہریں گے اور حق تعالیٰ کی مدد اور نصرت ان کے شامل حال رہے گی، زمین کی بساط آپؑ کے سامنے لپیٹ دی جائے گی، زیرِ زمین چھپے ہوئے خزانے اپنے آپ کو حضرتؑ کے سامنے ظاہر کریں گے اور آپؑ کی سلطنت کی سرحدیں مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی ہوں گی۔ (کمال الدین و تمام النعمہ، ج۱، ص۳۳۱)

امام زمانہؑ کی عالمی حکومت

حضرت ولی عصرؑ کی حکومت ہمہ گیر اور عمومی ہونے کے ناطے پورے عالم میں اس کی سرحدیں پھیلی ہوئی ہوں گی ''مُؤَيَّدٌ بِالنَّصرِ'' تائید و توفیقِ الٰہی ہمیشہ اس کے شاملِ حال رہے گی، زمین کی بساط آپؑ کے سامنے لپیٹ دی جائے گی؛ یعنی پوری کائنات کا اختیار اور اس پر حقِ تسلّط حضرت امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا ہوگا۔ زیرِ زمین پوشیدہ خزانے آپؑ کے سامنے ظاہر ہوں گے اور آپؑ کی حکومت کی سرحدیں مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی ہوں گی۔

اس کے چند جملوں کے بعد فرماتے ہیں: ''فَلَا يَبْقَى فِي الْأَرْضِ خَرَابٌ إِلَّا قَدْ عُمِرَ''[1] یعنی امامؑ کو یہ جو قدرت و طاقت ملے گی آپؑ اسے دنیا کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کریں گے نہ کہ لوگوں کے حقوق اور منافع غصب کرنے اور انہیں کمزور کرنے پر صرف کریں گے۔ اس زمانے میں دنیا کے کسی کونے میں بھی کوئی ایسی جگہ نہیں ہوگی جو ویران اور غیرآباد ہو، یعنی ہر جگہ آباد ہوگی چاہے وہ ویرانی اور خرابی انسانوں کے اپنے ہی ہاتھوں ہوئی ہو یا انسانوں کی جہالت کی وجہ سے ویران ہو گیا ہو۔ اس سلسلے میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک روایت نقل کی گئی ہے جس میں آپؑ فرماتے ہیں: ''حَتَّى إِذَا قَامَ الْقَائِمُ جَاءَتِ الْمُزَايَلَةُ وَأَتَى الرَّجُلُ إِلَى كِيسِ أَخِيهِ فَيَأْخُذُ حَاجَتَهُ فَلَا يَمْنَعُهُ''[2] یہ حدیث اس وقت کے انسانوں کے درمیان بھائی چارگی کی فضاء اور مساوات و برابری کی طرف اشارہ کرتی ہے، ایثار و قربانی کے انسانی جذبے کی طرف اشارہ ہے، اسی طرح بخل و کنجوسی اور حرص و طمع جیسی بیماریوں سے بنی نوع انسان کی رہائی اور نجات کی طرف اشارہ ہے یقیناً انسان کی بدبختی کی ابتداء ہی بخل اور لالچ جیسی قلبی و روحانی بیماریوں سے ہوتی ہے گویا یہ ایک خاص کیفیت

---

[1] زمین کا کوئی حصّہ ویران نظر نہیں آئے گا مگر یہ کہ وہ قابلِ استفادہ اور آباد ہوگا۔ (کمال الدین و تمام النعمہ، ج۱، ص۳۳۱)

[2] جب حضرت قائم عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف ظہور فرمائیں گے تو سخاوت اور فیاضی اس طرح عام ہوگی کہ لوگ بغیر پوچھے اپنے دوستوں کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنی ضرورت کے مطابق پیسے نکالیں گے اور وہ برا نہیں مانیں گے۔ (وسائل الشیعہ، ج۵، ص۱۲۱)

اور حالت، جس کا اس وقت کے معاشرے میں بول بالا ہوگا، کے متعلق بشارت اور خوشخبری ہے۔ انسان اپنے بھائی کی جیب سے بغیر پوچھے اپنی ضرورت کے مطابق رقم نکالے گا اور کوئی اسے روکنے ٹوکنے والا نہیں ہوگا۔

یہ بات اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اس وقت نظامِ اسلامی مکمل طور پر نافذ العمل ہوگا اور معاشرہ اخلاقی اقدار کے اوجِ کمال کو پہنچ چکا ہوگا؛ یعنی اس وقت زبردستی اور مجبوری نام کی کوئی چیز ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔ تمام انسان بخل و کنجوسی اور حرص جیسی روحانی بیماریوں اور غلاظتوں سے پاکیزہ و منزّہ ہو چکے ہوں گے اور دنیا میں جیتے جی گویا بہشتی کرامات اور رحمتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔ چنانچہ ایک اور روایت میں ارشاد ہوتا ہے: ''إِذَا قَامَ قَائِمُنَا اضْمَحَلَّتِ الْقَطَائِعُ فَلَا قَطَائِع''[۱] دنیا کی استکباری حکومتیں جو ہمیشہ اپنے دوستوں اور حامیوں کو تحفے تحائف سے نوازتی ہیں اور حاتم طائی بن کر عوام کا مال، لوگوں میں تقسیم کرتی رہتی ہیں ان تمام لوگوں کی دنیوی بساط لپیٹ دی جائے گی۔ ''قطیعہ'' کی گذشتہ زمانوں میں کوئی اور شکل و صورت تھی لیکن آج کل اس کا انداز بدل چکا ہے۔ گذشتہ زمانے میں اس کی ماہیت یہ تھی کہ کوئی بادشاہ یا حاکم زمین کے کسی ٹکڑے، کسی صحرا، کسی دیہات، کسی شہر اور کبھی تو پورے ایک صوبے کو کسی ایک شخص کے حوالے کر دیتا تھا اور اس سے کہتا تھا: جاؤ وہاں جاکر جو کچھ کرنا چاہو کرو۔ وہاں کے لوگوں سے مالیات لو، وہاں کی زراعت اور کھیتی باڑی سے استفادہ کرو، جو بھی مالی فائدہ ہوگا وہ تمہارا ہوگا۔ ہاں بس اس میں سے بادشاہ سلامت کا حصّہ بھجوا دینا، لیکن آج اس کی شکل و صورت بدل چکی ہے۔

آج کے حکمران لوگوں سے رشوتیں لیکر پٹرولیم مصنوعات، تجارتی منڈیاں اور بڑے بڑے کار خانے بخش دیتے ہیں جس کی وجہ سے کوئی دوسرا شخص اس جیسی کمپنی یا کاروبار نہیں کر سکتا ہے۔ لہٰذا آج کے دور میں قطیعہ انحصار طلبی یعنی ''لمیٹڈ'' کی صورت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ آج کے دور کی انحصار طلبی بھی حقیقت میں قطائع ہی

۱۔ ہمارے قائم عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ظہور کے بعد زمینوں سے خراج کا سلسلہ ختم ہوچکا ہوگا اور کوئی زمین خراجی نہیں کہلائے گی۔ (جامع احادیث الشیعہ، بروجردی، ج۲۳، ص۱۰۱۲)

کے حکم میں آتی ہے کیونکہ یہ چیزیں حکمرانوں کے ساتھ مک مکا اور رشوت دے کر یا رشوت لے کر حاصل کی جاتی ہیں، لیکن (حضرت امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ظہور کے وقت) اس طرح کے انسان کش مظالم اور اخلاقی پستیوں اور رذائل کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے گا اور ملک و سلطنت کے وسائل سے لوگ یکساں طور پر مستفید ہوں گے۔ ایک اور روایت میں اس زمانے کے اقتصادی حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے: ''وَيُسَوِّي بَيْنَ النَّاسِ حَتَّى لَا تَرَى مُحْتَاجاً إِلَى الزَّكَاةِ''[۱]

یعنی مالی اور قتصادی حوالے سے لوگوں کے درمیان اس طرح مساوات اور برابری قائم ہو جائے گی کہ ڈھونڈنے سے بھی کوئی ایسا غریب اور نادار شخص آپ کو نہیں ملے گا کہ جس کو آپ اپنے مال کی زکات دے سکیں پس اس دور میں زکات کو عمومی مصارف میں خرچ کر دیا جائے گا اور فقراء کو نہیں دیا جائے گا کیونکہ زکات دینے کے لیے کوئی فقیر ملے گا ہی نہیں۔

لہٰذا اس قسم کی روایات موجود ہیں جو اس اسلامی بہشت اور دنیائے واقعی کی تصویر کشی کرتی ہیں جن لوگوں نے مدینہ فاضلہ کے نام سے اپنے تصوّرات و خیالات اور نظریات کا اظہار کیا ہے تو یہ باتیں اُن کے تصوّرات اور نظریات کی طرح من گھڑت اور خیالات و توہمات پر مبنی نہیں ہیں بلکہ یہ باتیں تو اصل اسلامی نعرے اور شعارِ اسلامی کی جھلکیاں ہیں اور یہ ساری باتیں عملی طور پر ہو کر رہیں گی۔ چنانچہ ہم اسلامی جمہوری حکومت میں اس بات کا بخوبی احساس کر رہے ہیں کہ کوئی ماورائے طبیعت قدرت حتماً کارفرما ہے اور کوئی فکر و نظریہ ضرور ایسا ہے جو تائید خداوندی اور وحی الٰہی سے متصل ہے۔ ایک معصوم انسان یقیناً اس طرح کے نظام کو بحال کر سکتا ہے اور فطری طور پر بشریت بھی اس طرح کے نظام کی تائید اور اس کا استقبال کرے گی یہ اس وقت کی دنیا کی ہلکی سی جھلک اور تصویری خاکہ ہے۔

(۱۰۔۴۔۱۹۸۷ء)

---

[۱] بحار الانوار، ج۵۲، ص۳۹۰

اب اگر آیات اور احادیث کا مطالعہ کریں (البتہ محققین اور دانشور حضرات یقیناً مطالعہ کر چکے ہیں) تو آپ کو اور بھی بہت ساری خصوصیات نظر آئیں گی۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں ظلم و ستم اور قتل و غاری گری کا کوئی وجود نہ ہو گا، جہاں لوگوں کے دینی اور علمی تفکرات و خیالات بلندترین سطح پر ہوں گے، وہ معاشرہ جس میں ہر قسم کی برکتیں، نعمتیں، نیکیاں اور دنیا بھر کی خوبصورتیاں ظاہر ہو جائیں گی اور انسانوں کے اختیار میں ہوں گی اور بالآخر اس معاشرے کا اصلی محور تقویٰ و پرہیزگاری، فضیلت و برتری، ایثار و قربانی، بھائی چارگی و مہرانی اور برابری و مساوات پر مبنی ہو گا۔ ایک ایسے معاشرے کا آپ اپنے ذہن میں تصور کیجئے یہ وہ معاشرہ ہو گا جسے حضرت مہدی موعود عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف اور ہمارے زمانے کے امامؑ اور ہمارے دیرینہ محبوبؑ (جو اس وقت بھی اس آسمان تلے اور روئے زمین پر ہمارے اور آپ کے درمیان موجود ہیں) تشکیل دیں گے اور اسے آگے بڑھائیں گے۔ یہ امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف سے متعلق ہمارا عقیدہ ہے۔

ہم ملتِ ایران نے بھی ایک انقلاب برپا کیا ہے۔ ہمارا یہ انقلاب درحقیقت اُس عظیم ہدف اور انقلاب کا پیش خیمہ، مقدمہ اور اس راہ میں ایک بڑا قدم ہے، جس انقلاب کو برپا کرنے اور اسے آگے بڑھانے کے لیے حضرت ولی عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف تشریف لائیں گے۔ اگر ہم نے یہ اقدام نہ اُٹھایا ہوتا تو یقیناً حضرت ولی عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا ظہور تاخیر کا شکار ہو سکتا تھا۔ آپ ملتِ ایران، شہداء کے والدین جو اپنے بیٹوں کی جدائی کا داغ سہہ رہے ہیں، اسی طرح وہ وہ لوگ جنھوں نے اس عرصے میں زحمتیں اور مشقتیں برداشت کی ہیں یہ یاد رکھیں کہ آپ لوگ انسانیت کی اس ہیجان آور تحریک کو اپنی منزل مقصود کی طرف رواں دواں کرنے اور حضرت ولی عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ظہور میں تعجیل کا سبب بنے ہیں۔ آپ لوگوں نے اس بارِ گراں کو اس کی منزل سے ایک قدم قریب تر کر دیا ہے۔ اس انقلاب کے ذریعے ایک بہت بڑی رکاوٹ (یعنی ظلم و استبداد پر مبنی شاہی حکومت جو اس مملکت میں قائم تھی اور جس نے ایک خطرناک قسم کے وبائی مرض اور کینسر کی شکل اختیار کر لی تھی) کا قلع قمع کرتے ہوئے اسے جڑوں سے اُکھاڑ پھینکا ہے۔

ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں؟

اب اس کے بعد ہم کیا کریں؟ اس کے بعد ہماری ذمہ داریاں واضح ہیں۔ سب سے پہلے تو ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ جس طرح ہمارے اس انقلاب کی بدولت ظہور حضرت ولی عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف ایک قدم قریب ہو گیا ہے اسی طرح اس انقلاب کے ذریعے امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ظہور کو مزید قریب سے قریب تر کیا جا سکتا ہے، یعنی جن لوگوں نے انقلاب برپا کیا اور اپنے اِس اقدام کے ذریعے اپنے آپ کو زمانے کے امامؑ کے قریب کیا ہے، وہی لوگ خود کو اپنے زمانے کے امامؑ کے مزید قریب تر کر سکتے ہیں، لیکن وہ کیسے؟ سب سے پہلے یہ کہ جس قدر اسلامی اقدار کو ہم نے ایران میں نافذ کر دیا ہے (بغیر کسی مبالغے کے یہ مکمل اسلام تو نہیں ہے لیکن بہرحال اسلام کے ایک حصّے کو نافذ کرنے میں یہ ملت کامیاب ہوئی ہے) اس مقدار کو کم از کم پورے عالم کے گوشہ و کنار اور ان دوسرے ممالک تک پھیلانے کی کوشش کریں، جہاں جہالت اور تاریکی چھائی ہوئی ہے اور جس حد تک اس سلسلے میں کوششیں کریں گے ہم اتنا ہی حضرت ولی عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ظہور میں معاون و مددگار ثابت ہوں گے۔

دوسرا یہ کہ حضرت امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے قریب ہونے کا مطلب زمان یا مکان کے لحاظ سے قریب ہونا نہیں ہے یعنی اگر آپ ظہورِ امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے قریب ہونا چاہتے ہیں تو ایسا نہیں کہ ظہور کا کوئی وقت معین ہو، یعنی سو سال یا پچاس سال بعد تاکہ ہم یہ کہہ سکیں ان پچاس سالوں سے تو دو یا تین گزر چکے ہیں لہٰذا اب سینتالیس یا اڑتالیس باقی بچتے ہیں، ایسا نہیں ہے اور مکان کے اعتبار سے بھی قریب ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم کہہ سکیں کہ یہاں سے مشرق، مغرب، شمال یا جنوب کی طرف چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ حضرت ولی عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کہاں پر تشریف رکھتے ہیں تاکہ ہم ان کے قریب ہو سکیں، ایسا بھی نہیں ہے بلکہ یہاں امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے قریب ہونے کا مطلب روحانی اور معنوی لحاظ سے قریب ہونا ہے؛ یعنی ہم اگلے پانچ، دس سالوں سے

لے کر سو سالوں تک اسلامی معاشرے کی کمیت اور کیفیت کو بڑھاتے ہوئے ظہورِ امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے قریب تر ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو اپنے اندر اور اپنے معاشرے میں (ہر جگہ انقلاب برپا کرتے ہوئے) تقویٰ و پرہیزگاری، زہد و معنویت اور اخلاقی اقدار و دینداری کو پروان چڑھاتے ہوئے خدا سے قریب ہو سکتے ہیں۔

لہٰذا سب سے پہلے حضرت ولی عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ظہور کا راستہ ہموار کیجئے اور جتنا ہو سکے مخلص اور مومن مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کی کوشش کریں تاکہ حضرت امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف اور ان کے ظہور کے قریب ہو سکیں۔ پس یوں ہم آہستہ آہستہ اپنے معاشرے، زمانے اور تاریخ کو ظہورِ ولی عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے قریب سے قریب تر کر سکتے ہیں۔

دوسرا نکتہ یہ کہ آج ہم اپنے اس انقلاب کے اندر مختلف تحریکیں اور نظریات دیکھ رہے ہیں۔ ان نظریات کو کس سمت آگے بڑھنا چاہیے؟ یہ نکتہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی مثال ایک ایسے طالب علم کی سی ہے جو پڑھ لکھ کر ریاضی کا استاد بننا چاہتا ہے اب اس طالب علم کو کس قسم کے مقدمات فراہم کیے جانے چاہییں؟ یعنی اس طالب علم کو ریاضی سے مربوط علوم کی تعلیم دینا ضروری ہے کیونکہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص جو ریاضی دان بننا چاہتا ہے اسے ہم فقہ پڑھانا شروع کردیں یا اس کے برعکس جو شخص فقیہ بننا چاہتا ہے اسے ہم علم طبیعت پڑھانا شروع کر دیں۔ پس مقدمات کا اس کی غرض و غایت کے مطابق ہونا ضروری ہے۔

اب جبکہ ہمارا مقصد اور ہدف مہدوی معاشرے کا قیام ہے جس کی خصوصیات کا تذکرہ پچھلے صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے تو ہمیں چاہیے کہ اپنے مقصد اور ہدف کے مناسب مقدمات بھی فراہم کریں، ہمیں ظلم برداشت نہیں کرنا ہوگا بلکہ ظلم کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونا ہوگا، چاہے وہ ظلم جیسا بھی ہو اور جس سے بھی سرزد ہوا ہو۔ ہماری سمت اور جہت احکام اور حدودِ الٰہی کا نفاذ ہونا چاہیے۔ ہمیں اپنے معاشرے کے اندر کسی بھی صورت میں غیراسلامی، بلکہ اسلام مخالف سوچ کو پروان نہیں چڑھنے دینا چاہیے لیکن یہ زور اور طاقت کے بل بوتے پر نہیں بلکہ فکر و حکمتِ عملی اور تدبّر کے

ذریعے ہو کیونکہ غور و فکر اور تدبّر کے بغیر غیراسلامی سوچ کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ عقل اور منطق کی روشنی میں ہی اسلامی فکر کو پروان چڑھایا جاسکتا ہے۔

لہٰذا ہماری حکومت اور حکومتی اداروں وغیرہ کے تمام قوانین اور مقررات کا مکمل طور پر اسلامی احکام کے عین مطابق ہونا ضروری ہے صرف یہی نہیں بلکہ ہر روز انہیں اسلامی بنانے کی کوششیں جاری رہنی چاہییں۔ یہی وہ سمت اور جہت ہے کہ جس کی طرف حضرت ولی عصرعجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا انتظار ہمیں کھینچ رہا ہے۔ جیسا کہ ہم دعائے ندبہ میں پڑھتے ہیں کہ حضرت امام زمانہعجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف فسق و فجور، ظلم و عدوان اور سرکشی و نفاق سے مقابلہ کریں گے اور نفاق، طغیان، معصیت، افتراق و انتشار اور دو رخی پالیسی کو ان کی جڑوں سے اُکھاڑ پھینکیں گے تو آج ہمیں بھی اپنے معاشرے میں تمام برائیوں کے خلاف عَلم بغاوت بلند کرنا ہوگا۔ یہی وہ کام ہے جو معنوی لحاظ سے ہمیں حضرت امام زمانہعجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے نزدیک کر سکتا ہے اور ہمارے معاشرے کو اس مہدی، علوی اور توحیدی معاشرے کے نزدیک اور قریب کر سکتا ہے۔

(۲۷-۶-۱۹۸۰ء)

موجودہ زمانے کی جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے اور اس سے جو نتیجہ ہم اخذ کرکے متاثر ہو سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں سے مایوسی اور نااُمیدی کو نکالتے ہوئے ان کے دلوں میں اُمید کی کرنیں روشن کریں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا جہاد مؤثر اور نتیجہ بخش ہے۔ کبھی کبھار بعض ایسے لوگ جو فکر اسلامی کے اس پہلو سے ناواقف ہیں وہ دنیا کی ان عظیم مادی ترقیوں کے مقابلے میں حیرت زدہ ہو کر مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ سوچنے لگتے ہیں کہ آخر دنیا کی ان سپر طاقتوں کا جو جدید ٹیکنالوجی اور ایٹم بم جیسے مہلک ہتھیاروں سے لیس ہیں، اگر کسی ملک میں کتنا ہی بڑا انقلاب آجائے، بھلا وہ کیونکر ان کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ لہٰذا وہ یہ سوچتے ہیں کہ ہم ان ظالم اور استکباری طاقتوں کا مقابلہ کرنے سے یکسر قاصر ہیں؛ لیکن عقیدۂ مہدویت پر ایمان اور حضور اکرمﷺ کی پاکیزہ ذرّیت سے وابستہ ایک شخص کے ہاتھوں دنیا میں عالمی اسلامی حکومت کے قیام کاعقیدہ، انسان کے اندر اُمید کی کرن روشن کر دیتا ہے اور وہ یہ کہتا ہے: نہیں جناب! ہم ان کا

مقابلہ کر سکتے ہیں کیونکہ آنے والا دور ہمارا ہے کیونکہ بالآخر ایسا ہونا ہی ہے کہ دنیا اُن کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے گی اور یہ ہو کر رہے گا۔ چونکہ تاریخ کا رُخ بھی اسی سمت ہے جس کی بنیاد آج ہم نے رکھ دی ہے اور اس کا ایک نمونہ پیش کر دیا ہے اگرچہ ہمارا یہ نمونہ ناقص ہے۔ یہ اُمید اگر مجاہد اقوام کے دلوں میں زندہ ہو جائے (بالخصوص مسلمان اقوام کے دلوں میں) تو ان کے اندر بھی ایک ایسا نیا ولولہ اور جوش پیدا ہو جائے گا کہ کوئی بھی طاقت انہیں میدانِ جنگ میں قدم رکھنے سے باز نہیں رکھ سکتی اور نہ ہی انہیں نفسیاتی یا ظاہری طور پر شکست دے سکتی ہے۔

غلط پروپیگنڈے کا ازالہ

یہاں پر ایک اور نکتے کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے، وہ یہ کہ تاریخ میں ایک طویل عرصے تک مسلسل غلط پروپیگنڈوں کے ذریعے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھائی گئی تھی کہ حضرت امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ظہور سے پہلے کسی بھی قسم کی اصلاحی تحریک چلانا فضول اور بے فائدہ ہے اور وہ اپنے اس دعوے کی دلیل یہ پیش کرتے تھے کہ ہمیں دنیا کو ظلم و جور سے پُر ہونے دینا چاہیے کیونکہ جب تک دنیا ظلم و جور سے پُر نہیں ہوگی امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا ظہور نہیں ہوگا۔ وہ کہتے تھے کہ امامؑ اس وقت ظہور فرمائیں گے جب دنیا ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی۔ یہاں پر ایک نکتہ قابلِ غور ہے کہ ان تمام روایات میں جن میں حضرت امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ظہور سے متعلق گفتگو کی گئی ہے ایک جملہ ملتا ہے کہ: ''يَمْلَأُ اللّٰهُ بِهِ الْأَرْضَ قِسطاً وَعَدْلاً كَمَا مُلِئَتْ ظُلْماً وَجَوْراً''[1] کسی ایک روایت میں بھی میں نے نہیں دیکھا ہے کہ یہ جملہ اس طرح آیا ہے ہو: ''بَعْدَ مَا مُلِئَتْ ظُلْماً وَجَوْراً'' اسی نکتے کو مدِّ نظر رکھ کر میں نے بہت ساری احادیث کو ٹٹولا اور مختلف ابواب میں تحقیق کی لیکن کسی بھی جگہ روایت میں ''بَعْدَ مَا مُلِئَتْ ظُلْماً وَجَوْراً'' کے الفاظ نہیں ملے بلکہ ہر جگہ ''كَمَا مُلِئَتْ ظُلْماً وَجَوْراً'' ہی ملا ہے؛ یعنی حضرت امام

---

[1] اللہ تعالیٰ حضرت امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ذریعے دنیا کو عدل و انصاف سے اس طرح بھر دے گا جس طرح وہ ظلم و جور سے بھر چکی تھی۔ (الکافی، ج۱، ص۳۴۱)

مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف دنیا کو عدل و انصاف سے پُر کردیں گے، اس کے بعد نہیں ہے کہ دنیا ظلم و ستم اور جور سے بھری ہوئی ہوگی بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح پوری تاریخ بشریت میں ایک مرتبہ نہیں بلکہ متعدد مرتبہ، اسی طرح ایک زمانے میں نہیں بلکہ مختلف زمانوں میں دنیا ظلم و جور سے بھر چکی ہے جیسے فراعنہ، طاغوتی ریاستوں اور دیگر ظالم و جابر سلطنتوں کے دور میں پوری دنیا پر کئی مرتبہ اس طرح ظلم و ستم کے بادل چھا چکے ہیں کہ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا تھا۔ کسی جگہ بھی نور کا کوئی وجود نہیں تھا، جو عدل اور دادگستری کی علامت ہو۔ پس اس دنیا نے اپنی تاریخ میں ایسے ایام کو دیکھا ہے تو اب ایک ایسا دن بھی دیکھے گی کہ دنیا کا گوشہ گوشہ نور اور عدل و انصاف سے پُر ہو جائے گا کوئی ایک جگہ بھی ایسی نہیں ہوگی جہاں عدل کا نور نہ پہنچا ہو اسی طرح کوئی ایک جگہ بھی نہیں ہوگی جہاں ظلم وستم کا کوئی نام و نشان موجود ہو؛ یعنی دنیا کا کوئی ایسا علاقہ نہیں ہوگا جہاں ظلم و ستم نام کی کوئی چیز باقی رہ جائے، جہاں کوئی شخص ظلم و ستم کی چکی میں پس رہا ہو اور نہ کوئی ایسی حکومت ہوگی جو لوگوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنا سکے اور نہ ہی انفرادی طور پر کوئی ایسا ڈکٹیٹر ہوگا جو کسی کو دبانے کی جرأت کر سکے اور نہ ہی طبقاتی نظام کا کہیں کوئی نام و نشان ہوگا۔ یعنی آج دنیا کے بیشتر علاقوں میں لوگ ظلم وستم کا نشانہ بن رہے ہیں۔ یقیناً ایک دن ایسا بھی آیا ہے یا آئے گا کہ دنیا کے تمام لوگ ظلم و بربریت کا نشانہ بن جائیں گے اور پھر اس کے بعد حالات یکسر بدل جائیں گے اور ہر طرف عدل و انصاف کا بول بالا ہوگا۔

(۱۰-۴-۱۹۸۷ء)

آج ہمارے انقلابِ اسلامی کی بدولت، جس کا بنیادی مقصد بھی دنیا میں عدل و انصاف کا بول بالا کرنا ہے، حضرت امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا عظیم انقلاب اپنے ہدف اور مقصد کے بہت ہی قریب ہو چکا ہے۔ اسلامی انقلاب کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ وعدۂ الٰہی تاخیر کا شکار نہیں ہوا ہے بلکہ اس کی آمد پہلے سے کہیں زیادہ نزدیک اور متوقّع ہوچکی ہے اور انتظار کے معنی بھی یہی ہیں۔ پس انتظارِ فرج، یعنی قرآن اور اسلام کی حاکمیت کا قیام۔ آج دنیا جس موڑ پر کھڑی ہے یقیناً آپ لوگ اس سے مطمئن نہیں ہیں یہاں تک انقلابِ اسلامی کے بعد ترقی کے اتنے سارے مراحل طے کر چکے ہیں اس پر بھی راضی نہیں

ہیں بلکہ قرآن اور اسلام کی حاکمیت کے اور نزدیک ہونے کے خواہشمند ہیں اور انتظارِ فرج اسی کو کہتے ہیں۔ یعنی انسانی کارکردگی اور عمل کے اوجِ کمال اور آسودگی کا نام انتظار ہے۔ آج پوری بنی نوع انسان مختلف مشکلات اور پیچیدگیوں میں گرفتار ہے۔ آج آئے روز انسانوں پر مادی تہذیب کو مسلّط کرنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں یہ بھی ایک مشکل ہے، اسی طرح آج دنیا میں رائج طبقاتی نظام سے بھی انسان پریشان ہے۔ یقیناً یہ بھی ایک بہت بڑی مشکل ہے۔ آج دنیا کی سپر طاقتیں اور سازشی عناصر اپنے غلط پروپیگنڈوں اور ہتھکنڈوں کے ذریعے ایک انقلابی ملت کی صدائے عدالت خواہی کو دبانے کی کوششیں کر رہے ہیں یہ بھی ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ آج افریقہ، لاطینی امریکا اور ایشیاء میں بسنے والے کروڑوں محروم، مستضعف اور مختلف رنگوں کے لوگ طبقاتی نظام کی وجہ سے پسے جارہے ہیں اور ان کی اُمید بھری نظریں ایک فریاد رس اور نجات بخش انسان کی راہ تک رہی ہیں لیکن دنیا کی سپر طاقتیں اس صدائے نجات بخش کو ان کے کانوں تک پہنچنے میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔ یہ بھی ایک گرہ ہے اور انتظارِ فرج کے معنی ان تمام گرہوں کو کھولنا ہے۔ لہٰذا اپنی نظر کو وسیع کیجئے اسے اپنے گھر کی چار دیواری تک محدود مت کیجئے آج پوری انسانیت فرج اور گشادگی کی منتظر ہے لیکن وہ فرج اور کشادگی کی راہوں سے ناواقف ہے۔ آپ اور تمام ملتِ اسلامیہ کو چاہیے کہ اپنی منظم جدوجہد کو جاری رکھتے ہوئے اس انقلابِ اسلامی کے تسلسل کے ذریعے اپنے آپ کو اور پوری انسانیت کو آہستہ آہستہ اس عالمی انسانی کشادگی کے قریب کریں اور مہدی موعود عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ظہور اور اُس عالمی اسلامی انقلاب کے نزدیک کرنے کی کوشش کریں جو پورے عالم انسانیت میں وقوع پذیر ہوگا اور ان تمام گرہوں کو کھول دے گا۔ اسی کو انتظارِ فرج کہتے ہیں۔ اس راہ میں خداوند عالم کا لطف و کرم اور حضرت ولی عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی مستجاب دعائیں ہمارے ساتھ ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ان کی معرفت حاصل کرتے ہوئے اپنے آپ کو ان کے نزدیک کریں اور اپنے زمانے کے امامؑ کو فراموش نہ کریں۔ ہماری مملکت درحقیقت حضرت امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف ہی کی مملکت ہے۔ اسی طرح ہمارا انقلاب بھی حضرت امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا انقلاب ہے کیونکہ یہ بھی اسلام کے نام ہی برپا ہوا ہے۔ لہٰذا ہمیشہ اپنے دلوں کو حضرت ولی اللہ الاعظمؑ کی یادوں سے منور کیجئے۔

اور دعائے ”اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَرْغَبُ إِلَيْكَ فِي دَوْلَةٍ كَرِيمَةٍ“[۱] پورے دل و جان اور راز و نیاز سے تلاوت کیجئے اور اپنی روح اور جسم دونوں کے ذریعے حضرت امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا انتظار کیجئے۔ یاد رکھیں! اس انقلاب کی کامیابی اور مضبوطی کے لیے اُٹھایا جانے والا آپ کا ایک ایک قدم آپ کو امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ظہور کے قریب تر کر دیتا ہے۔

(۱۹۔۶۔۱۹۸۱ء)

آج یہ جو حکومت آپ لوگوں کے ہاتھوں میں ہے یہ پچھلے ایک ہزار سال سے اللہ کے نیک اور مومن بندوں کی خواہش اور ان کے دلوں کی آواز ہے۔ ہمارے سارے ائمہ طاہرین علیہم السلام نے اسی راہ میں جدوجہد کی ہے تاکہ معاشرے میں خدا کی حاکمیت کو قائم کرتے ہوئے قوانینِ الٰہی کا نفاذ کر سکیں اور اس سلسلے میں بہت ساری کوششیں ہوئی ہیں اور راہِ خدا میں جہاد کرتے ہوئے رنج و الم برداشت کیے ہیں، جیلوں میں گئے ہیں، جلا وطنیاں کاٹی ہیں، یہاں تک کہ بہت سی قیمتی جانوں کے نذرانے پیش کیے ہیں اور آج آپ کو یہ موقع ملا ہے جس طرح بنی اسرائیل کو کئی صدیوں کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں موقع ملا تھا۔

(۸۔۵۔۱۹۸۱ء)

اے ملتِ اسلامیہ اور ایران کی غیوّر اور مجاہد قوم! آج آپ کے پاس جو کچھ بھی ہے اس کی قدر کو سمجھو اور اپنی حفاظت کرو تاکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی شاملِ حال ہو اور یہ حکومت حضرت امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی عظیم عالمی حکومت سے ملحق ہو جائے۔ یہ وہ راستہ جسے آپ ایران کی عزیز ملت نے اپنایا ہے، آج بھی اسی پر گامزن ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی خدا کی توفیق سے اسی راستے پر آگے بڑھتی رہے گی۔ یہ وہی راستہ ہے جس کو خوش قسمتی سے آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا کے گوشہ و کنار میں بسنے والی مسلمان قومیں کشاں کشاں اسی سمت پر گامزن ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ”وَ

---

[۱] اے پروردگار! ہم (امام زمانہ ؑ کی) دولتِ کریمہ کے زیر سایہ اپنی زندگی گزارنے کے مشتاق ہیں۔ (الکافی، دعائے افتتاح، ج۳، ص۴۲۴)

الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ''[۱] پس اگر ہم تقویٰ کو اپنے عمل کا شیوہ قرار دیں تو یقیناً کامیابی ملتِ اسلامیہ کا مقدر ہو کر رہے گی اور اس طرح کا درخشاں مستقبل کوئی زیادہ دور نہیں ہے بلکہ عنقریب حاصل ہونے والا ہے۔

(۲۱۔۲۔۲۰۱۱ء)

امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف سے توسُّل

آخر میں ایک اور نکتے کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ ہم میں سے ہر ایک کو روحانی، معنوی اور جذباتی طور پر اپنے زمانے کے معصوم امامؑ کے ساتھ رابطہ برقرار رکھنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس مسئلے کو فکری اور روشن فکری کے انداز میں تجزیہ اور تحلیل کرنے کی حد تک محدود نہ رکھیں۔ خدا کا یہ برگزیدہ امامؑ آج ہم انسانوں کے درمیان موجود ہیں۔ وہ دنیا کے کسی ایک خطے میں زندگی گزار رہے ہیں لیکن ہم نہیں جانتے۔ وہ بالکل موجود ہیں، وہ دعا کرتے ہیں، قرآن کی تلاوت کرتے ہیں، احکامِ الٰہی بیان فرماتے ہیں، رکوع کرتے ہیں، سجدہ کرتے ہیں، خدا کی عبادت کرتے ہیں، وہ لوگوں کے اجتماعات میں شریک ہوتے ہیں، لوگوں کی مدد فرماتے ہیں، وہ خارجی وجود رکھتے ہیں، وجودِ عینی کے حامل ہیں لیکن ہم انہیں پہچان نہیں سکتے۔ پس اللہ کا یہ منتخب اور برگزیدہ بندہ ہمارے درمیان موجود ہے ہمیں چاہیے کہ اجتماعی اور سیاسی حیثیت کے علاوہ (کہ الحمد للہ ہمارا موجودہ نظام ان شاء اللہ امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی خواہش کے مطابق ہے) انفرادی، شخصی اور قلبی طور پر بھی اپنے آپ کو ان سے وابستہ رکھیں اور اس رابطے کو مزید مضبوط اور مستحکم بنائیں؛ یعنی معاشرے کے ایک ایک فرد کو چاہیے کہ وہ حضرت ولی عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ساتھ متوسّل ہو، آپؑ کی معرفت حاصل کرے، آپؑ کے ساتھ راز و نیاز کرے، آپؑ کو سلام بھیجے اور آپؑ کی یاد اور آپؑ سے رابطہ رکھنے کو اپنا فرض سمجھے، اور آپؑ کی صحت و سلامتی کے لیے دعا کرے، جیسا کہ ہم روایات میں پڑھتے ہیں: ''اَللّٰهُمَّ كُنْ

---

[۱] نیک عاقبت بہر حال صاحبانِ تقویٰ کے لیے ہے۔ (سورہ اعراف، آیت۱۲۸)

لِوَلِيّكَ ۔۔۔''[1] یہ دعاؤں کے مجموعے میں سے ایک دعا ہے جو روایات میں آئی ہے۔ اسی طرح وہ زیارات جو کتابوں میں درج ہیں، جن کی ہم تلاوت کرتے رہتے ہیں یہ تمام زیارتیں جہاں ہمارے لیے فکری طور پر ائمہ علیہم السلام کی معرفت اور آگاہی کا سبب ہیں وہاں معنوی، قلبی، جذباتی اور احساساتی طور پر بھی تقویت کا سبب بنتی ہیں، لہٰذا ہمیں ان زیارتوں کی تلاوت کرتے رہنا چاہیے، ہمارے بچے، ہمارے جوان اور مملکت کی سرحدوں کی حفاظت پر تعینات ہمارے مجاہدین، حضرت امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی یاد اور ان سے توسّل سے روحانی قوت حاصل کرتے ہیں اور اپنے اندر تازگی اور شادابی کا احساس کرتے ہیں۔ یہ جس شوق سے گریہ کناں ہوتے ہیں اور اپنی آنکھوں سے اشکِ شوق بہاتے ہیں، اس کے ذریعے وہ اپنے دلوں کو اپنے زمانے کے امامؑ کے قریب کرتے ہیں۔اسی طرح وہ اپنے آپ کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ اور حضرت امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے لطف و کرم اور عنایات کا حقدار بناتے ہیں اور ایسا کرنا بہت ضروری بھی ہے۔

(۱۰۔۴۔۱۹۸۷ء)

اے امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف! اے اس ملت کے محبوب مہدی موعودؑ! اے انبیاء کی پاک و پاکیزہ نسل کے وارث! اور اے تمام عالمی اور توحیدی انقلابات کے وارث! ہماری اس ملت نے آپؑ ہی کی یاد اور آپؑ ہی کے نام سے اس انقلاب کا آغاز کیا ہے اور اپنی زندگی اور اپنے وجود میں آپؑ کے لطف و کرم کی یادوں کو بسا رکھا ہے۔

اے خدا کے نیک اور صالح بندے! آج ہماری ملت کو آپؑ کے پاک و پاکیزہ دل اور روح قدسی سے نکلنے والی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ آپؑ اس ملت اور اس انقلاب کی کامیابی کے لیے دعا کیجئے اور اپنے ان طاقتور ہاتھوں کے ذریعے جنہیں اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو عطا فرمایا ہے اس ملت اور اس انقلاب کی مدد کیجئے: ''عَزِيزٌ عَلَيَّ أَنْ أَرَى الْخَلْقَ وَلَا تُرَى''[2] اے امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف! ہمارے لیے یہ بہت گراں ہے کہ ہم اس دنیا میں جو اللہ کے نیک

۱۔ ''اللّٰهُمَّ كُنْ لِوَلِيّكَ الحُجَّةِ بْنِ الْحَسَن صَلَواتُكَ عَلَيهِ وَعَلىٰ آبائِهِ فِي هَذِهِ السَّاعَةِ وَفِي كُلِّ سَاعَةٍ وَلِيّاً وَحَافِظاً وَقَائِداً وَنَاصِراً وَدَلِيلًا وَعَيْناً حَتَّى تُسْكِنَهُ أَرْضَكَ طَوْعاً وَتُمَكِّنَهُ فِيهَا طَوِيلا'' (الکافی، ج۴، ص۶۲)

۲۔ میرے لیے یہ انتہائی سخت مرحلہ ہے کہ خدا کی تمام مخلوقات کو تو دیکھوں لیکن آپؑ کی زیارت سے محروم

اور برگزیدہ انسانوں کے لیے مخصوص ہے، اللہ کے دشمنوں کو دیکھیں اور ان کے آثار کو محسوس کریں لیکن آپؑ کی زیارت اور فیض وجود سے محروم رہیں۔

اے پروردگار! تجھے قسم ہے محمد و آل محمدؐ کی! ہمارے دلوں کو ہمیشہ حضرت امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی یاد سے منوّر فرما۔ اے پروردگار! ہماری آنکھوں کو حضرت ولی عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے جمال سے نورانی فرما۔ اے پروردگار! خدا کے اس لشکر اور ان انسانوں کو جنھوں نے تیری راہ میں جدوجہد کی ہے امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے سپاہیوں اور ان کے جانبازوں میں سے قرار دے۔

(۲۷۔۶۔۱۹۸۰ء)

پروردگار! محمد و آل محمدؐ کے صدقے میں اپنے ولی حضرت امام عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے دل کو ہم سے راضی اور خوشنود فرما اور ہم سب کو آپؑ سے متوسّل اور آپؑ کی طرف متوجہ رہنے والوں میں سے قرار دے۔

اے پروردگار! محمد وآل محمدؐ کی حرمت کے واسطے حضرت امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ظہور اور اس الٰہی حکومت کے قیام کو نزدیک سے نزدیک تر فرما۔

اے پروردگار! ہمیں اس نومولود نظام کو جو اسلام کے نام سے وجود میں آیا ہے حضرت امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی حکومت سے مشابہ بنانے کی توفیق عنایت فرما۔

اے پروردگار! حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آل محمد علیہم السلام کے صدقے میں ہمیں ہر حال اور ہر کام میں قائمِ آل محمد عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے دوستوں اور ان کے چاہنے والوں میں سے قرار دے۔

(۱۰۔۴۔۱۹۸۷ء)

آمِینَ یَا رَبَّ الْعَالَمِین

رہوں۔ (بحار الانوار، دعائے ندبہ کا ایک حصّہ، ج۹۹، ص۱۰۸)

علمی مقابلہ

اس کتاب کے متن سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے چند سوالات تیار کیے گئے ہیں، اگر آپ اس علمی مقابلے میں شرکت کرنا چاہتے ہیں تو اپنے جوابات درج ذیل کسی ایک طریقے سے ہمیں ارسال فرمائیں۔

۱۔ اپنے جوابات اِس ایڈریس پر ارسال فرمائیں: مشہد مقدّس، حرم مطہر امام رضاعلیہ السلام، صحن جمہوری اسلامی، مدیریت زائرین غیرایرانی، ص ب: ۳۱۳۱- ۹۱۳۷۵

۲۔ اپنے جوابات مذکورہ ای میل پر ارسال کریں:

iro@imamrezashrine.com

۳۔ اپنے جوابات حرم مطہر امام رضاعلیہ السلام کی مذکورہ سائٹ کے ذریعے ارسال کریں:

www.imamrezashrine.aqr.ir

سوالات:

۱۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک اسلامی نظام کے لیے کونسا دشمن سب سے زیادہ خطرناک تھا؟

الف: مدینہ منورہ کے اطراف میں بسنے والے وحشی و جنگجو قبائل۔

ب: مکہ مکرمہ کے اشراف اور وہاں کے متکبر، طاقتور اور باأثر سردار۔

ج: مدینہ میں رہنے والے یہودی اور منافقین۔

د: وہ دشمن جو ہر مسلمان اور مومن کے باطن میں موجود تھا۔ (یعنی نفسانی خواہشات، خود غرضیاں)

۲۔ اسلام اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے نزدیک حکمرانی کا کونسا مفہوم صحیح ہے؟

الف: سیاسی نظام کی تشکیل اور امامت کی بنیاد پر حکومت کی تاسیس۔

ب: اہل بیتِ وحی علیہم السلام کی مخصوص فکر کے مطابق دین کی تفسیر و تشریح۔

ج: معارفِ اسلامی اور دینی احکام میں شامل غلط تفسیروں اور تحریفات کا خاتمہ۔

د: مذکورہ تینوں موارد صحیح ہیں۔

۳۔ تشیع کی جدّوجہد جس کو "علوی تحریک" کا نام دیا جا سکتا ہے، کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟

الف: ائمہ اطہار علیہم السلام ان سخت اور کٹھن حالات میں بھی، عقلمندانہ اور شجاعانہ انداز سے تشیع کی اس چھوٹی لیکن گہری اور پائیدار تحریک کو دشوار اور خطرناک راہوں سے

گزارنے میں کامیاب رہے۔

ب: بنو اُمیہ اور بنو عباس کے خلفاء، ائمہ اطہار علیہم السلام کو شہید کرکے بھی امامت کی اس تحریک کو ختم نہ کر سکے۔

ج: بنو اُمیہ اور بنو عباس کے ظالم خلفاء، بالآخر ائمہ اطہار علیہم السلام کو شہید کرکے امامت کی اس تحریک کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

د: الف اور ب دونوں مورد صحیح ہیں۔

۴۔ وہ کونسی دو شخصیات ہیں جن کے لیے "ثَارَاللّٰہ" کی تعبیر استعمال کی گئی ہے؟

الف: امام حسین علیہ السلام اور سید الشہداء حضرت حمزہ علیہ السلام۔

ب: امام حسین علیہ السلام اور امام حسن علیہ السلام۔

ج: امام حسین علیہ السلام اور آپؑ کے والد امیر المومنین علی بن ابیطالب علیہما السلام۔

د: امام حسین علیہ السلام اور امام رضا علیہ السلام۔

۵۔ حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا کی اتّباع میں ایک مسلمان عورت پر کیا چیز واجب ہے؟

الف: وہ علم و حکمت حاصل کرے اور اپنی ذات کی معنوی و اخلاقی تربیت کے لیے اہتمام اور کوشش کرے۔

ب: وہ میدانِ جنگ و جہاد میں مجاہدین اسلام کے شانہ بشانہ شریک ہو اور وہ دنیوی زر و جواہر اور فیشن کی دلدادہ نہ ہو۔

ج: اس کی عفّت و پاکدامنی اور پاکیزگی ایسی ہو کہ اجنبی افراد کی نظریں جھکنے پر

مجبور ہو جائیں اور وہ گھر میں اپنے شوہر اور اولاد کے آرام و سکون کا باعث ہو۔

د: مذکورہ تینوں موارد صحیح ہیں۔

۶۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی بیٹی حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کے ہاتھ کیوں چومتے تھے؟

الف: آپؐ فقط پدرانہ محبت اور بیٹی سے اُنسیت کی وجہ سے بوسے لیتے تھے۔

ب: یہ اس بات کی علامت تھی کہ یہ بیٹی اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت انسانیت کی ملکوتی بلندیوں پر فائز تھی۔

ج: آپؐ کا یہ طرزِ عمل عورت کے بارے میں اسلام کا نکتۂ نظر ظاہر کرتا ہے۔

د: ب اور ج دونوں مورد صحیح ہیں۔

۷۔ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی ظاہری شکست کی اصلی وجہ کیا تھی؟

الف: لوگوں میں عمومی سوچ و بصیرت کی کمزوری۔

ب: لوگوں کے ایمان کی مادی خواہشات کے ساتھ ملاوٹ۔

ج: رہبریت کا متزلزل اور عمومی بیداری کا ضعیف ہونا۔

د: الف اور ب دونوں مورد صحیح ہیں۔

۸۔ اگر امام حسن علیہ السلام معاویہ کے ساتھ جنگ کرتے تو کن حالات کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا؟

الف: یقیناً آپؑ کو آپؑ کے اصحاب ہی کے ہاتھوں شہید کرا دیا جاتا۔

ب: آپؑ کے مخلص اصحاب قتل کر دیئے جاتے۔

ج: شیعہ نام کا کوئی ایسا شخص باقی نہ بچتا جو بعد میں امام حسین علیہ السلام کو دعوت دے۔

د: مذکورہ تینوں موارد صحیح ہیں۔

۹۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کے قیام کا بنیادی اور اساسی مقصد کیا تھا؟

الف: امام حسین علیہ السلام نے فقط شہید ہونے کے لیے قیام فرمایا تھا۔

ب: امام حسین علیہ السلام نے تشکیلِ حکومت کے لیے قیام کیا تھا اور آپؑ کا مقصد ایک واقعی علویؑ حکومت بنانا تھا۔

ج: امامؑ نے تشکیلِ حکومت اور شہادت دونوں کے لیے تیاری کر رکھی تھی، جو بھی نتیجہ نکلتا آپؑ ذہنی طور پر دونوں کو قبول کرنے کے لیے تیار تھے۔

د: امامؑ کا اصلی ہدف، دین کے واجبات میں سے ایک عظیم ترین واجب کو انجام دینا تھا۔

۱۰۔ موجودہ زمانے میں امام حسین علیہ السلام کے قیام کی ایک چھوٹی سی جھلک کب ظاہر ہوئی اور اِن دونوں قیاموں کی مماثلت و اختلاف کس چیز میں ہے؟

الف: امام خمینیؒ کے قیام کی صورت میں ظاہر ہوئی؛ امام حسین علیہ السلام اور امام خمینیؒ دونوں کا قیام ظلم و استبداد کے خلاف مشترک حیثیت کا حامل ہے، جبکہ دونوں قیاموں کے زمانے میں اختلاف ہے۔

ب: امام خمینیؒ کے قیام کی صورت میں ظاہر ہوئی؛ دونوں قیام ظالم اور فاسد نظامِ حکومت کے خلاف مشترک تھے، جبکہ فرق یہ ہے کہ امام حسین علیہ السلام کے قیام کا نتیجہ شہادت اور امام خمینیؒ کے قیام کا نتیجہ حکومت کی صورت میں ظاہر ہوا۔

ج: امام خمینیؒ کے قیام کی صورت میں ظاہر ہوئی؛ امام حسینؑ اور امام خمینیؒ دونوں کا ہدف اور مقصد ایک ہی تھا، دونوں اسلام اور اسلامی معاشرے کو صراطِ مستقیم اور سیدھے راستے کی طرف پلٹانا چاہتے تھے، جبکہ حسینیؑ تحریک شہادت پر منتج ہوئی اور خمینیؒ تحریک حکومت سے ہمکنار ہوئی۔

د: ب اور ج دونوں مورد صحیح ہیں۔

۱۱۔ واقعۂ کربلا میں حضرت زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا نے کیا کردار ادا کیا؟

الف: حضرت زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا نے اِس ظاہری شکست کو ایک دائمی فتح و کامرانی میں تبدیل کرنے کے اسباب فراہم کر دیئے۔

ب: حضرت زینب سلام اللہ علیہا نے دشمن کی پیشانی پر ذلّت اور رسوائی کا ایک ایسا دائمی داغ لگا دیا کہ اس کی فتح اور کامرانی، شکست میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔

ج: آپؑ نے اپنے اِس عمل سے پوری دنیا پر واضح کر دیا کہ خواتین کے حجاب اور پاکدامنی کو مجاہدانہ وقار اور عظیم جہاد میں کس طرح سے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

د: مذکورہ تینوں موارد صحیح ہیں۔

۱۲۔ یہ حدیث شریف ”اِرْتَدَّ النَّاسُ بَعْدَ الْحُسَیْنِ إِلَّا ثَلَاثَۃً“ کس امام معصومؑ سے مروی ہے؟

الف: حضرت امام محمد باقرؑ سے

ب: حضرت امام زین العابدینؑ سے

ج: حضرت امام جعفر صادقؑ سے

د: حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے

۱۳۔ امام زین العابدین علیہ السلام نے اسلامی حکومت کی تشکیل کے لیے کونسے اہم مرحلوں کو طے کیا؟

الف: صحیح اسلامی افکار و نظریات جیسے توحید، نبوّت اور اسلامی احکام کی تدوین۔

ب: انسان کی معنوی حیثیت اور مقام کو بیان کرنا۔

ج: خدا اور بندے کے درمیان رابطے کو بیان کرنا۔

د: مذکورہ تینوں موارد صحیح ہیں۔

۱۴۔ امام زین العابدین علیہ السلام کو اپنی تحریک آگے بڑھانے کے لیے بنیادی نوعیت کے حامل کونسے اہم اُمور انجام دینے تھے؟

الف: صحیح اسلامی افکار و نظریات کی قرآن کے مطابق تدوین و ترتیب۔

ب: خلافت، امامت اور ولایت پر اہل بیت علیہم السلام کی حقانیت کا اثبات۔

ج: شیعوں اور اہل بیت علیہم السلام کے پیروکاروں کی ایک باقاعدہ تنظیم کی تشکیل۔

د: مذکورہ تینوں موارد صحیح ہیں۔

۱۵۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کی زندگی پر ابہامات کے پردے پڑے ہونے کا راز کیا ہے؟

الف: مؤرّخین نے تاریخی حوادث اور واقعات کو صرف ظالم و جابر حکمرانوں کے بارے میں قلمبند کیا ہے۔

ب: تمام تاریخی کتابیں بنو اُمیہ اور بنو عباس کے ظالم و جابر حکمرانوں کے زور و قدرت کے زمانے (اور ان کے حکم سے) لکھی گئی ہیں۔

ج: امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے میں حدیثوں اور روایتوں کی فراوانی اس بات کا سبب بنی ہے۔

د: پہلا اور تیسرا مورد صحیح ہیں۔

۱۶۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کا بنو اُمیہ کی اسلام دشمن حکومت سے جنگ کا انداز کس طرح تھا؟

الف: آپؑ اسلام کے صحیح اور قرآن کے اصلی مفاہیم بیان فرماتے تھے جو مفسدوں اور مفاد پرستوں کی طرف سے تحریف کا شکار ہو گئے تھے۔

ب: آپؑ بنو اُمیہ کی سلطنت کا تختہ اُلٹ کر اسلامی اور علوی حکومت قائم کرنے کے لیے ماحول فراہم کر رہے تھے۔

ج: آپؑ نے اپنے پیروکاروں اور علوی حکومت کے حامیوں کے تعاون سے پورے عالم اسلام میں ایک وسیع تنظیم قائم کی ہوئی تھی۔

د: مذکورہ تینوں موارد صحیح ہیں۔

۱۷۔ جب ہارون عباسی نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے "فدک" کی حدود اربعہ کے بارے میں سوال کیا تو امامؑ نے کیا جواب دیا اور اس کا مطلب کیا تھا؟

الف: امامؑ نے باغِ فدک کی حدود کو مدینہ میں کھجور کے چند درختوں کی حدّ تک بیان کیا اور آپؑ کا مقصد اہلِ بیت علیہم السلام کے حق کو واپس لوٹانا تھا۔

ب: امامؑ نے جب فدک کی حدود بیان کرنا شروع کیں تو اُس وقت کی پوری اسلامی

مملکت کو فدک کی حدود میں شامل قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ فدک یہ ہے؛ کیونکہ اصل مسئلہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلافت اور جانشینی کا ہے، مسئلہ اسلامی حکومت کی رہبری اور قیادت کا ہے۔

ج: امامؑ نے باغِ فدک کی حدود بھی بیان کیں اور پورے عالمِ اسلام کی حدود بھی بیان کیں۔

د: الف اور ب دونوں مورد صحیح ہیں۔

۱۸۔ مامون عباسی آٹھویں امام حضرت علی ابن موسیٰ الرضا علیہ السلام کو مدینہ سے خراسان بلا کر ولی عہدی قبول کرنے پر کیوں مجبور کر رہا تھا؟

الف: کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ ہارون اپنی شان و شوکت اور رُعب و وحشت حتی کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو کافی مدت زندان میں قید و بند میں رکھنے اور انہیں زہر دینے کے باوجود بھی انقلابی تحریکوں اور تشیع کی سیاسی، تبلیغی، فکری اور مسلّحانہ جدّ و جہد کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

ب: کیونکہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی شہادت کے بعد پندرہ سالہ وقفے اور خاص طور پر پانچ سالہ خانہ جنگی کے دوران شیعہ تحریک کو علوی حکومت قائم کرنے کے بیشتر مواقع فراہم ہوئے تھے۔

ج: کیونکہ مامون چاہتا تھا کہ ایک ہی مرتبہ اس پوشیدہ اور تقیہ کی کیفیت کو اس تحریک کے بانی سے چھین لے اور امامؑ کو اس انقلابی میدان سے سیاسی میدان میں لے آئے اور اپنی اس چال سے مقصدِ تشیع اور اس پوشیدہ و مخفی عمل کو جو روز بروز ترقی کی منازل طے کر رہا تھا، بالکل صفر درجے تک پہنچا دے۔

د: مذکورہ تینوں موارد صحیح ہیں۔

۱۹۔ امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف جس رول ماڈل انسانی معاشرے کو تشکیل دیں گے اس کی خصوصیات کیا ہوں گی؟

الف: اس معاشرے میں اولیائے الٰہی کی عزت ہوگی اور دشمنانِ اسلام ذلیل و خوار ہوں گے اور وہ معاشرہ ظلم و استبداد کی جڑوں کو اُکھاڑ پھینکنے کے لیے تشکیل دیا جائے گا۔

ب: اس معاشرے میں لوگوں کی فکری سطح بلند ہوگی، علمی لحاظ سے بھی اور اسلامی معارف کے لحاظ سے بھی اور فضیلت کا معیار فضائل اخلاقی ہوں گے۔

ج: اس دور میں تمام توانائی کے وسائل اور زیر زمین موجود ذخائر ظاہر ہو جائیں گے اور زیرِ زمین کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہے گی جس سے انسان استفادہ کر سکتا ہو۔

د: مذکورہ تینوں موارد صحیح ہیں۔

۲۰۔ غیبتِ امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے دوران ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں؟

الف: صرف امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ظہور کا انتظار کرنا۔

ب: پورے عالم کے گوشہ و کنار میں اپنی طاقت و استعداد کے مطابق اسلام کو پھیلانے کی کوشش کرنا اور اپنے اندر اور اپنے معاشرے میں تقویٰ، زہد، اخلاقی اقدار اور دینداری کو پروان چڑھاتے ہوئے خدا سے قریب ہونا۔

ج: ہمیں ظلم برداشت نہیں کرنا ہوگا بلکہ ظلم کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونا ہوگا، چاہے وہ ظلم جیسا بھی ہو اور جس سے بھی سرزد ہوا ہو اور ہماری سمت اور جہت احکام اور حدودِ الٰہی کا نفاذ ہونا چاہیے اور ہمیں اپنے معاشرے میں کسی بھی صورت اسلام مخالف افکار کو پروان نہیں چڑھنے دینا چاہیے۔

د: ب اور ج دونوں مورد صحیح ہیں۔

فردی خصوصیات

نام: ------------------------- فیملی نام: --------------------
ولدیت: ---------------------- تاریخ پیدائش: --------------------
فون نمبر: -------------------- ایمیل ایڈریس: -------------------
پوسٹل ایڈریس: ---

جواب نامہ

نوٹ: صحیح جواب کے خانے میں (علیہ السّلام) کا نشان لگائیں۔

سوال نمبر	الف	ب	ج	د
پہلا سوال				
دوسرا سوال				
تیسرا سوال				
چوتھا سوال				
پانچواں سال				
چھٹا سوال				
ساتواں سوال				
آٹھواں سوال				
نواں سوال				
دسواں سوال				
گیارہواں سوال				
بارہواں سوال				
تیرہواں سوال				
چودہواں سوال				
پندرہواں سوال				
سولہواں سوال				
سترہواں سوال				
اٹھارہواں سوال				
انیسواں سوال				
بیسواں سوال				

علمی سروے

زائرِ گرامی!

مندرجہ ذیل سوالنامہ مدیریتِ زائرینِ غیر ایرانی کی ثقافتی خدمات کی پیشرفت اور آپ کی گرانقدر و ارزشمند تجاویز سے بہرہ مند ہونے کی خاطر تیار کیا گیا ہے۔ برائے مہربانی اِس مقصد کی تکمیل میں ہماری مدد فرمائیں۔

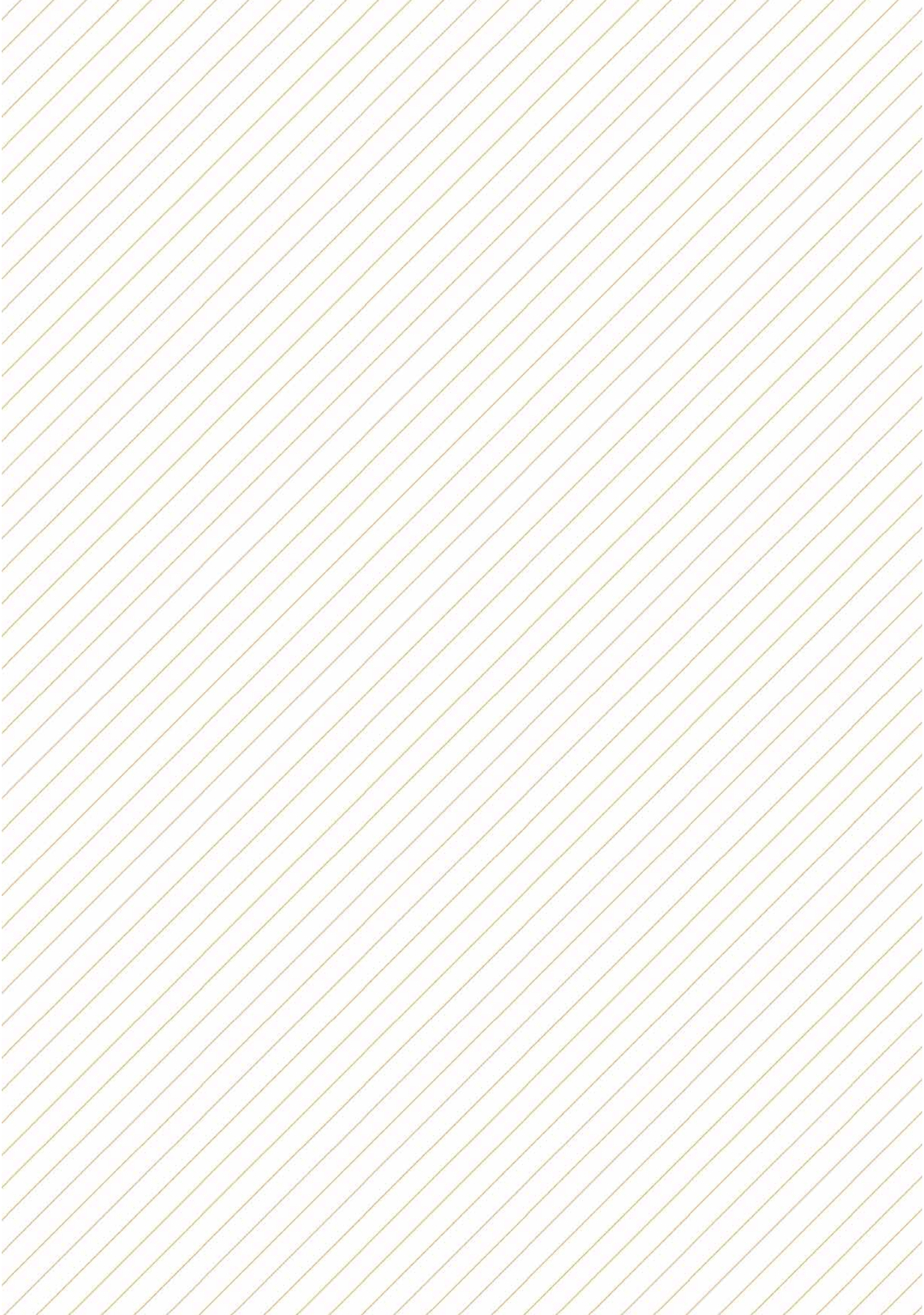نمبر شمار	موضوع	بہت کم	کم	متوسّط	زیادہ	بہت زیادہ
۱	ظاہری خوبصورتی (جلد کے ڈیزائن اور سائز) سے آپ کی رضامندی					
۲	مطالب کے اسلوب سے آپ کی رضامندی					
۳	مفاہیم و مطالب کے قابلِ فہم ہونے سے رضامندی					
۴	موضوع اور مطالب کی تازگی اور جذابیت سے رضامندی					
۵	مطالب کے تاثیرگزار اور مفید ہونے سے رضامندی					
۶	آپ کی ضرورت کے لحاظ سے مفاہیم کا علمی معیار					
۷	موضوع کے ساتھ سوالات کی مناسبت کا لحاظ					
۸	کلی طور پر آپ کی رضامندی					
آراء و تجاویز